سلطان المعظم زین العابدین عرف بڈشاہ بادشاہ کشمیر کے سوانح عمر

تاریخ بڈشاہی

محمد الدین فوق

گلشن پبلشرز سرینگر

تاریخ بڈشاہی

جس میں

کشمیر کے مشہور اور محبوب ترین بادشاہ "زین العابدین اعظم" عرف بڈشاہ کے سوانح حیات
اس کے عہد زرین کی برکات۔ عہد بڈشاہی کے شعرا۔ علما مشائخ اور ہندو مسلمان
۱۲ سلطنت اور صنعت و حرفت کی افزونی اور پندرھویں صدی عیسوی
کشمیر کی سیاسی عظمت و اہمیت اور ہندو مسلم اتحاد اور بڈشاہ کی
علم نوازی۔ ہنر پروری۔ انصاف گستری اور مساوات
پرستی کے مفصل و مکمل حالات درج ہیں

از قلم

محمد الدین فوق

گلشن پبلیشرز سرینگر

نام کتاب ______ تاریخ بڈشاہی

مصنف ______ محمد الدین فوق

ناشر ______ گلشن پبلشرز سرینگر

زیر اہتمام ______ شیخ اعجاز احمد

کتابت ______ منظور قادری، نوہٹہ

طباعت ______ پریس دہلی

قیمت ______ ۲۰۰ روپے

تقسیم کار

شیخ محمد عثمان اینڈ سنز تاجران کتب گاؤکدل چوک سرینگر کشمیر

فہرست مضامین

پیش لفظ

یہ کتاب اس ملک اور اس قوم کی تہذیب و ترقی کا مٹا ہوا خاکہ ہے جس نے کبھی پنجاب و سندھ تبت و کاشغر اور کابل و بدخشاں تک در و دیوار سے اپنی شجاعت و بسالت اور رواداری و انصاف کی شہادت دلوائی تھی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد جو کشمیر کے سیاسی اقتدار اور اس کی گذشتہ علمی عظمت و فضیلت کی نوحہ خواں ہے۔ اہل کشمیر کو غور کرنا ہوگا کہ سلف ایسے تھے تو کیوں تھے؟ اور خلف اب ایسے ہیں تو کیوں ہیں؟ ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک تھی پسند گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

"تاریخ بڈشاہی" کی تصنیف کا خیال ۱۹۱۸ء میں آیا ۱۹۲۰ء میں اس کا کچھ ڈھانچہ تیار کیا گیا لیکن اس کی تکمیل جہانتک راقم کے امکان میں ہے آج پچیس سال کے بعد ہوئی ہے اس پر بھی راقم کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک مصنف زندہ ہے اس کی تصنیف نامکمل ہے کسی مصنف کی نسبت معصومیت کا دعوی کرنا فطرت انسانی سے انکار اور کسی تصنیف کی تکمیل اور عدم نقص کا ادعا علم کی روزافزوں ترقی کی توہین ہے آج کی تحقیق کل کی ترقی کے معیار پر کس طرح پوری اتر سکتی ہے۔

اس لئے میں اپنی اس پچیس سالہ محنت کے سرمایہ کو بھی آخری اور قطعی لفظ قرار نہیں دیتا بلکہ چاہتا ہوں کہ میرے اس کام کو جاری رکھنے والے پیدا ہوں۔ جو تاریکی کے پردوں کو دور کر کے اپنی تاریخ کے گم شدہ اوراق کو روشنی میں لاتے رہیں۔ اور اپنے اہل وطن پر ثابت کر دیں ؎

اس عالم ایجاد کی تقدیر ہے
خواب ماضی کی فضائے حال میں تعبیر ہے

محمد الدین فوق

تاریخ بڈشاہی

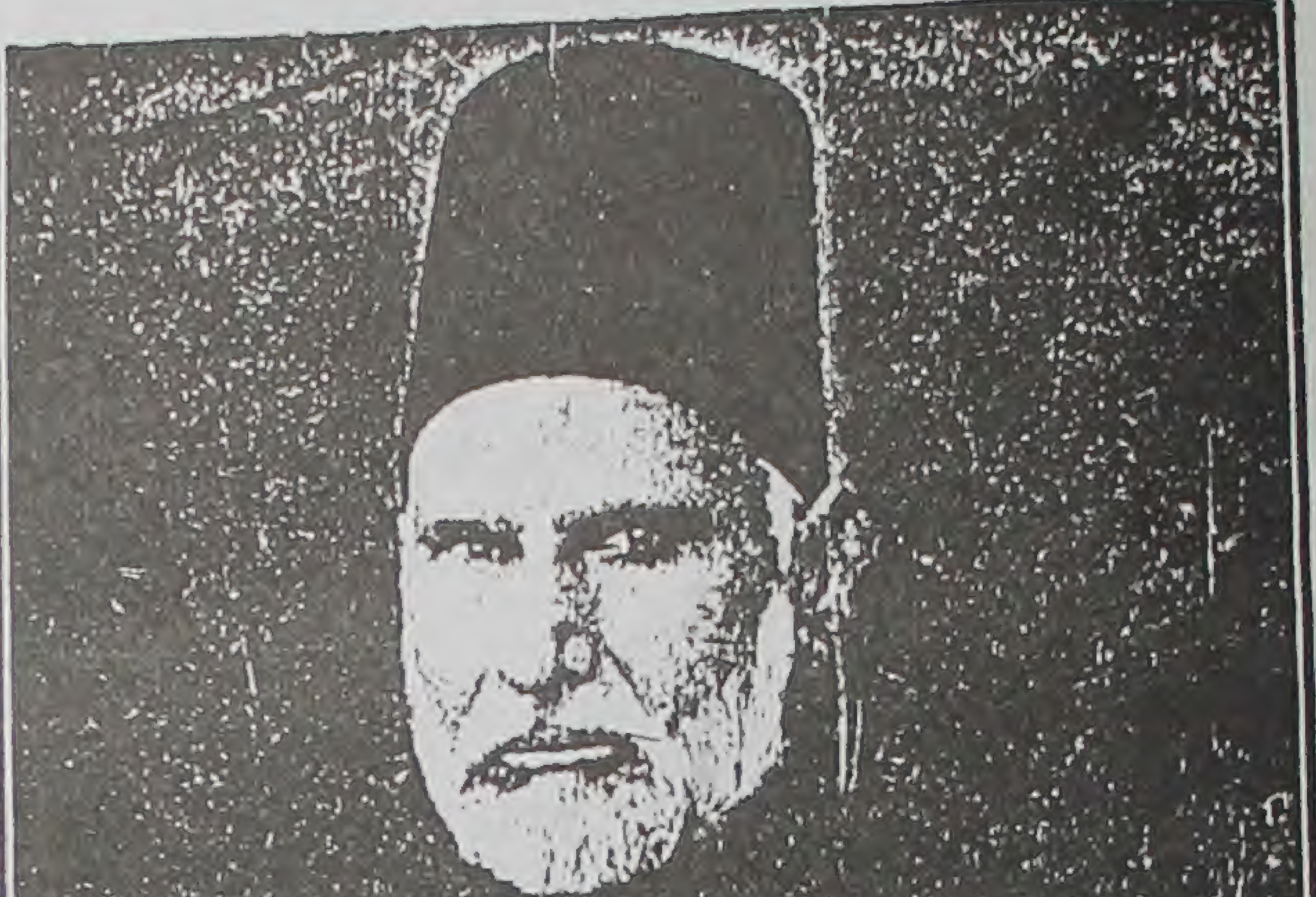
باب اوّل (۱)

کشمیری خاندان کی ابتدا اور اس کا شجرہ نسب

زوالِ راجگان ہنود کے آخری ایام

کشمیر کے متعلق جس قدر تاریخی مواد سنسکرت فارسی۔ اردو۔ انگریزی کی تاریخوں اور دیگر تذکروں سے مل سکتا ہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ خونریز لڑائیوں غیر ملکی حکمرانوں کے حملوں مختلف العقائد فرمانرواؤں کی تبدیلیوں اندرون ملک کی خانہ جنگیوں اور دیگر آفات ارضی وسماوی کے باوجود دنیا میں یہ ایک واحد ملک ہے۔ جو پانچہزار سال یا کچھ زیادہ عرصہ سے اپنی مسلسل تاریخ رکھتا ہے۔۔

اس چھوٹے سے ملک میں ہندو راجگان کے اکیس خاندان ساڑھے



محمدالدین فوق

چار ہزار سال سے زیادہ مدت تک حکمران رہ چکے ہیں۔ ان میں بعض ایسے خاندان بھی تھے جو کمال کے بعد زوال اور زوال کے بعد کمال حاصل کرتے رہے۔ کبھی ان کو تخت سلطنت پر جلوہ گر دیکھا گیا۔ اور کبھی وہ خاک چھانتے نظر آئے۔ بارہا اُٹھے - بارہا سنبھلے اور بارہا گرے اور ان لوگوں کو جنہیں خدا نے بصیرت کی آنکھیں دی تھیں۔ قدرت کی سبق آموز نیرنگیاں اور اپنے اعمال و افعال کا انجام دکھاتے رہے ؎

ز انقلاب زمانہ عجیب مدار کہ چرخ　　　ازیں افسانہ ہزاراں ہزار دارد یاد

جس زمانے کا ذکر ہم کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں ہندو راجگان قدیم کا آخری خاندان جو تاریخ میں خاندان اوپیا دیو۔ کے نام سے مشہور ہے۔ کشمیر پر حکمران تھا۔ اور اس خاندان کا آخری راجہ سہدیو[1] نہ صرف اپنی حکومت بلکہ کشمیر پر ہندو راجگان قدیم کے اقبال و اقتدار کی آخری گھڑیاں گن رہا تھا۔ اس راجہ کے عہد میں ذوالقدر خان تاتاری جس کو اہل کشمیر ذوالچو[2] کہتے ہیں۔ آیا۔ وہ سفاکی اور خونریزی میں ہلاکو خان سے کم نہ تھا۔ اس نے کشمیر میں داخل ہو کر قتل عام شروع کر دیا۔ راجہ کشتوار کی طرف بھاگ گیا۔ کئی لوگ تبت کی طرف چلے گئے۔ تاریخ خواجہ اعظمی کا مصنف لکھتا ہے

---

[1] طبقات اکبری طبع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں صفحہ ۴۲۴ پر سہدیو کا نام سریو درج ہے۔ جو غلط ہے۔

[2] صاحب طبقات اکبری ذولچو کے متعلق لکھتے ہیں:۔ دلجو میر بخشی قندھار بود بجمعیت تمام بر سر کشمیر آمدہ تمام آں ولایت را زیر و زبر ساخت و راجہ سہدیو در اسپیدر بر رعایا توجیہہ کردہ بجہت پیشکش دلجو فرستادہ خود بگوشہ بدر رفت و ازیں امر تمام ولایت کشمیر خراب شد و دلجو بواسطہ کثرت سرما آں جا نتوانست بود و بہ قندھار باز گشت بود صفحہ ۱-۲ مطبوعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔

"ذوالجو مردود بہ مجرّد آمدن فرمود کہ بے ملاحظہ ہمہ را بہ قتل رسانند وزن ہا و اطفال ہا اسیر نمایند و غلّہ را بسوزند و عمارات را ویران ومنہدم سازند و تمام شہر را آتش بر کشند۔"

کشمیر میں تین خوش نصیب نو وارد

اسی راجہ کے عہد میں تین خوش نصیب شخص کشمیر میں قسمت آزمائی کے لئے داخل ہوئے۔ ان میں ایک راجہ تبت کا جوان فرزند رینچن[1] تھا۔ وہ اپنے چچا سے مغلوب ہوکر اور شکست کھاکر کشمیر چلا آیا۔ راجہ سہدیو کے سپہ سالار رام چندر نے راجہ سے اس کا مستقل وظیفہ مقرر کرادیا۔ ذوالجو کے حملہ کشمیر

---

[1] اس کا اصل نام "لالچن رینچن" تھا۔ اس کے آباؤ اجداد تبت اصلی یعنی لہاسہ کے راجہ تھے اور ان کا پتہ تاریخ لداخ سے جس کے جابجا حوالے منشی حشمت اللہ خان وزیر لداخ نے اپنی تاریخ میں دیئے ہیں۔ مسیح سے تقریباً پونے چار سو سال قبل ملتا ہے۔ سب سے پہلا راجہ نیا ٹھی چن پو" تھا اور آخری راجہ "لنگ زرما" کا بیٹا "یوم ستن" تھا جو اس خاندان کا اکتالیسواں راجہ تھا۔ اور جو ۹۳۵ء تک حکمران رہا ہے۔ اس کے بعد یوم ستن کے بھائی "نمی نم الدے" کا بیٹا "اوت شونگ راجہ" بنتا ہے۔ لیکن اس کی اولاد کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے اس کا ایک پوتے "الدے پل کھوبن" کا فرزند ثانی "سکت الدے" یا "نمی کیدا نیما گون" سو سوار دل کے ساتھ مغربی تبت کی طرف قسمت آزمائی کے لئے چلا جاتا ہے اور وہاں ابتدائی کامیابیاں حاصل کرکے لہاچین خاندان کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ اور ۹۰۵ء سے ۹۹۰ء تک حکومت کرتا ہے۔ اس کے بیٹے "سپیگی گون" نے لداخ کو فتح کیا۔ اور اپنے خاندان کا سب سے پہلا نامور راجہ لداخ ہوا۔ اس کی چودھویں پشت میں "لہاچین نوروپ گون" راجہ ۱۲۹۰ء سے ۱۳۲۰ء تک لداخ کا حکمران رہا۔ گیالبو رینچن اسی کا بیٹا تھا (بقیہ صفحہ

کے زمانے میں یہ تبتی شہزادہ بھی سپہ سالار کے ساتھ بھاگ گیا تھا۔ آخر حادثہ ذوالچو کے بعد یہ دونوں اپنے ملک میں واپس آئے۔ لیکن رینچن نے ملک گیری کی ہوس میں رام چندر کو قتل کر کے اس کے بیٹے راون چندر اور اس کے تمام اہل وعیال کو گرفتار کر لیا۔ اور ۱۳۲۵ء میں کشمیر کے نہ صرف تاج وتخت کا مالک بن گیا۔ بلکہ اس نے رام چندر سپہ سالار کی لڑکی اور راون چندر کی بہن کوٹہ رین سے جو بعد کی تاریخوں میں کوٹہ رانی کے نام سے موسوم ہوئی۔ شادی بھی کر لی۔

(۱) تبتی شہزادہ رینچن شاہ

رینچن نے کشمیر کا فرمانروا ہو کر مذہب اسلام قبول کر لیا اور اس کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی مسلمان ہو گئے۔ لیکن اس کی حکومت دیر تک نہ رہی۔ تقریباً پونے تین سال کے بعد وہ عالم عقبےٰ کو چلا گیا۔ اور ایک خورد سال فرزند حیدر نام چھوڑ گیا۔ رینچن کا اسلامی نام ملک صدر الدین تھا۔ سال وفات ۱۳۲۷ء ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴) دگیالبو تبتی زبان میں شاہزادہ کو کہتے ہیں) وہ باپ کی بدسلوکی سے تنگ آکر کشمیر چلا آیا کشمیر کے مورخوں نے اس کے صرف ایک مسلمان فرزند شاہزادہ حیدر کا ذکر کیا ہے لیکن منشی حشمت اللہ خان نے تبتی اور لداخی تاریخوں کے حوالہ سے اس کے ایک لداخی (بدھ مذہب) کے فرزند الہاچین شیرب کا ذکر بھی کیا ہے۔ جو اپنے دادا کے بعد ۱۳۴۰ء سے ۱۴۰۰ء تک لداخ کا راجہ رہا۔ اور جس کی اولاد ۱۵۳۲ء تک لداخ میں حکومت کرتی رہی آخر مرزا حیدر دوغلات نے ۹۳۹ھ مطابق ۱۵۳۲ء میں اس خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ (از تاریخ جموں وملحقات مصنف منشی حشمت اللہ خاں)

(۲) لنگر چک بانی چک خاندان

دوسرے خوش نصیب شخص کا نام جو راجہ سہدیو کے زمانے میں کشمیر میں آیا لنکہ چکمہ یا لنگر چک تھا۔ یہ علاقہ دردستان کا رہنے والا تھا یہی شخص کشمیر اور بیرون کشمیر کی چک قوم کا جد امجد ہے۔ راجہ نے اس کے ساتھ بھی نیک سلوک روا رکھا۔ اور اس کو ترہگام میں رہنے کو جگہ دی۔ اس کی اولاد نے کشمیر میں بڑا اقتدار حاصل کیا اور قریباً دو سو سال کے بعد اس کا سیاسی عروج و اثر اس قدر بڑھ گیا۔ کہ چک قوم ہی کشمیر کی حکمران بن گئی۔ اس قوم نے مسلمان ہونے کے بعد شیعہ مذہب اختیار کر لیا۔

(۳) شاہ میر بانئے شہمیری خاندان

اس بدنصیب راجہ کے عہد میں جو تیسرا خوش نصیب شخص کشمیر میں داخل ہوا اس کا نام شاہ میر تھا۔ یہی شاہ میر شہمیری خاندان کا بانی ہے۔ اور اسی کی نسل سے سلطان شہاب الدین سلطان قطب الدین۔ سلطان سکندر سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ جیسے جلیل القدر بادشاہ کشمیر میں گزرے ہیں۔

ہندو راجگان کے اس آخری دور میں سہدیو اس کا بھائی اودیان دیو اور خود کوٹہ رانی اپنی حکومت کو سنبھالنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ اور کبھی کبھی یہ مرض سنبھالا بھی لیتا رہا لیکن بنیاد چونکہ ہل چکی تھی ہوا اکھڑ چکی تھی۔ اور حکمران طبقہ کی ذاتی کمزوریوں بے اعتدالیوں اور غفلتوں اور وزراء امراء کی باہمی خانہ جنگیوں نے ملک کا برا حال کر رکھا تھا۔ اس لئے یہ سنبھال "خورشید لب بام" اور "شمع سحر" کے وجود سے زیادہ دیر پا ثابت نہ ہو سکا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی۔ کہ واقعات وحالات جو پیش

انہے تھے۔ اور جو آئندہ پیش آنے والے تھے۔ ایک دوربیں آنکھ دور رس نگاہ اس گرد و غبار میں کسی شہسوار کی آمد آمد کا انتظار کر رہی تھی اور اشاروں سے بتا رہی تھی

یہ جتنے کارواں ہیں سب ہنیگے خاک منزل کی
نیا اک کارواں خاکستر منزل سے نکلے گا

اس خاکستر منزل سے جو نیا کارواں نکلا۔ وہ یہی شاہ میر تھا۔ جو سنہ ۱۹ مطابق سنہ ۲۰ء یا اس کے قریب اپنے اہل و عیال کو لے کر اپنے وطن سے باہر نکلا اور راجہ سہدیو کے زمانہ میں کشمیر میں آیا۔ یہ بدقسمت راجہ ہر چند آنے والے واقعات کا مقابلہ کرنے کے ناقابل تھا۔ لیکن اس کی نیکی اور فیاضی پر کسی کو شک نہ تھا۔ اس نے شاہ میر کے غیر ملکی اور غیر مذہب ہونے کے باوجود اس کو جاگیر دی اور اس کی عزت افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

شاہ میر کا حسب نسب

شاہ میری خاندان کے بادشاہوں کے حالات سب سے پہلے بڈشاہ کے عہد میں لکھے گئے۔ بڈشاہ کے ایک درباری شاعر اور مورخ زونراج نے زینہ راج ترنگنی کے نام سے سنسکرت نظم میں جو تاریخ لکھی ہے۔ اس میں بانی خاندان کا نام شہمیر اس کے باپ کا نام طاہر راج اور دادا کا نام تورشاہ لکھا ہے۔ تورشاہ کے متعلق وہ لکھتا ہے۔ وہ ایک اچھے اور شریف خاندان سے تھا۔ اس نے اس کا سلسلہ نسب ارجن کے پوتے اور ابھمن کے بیٹے پرکھشت سے ملایا ہے۔ اس پرکھشت کو بعض نے

لہ ارجن پانڈو کا بیٹا اور بھیم اور یدھشٹر کا حقیقی بھائی تھا۔ اس کا فرزند ابھمن۔ جنگ کورو پانڈو میں دریودھن کے بہنوئی راجہ جیدرتھ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔ اس کی ہلاکت کے بعد اس کا بیٹا پرکھشت پیدا ہوا جو یدھشٹر کی ۳۶ سالہ حکومت کے بعد راجہ بنا۔

پہ پھپت اور بعضوں نے باشا رتھ لکھا ہے۔ اس کے بعد وہ تورشاہ کی تعریف میں لکھتا ہے۔ کہ اس کے بازوؤں پر جرأت رجوانمردی کا نشان ایک کمان کی صورت اس کی خوش اقبالی کی اس طرح شہادت دے رہا تھا جس طرح صبح کے وقت کسی پہاڑ کی چوٹی پر آفتاب کی خوبصورت سنہری کرنیں شاہ خاور کی آمد کا پتہ دیا کرتی ہیں۔ اس کی تین آنکھیں تھیں۔ وہ کثیر الاولاد ہوگا۔ اس کی اولاد کی بڑی شہرت ہوگی۔ وہ کشمیر میں حکمرانی کریگی۔ اور اس حکمران خاندان کا بانی شمس الدین ہوگا اور ملک کے دیگر چھوٹے زمانہ واؤں کو اس کا مطیع بن کر رہنا پڑے گا۔ آگے چلکر وہ لکھتا ہے۔ تورشاہ کے ہاں ایک فرزند طاہر راج کے نام سے پیدا ہوگا جو لمبا اوفات کمان کی تانت کو شہ زوری کی وجہ سے اپنے کانوں تک کھینچ لایا کرے گا۔ اس کے بعد طاہر کے ہاں شاہ میر پیدا ہوا جس کا جوش گرمی میں آفتاب نصف النہار کی سی تاب رکھتا تھا۔ اور جس کی بہادری و شجاعت اس کے دشمنوں کی بیوہ عورتوں کے زار وقطار گریہ سے ظاہر ہوتی رہتی تھی۔ یہی شاہ میر شمس الدین کے نام سے کشمیری خاندان کا بانی ہوا۔

شاہ میر کا اصلی وطن

شاہ میر علاقہ پکھلی کو طے کرتے ہوئے بارہ مولا میں پہنچا۔ بارہ مولا کو باب الکشمیر یعنی کشمیر کا دروازہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ کشمیر کی اصل وادی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس زمانے میں اور اس سے پیشتر بارہ مولا کے رستے جو لوگ کشمیر آتے تھے۔ انہیں پکھلی ضلع ہزارہ کا علاقہ طے کرکے آنا پڑتا تھا چنانچہ میر سید علی ہمدانی جب کشمیر سے واپس گئے۔ تو پکھلی ہی میں وفات پا گئے۔ اور جب محمود غزنوی کے زمانہ میں راجہ اوربانڈ نے راجہ کشمیر سے مدد طلب کی تو کشمیری افواج نے اسی راستہ سے سندھ اٹک کو عبور کیا۔ اکبر اور جہانگیر بھی عموماً

اسی راستے آیا کرتے تھے۔ چنانچہ جہانگیر نے تزک جہانگیری میں اس راستے کے اکثر مقامات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ شاہ میر کا اصلی وطن افغانستان کا وہ شمالی علاقہ بتایا جاتا ہے۔ جس میں کوہستان سوات بنیر۔ کنہر۔ پنج کوڑہ اور باجوڑ واقع ہیں۔ بعض مصنفین نے اس کا وطن خاص کنہر یا کونار یا کنبر لکھا ہے۔ بعض کا یہ بھی خیال ہے۔ کہ جب وہ پانڈووں کی اولاد سے ہے۔ تو افغانستان کے علاقہ سے اس کا کیا تعلق وہاں تو مسلمانوں کی آبادی قدیم سے چلی آتی ہے

لیکن اس معمہ کو خود زونراج حل کر دیتا ہے جب وہ اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ اس کا اصلی وطن پنج گور تھا۔ اوپر ہم لکھ چکے ہیں کہ افغانستان کے شمالی کوہستان میں جو اہم مقامات ہیں۔ ان میں پنج کوڑہ بھی ہے۔ ذرا سے غور کے بعد صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ پنج کوڑہ وہی مقام ہے جس کا نام آج سے پانچ چھ صدی پیشتر پنج گوڑ تھا۔

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ افغانستان میں ہندو کبھی آباد نہیں تھے وہ افغانستان کی تاریخ قدیم اور صوبہ سرحد کے آثار قدیمہ کے کھنڈروں سے قطعی لاعلم معلوم ہوتے ہیں۔ افغانستان میں ہندوؤں اور بدھوں کی آبادی کے آثار زمانہ قدیم سے پائے جاتے ہیں۔ ان پر سب سے پہلے یونانیوں نے پھر تاتاریوں۔ پھر ایرانیوں اور ان سب کے بعد مسلمانوں نے حملے کئے۔ مسلمانوں کے زمانے میں افغانستان اور اس کے نواحی علاقہ جات سوات۔ بنیر۔ کنہر۔ پنج کوڑہ۔ چترال وغیرہ کا کثیر حصہ مسلمان ہو گیا۔ صرف وہ وسیع رقبہ مسلمان نہ ہو سکا۔ جو کوہ ہندوکش کے شکم میں واقع ہے۔ اور جسے اسی وجہ سے مسلمانوں نے کافرستان کا نام دے رکھا ہے۔ اور اب تو ان میں سے بھی کئی قبیلے مسلمان ہو چکے ہیں۔ ان کے دیوتوں

میں بعض نام ایسے ہیں۔ جو صاف طور پر ہندو زمانے کی یادگار معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً کام دلیش جو ایک بہت بڑے علاقہ کا نام ہے۔ لنبی گرام۔ سوندیش۔ پندریش وغیرہ۔

علاوہ ازیں افغانستان کے پرانے کھنڈروں سے جو بت اور سامان بت پرستی اور پرانے سکے ملتے ہیں جن پر ایک طرف بیل کی تصویر کے ساتھ ایک آدمی کی بھی تصویر ہے۔ جو دھوتی اور زنار پہنے ہوئے ہے۔ ان سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ اس ملک میں ہندوؤں کی سکونت اور حکومت رہی ہے۔ نیز ایبک سے مغربی پہاڑ کی طرف ایک پرانی عمارت کے نشان موجود ہیں جس کو پانڈو کے عہد کا قلعہ بتایا جاتا ہے۔ علاقہ مہا لوالی کے کوہ سکیسر میں بھی ایک بہت پرانی عمارت کو اب تک، پانڈو کا سنگھاسن کہتے ہیں۔

مہابھارت کی روایت کے مطابق دریودھن کی والدہ راجہ گندھارا (قندھار) کی بیٹی تھی۔ اس کے علاوہ پرانے ترکستان بامیان کے علاقہ میں کوہ ہندوکش کی گھاٹی پر بہت سی قدیم عمارات کے نشان موجود ہیں۔ اور دو مورتیاں بھی استادہ ہیں۔ جن میں ایک ۱۰۰ فٹ اور دوسری ۱۰ فٹ بلند ہے۔ ایک چشمہ بھی ہے جس کو ہندو متبرک تیرتھ تصور کر کے سینکڑوں برس سے ہر سال وہاں جایا کرتے ہیں۔

متذکرہ صدر شہادتوں سے قطع نظر ایبٹ آباد صوبہ سرحد۔ افغانستان اور سوات۔ چترال کے علاقوں میں ہندو عہد قدیم کے آثار ملتے ہیں۔ اور پشاور اور لاہور کے عجائب خانوں میں مورتیوں اور بتوں کی صورتوں میں ان کی زندہ تصویریں موجود ہیں۔

مسلمان مورخ اور شاہ میر کا حسب نسب

بڈشاہ کے حالات میں سنسکرت مصنفین نے تین کتابیں لکھی ہیں سب سے پہلی کتاب راجہ ولی یا زینہ ترنگنی ہے۔ لیکن زیادہ تفصیل حالات زینہ راج ترنگنی میں ہیں۔ اور وہیں اس کا خاندان پانڈوؤں کی ذریات سے ظاہر کیا گیا ہے۔ تیسری کتاب زینہ چرت ہے۔ جو صرف بادشاہ ہی کے حالات سوانح کے متعلق ہے۔ وہ چونکہ بالکل ناپید ہے۔ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں بادشاہ کے حسب نسب کے متعلق کیا کچھ درج تھا۔ ان کے علاوہ بڈشاہی عہد میں دو فارسی تاریخوں کا بھی پتہ ملتا ہے۔ جن میں ایک ملا احمد اور ایک ملا نادری کی تصنیف ہے۔ یہ دونوں تاریخیں بھی نایاب بلکہ ناپید ہیں البتہ دوسری فارسی تاریخوں میں جو عہد بڈشاہی کے بعد لکھی گئی ہیں۔ ان تاریخوں کا نام یا ان کا کہیں کہیں صرف حوالہ نظر آتا ہے۔ ان کے بعد سب سے پہلا مسلمان مورخ میرزا حیدر گورگانی[1] جو کئی سال تک کشمیر کا حاکم بلکہ ایک لحاظ سے کشمیر کا بادشاہ رہ چکا ہے۔ اس نے بھی شاہ میر کے حسب نسب کے متعلق کوئی ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ اس کا زمانہ بڈشاہ کی وفات سے صرف ستر پچھتر سال بعد کا تھا۔ البتہ بڈشاہ کی وفات سے قریباً سوا سو سال کے بعد خواجہ نظام الدین ہروی نے طبقات اکبری میں لکھا ہے۔

"شاہ میر نام شخصے کہ نسبت خود چنیں مے گفت کہ شاہ میر بن طاہر بن شاشب بن گرشاشپ بن نیکوزر وانتہائے نسب خود بہ ارجن کہ یکے از پانڈواں است مے نمود"

---

[1] میرزا گورگانی بابر بادشاہ کا خالہ زاد بھائی تھا۔ انگریزی کتاب ہمایوں بادشاہ کے مصنف ایس کے بنرجی ایم اے پی ایچ ڈی نے اس کا سلسلہ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶ پر)

اس کے بعد تاریخ فرشتہ۔ تاریخ ملک حیدر چاڈورہ۔ تاریخ خواجہ اعظمی۔ سیر المتاخرین اور کئی اور تاریخوں میں شاہ میر کے متعلق جو کچھ درج ہے۔ وہ تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ طبقات اکبری ہی کا عکس ہے۔ "نسبت خود چنیں مے گفت" کا فقرہ اندرون کشمیر اور بیرون کشمیر کی تاریخوں میں نقل د نقل ہوتا چلا گیا ہے۔ اور جو شجرہ طبقات اکبری نے نیکوزر تک شاہ میر کا لکھا ہے سب نے قریباً اسی کو دُہرایا ہے۔ اور تورشاہ کا کہیں نام نہیں لکھا۔ جو طاہر کا باپ تھا۔ اور جس کو بڈشاہی عہد کے مصنف زونراج نے جو بعد کے تمام مورخوں سے زیادہ معتبر ہے۔ اپنی تاریخ میں درج کیا ہے۔ البتہ طاہر کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ (۳) بابر سے اس طرح ملایا ہے۔ یونس خاں مغل شہزادہ کی دو بیٹیاں تھیں ایک خوب نگار خانم جس کا خاوند محمد حسین میرزا دوغلات تھا دوسری قتلق نگار خانم جس کا خاوند عمر شیخ میرزا حاکم فرغانہ تھا۔ خوب نگار خانم کے فرزند کا نام محمد حیدر میرزا تھا۔ اور قتلق نگار خانم کے فرزند کا نام محمد ظہیر الدین بابر بادشاہ تھا۔ حیدر میرزا ابتدا میں کامران میرزا یعنی بابر کے فرزند کے ماتحت لاہور کا نائب گورنر رہا۔ لیکن کامران نے اس کو کسی وجہ سے اور شاید اس وجہ سے کہ وہ ہمایوں کا طرفدار تھا عہدہ نیابت سے ہٹا دیا۔ وہ ۹۳۶ھ میں بابر کے پاس چلا گیا۔ حیدر میرزا نے رسال تک پنجاب میں کامران کے ماتحت حکومت گزار ہا بابر کے بعد اس لئے ہمیشہ ہمایوں کا جو بابر کے بعد ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا تھا ساتھ دیا بلکہ اسی نے ہمایوں کو کشمیر پر حملہ کرنے کا مشورہ دیا۔ لیکن ہمایوں اس وقت خود شیر شاہ سوری کے خوف سے پنجاب کو چھوڑ کر سندھ کے ریگستان کی طرف جا رہا تھا۔

سنہ وفات خواجہ نظام الدین ہروی ۱۰۰۳ھ بزمانہ اکبر سال تصنیف طبقات اکبری ۱۰۰۱ھ

کے بعد شاشب اور گرشاشپ اور نیکوزرد وغیرہ ایسے نام لکھ دیئے ہیں۔ جو ایرانی بادشاہوں کے ناموں سے ملتے جلتے ہیں اور جن کا زونراج نے ذکر تک نہیں کیا معلوم نہیں یہ نام کہاں سے اور کیا سمجھکر شجرہ میں بڑھا دیئے ہیں۔

شاہ میر کے قدیم وطن کا تعلق بہ لحاظ آب وہوا کشمیر کے ساتھ

سوات اور اس کے علاقے اور ملحقہ آبادیوں کی آب وہوا کشمیر سے ملتی جلتی ہے اور اس ملک میں جو کوہستانی اور میدانی نظارے ہیں۔ اور ان کے اندر جو چشمے۔ مرغزار اور سبزہ زار اور دلکش وادیاں ہیں۔ وہ دامن دل کھینچنے میں کشمیر کے کسی گوشہ سے کم نہیں ہیں خوشحال خاں خٹک جو اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں پشتو زبان کا ایک مشہور سواتی شاعر گزرا ہے۔ اپنے وطن کو خطۂ کشمیر سے نسبت دیتا ہوا لکھتا ہے۔

خبردار بہ شوم نہ ہزہ ہرہ نہ ایشہ | سوائلہ مے واڑہ لکڈ مال کڈہ سرتاپایہ
پہ دوران یوسف زیو دران رباط دے | ملک دسواتھ وملوکا نو بونشاط دے
جیف دی واچہ کشمیر آرت دی دے تنگ دے | یہ ہواکش وکشمیر وبہ آب ورنگ دے

مطلب ان اشعار کا یہ ہے کہ میں نے تمام سوات کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ملک سوات اس قابل ہے کہ بادشاہ یہاں آکر عیش ونشاط منائیں اور خوشیاں کریں۔ مگر یوسف زیوں نے اس ملک کو ایک ویران رباط (سرائے) بنا دیا ہے آب وہوا اس ملک کی کشمیر کی طرح ہے۔ مگر صرف اتنا افسوس ہے کہ کشمیر ایک وسیع ملک ہے اور سوات اس کے مقابلے میں ایک چھوٹا سا خطہ ہے۔

اس لئے شہمیر نے جب نقل مکانی اور ترک وطن کا ارادہ کیا تو آب وہوا اور کوہساروں اور مرغزاروں کے لحاظ سے اور اس خیال سے کہ کشمیر سوات اور نیز کوڑہ سے زیادہ دور بھی نہیں ہے کشمیر ہی کی سیاحت واقامت کو پسند کیا نیز مؤرخین کشمیر کی تحریروں کے مطابق قورشاہ کے وہ الفاظ بھی اس کے دماغ

میں گونج رہے تھے جو اس کے دل میں کبھی کبھی توانا نہ ولولے پیدا کر دیا کرتے تھے ۔ اور جن کا ذکر اگلی سطور میں آئے گا ۔

شاہ میر کے بادشاہ کشمیر ہونے کی پیش گوئی

زینہ ترنگنی کا مصنف زونراج لکھتا ہے ۔ ایک مرتبہ شاہ میر جنگل میں شکار کی تلاش میں سرگرداں تھا جب تھک کے چور ہوگیا ۔ تو ایک جگہ اس کو غنودگی سی آگئی ۔ خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ مہادیوی اس کو امید افزا اور مسرت بھرے لفظوں میں سلطنت کشمیر کی خوش خبری دے رہی ہے ۔ اور کہہ رہی ہے کہ یہ ملک ایک نہ ایک دن تمہارے قبضہ میں آئے گا ۔ اور تمہاری اولاد عرصہ دراز تک اس ملک پر حکومت کرتی رہے گی ۔

خواجہ محمد اعظم مصنف تاریخ کشمیر اعظمی بھی شاہ میر کے متعلق اس قسم کے ایک واقعہ کا ذکر کرتا ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ شاہ میر کے بادشاہ کشمیر ہونے کی پیشگوئی اس کے دادا قور شاہ نے جو صاحب کرامت و خوارق تھا کی تھی ۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے

" در مجمع مردم روزے گفت کہ الہام رب جلیل بہ من در رسید کہ
از فرزند تو پسرے مے شود شہمیر نام بادشاہ ولایت کشمیر باشد
و از نسل او چند کس بر تخت خواہند نشست ۔"

شاہ میر کے متعلق اس قسم کے الفاظ فارسی کے دیگر مورخوں نے بھی لکھے ہیں بہر حال ان ایام میں کشمیر کے حالات و واقعات ہی بتا رہے تھے ۔ کہ اس جنت نظیر ملک کے تاج و تخت کے لئے گردش فلک کسی اور صاحب نصیب کا انتظار کر رہی تھی ۔

شاہ میر کا کشمیر میں داخلہ

شاہ میر کو مہادیوی نے تخت کشمیر کی اجازت دی ۔ یا اس کے دادا قور شاہ

کے الفاظ اس کے کانوں تک پہنچے۔ بہر حال اس کے دل میں ایک قسم کی اُمنگ اور امید پیدا ہوگئی۔ اور جب راجہ سہدیو نے بہ لطف خسروانہ دیکھا۔ اور اس کے ساتھ شاہانہ سلوک روا رکھا۔ تو جس امید کو لیکر وہ اپنے وطن سے نکلا تھا یا جس بشارت کو اس نے عالم غنودگی میں سُنا تھا۔ اس کی کامیابی کی کچھ دُھندلی سی جھلک اس کو کشمیر کی کمزور حکومت کے گرد وغبار میں نظر آنے لگی۔

وہ اہل وعیال سمیت قسمت آزمائی یا سیر وسیاحت کے لئے اپنے وطن سے کشمیر چلا آیا۔ بارہ مولا میں اس نے اقامت اختیار کی جہاں راجہ سہدیو نے اس کو ایک موضع جاگیر میں دیدیا۔ اور اس نے اپنے شاندار مستقبل کے لئے راجہ کے اس عطیہ کو فال نیک تصور کیا۔

تاریخ اعظمی میں بھی لکھا ہے "کشمیر دو بارہ مولا۔ بہ اہل وعیال خود سکونت کردہ چوں خبر سکونت او راجہ بہ رسید۔ حکم نمود کہ بہ قریہ دوارہ دیر سکونت کند و حاصلات آں را در وجہ کفاف صرف نماید"۔

زینہ ترنگنی میں بھی شاہ میر کے داخلۂ کشمیر کا ذکر آیا ہے۔ لکھا ہے ۸۹ لوکک (۴۳۸۹ لوکاک) مطابق ۱۲۲۵ شاکا ہین۔ وہ آخر کار کشمیر میں داخل ہوا اس کے اہل وعیال اور دیگر رشتہ دار اُس کے ساتھ تھے۔ راجہ کشمیر نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اور اس کا معقول وظیفہ مقرر کر کے اس کی اعانت اور امداد اس فیاضانہ طریق سے کی۔ جیسے آموں کے ساتھ لدا ہوا درخت شہد کی مکھیوں کو دعوت دے کر سیر کر دیتا ہے۔

بنتی شہزادہ رینچن اور شاہ میر

حادثہ ذوالچو کے ایام میں رینچن اور شاہ میر دونوں کچھ عرصہ تک قلعہ گگناگیر (علاقہ لار) میں محفوظ وپناہ گزیں رہے تھے۔۔ اور وہاں شہبر کی صحبت نے

اس کے مذہبی خیالات میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ اس لئے رینچن شاہ نے جب سہدیو کے بعد تخت کشمیر پر قبضہ کیا۔ اور پھر مسلمان ہو کر اپنا نام ملک صدرالدین رکھا۔ تو شاہ میر کا وقار بہت کچھ بڑھ گیا۔

ملک صدرالدین نے سپہ سالار رام چندر کو قتل کر کے اس کی بیٹی کوٹہ رین دکوٹہ رانی) سے شادی کر لی۔ اور دو شخصوں کو اپنا سپہ سالار بنایا۔ ایک وہی شہمیر۔ دوسرا لچھ بٹ کاکا پوری۔ یہ دونوں اس زمانے کے نامور سرداروں میں تھے۔

شہمیر ترقی و اقتدار کی منازل میں

شاہ میر سپہ سالار او رمدار المہام ہی نہ تھا۔ بلکہ اس کے سپرد ملک صدرالدین کا فرزند حیدر خاں بھی تھا جس کو آئندہ بادشاہ کشمیر ہونا تھا شاہ میر نے حیدر خاں کو اسلامی طور و طریق کے مطابق تعلیم و تربیت دی۔

"رینچن بہ حکومت نشست" کے بعد طبقات اکبری بھی شاہ میر کی اتالیقی کے متعلق ذیل کی سطور لکھتا ہے:۔

"شاہ میر را وزیر خود ساختہ مدار کارخانہ حکومت بُرد گزشت و اتالیقی پسر خود کہ چندر[1] نام داشت بہ او تفویض نمود۔"

---

[1] رینچن شاہ کے فرزند کا پیدائشی نام شاید چندر ہو۔ لیکن اسلامی نام اس کا حیدر تھا جب رینچن شاہ نے تخت کشمیر پر قبضہ کیا ہے۔ تو اس کے فرزند کی عمر ساڑھے گیارہ سال تھی۔ اور اس نے اپنے مسلمان ہونے کے ساتھ ہی بیٹے کو بھی مسلمان کر کے اس کا نام حیدر خاں رکھ لیا تھا۔ چونکہ حیدر اور چندر میں تجنیس خطی موجود ہے۔ اس لئے حیدر کی جگہ چندر طبقات اکبری میں غلط نام درج ہے۔

پندرہ سال کے لئے کشمیر میں پھر ہندو حکومت

ملک صدر الدین کی ڈھائی سالہ حکومت اور اس کی وفات کے بعد تاریخ کشمیر ایک اور پلٹا کھاتی ہے۔ کوٹہ رانی اپنے سوتیلے فرزند حیدر خان کو تخت سے محروم کر دیتی ہے۔ اور اپنے پہلے خاوند راجہ سہدیو کے بھائی راجہ اودیان دیو کو جو حادثہ ذوالچو کے وقت سے علاقہ پکھلی میں پناہ گزین تھا۔ نہ صرف طلب ہی کرتی ہے۔ بلکہ جب وہ آتا ہے۔ تو اس کے سلک زوجیت میں آجاتی ہے اب لچہ بٹ کاکاپوری کو سپہ سالاری اور شاہ میر کو مدار المہامی کا عہدہ ملتا ہے اور اس انقلاب کے زمانے میں تاریخ کشمیر حیدر خاں پسر سلطان صدر الدین کا انجام بتانے سے بالکل خاموش ہے۔

راجہ اودیان دیو کے زمانۂ حکومت میں جو پندرہ سال سے کچھ زیادہ ہے شاہ میر کا عروج پھر بڑھتا ہے۔ ایک معرکہ میں وہ ایک بیرونی دشمن کے دانت ایسے کھٹے کرتا ہے۔ کہ دشمن کی فوج کا کثیر حصہ قتل ہو جاتا ہے۔ اور کچھ جان بچا کر واپس لوٹ جاتا ہے لیکن اودیان دیو دشمن کے خوف سے تبت کی طرف نکل جاتا ہے۔

اودیان دیو تو بالکل مٹی کا مادھو تھا۔ البتہ رانی خود دلاور تھی اور دلاوروں کی قدر کرتی تھی۔ اس نے شاہ میر کو مختار کل بنا دیا تھا۔ اور اس کے دو فرزندوں جمشید اور علاؤالدین کو کامراج میں جاگیریں بھی دیں۔ امن و امان ہونے کے بعد اودیان دیو کو رانی نے تبت سے واپس بلایا۔ لیکن وہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ایک خوردسال فرزند (از بطن کوٹہ رانی) چھوڑ کر دنیا سے چل بسا۔

شاہ میر بطور بادشاہ کشمیر

اب پھر تخت کشمیر اپنے وارث سے خالی ہوتا ہے۔ کوٹہ رانی اپنے بھائی

رادن چندر کے ساتھ کچھ ایسے مشورے کرتی ہے۔ کہ اعیان حکومت دل برداشتہ ہو جاتے ہیں۔ اور اگر سارے ملک میں نہیں۔ تو کم از کم سرینگر میں جو دارالحکومت ہے سخت بدامنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور رانی دو مہینے پورے بھی حکومت کرنے نہیں پاتی۔ کہ شاہ میر لچھ بٹ سپہ سالار کو (جو اودیان دیو کے شیر خوار پسر کا سرپرست بنکر شاہ میر کی مخالفت کر رہا تھا) قتل کر دیتا ہے۔ اور امرائے سلطنت سے عہد و پیمان کر کے اپنے جدِ امجد کی پیشگوئی یا بقول زونراج مہادیو کی بشارت کے مطابق خود کشمیر کا بادشاہ بن جاتا ہے [1]

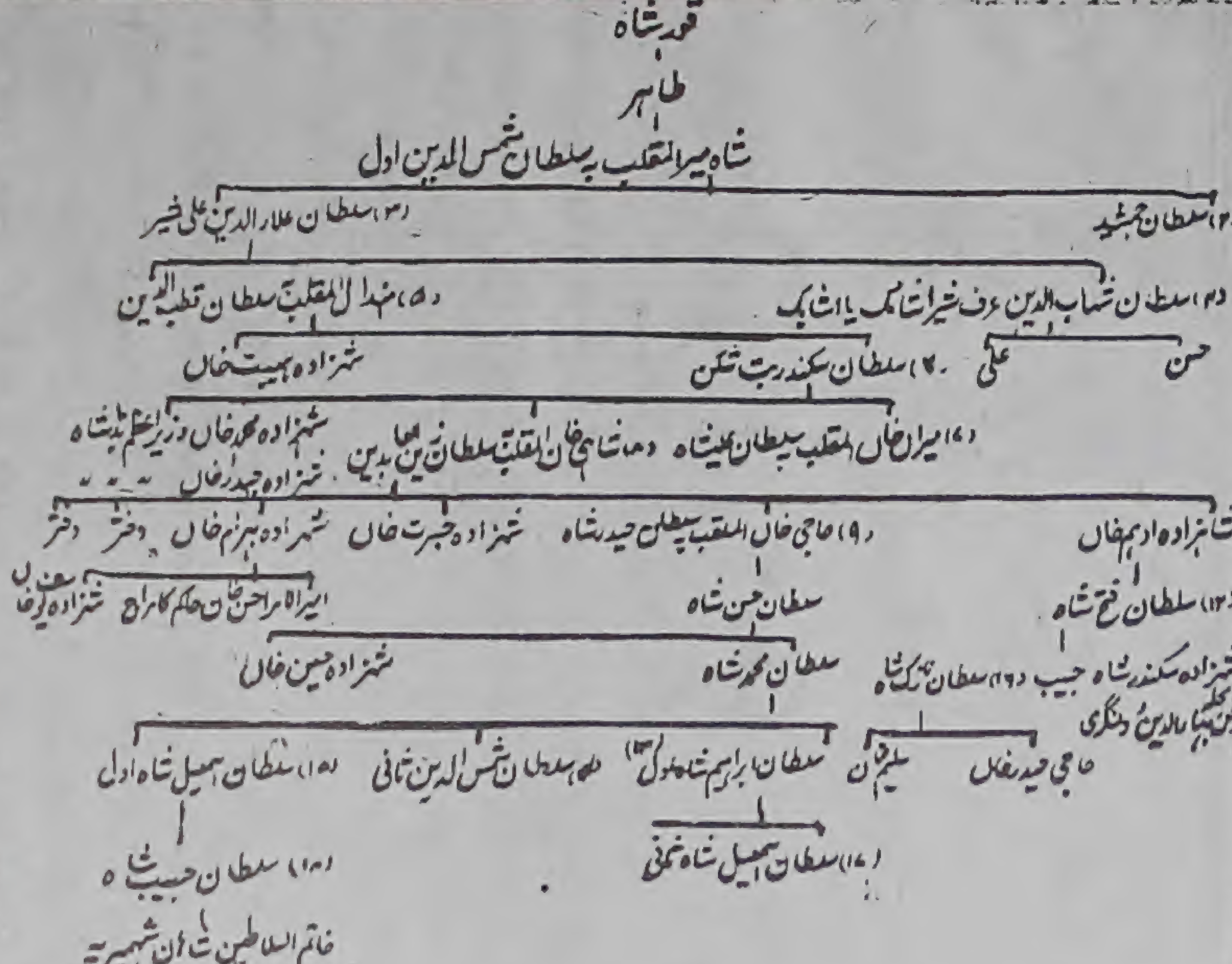
وہ بھی تھا اک مسافر ایمن مری طرح
تم نے بیک نظر جسے موسے بنا دیا

---

[1] شاہ میر یعنی سلطان شمس الدین کا مقبرہ موضع سنبل میں واقع ہے یہ مقبرہ سلطان صاحب یا سلطان پادشاہ کے نام سے مشہور ہے یہ مقبرہ ایک کوٹھڑی میں ہے جو اندازاً اٹھارہ بیس فٹ مربع ہے کوٹھڑی کی چھت کے تختے بوسیدہ ہو کر گر چکے ہیں۔ قبر پانچ فٹ لمبی اور چوبی تعویذ سے ڈھکی ہوئی ہے کوٹھڑی اس قسم کی نیم خام اینٹوں کی ہے جیسی کشمیر کے دیہات میں عام طور پر نیم پختہ دیکھی جاتی ہیں۔ اس کوٹھڑی کی دیوار کے گرد پھر ایک کچی دیوار ہے جس میں جا بجا منقش سنگی تعویذ لگے ہوئے ہیں۔ اور جن پر کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔ اس دیوار کے باہر بھی اس قسم کے تعویذ دیکھے گئے۔ یہ اس بادشاہ کی قبر کا حال ہے۔ جس نے کشمیر میں اس عظیم الشان خاندان کی بنیاد رکھی۔ جو دو سو سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک کشمیر کا حکمران رہا۔ اور جس نے قطب الدین۔ شہاب الدین سلطان سکندر۔ اور بڈشاہ جیسے اولو العزم بادشاہ پیدا کئے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

شجرہ نسب شاہان خاندان شاہ میر



شجرہ نسب کے متعلق ایک ضروری تصریح

صاحب طبقات اکبری اور مصنف تاریخ فرشتہ نے شاہ میر عرف سلطان شمس الدین بانی خاندان شمیری کے دو کی بجائے چار فرزند لکھے ہیں (۱) جمشید (۲) علی شیر عرف علاؤالدین اور تیسرے کا نام کہیں شیر اسا ملک کہیں خیر اشا ملک اور کہیں شیر آسا درج ہے۔ اور اس کا لقب سلطان شہاب الدین بتایا ہے چوتھے کا نام شہزادہ ہندال عرف سلطان قطب الدین ظاہر کیا ہے۔

لیکن زینہ ترنگنی نزونراج نے شہزادہ ہندال اور شہاب الدین دونوں کو شاہ میر کے فرزند سلطان علاؤالدین علی شیر کے بیٹے لکھا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے شیمبر کے دو پوتے بڑے قابل تھے۔ ایک کا نام شرج تنتا کا۔ دوسرے کا نام ہمدا تھا۔ نزونراج نے شہاب الدین کو شرج تنتا کا کے علاوہ شہادوینا بھی لکھا ہے۔ ہمدا سے مطلب ہندال ہے۔ جو قطب الدین ہی کا ایک نام تھا۔ اور اس بارہ میں زینہ ترنگنی کی تحریر بعد کی تاریخوں کے مقابلے میں زیادہ معتبر و مستند ہے۔

دوسرا باب ۲

بادشاہ کے ایام شہزادگی

مؤرخین کشمیر کی تاریخی فروگزاشتیں

کشمیر کے سب سے پہلے تاریخ نویس نے چونکہ تاریخ کی بنا نظم پر رکھی تھی جو سنسکرت زبان میں تھی۔ اس لئے اس کی تقلید میں سنسکرت زبان کے مؤرخوں

نے اپنی تمام تاریخیں نظم ہی میں لکھیں سنسکرت تاریخوں کے ساتھ ساتھ بعض تاریخیں فارسی میں بھی لکھی گئیں۔ مگر نظمیہ تاریخوں کی تقلید میں کشمیر کے شاعر گورنر راجہ سکھ جیون نے اپنے عہد میں کشمیر کی تاریخ نظم ہی میں لکھوائی یہاں تک بھی کوئی قباحت نہ تھی۔ مگر زیادہ افسوس یہ ہے کہ کشمیر کے مورخین نے نہ قدیم راجاؤں نہ مسلمان بادشاہوں نہ صلحا و علماء کے حالات میں ان کے سنین پیدائش اور عام ملکی معاملات اور طرز حکومت وغیرہ کا کوئی خاص خیال رکھا۔

بزرگان دین کے سوانح میں تو زیادہ زور "نقل است" "روایت است" "گفتند" "مے گویند" پر ہی دیا گیا ہے۔ اور اس بات کا مطلق لحاظ نہیں رکھا گیا کہ جو واقعہ "نقل است" کے ذریعہ وہ تحریر کر رہے ہیں۔ اس کے تسلیم کرنے میں "عقل است" کی بھی ضرورت ہے یا نہیں۔ اور "گفتند" اور "مے گویند" کی تاریخی واقعات سے بھی کچھ تطبیق ہو سکتی ہے یا نہیں۔ صلحاء و مشائخ کے تذکرہ نویسوں نے عقل و تاریخ اور تحقیق و تدقیق سے کام لینے کی بجائے زیادہ تر اظہار کرامات و خوارق عادات ہی کو اپنا مقدس فرض سمجھا ہے۔

اس سلسلہ میں مورخین کشمیر پر یہ ایک سیاہ نما دھبہ ہے کہ بڈشاہ جیسے مشہور و جلیل القدر اور بے تعصب، بادشاہ کے متعلق جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں ہر دلعزیز تھا کشمیر کی کسی تاریخ میں اس کی تاریخ پیدائش تو کجا سنہ پیدائش کا بھی ذکر نہیں کیا گیا۔

بادشاہ کے سال پیدائش کی تحقیق

بڈشاہ کے زمانہ میں جو فارسی تاریخیں ملا نادری اور ملک احمد ملک الشعراء کی تصنیف سے بتائی جاتی ہیں۔ وہ تو بالکل عنقا ہیں معلوم نہیں ان میں بادشاہ

کی پیدائش کا ذکر تھا یا نہیں۔ لیکن بڈشاہی عہد کی سنسکرت زبان کی تاریخیں جو اپنے تراجم سمیت اس وقت موجود ہیں ان میں بھی صرف ایک زینہ راج ترنگنی مصنفہ شریور بٹ میں اس کے سال وفات کا ذکر ہے۔ پیدائش کا سال اس نے بھی نہیں لکھا۔ اس نے بادشاہ کی وفات سنہ ۴۶ لوکک میں بتائی ہے اور یہ لوکک سال اس زمانے میں ۴۵۴۶ تھا۔ اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ مصنف نے پنڈت کلہن وغیرہ قدیم مصنفوں کی تقلید میں آبادی کشمیر یا کلجگ کی تاریخ ہی سے اس سنہ کا شمار کیا ہے یعنی بادشاہ کی وفات کے زمانہ تک کشمیر کو آبادی کی صورت اختیار کئے ۴۵۴۶ سال گزر چکے تھے۔

لوکک سمت ۴۵۵۰ سنہ ۱۴۷۰ء کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ اور سنہ ۱۴۷۰ء کی موافقت میں سنہ ۸۷۴ھ کا نام لیا جاتا ہے لیکن کشمیر کی قدیم فارسی تاریخوں مثلاً تاریخ خواجہ اعظمی وغیرہ میں اس کا سال وفات سنہ ۱۴۷۴ء مطابق سنہ ۸۸۰ھ بتایا گیا ہے۔ عیسوی سن کے مطابق چار سال اور ہجری سنہ کے مطابق سال کا فرق ان تاریخوں میں موجود ہے۔ بڈشاہ کے ایام حکومت شریور کی زینہ راج ترنگنی کے مطابق پچاس سال ہیں۔ اور مصنف تاریخ خواجہ اعظم کی تحریر "پنجاہ و دو سال حکومت کردہ۔ در تاریخ ہشتصد و ہفتاد و ہشت از ایں عالم درگذشت" کے مطابق باون برس ہیں۔ اور مکمل تاریخ کشمیر (اردو) میں مدت حکومت سوا اکیاون سال اور سال وفات سنہ ۸۷۹ھ درج ہے۔ اس طرح سال تخت نشینی میں بھی تین چار سال کا فرق مختلف تاریخوں سے نظر آرہا ہے۔ غرض اس قسم کا فرق جہاں صدیاں گزر جائیں اور ابتدا میں کسی نے تاریخ یا سال پیدائش لکھنے کی طرف توجہ بھی نہ کی ہو کوئی اہم فرق نہیں ہے۔ تاہم بڈشاہ کی عمر ۶۹ سال تسلیم کرنے میں

کئی مورخوں کو اتفاق ہے[1]

اور اس بارے میں سب سے بڑی سند شری ور کی زینہ راج ترنگنی ہے۔ جہاں صاف الفاظ میں اس کی عمر ۶۹ سال اور مدت حکومت پچاس سال درج ہے اس تحریر کے مطابق بادشاہ نے سنہ ۴۵۴۶ لوکک میں انتقال کیا تھا۔ سنہ ۴۵۴۶ لوکک کے مطابق ہجری سال ۸۷۵ھ ہے شری ور نے بادشاہ کی تخت نشینی کا سال سنہ ۴۴۹۶ لوکک مطابق ۸۲۳ھ لکھا ہے۔ اور فارسی مورخوں کی تاریخوں کے مطابق اس کی تخت نشینی کا سال ۸۲۶ء ہے صرف تین سال کا فرق ہے۔ جو زیادہ اہم نہیں ہے

اس حساب سے اس کا سال وفات ۸۷۴ھ اور عمر اس کی ۶۹ سال ہے۔ اس کا سال پیدائش ۴۴۷۶ لوکک مطابق ۸۰۵ھ نکلتا ہے۔ اس کے باپ سلطان سکندر کی وفات ۸۲۰ھ میں ہوتی ہے۔ اس وقت بادشاہ کی عمر پندرہ سال کی تھی طبقات اکبری کا مصنف بھی لکھتا ہے۔ کہ جب سلطان سکندر نے وفات پائی۔ تو اس کے فرزند ابھی چھوٹی عمر کے تھے۔ اس نے ان کو اتحاد و اتفاق کی نصیحت کی علی شاہ بادشاہ کا بڑا بھائی تھا۔ وہ تخت پر بیٹھا۔ اس کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ بیس سال ہوگی شاہی خان یعنی بڈشاہ اور شہزادہ محمد خان یہ دونوں علی شاہ سے چھوٹے تھے۔ ۸۲۴ھ میں ملک سیف الدین عرف سیہہ بٹ کی وفات کے بعد علی شاہ اپنے چھوٹے بھائی زین العابدین کو اپنا نائب السلطنت اور وزیر اعظم مقرر کرتا ہے۔ اس وقت زین العابدین کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔ اور اس چھوٹی سی عمر میں بھی اس نے شجاعت و جوانمردی میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی جیسا کہ صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں: "سلطان برادر خورد شاہی خاں

---

[1] میں نے خود اپنی مکمل تاریخ کشمیر جلد دوم مطبوعہ ۱۹۱۰ء میں بڈشاہ کی عمر ۶۹ سال لکھی ہے

را کہ بہ شجاعت وکیاست مشہور بود بہ وزارت برگزید۔[1]

بادشاہ کا اصل نام کیا تھا؟

بڈشاہ اپنے بھائی علی شاہ سے جس کا اصل نام میراں خاں تھا۔ چھوٹا تھا۔ جب یہ پیدا ہوا۔ تو باپ نے آثار سعادت واقبال دیکھکر نام شاہ رخ رکھا۔ کشمیر میں چونکہ اصل نام سے بہت کم لوگ مشہور ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی نہ کوئی عرف ان کے اعمال یا ان کے خاندان یا ان کے مشکل نام کی وجہ سے جو زبان پر آسانی سے نہیں چڑھ سکتا مشہور ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اصل نام کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ اسی طرح شاہ رخ کا نام اہل کشمیر نے شاہی خاں پکارنا شروع کیا۔ اور شہزادگی کے زمانے تک وہ اسی نام سے مشہور رہا۔ اور اب غالباً کوئی شخص بھی نہیں جانتا۔ کہ اصلی نام شاہ رخ تھا یا شاہی خاں۔ بلکہ عوام اب ان دونوں ناموں کو بھول کر صرف اس کے عرف عام بڈشاہ ہی کے نام سے واقف وآگاہ ہیں۔

بچپن اور تعلیم

شاہی خاں کے بچپن میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی محلات شاہی میں پیدا ہوا۔ وہیں پلا اور وہیں اس نے بچپن گزارا۔ اس کے بچپن کے صرف دو واقعے مختلف تاریخوں کی چھان بین کے بعد مل سکے ہیں۔ اور ان کا تعلق بھی مشائخ عظام کی ذات اقدس سے ہے۔ اس کے باپ سلطان سکندر کے زمانے میں سید حسین[2] خوارزمی ایک بہت بڑے بزرگ کشمیر میں رونق افروز تھے۔ سکندر ایک دن اپنے دونوں شہزادوں کو دعائے حصول دولت وبرکت کے لئے سید ممدوح کے پاس لے گیا۔ چنانچہ آپ[3] کی دعا سے دونوں شہزادے سعادت دارین سے

---

[1] جلد دوم صفحہ ۴۴۴ [2] تجلیات کبرویہ غیر مطبوعہ صفحہ ۳۱۹۔ [3] آپ کا مزار محلہ سنوارا میں ہے۔

بہرہ ور ہوئے۔ یعنی پہلے بڑا بھائی تخت پر بیٹھا۔ اور اس کے بعد شاہی خان۔
شاہی خاں اپنے بچپن کے زمانے میں ایک مرتبہ شیخ بہاءالدین کی خدمت میں گیا۔ وہ اس کی خوش تیزی و خوش کلامی سے بہت خوش ہوئے۔ نظرِ فیض اثر سے دیکھا۔ اور فرمایا (بحکم خدا) "ترا بادشاہ دین و دنیا کردیم و گنج ہائے فراواں بہ تو بخشیدیم۔"
شاہی خاں کے آئندہ حالات پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ کہ وہ واقعی "بادشاہ دین و دنیا ہو کر گنج ہائے فراواں کا مالک بنا۔ اسی دن سے بہاءالدین "گنج بخش" کے نام سے موسوم ہوگئے۔
سکندر نے اپنے ہونہار فرزند کے لئے مولانا کبیر کو جو دینی و دنیوی علوم و فنون میں مہارت تامہ رکھنے کی وجہ سے درحقیقت استاد اکمل تھے۔ استاد مقرر کیا۔ معمولی رئیس زادوں کی رسم بسم اللہ دھوم دھام سے ہوتی ہے۔ شاہی خان کو جب استاد نے پہلا سبق دیا ہوگا۔ تو باپ نے کیا کچھ جشن نہ منایا ہوگا۔ شاہی خاں کو علوم دینی و دنیوی سے جو محبت تھی۔ وہ سب مولانا ہی کے فیض صحبت کا نتیجہ تھی۔

بادشاہ کی والدہ

مورخین کشمیر نے سلطان سکندر کی بیگمات کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ سوائے اس امر کے کہ مقبرہ بڈشاہ کے احاطے کے اندر جو ڈ؟ مٹ ہے۔ وہ سکندر کی بیگم اور بڈشاہ کی والدہ کا ہے۔
زینہ ترنگنی کے مصنف نونراج نے سکندر کی بیگمات اور بڈشاہ کی والدہ کے متعلق البتہ چند سطور لکھی ہیں۔ وہ لکھتا ہے سکندر نے جب اُدیانڈپور[۱]

[۱] اُدیانڈپور کے تفصیلی حالات کے لئے دیکھو ضمیمہ ۲

کے فرمانروا کو شکست دی۔ نواد ہانڈ پور کے فرمانروا نے شکست کے بعد اپنی لڑکی سلطان سکندر[1] کو دے کر اس کے ساتھ صلح کر لی۔ اس راجکماری کا نام شری میرا[2] تھا۔ وہ یقیناً ایک دیوی تھی جس کی قسمت میں لکھا تھا کہ اس کے بطن سے وہ نامور فرزند پیدا ہوگا۔ جو کشمیر کو خوشحال بنائے گا اور ملک کی بے اطمینانی دبے چینی کو دور کرے گا۔ جو ملیچھوں کے ظلم و تشدد سے تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ اس شہزادے کا نام شری "جینول عابدین" ہے جو اس کلجگ کے زمانے میں نیکیوں اور بھلائیوں کا ایک سرچشمہ ہے۔"

---

[1] دیکھو انگریزی ترجمہ زینہ ترنگنی جے سی دت آف کلکتہ سائز کلاں صفحہ ۵۸۔

[2] بعض اصحاب نے بتایا ہے کہ میرا کا صحیح تلفظ تہر ہے۔ ہندی اور سنسکرت میں ناموں کے آگے الف زیادہ لگا دیتے ہیں۔ جیسے قندھار کو قندہارا۔ دت کو دتا کرشن کو کرشنا کہتے ہیں۔ اس بنا پر کہا جاتا ہے۔ کہ اصل نام مہر یا مہر خاتون تھا۔ سنسکرت مصنف نے مہر میں الف زائد کر کے مہر کی بجائے میرا لکھدیا ہے۔ لیکن راقم مؤلف ۱۰ اہادون سمت ۱۹۹۵ مطابق ۲۵۔ اگست ۱۹۳۸ء کو جب تبگو علاقہ زنگیر میں تھا۔ تو منشی برکت علی خان تحصیلدار ہندواڑہ کے روبرو دو بہنیں انتقال زمین کی تصدیق کرانے کے لئے پیش ہوئیں۔ جن کے نام تیرا اور پیرا تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرا نام اب تک کشمیر میں چلا آتا ہے۔ یہ نام کشمیر ہی کی پیدائش ہے اصل نام اس بیگم کا جو اس کی والدہ نے رکھا تھا۔ اس کا کسی نے صحیح پتہ نہیں بتایا۔ میرا کے ساتھ شری کا جو لفظ ہے۔ وہ ادباً اور تعظیماً ہے۔ علاوہ ازیں میرا نام کے کشمیری ہونے کا ایک اور ثبوت بھی ملتا ہے سید شمس الدین اندرابی جو سید میر میرک اندرابی کے والد تھے کی شادی سید مفضل اللہ منطقی خلف سید حسن منطقی (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳ پر)

زونراج آگے چل کر لکھتا ہے ۔ شری میرا کے بطن سے اور بھی دو شہزادے تھے ۔ جن میں بڑا میرا خان عرف علی شاہ تھا ۔ اور سب سے چھوٹے کا نام محمد خاں تھا ۔ اس بیگم کا مقبرہ مہاراج گنج احاطہ مزار السلاطین کے اندر ایک بلند گنبد کی صورت میں اب تک اقبال سکندری پر نوحہ کر رہا ہے ۔ اس عمارت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے ۔ کہ اس کی روغنی اور سانچہ کی ڈھلی ہوئی اینٹیں جو بیرونی دیواروں میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر لگی ہوئی ہیں اپنی قدیم صنعت کا ثبوت دے رہی ہیں ؎

زونراج کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سکندر کی ایک اور بیگم بھی تھی ۔ اس کا نام اس نے شوبھا دیوی لکھا ہے ۔ معلوم نہیں وہ کس ہندو راجہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶) بڈشاہی کی دختر میرا بائی سے ہوئی تھی ۔ اس معزز خاتون کا نام میرا بی بی اور میرا باجی دونوں طرح تاریخوں میں درج ہے ۔ دیکھو مناقب السادات حصہ اول صفحہ ۱۰۱۱ مصنفہ مولوی محمد شاہ سعادت مفتی سرینگر ۔ یہ نام ہندوستان ور پنجاب میں بھی عام طور پر رائج ہے ۔ جیسے راجپوتانہ کی میرا بائی جو بڑی شاعرہ مشہور ہے ۔ اور بڈشاہ کے بھائی سلطان علی شاہ کا نام میرا خاں یا میراں خاں تھا

۳؎ زونراج اور شریور جہاں کہیں مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں ۔ وہ ان کو ملیچھ جیسے مکروہ الفاظ ہی سے یاد کرتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے ۔ عہد بڈشاہی سے پیشتر کشمیر کے پنڈتوں کو جو مذہبی و مالی نقصان پہنچا ہے ۔ ان ہتک آمیز الفاظ کے ذریعے یہ دونوں مصنف اپنے دل کو کچھ تسکین دے لیا کرتے تھے ۔ بلکہ بلبل لنکر شہر کے جس حصہ میں ہے ۔ اس کو بھی ہندو ملیچھ مر کہتے ہیں ۔ ملیچھ اس زمانے میں ہر غیر ہندو کا نام تھا ۔ اور مر زبان کشمیری جگہ کو کہتے ہیں ۔ (اس کا حاشیہ صفحہ ۴۸ پر)

کی راجکماری تھی۔ سو صرف اسی قدر لکھتا ہے۔ کہ شوبھا دیوی بے حد امیر تھی۔ اس نے اپنی دولت کے جائز استعمال سے دین و دنیا کی نعمتیں حاصل کر لی تھیں۔ اس کے بھائی کا نام راجہ ضجیہ تھا جس کو ایک مغرور اور طاقتور سردار اودا نے قتل کر دیا تھا۔ اس رانی کے بطن سے کوئی اولاد بھی نہ تھی۔ اس لئے اس نے دو لڑکوں کو اپنی دلبستگی کے لئے متبنّے بنا رکھا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام پیروزہ (فیروز) تھا۔ اور دوسرے کو جس کا نام زونراج نے نہیں لکھا۔ بادشاہ نے کسی وجہ سے جلاوطن کر رکھا تھا۔ ؎

سمرقند میں نظر بند رہنے کا قصّہ

کشمیر کی اکثر تاریخوں میں یہ قصّہ مذکور ہے۔ کہ امیر تیمور فتح ہند (۸۰۱ھ ۱۳۹۸ء) کے بعد سلطان سکندر بادشاہ کشمیر کے فرزند دوئم شاہزادہ شاہی خان کو اپنے ہمراہ سمرقند لے گیا۔ اور اس وقت تک شہزادے کو مراجعت کشمیر کا موقع نہ مل سکا۔ جبتک کہ امیر تیمور اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت نہ ہو گیا۔ یہ

(۱؎ حاشیہ صفحہ ۴۰) پنڈت انند کول بامزئی جو انگریزی زبان کے مشہور کاشمیری مصنّف تھے۔ اپنے جغرافیہ ریاست جموں وکشمیر میں لکھتے ہیں۔ جس مقام پر سلطان سکندر کی بیگم مدفون ہے۔ یہاں مہاراجہ پرورسین والئے کشمیر نے مہاشری کے نام سے مندر تعمیر کیا تھا۔ یہ عمارت اسی مندر کے چبوترے پر بنائی گئی ہے۔ اب یہ مندر معدوم ہے۔ اور مندر کی بجائے اب اس کا نام مقبرہ بڈشاہ یا مزار السلاطین ہے۔

؎ زونراج نے نہ فیروز کے مزید حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ اور نہ جلاوطن لڑکے کا نام اور اس کی جلاوطنی کی وجہ بتائی ہے اور نہ یہ لکھا ہے کہ وہ لڑکے کس خاندان سے تھے۔ گمان غالب ہے کہ کشمیری خاندان ہی سے ہونگے۔

واقعہ ۸۰۰ھ کے بعد کا بیان کیا جاتا ہے۔
سب سے پہلے اس قصہ کو خواجہ محمد اعظم دیدہ مری مصنف تاریخ اعظمی نے ۱۱۴۸ھ میں بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی بیان کیا ہے۔ اور لکھا ہے "در بعض تواریخ خصوصاً ظفر نامہ کہ در احوال امیر تیمور مرقوم است دیدہ شد کہ شاہی خان پسر سلطان سکندر خان کہ مشہور بہ زین العابدین است برائے ملازمت امیر تیمور رفتہ بود۔ او سمرقند بردہ و شہر بند کردہ بعد وفات امیر تیمور خلاصی یافتہ و العلم عند اللہ"۔
لیکن ظفر نامہ تیموری قلمی میں جو پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے۔ مولانا شرف الدین یزدی کشمیر کے متعلق اور بہت کچھ لکھتے ہیں سلطان سکندر کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ امیر تیمور کے ایلچی بھی سکندر کے پاس آتے ہیں۔ امیر تیمور ہاتھی اور دیگر تحائف اور ہدایا اپنے ایلچیوں کے ہاتھ امیر تیمور کی خدمت میں ارسال کرتا ہے لیکن اس میں شاہزادہ شاہی خان کے سمرقند جانے یا رئیس الوفد ہونے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ تعجب ہے ظفر نامے کے متعلق خواجہ محمد اعظم نے "دیدہ شد" بھی لکھا ہے۔ اور العلم عند اللہ کا سہارا بھی لیا ہے۔ ظفر نامہ تیموری کے علاوہ تزک تیموری بھی راقم مؤلف کی نظر سے گزر چکی ہے۔ اس میں بھی اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔
طبقات اکبری تاریخ اعظمی سے قریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کی تصنیف ہے۔ وہ بھی شاہی خان کے سمرقند جانے کے متعلق قطعی خاموش ہے۔ چنانچہ صاحب طبقات اس موقعہ پر جب امیر تیمور سلطان سکندر کو سرحد کشمیر یعنی (آب سندھ) پر حاضر ہونے کا حکم دیتا ہے۔ لکھتے ہیں: "شنید کہ حضرت صاحب قرانی از آب سندھ گذشتہ متوجہ سمرقند شدند۔ ایلچیاں را با پیش کش بسیار بخدمت آنحضرت فرستادہ بکشمیر مراجعت نمود"۔

صاحب طبقات نے بھی صرف ایلچیوں کا ذکر کیا ہے شہزادے کا کہیں نام نہیں لیا۔ تاریخ رشیدی۔ طبقات اکبری سے بھی پچاس ساٹھ سال قبل کی تصنیف ہے۔ اس میں بھی شہزادے کے سمرقند جانے کا ذکر نہیں ہے۔

طبقات کے بعد حیدر ملک چاڈورہ نے ۱۰۲۷ھ مطابق ۱۲ جلوس جہانگیری میں کشمیر کی تاریخ لکھی ہے۔ وہ بھی ایلچیوں کا ذکر کرتا ہے شاہی خاں کا کہیں نام نہیں لکھتا چنانچہ ذیل میں اس کے اصل الفاظ درج کئے جاتے ہیں ۱

"در زمان سلطنت سلطان (سکندر) مذکور امیر تیمور صاحب قرآن ہندستان آمدند و فتح ہند نصیب اولیائے دولت ایشاں گردید۔ و با سلطان سکندر راہ مراسلات و مکاتبات نمودہ و یک زنجیر فیل برائے ایشاں فرستاد و سکندر مذکور تحفہ و ہدایا چنداں برائے صاحبقران ارسال نمود کہ مواسبان از جناب آں عاجز آمدند۔"

۱۱۳۲ھ میں نرائن کول عاجز نے بہ عہد عارف خاں نائب صوبہ کشمیر کشمیر کی جو تاریخ لکھی ہے۔ اس میں بھی اس نے شاہی خان کے سمرقند جانے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ غرض خواجہ محمد اعظم سے قبل کسی مورخ نے شاہی خاں کے سمرقند جانے اور وہاں چھ سات سال نظر بند رہنے کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ اس کے بعد جو مورخ گزرے ہیں۔ انہوں نے تاریخ اعظمی کی سند پر شاہی خاں کے سمرقند جانے کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ پنڈت بیربل کاچرو جو مہاراجہ گلاب سنگھ بانی خاندان ڈوگرہ کے عہد میں گزرا ہے۔ وہ شاہی خان کے سمرقند جانے

---

۱ مکمل تاریخ کشمیر جلد دوم اور دیگر اردو و فارسی تاریخوں میں بھی تاریخ اعظمی ہی کا تتبع کیا گیا ہے۔

کا ذکر کرتا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے[۱]

"علیشہ با تحف و ہدایا بدست شاہی خاں بچہ خود را کہ معروف بہ زین العابدین بود بہ بارگاہ او فرستادہ امیر تیمور ازین حرکت او بنایت رضامند گردید و فیل و خلعت برائے او ارسال داشت۔ شاہی خاں را ہمراہ بردہ در سمرقند بند نمود و بعد وفات او ازاں جا رہائی یافتہ بہ کشمیر آمد"

کشمیر کی تاریخ حسن میں شاہزادہ شاہی خاں کے مفروضہ سفر سمرقند کے ہمراہیوں کے دو نام خصوصیت سے درج ہیں۔ ایک کھکھی خان، ایک حاتم خاں یا ہاتو خاں مصنف نے ان دونوں کو نومسلم راجپوت اور حقیقی بھائی بتایا ہے لیکن سکندر کے ایڈیول میں نہ یہ دو نام درج ہیں اور نہ کسی اور قدیم مورخ نے سلطان سکندر یا بڈشاہ کے عہد میں ان کے وجود کا ذکر کیا ہے

صاحب "اسلامک کلچر ان کشمیر" نے بھی اپنے ایڈیشن اول میں تاریخ خواجہ اعظمی اور اس کے زمانہ ابعد کی تاریخوں کی تقلید کی ہے۔ بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ جب شاہی خاں کو امیر تیمور ۸۰۳ھ میں اپنے ہمراہ سمرقند لے گیا تو شاہی خاں غدان

---

[۱] ورق ۵۸ قلمی کتاب سری پرتاپ لائبریری سرینگر کشمیر۔

[۲] تاریخ حسن بڑی ضخیم کتاب ہے۔ اور چار جلدوں میں ہے۔ مصنف نے اس پر بڑی محنت کی ہے۔ مذکورہ بالا واقعہ کا ذکر جلد اول کے صفحہ ۱۸۱ پر ہے۔ مصنف نے ان دونوں نومسلم راجپوتوں کو راجگان کھکھہ و بمبال کا جو کشمیر کی تحصیل اوڑی میں جاگیر دار تھے مورث اعلیٰ بتایا ہے لیکن جدید تحقیقات اور بالخصوص ککھہ قوم کے تاریخی حالات سے یہ امر بھی پایہ ثبوت تک نہیں پہنچتا۔ یہ تاریخ اب تک غیر مطبوعہ ہے اور کشمیر کی سرکاری لائبریری کے علاوہ بعض اور لوگوں کے پاس بھی موجود ہے۔

شباب کے عالم میں تھا۔ لیکن یہ قصہ کئی وجوہ سے ناقابل تسلیم ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ نہ ظفرنامہ تیموری میں اس کا ذکر ہے۔ نہ تزک تیموری میں۔ اس کے غلط ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے۔ کہ شاہی خاں عرف بڈشاہ کے زمانے میں جونراج مورخ زونراج اور شرتور گزرے ہیں۔ ان دونوں نے اس کے سمرقند میں نظربند ہونے یا ایلچیوں کے ہمراہ بطور رئیس الوفد سمرقند جانے کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ چونکہ یہ دونوں مورخ بادشاہ کے مقرب اور درباری تھے۔ اس لئے انہوں نے بادشاہ کے پاس خاطر سے اس واقعہ کا ذکر نہ کیا ہو۔ لیکن ظفرنامہ تیموری کے مصنف اور خود امیر تیمور کو اپنی توزک میں اس کا ذکر کرنے سے کونسا امر مانع تھا۔ بلکہ وہ بطور فاتح فخر کے ساتھ مفتوح یا زیر اقتدار بادشاہوں کا ذکر کر سکتے تھے۔ جیسا کہ بادشاہ دہلی سلطان محمود تغلق پر فتح حاصل کرنے اور راجہ جسرت کو گرفتار کرنے اور فتح لاہور کے بعد گکھڑوں کو تباہ کرنے کا ظفرنامہ اور توزک میں تفصیل سے ذکر ہے۔

تیسری دلیل اس واقعہ کے غلط ہونے کی یہ ہے۔ کہ بڈشاہی عہد کے مورخوں کی تحریروں کے مطابق بڈشاہ کی پیدائش ۸۰۵ھ مطابق ۱۴۰۲ء میں ہوئی ہے۔ اور امیر تیمور ۸۰۱ھ میں ہندوستان آتا ہے۔ اور فتح ہند کے بعد ۸۰۱ھ میں وہ واپس سمرقند چلا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ بڈشاہ کی عمر چار سال سے زیادہ نہ تھی اور بالفرض اگر تیمور اسے لے بھی گیا تھا۔ تو بڈشاہ تیمور کی وفات (۸۰۷ھ) کے وقت دس گیارہ سال سے زیادہ عمر کا نہ تھا۔ اس عمر میں وہ سمرقند سے صاحبان علم و فضل اور اہل فن و ہنر کے کمالات اور اپنی ملکی ضروریات سے کس طرح واقف ہو سکتا اور انہیں کشمیر لا سکتا تھا۔

تیسرا باب

شاہی خاں کی اپنے بھائی علی شاہ بادشاہ کشمیر سے جنگ

سلطان سکندر کی وفات اور علی شاہ کی تخت نشینی

تپ محرقہ جب مرض الموت بن کر سلطان سکندر کا دامنگیر ہوا۔ تو اس نے اپنے تینوں بیٹوں میراں خاں۔ شاہی خاں اور محمد خاں کو بلوایا۔ اتفاق و اتحاد کی نصیحت کی۔ پسر کلاں میراں خاں عرف علی شاہ کو خلعت ولیعہدی عطا کیا اور باقی دونوں کو اس کی متابعت کا حکم دے کر ۲۲ محرم سنہ ۸۲۰ھ / ۱۴۱۶ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔

ملک سیف الدین بٹ جو سکندر کے زمانے میں سلطنت کا مختار جزو کل تھا بدستور علی شاہ کا وزیر بنا رہا۔ شاہی خان اور محمد خان کو جاگیریں عطا کی گئیں پانچ سال کے بعد سنہ ۸۲۵ھ میں ملک سیف الدین بھی انتقال کر گیا۔

شاہی خاں منصب وزارت پر

سیف الدین عرف سیہہ بٹ کے انتقال کے بعد علی شاہ نے منصب وزارت پر اپنے چھوٹے بھائی شاہی خاں کو سرفراز کیا۔ اس وقت ملک کی یہ حالت تھی۔ کہ چاروں طرف ملک سیف الدین کے خوف و تشدد سے سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہندو بالخصوص سہمے ہوئے تھے۔ اس کی وزارت کے زمانے میں کئی ہندو جلاوطن ہو گئے۔ اور کئی خودکشی کر کے اس کے ظلم سے نجات حاصل کر گئے۔ جیسا کہ صاحب طبقات اکبری جلد دوم کے صفحہ ۴۳۴ پر لکھتے

ہیں۔ کہ "اکثرے از ہنود ان جلاوطن گشتند۔ و بعض ہا خود را کشتند"

شاہی خاں نے نہایت نازک حالت میں وزارت کشمیر کا قلمدان اپنے ہاتھ میں لیا۔ اسلام کی تعلیم نے اخلاق و مساوات کا جو سبق اسے دیا تھا اس کا تقاضا تھا۔ کہ وہ اسلام اور مسلمانوں سے جو بدگمانی ماتحت قوم کو ہو رہی ہے۔ اس کو دُور کرے۔ اسی بنا پر اس نے بادشاہ سے کامل انتظامی اختیارات طلب کئے جو اس نے عنایت کر دیئے۔

شاہی خاں نے تھوڑے ہی عرصہ میں عدل و انصاف کا وہ سکہ بٹھایا کہ ہنود جو ہمیشہ مضطرب الحال رہتے تھے امن و امان سے زندگی بسر کرنے لگے بادشاہ نے بھی محسوس کیا۔ کہ اب میرے ملک میں کوئی بے چینی اور بدمزگی نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے شاہی خاں کو اپنا نائب السلطنت بلکہ ولیعہد بنا کر خود مقامات مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس وقت اس کی سلطنت کو قریباً چھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔

علی شاہ بادشاہ کشمیر کی روانگی

زونراج نے زینہ ترنگنی میں بادشاہ کی حج کو روانگی کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ بادشاہ کو اپنے منجھلے بھائی (شاہی خاں) سے بڑی محبت تھی۔ جب بادشاہ نے یاترا کا ارادہ کیا۔ تو بھائی کو جس نے اُسے اپنی زندگی میں ہی اپنا ولی عہد[1] قرار دے لیا تھا۔ بلایا اور کہا جس طرح اپنے بزرگوں کے نام پر نذر نیاز نہ دینے سے ہمارے دل کی تیرگی دُور

[1]: زونراج نے اور نہ کسی اور مصنف نے علیشاہ کی اولاد کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علی شاہ لاولد تھا یا کم از کم اولاد نرینہ سے محروم تھا۔

نہیں ہو سکتی اور نہ ان میں پاکیزگی پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ہمارا جسم مقدس مقامات کی یاترا کے لئے اگر کچھ تکلیف نہ اٹھائے۔ تو پاک نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہم میں روحانیت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں نے بادشاہی کا بوجھ تمہارے کندھوں پر رکھدیا ہے۔ اور خود یاترا کا عزم مصمم کر لیا ہے شاہی خاں نے بڑے ادب کے ساتھ عرض کیا اگر آپ جیسے بہادر نوجوان اور جنگجو بادشاہ اپنی موروثی بادشاہت سے اس طرح کنارہ کشی کر جائینگے۔ تو عام لوگ اور گرد و نواح کے والیان یہی سمجھیں گے کہ آپ میں حکومت کرنے کی اہلیت و قابلیت موجود نہیں ہے۔ اگر آپ کو زیارت حرمین کی خواہش ہے تو یہ خدمت ہم خادموں کے سپرد کیجئے یعنی اپنا قائم مقام بنا کر ہمیں روانہ کیجئے۔ آپ چونکہ بادشاہ ہیں۔ اس لئے آپ کی طویل غیر حاضری ملکی مصلحت کے لحاظ سے مناسب نہیں ہے۔

ولیعہد کے یہ الفاظ سنکر بادشاہ نے کسی قدر متبسم ہو کر فرمایا تم میرے دست و بازو ہو۔ اگرچہ میرے جسم کے ساتھ جڑے ہوئے نہیں ہو۔ تم جیسا بھائی اور ولیعہد جو میرے ساتھ ایک جان دو قالب ہے۔ اور جس کی بہادری

لہ صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں۔ علی شاہ کا ارادہ ملکوں کی سیر و سیاحت کا تھا حج کا نہ تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں: "بعد از اں شاہی خاں را ولیعہد ساختہ محمد خان برادر خود را بہ اطاعت او وصیت نمودہ بہ ارادۂ سیر از کشمیر بر آمدہ" لیکن زونراج چونکہ عہد بڈشاہی کا مصنف ہے۔ اور اس نے علی شاہ کے متعلق مقدس مقامات کی یاترا کا لفظ لکھا ہے۔ اس لئے اس بارہ میں اس کی تحریر زیادہ قابل اعتماد ہے۔

اور قابلیت مسلمہ ہے۔ موجود ہو تو لوگ، میری نااہلیت کا کس طرح گمان کر سکتے ہیں۔ اگر تم مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کروگے۔ تو اس سے مجھے ناقابل برداشت روحانی صدمہ پہنچیگا۔

اب شاہی خاں کے پاس خاموشی کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ بادشاہ نے روانگی کی تیاریاں شروع کیں۔ اور شاہی خاں کو دُعا دی کہ اس کے نام کی حکومت تادیر قائم رہے۔ شاہزادہ شاہی خاں نے بادشاہ کو خزانہ سے قیمتی جواہرات اور بے شمار مال و دولت اور شاہی اصطبل سے خوبصورت گھوڑے پیش کئے۔ بادشاہ سب سے چھوٹے بھائی محمد خاں کو شاہی خاں کی فرمانبرداری کے احکام دے کر جاہ و جلال اور دھوم دھام کے ساتھ کشمیر سے باہر نکلا۔ شاہی خاں دو دن تک بادشاہ کا ہمرکاب رہا۔ اور تیسرے دن دارالحکومت میں واپس آیا۔

بادشاہ کے ہمراہ بہت سے لوگ تھے جو اس دور دراز سفر کی تکالیف سے بچنا چاہتے تھے۔ لیکن شاہی خاں اور بادشاہ کے خوف سے حرفِ شکایت زبان پر نہ لاسکتے تھے۔ درحقیقت جیسا کہ زونراج نے لکھا ہے۔ بادشاہ کا ارادہ واپسی کا نہ تھا۔ اس کا یہی منشا تھا۔ کہ اس کی جگہ اب اس کا بھائی حکمرانی کرے اور خود وہ مقامات مقدسہ میں ہی اپنی بقیہ زندگی گزار دے۔

لیکن جب شاہی خاں واپس چلا آیا۔ تو اس کے ہمراہیوں نے جو اپنے وطن اور اپنے بال بچوں کی جدائی سے ہراساں تھے۔ بادشاہ کو یہ ذہن نشان کرانا شروع کیا۔ کہ بادشاہ کے لئے رعایا پروری کے مقابلے میں سیر و سیاحت ایک غیر ضروری چیز ہے۔ سب سے بڑا حج یہی ہے کہ خدا کی مخلوق

کے ساتھ انصاف و عدل سے حکومت کی جائے۔ آپ کو خدا نے اپنی مخلوق کی خدمت کا جو نادر موقع دیا ہے۔ اس سے آپ کیوں فائدہ نہیں اٹھاتے ان خیالات کا رفتہ رفتہ بادشاہ کے دل پر اثر ہونا شروع ہوا۔

راجہ مدر دیش اور علی شاہ بادشاہ کشمیر

مدر دیش[1] کے راجہ کی بیٹی علی شاہ بادشاہ کشمیر کی بیگم تھی۔ زونراج نے راجہ کو مغرور متکبر اور طاقتور راجہ لکھا ہے جب بادشاہ کشمیر سے روانہ ہو کر مدر دیش کی حدود میں داخل ہوا۔ اور راجہ مدر دیش کو بادشاہ کے اس ارادے کا پتہ چلا کہ وہ حکومت ترک کر کے یاترا کو جا رہا ہے تو اس نے اس کو اس ارادے سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی۔ اس لئے کہ بادشاہ کے ہمراہ اس کی بیگم بھی تھی۔ جو راجہ کی بیٹی تھی۔ اور اس طریق سے اس کی بیٹی ہمیشہ کے لئے اس سے جدا ہو رہی تھی۔ نیز یہ امر بھی اس کے لئے سوہانِ روح کا باعث ہو رہا تھا۔ کہ اس کا داماد تارک السلطنت ہو رہا ہے جو مردانگی اور شجاعت کے خلاف ہے۔

راجہ نے بادشاہ کو ہر قسم کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔ بہاں اور کچھ سمجھایا ہوگا بھیشم پتامہ کے یہ الفاظ بھی گوش گزار کئے ہونگے۔ کہ اگر حکمران عادل ہو تو اس کو رکھشیروں اور پنڈتوں کے برابر نیکیوں کا پھل ملتا ہے اسی لئے برہمنوں اور کھشتریوں کا قول ہے۔ کہ راجہ کو سلطنت کسی حال میں ترک نہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ جو پھل اس کو جنگل میں ہزار سال عبادت کرنے سے مل سکتا ہے۔ وہ سلطنت میں ایک روز عدل کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے

غرض کچھ ہمراہیوں کے زور دینے سے اور کچھ راجہ مدر دیش کے سمجھانے

---

[1] دیکھو کتاب ہذا کا ضمیمہ ۳ بعنوان مدر دیش

سے بادشاہ نے اپنا ارادہ ترک کر دیا لیکن یہ خوف لحظہ بہ لحظہ غالب آ رہا تھا کہ ملک بھائی کے قبضہ میں ہے۔ فوج سپاہ و خزانہ سب اس کے پاس ہے میں تنہا بازگشت بھی کروں گا۔ تو کونسا پہاڑ ڈھاؤں گا۔

راجہ مدر دیش بادشاہ کے تفکرات سے لاعلم نہ تھا۔ بادشاہ اس کا داماد تھا۔ ملکہ کشمیر یعنی بادشاہ کی بیگم اس کی پیاری بیٹی تھی۔ اور اس کے مشورہ سے بادشاہ نے اپنا ارادہ بھی ترک کر دیا تھا۔ اس لئے راجہ نے اس کو خزانہ اور فوج دونوں سے مدد دی۔ بلکہ جب خزاں کا موسم آیا۔ تو علی شاہ کی امداد و اعانت کے لئے خود اس کے ساتھ روانہ ہوا۔

راجہ مدر دیش کے مشورے سے علیشاہ کی مراجعت کشمیر

شاہی خان نے جب بادشاہ کی واپسی کی خبر لی۔ تو بہت خوش ہوا۔ اس لئے کہ اس کی پہلے ہی یہ تمنا اور خواہش تھی۔ کہ بادشاہ کو ملکی مصلحتوں کے لحاظ سے اس قدر دور دراز سفر اختیار نہ کرنا چاہیئے لیکن جب اس نے یہ سنا کہ بادشاہ کا خسر ایک عظیم فوج لے کر اس کے ہمراہ اس لئے آ رہا ہے۔ کہ وہ مجھ سے لڑائی کر کے اس کو کشمیر واپس دلائے۔ تو اسے بہت صدمہ پہنچا۔ زود تراج اس موقعہ پر لکھتا ہے۔ اس نیک دل شہزادے نے کسی پر اپنے رنج کا اظہار نہ کیا۔ اپنے بھائی کی محبت کے تقاضے سے اور اس خیال سے کہ ہزارہا لوگوں کا بے گناہ خون بہ جائے گا۔ اس نے اپنے بھائی کی عطا کردہ سلطنت کو خیرباد کہا اور خاموشی کے ساتھ کشمیر سے باہر چلا گیا۔

صاحب طبقات اکبری اس واقعہ پر لکھتے ہیں: شاہی خان از کشمیر بہ سیالکوٹ رفت چونکہ اس کے نیک دلی کی وجہ سے عوام اس کے گرویدہ تھے۔ اس لئے ملک کے کئی بڑے بڑے ٹھاکر جاگیردار بھی اس جدو طنی

میں اس کے ہنر کا ب ہو گئے

شاہی شاں کے چلے جانے کے بعد مدر ویش کے راجہ کی فوج اس طرح امن و امان اور اطمینان کے ساتھ کشمیر میں داخل ہوئی جس طرح دریا میں مگر مچھ کے چلے جانے کے بعد نہانے والا بے فکر اور نڈر ہو کر غوطے لگاتا ہے۔

اپنے خسر و راجہ مدر دیش کی مدد سے علی شاہ پھر تخت کشمیر[1] پر بیٹھتا ہے۔ گو اس نے ملک پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اس کا بھائی اب جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن علی شاہ اپنے ظالم اور خود غرض مشیروں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں پر قبضہ نہ کر سکا۔ زونراج لکھتا ہے جس طرح بندر ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اچھل کر سایہ دار درختوں کی ہری بھری ٹہنیوں کو خراب کر دیتے ہیں۔ اسی طرح بادشاہ کے ترشکوں نے اس کی سلطنت اور رعایا کو تباہ کر دیا۔

ملکہ ایک یادن[3] بیر کمسار کے متعلق تو وہ لکھتا ہے کہ اس ظالم نے

---

[1] صاحب طبقات اکبری (م ۳۲۲ صفحہ پر) راجہ جموں اور راجہ راجوری کی امداد سے علیشاہ کے تخت پر بیٹھنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "دریں ولا بعضے از ارباب غرض اُورا از دلی عہد ساختن شاہی خان پشیمان ساختند۔ راجہ جموں و راجہ راجوری بمدد علیشاہ رفتہ کشمیر را بار دیگر از تصرف اُو آوردند" [2] ترشک اور ترشکوں کے لئے دیکھو ضمیمہ ۔ [3] یادن کس زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں دیر تک اس کے متعلق واقفیت نہ ہو سکی۔ البتہ بیر کمسار کا پہلا لفظ بیر یہ ظاہر کرتا تھا کہ یادن مسلمانوں ہی کا کوئی فرقہ ہوگا۔ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء میں اتفاقاً (بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۰)

بادشاہ کی منشا اور رضامندی کے خلاف ملک میں ایک آفت بپا دی جس طرح شہد کی مکھیاں رس نکال کر کنول کے پھولوں کو ناکارہ بنا دیتی ہیں۔ اسی طرح اس وحشی نے کئی شہر باش عورتوں کی عصمتوں کے شیشوں کو چکنا چور کر کے بے آبرو اور ذلیل کر دیا۔

زونراج لکھتا ہے۔ ان ایام میں کشمیر صحیح معنوں میں راکشسوں کے قبضہ میں آگیا تھا۔ نیک دل وزراء امراء ان خرابیوں کا انسداد نہ کر سکے۔ بلکہ رات دن کر مظالم کے علاوہ جو خرابیاں۔ وزر دشن ہیں پیدا کر تی تھیں ان کے دفعیہ سے بھی بادشاہی اہلکار عاجز آ گئے تھے۔ پائیگاہ مکانات، رشک ارم باغات اعلےٰ النسل کے گھوڑے، بیش قیمت جواہرات۔ سب پر یادنوں نے قبضہ کر لیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹) سوانح عمری کلاں سوامی دیانند مصنفہ پنڈت لیکھرام پر نظر پڑی تو اس میں ایک جگہ سوامی دیانند اور ٹھاکر صاحب والیٔ ریاست راۓ پور کا ایک مختصر سا مکالمہ اس موقع پر درج کیا۔ جب ٹھاکر صاحب اپنے قائم مقام مدارالمہام شیخ کریم بخش کے ہمراہ سوامی جی کو ملنے گئے۔ سوامی جی نے مزاج پرسی کے بعد پوچھا۔ آپ کے ہاں راج منتری کون ہیں۔ ٹھاکر صاحب نے کہا شیخ الٰہی بخش ہیں۔ لیکن وہ جودھپور گئے ہیں۔ اور ان کی جگہ کریم بخش جی کام کرتے ہیں۔ جو میرے ہمراہ ہیں۔ اس پر سوامی جی نے کہا کہ آریہ پرشوں کو اچت ہے کہ یادنوں (مسلمانوں) کو اپنا راج منتری نہ بنائیں۔ ایسا کہنے سے کریم بخش اور پانچ سات مسلمان جو وہاں موجود تھے غصہ میں آکر گرم گرم باتیں کرنے لگے۔ اور ٹھاکر صاحب بھی سوامی جی سے آگیا لے کر اپنے راج محلوں کو چلے گئے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یادن سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ اور یہ لفظ مسلمانوں کے لئے بولا جاتا ہے۔

ان ہنگاموں کی وجہ سے بدقسمت بادشاہ جو اپنے اقتدار کا ارادہ ترک کر کے دین و دنیا دونوں کی نعمتوں سے محروم نظر آرہا تھا۔ دوسری مرتبہ پانچ چھ ماہ سے زیادہ حکومت نہ کرسکا۔

بھائیوں کی خونریز جنگ

شاہی خاں اپنے ساتھیوں سمیت کشمیر سے نکلکر پنجاب میں جہاں گکھڑوں کا عروج و اقتدار شاہانہ لوازمات کا مقابلہ کر رہا تھا۔ پناہ گزین تھا۔ اور خاموشی کے ساتھ آئندہ واقعات کا منتظر تھا۔ اسی اثنا میں اس کے بھائی علی شاہ بادشاہ کشمیر کو اس کے مشیروں نے یہ کہنا شروع کر دیا۔ کہ ولی عہد کا کشمیر سے باہر رہنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ وہ آپ کے دشمن جسرت گکھڑ کے پاس مقیم ہے۔ وہاں رات دن آپ کے خلاف سازشیں ہوتی ہیں اور وہ وقت دور نہیں۔ کہ جب ولیعہد گکھڑوں کی مدد لے کر کشمیر پر حملہ آور ہو۔ اس لئے ان سازشوں کا اور ولیعہد کے ارادوں کا ابھی سے تدارک کرنا لازم ہے۔ بادشاہ نے صلاح کاروں کے مشورے سے شاہی خاں کے پاس پیغام بھیجا۔ کہ وہ کشمیر واپس آجائے۔ اس کی جان و مال ہر طرح محفوظ ہے بلکہ لکھا کہ اس کی مزید عزت افزائی کی جائے گی۔

زونراج اس کے بعد خاموش ہے۔ اور نہیں بتاتا۔ کہ شاہی خاں نے علی شاہ کو کیا جواب دیا۔ وہ صرف اتنا لکھتا ہے۔ کہ آخرکار علی شاہ بادشاہ کشمیر جسرت گکھڑ پر چڑھائی کرنے کے لئے پنجاب کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاہی خاں نے مراجعت کشمیر سے اور بادشاہ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہوگا۔ بادشاہ کو بڑی توقع تھی۔ کہ وہ جسرت گکھڑ کو جو پنجاب کا مستقل بادشاہ نہیں ہے۔ اور نہ کسی اور بادشاہ نے

اس کی بادشاہت کو تسلیم کیا ہے۔ بہت جلد مفتوح و مغلوب کرلیگا لیکن اس کو کیا معلوم تھا۔ کہ اس کے نالائق اور ظالم اہلکاروں کے ستائے ہوئے مظلوم لوگوں کی آہیں باب قبولیت کو پہنچ چکی ہیں۔ اور تقدیر اس کی تمام تدبیروں کا ناکامیوں کے ساتھ خاتمہ کرنے والی ہے۔

فوج کے افسروں نے بادشاہ سے عرض کیا۔ کہ فوج ولیعہد سے لڑنا نہیں چاہتی۔ اس لئے ہمیں پیش دستی نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ جب ولیعہد گکھڑوں کی فوج لے کر ہم پر حملہ کرے۔ تو ہمیں مدافعانہ پہلو اختیار کرنا چاہئے لیکن بادشاہ نے کسی کی نہ سنی۔ دارالحکومت سے نکل کر ابھی دور نہ گیا تھا کہ قسمت نے پلٹا کھایا۔ یعنی اس کے کئی افسر اس سے علیحدہ ہو گئے اور فوج کے کثیر حصہ نے خودسری اختیار کرلی۔

یہ حالت دیکھکر بادشاہ کے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے اسی اضطراری حالت میں راجوری اور دوسرے مقامات کے جو اس کے زیر نگیں تھے۔ تو بادشاہ کو ڈالا۔ ایسی اضطراب افزا حالت میں اس کے اپنے بہی خواہ بھی دشمن نظر آرہے تھے۔

بادشاہ مدگرویال کے مقام پر مقیم تھا۔ کہ راجوری کے راجہ نے جو طاقتور راجاؤں میں تھا اپنے خاص قاصد کے ہاتھ اسے ذیل کا پیغام بھیجا۔

ف مدگرویال کا تلفظ مترجم زودزبان ترنگنی نے (MUDGARA UYALI) لکھا ہے۔ اس نام کا کوئی گاؤں اب کشمیر میں نہیں ہے اور نہ جموں کی تحصیل راجوری میں اس کا کہیں وجود ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ موضع راجوری یا شوپیاں کے علاقہ میں کہیں ہوگا کیونکہ بادشاہ بیمہ کی حالت میں جب راجوری کو بادشاہ بہت تیزی کے ساتھ بڑھنا چاہتا ہوگا اور مدگرویال بھی اسی راستہ کسی بلندی پر واقع ہوگا جہاں بادشاہ ٹھہرا تھا۔

ہر چند کہ آپ کی فوج میں پیادہ اور مسلح سپاہی، تیز رفتار گھوڑے ماہر جنگ اور بہادر نوجوان موجود ہیں۔ لیکن ان کے مقابلے میں گکھڑ قوم ہے جس کے جنگی کمالات مشہور عالم ہیں۔ اور جس کی شجاعت و بہادری سے ہم اکثر لڑائیوں میں واقف ہو چکے ہیں۔ اور چونکہ سانپ ہی سانپوں کے داؤ پیچ جان سکتے ہیں۔ اس لئے جب تک ہماری فوج آپ کے پاس مدد کے لئے نہ پہنچے۔ پہاڑ پر ہی مقیم رہئیے۔

زونراج اس موقع پر پھر پاروتوں پر برستا ہے۔ اور غم و غصہ کے ساتھ لکھتا ہے۔ پاروتوں کے بدذات سردار نے تکبر اور حسد سے اندھا ہو کر بادشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ راجہ مدر دیش نے یہ پیغام اس لئے بھیجا ہے۔ کہ اس لڑائی میں جو شہرت و عظمت اور فتح و نصرت آپ کو ملنے والی ہے۔ اس کا سہرا اس کے سر رہے۔ ہم اپنی ہی فوج سے دشمنوں کا قلع قمع کر سکتے ہیں۔ اس کے انتظار کی کیا ضرورت ہے۔

زونراج لکھتا ہے کہ بادشاہ نے یہ مشورہ قبول کر کے گویا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری۔ وہ پہاڑی سے نیچے نہیں اترا۔ بلکہ اس نے اپنی سربفلک عزت کو پہاڑی سے اتر کر خاک میں ملا دیا۔ اس کے جھنڈے بظاہر ہوا میں لہرا رہے تھے۔ مگر درحقیقت وہ لہراتے نہیں تھے۔ بلکہ گکھڑوں کی فوج کے ڈر سے کانپ رہے تھے۔

ادھر بادشاہ کی فوج پہاڑی سے اتری اور ادھر گکھڑوں کی فوج جو پہلے ہی جان بکف ہو کر مرنے مارنے پر تیار تھی۔ سامنے آگئی۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے کیا ہوئیں۔ گرد و غبار نے زمین و آسمان کو ایک کر دیا۔ دوست دشمن کی کسی کو پہچان نہ رہی۔ گھوڑوں کے سموں نے زمین کو چھلنی کر دیا۔

اس زمین میں جہاں صاف و شفاف چشمے بہتے تھے۔ خون کے فوارے پھوٹنے لگے۔ ترکش ختم ہو گئے۔ تو تلواروں پر نوبت آئی۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ بہادر سپاہیوں نے داد شجاعت دیتے ہوئے اپنی زندگیاں قربان کر دیں۔

بادشاہ کشمیر کی شکست اور نظربندی

طرفین جی توڑ کر لڑے اور خوب لڑے اور بقول صاحب طبقات اکبری "جنگے عظیم داد و از طرفین خلائق بسیار بہ قتل رسیدند" مگر بادشاہ کا اقبال چونکہ زوال پذیر ہو چکا تھا۔ اور تقدیر شاہی خاں کے سر پر چتر شاہی کا سایہ کر رہی تھی۔ اس لئے اس کی فوج کا ایک حصہ خود سر ہو گیا۔ اس کے لشکر یا افسران د ل طور پر ولیعہد کے طرفدار بن گئے۔ اور بادشاہ کو شکست ہو گئی زونراج نے یہ نہیں بتایا کہ شکست کے بعد بادشاہ کا کیا حشر ہوا۔ البتہ مؤرخین کشمیر با تفاق لکھتے ہیں کہ علی شاہ گرفتار ہو کر سیدکلی[۱] میں نظربند کیا گیا۔ اور اس نظربندی کی حالت میں وہ انتقال کر گیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ علی شاہ اپنی موت نہیں مرا بلکہ اس کو قتل کیا گیا۔ جیسا کہ زونراج کا شاگرد شریور مصنف زین راج ترنگنی[۲] لکھتا ہے کہ علی شاہ گرفتار ہو گیا اور ملک کے بیٹے نے اس کو قتل کر دیا۔ [illegible] مراد معلوم نہیں کس ملک سے ہے۔

---

[۱] سرکار پھکلی میں تین ولائتیں ہیں۔ بنیر۔ سوات۔ باجوڑ۔ میر سید علی ہمدانی کشمیر سے واپس اپنے وطن جاتے ہوئے اس علاقہ میں وفات پا گئے تھے۔ اور اپنی وصیت کے مطابق ختلان میں دفن ہوئے تھے۔ یہ تینوں ولائتیں جن کا نام سرکار پھکلی تھا۔ سلاطین کشمیر کے ماتحت تھیں (از سیر المتاخرین جلد اول در ذکر سرکار پھکلی) لیکن آجکل سوات ایک علیحدہ ریاست ہے۔ اور بنیر اور باجوڑ سرحدی علاقے ہیں جن کی حدود سوات سے ملتی ہیں۔

[۲] از ترجمہ زین راج ترنگنی بنام کنگس آف کشمیر صفحہ ۳۰ فصل سویم۔

چوتھا باب

شاہی خاں عرف بڈشاہ بادشاہ کی تخت نشینی

حصول سلطنت کے لئے باپ بیٹے اور بھائی بھائی میں جنگ

جب جہانگیر کی تخت نشینی پر اس کے بیٹے خسرو نے بغاوت کی۔ اور وہ آگرہ سے بھاگ کر لاہور کی طرف اپنی جمعیت بنانے اور باپ کا مقابلہ کرنے کے لئے بھاگ آیا۔ اور بادشاہ نے اس کے تعاقب میں اپنے معتمد افسر بھیجے۔ تو افسروں نے بادشاہ سے دریافت کیا کہ اگر وہ بغیر لڑائی کے قابو نہ آئے۔ تو کیا ارشاد ہے۔ بادشاہ نے کہا معاملات سلطنت میں کوئی خویشاوندی نہیں ہے۔ نرمی سے گرمی سے جس طرح وہ رام ہو سکے۔ اسے قابو کرو۔ اور اگر دوران جنگ میں اس کی جان بھی چلی جائے تو کوئی باز پرس نہ ہو گی۔ بلکہ وہ اپنے کئے کی سزا پائے گا۔

معاملات سلطنت تو بڑی بات ہیں معمولی معمولی باتوں پر حقیقی بھائیوں اور باپ بیٹوں تک میں خون خرابے ہو جاتے ہیں لیکن بعض امور میں کوئی نہ کوئی حکمت الٰہی بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ مثلاً اگر خسرو تخت پر بیٹھ جاتا۔ تو اپنی عادات اپنے اخلاق اور اپنی اور اپنے ہم جلیسوں کی نالائقیوں کی وجہ سے حکومت کے قطعی ناقابل تھا۔ ملک میں خانہ جنگیوں اور بغاوتوں کا بازار گرم ہو جاتا۔ اور رعیت و رامی دونوں تباہ ہو جاتے۔

داراشکوہ اور اس کے بھائیوں کے قتل اور شاہجہان کی قید کے واقعات

واقعی بڑے دردناک ہیں اور اس لحاظ سے اورنگ زیب کی تصویر نہایت ہیبت ناک اور خونریز نظر آتی ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے ؎

شربتِ سلطنت وجاہ چناں شیرین است
کہ شہاں از پئے آں خون برادر ریزند

لیکن کون نہیں جانتا کہ دارشکوہ باوجود شاہجہاں کی ہر قسم کی امداد کے کسی لڑائی میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اور اس کی وجہ محض یہ تھی۔ کہ وہ ایک صوفی مزاج اور ضدی شاہزادہ تھا۔ اور سلطنت کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ اس کے دوسرے بھائی اخلاقی حیثیت سے تمام عیوب کے ملجی وماوی تھے اورنگ زیب گو سب سے چھوٹا تھا۔ لیکن نواب سعد اللہ خان وزیر شاہجہاں نے اورنگ زیب کی شہزادگی کے عالم ہی میں کہہ دیا تھا۔ کہ اورنگ زیب ہی زیب اورنگ ہوتا نظر آتا ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ اس فرزانہ وزیر کی پیشینگوئی حرف بہ حرف صحیح نکلی۔

یہی حال شاہی خان اور علی شاہ کے متعلق قیاس کیا جاسکتا ہے علی شاہ سے تمام رعایا ناراض تھی۔ شاہی خان نے وزیر ہوکر تمام رعایا کی دلجوئی کی جب علی شاہ سیر وسیاحت کو روانہ ہوا اور ارباب غرض نے اسے بھائی کی طرف سے بدگمان کرکے بھائی کے ساتھ جنگ کرنے کو بھیجا تو شاہی خاں نے اس بدگمانی کو اپنی ذلت وتحقیر کا باعث سمجھا۔ مگر پھر بھی جنگ کو نامناسب سمجھ کر چپ چاپ کشمیر سے باہر چلا گیا۔ لیکن اس کے بعد جب علی شاہ نے خود بخود اس پر حملہ کردیا۔ تو آخر جنگ چھڑ گئی ظاہر بین نگاہوں میں شاہی خاں کو ایسا نہ کرنا چاہیے تھا۔ لیکن کس کو خبر تھی کہ قدرت اس بدگمانی وسرکشی اور بڑے بھائی کی شکست ونظر بندی

چھوٹے بھائی کی تخت نشینی و بادشاہی کے پردے میں کشمیر کے انتہائی عروج کے اسباب پیدا کر رہی ہے۔

شاہ رُخ سے شاہی خاں اور شاہی خاں سے زین العابدین

قدرت نے جس کو بطن مادری سے باہر آتے ہی شاہ رُخ بنا دیا تھا۔ عوام نے اس کو شاہی خاں کا خطاب دیا تھا۔ اور جب سید حسین خوارزمیؒ جیسے عابد و مرتاض بزرگ کی قبولیت دعا کا وقت آیا۔ تو شاہی خاں کا نام زین العابدین رکھا گیا۔ جو واقعی اپنے تزکیہ نفس اور اپنی ریاضت و عبادت سے زین العابدین اور اپنی طویل حکومت و رعایا پروری اور رہر دلعزیزی سے بڈشاہ یعنی بادشاہ اعظم ثابت ہوا۔

بادشاہ کی تخت نشینی کا سال

بادشاہ نے تخت نشین ہونے کی خوشی میں عظیم پیمانہ پر ایک جشن کیا۔ شان و شوکت سے جلوس بھی نکلا ہوگا۔ شاعروں نے جلوس جشن اور تخت نشینی پر قصیدے بھی لکھے ہونگے۔ جو مقدر میں تھا۔ وہ انعام بھی لیا ہوگا لیکن سال تخت نشینی کشمیری مورخوں نے ۸۲۶ھ لکھا ہے۔ اور سایہ الطاف خدائے واہب سے تاریخ نکالی ہے۔ مگر تعجب ہے کہ بڈشاہی عہد کا مؤرخ شرلور اس کی تخت نشینی کا سال ۴۴۹۶ لوکک اور مہینہ جیٹھ بدی لکھتا ہے۔ اس لوکک سال کے مطابق عیسوی ۱۴۲۰ء اور ہجری ۸۲۳ھ ہوتا ہے اور عیسوی مہینہ کے مطابق یکم جون سے ۱۵ جون اور ہجری مہینے کے مطابق ۱۰ جمادی الاول سے اخیر جمادی الاول کی تاریخیں نکلتی ہیں۔

شرلور کے بعد صاحب تاریخ فرشتہ اور صاحب سیر المتاخرین علی شاہ کی گرفتاری اور موت کا واقعہ جمادی الاول ۸۲۳ھ میں لکھتے ہیں۔ اور صاف

ظاہر ہے کہ علی شاہ کے بعد بڈشاہ ۸۲۳ھ میں تخت پر بیٹھا اور ۸۲۳ھ مطابق ہے۔ ۴۴۹۶ لوکاک کے۔ گویا ترپور اور اس کے بعد فرشتہ وغیرہ نے سال تخت نشینی جو ۸۲۳ھ لکھا ہے۔ وہی درست ہے کشمیری مورخوں نے معلوم نہیں ۸۲۶ھ کس طرح لکھ دیا ہے۔ بہرحال ۸۲۳ھ میں بادشاہ نے تخت کو نذموں کے نیچے اور تاج کو جو اس کا خاندانی اور پشتینی کلاہ تھا۔ سر پر رکھا۔ اس موقعہ پر زونراج لکھتا ہے بادشاہ نے ملک کے ہر گوشہ میں اپنی فتح اور تخت نشینی کا ڈھنڈورا پٹوایا۔ اور لوگوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس سے قبل ہی لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکا تھا۔

بڑے بڑے عہدوں کی تقسیم

بادشاہ نے اپنے بڑے بھائی علی شاہ کو جس کا وہ نائب السلطنت تھا۔ پکھلی میں نظر بند کر رکھا تھا۔ چھوٹا بھائی محمد خاں موجود تھا۔ اس کو نائب السلطنت یعنی وزارت عظمیٰ کا عہدہ تفویض کیا بلهمت رینہ اور احمد رینہ کو منصب سپہ سالاری عطا کیا۔ ملک مسعود ٹھاکر کو اپنے بھائی کے ماتحت مدار المہامی کا عہدہ عنایت کیا بلکہ عدالت انصاف کا اعلےٰ عہدہ پنڈت شری بٹ کو دیا قاضی جمال الدین کو عہدہ قضاۃ مرحمت کیا۔ زونراج محمد خاں کو شربت محمد خاں لکھتا ہے۔ اور اس کو بادشاہ کا ممد و مشیر کار بتاتا ہے۔

تخت نشینی پر قیدیوں کی رہائی

تخت نشینی پر بادشاہ نے کسی خاص اعلان کا پتہ نہیں ملتا لیکن تخت کے بعد اس نے اپنی قابل تقلید رعایا پروری سے جو لازوال شہرت حاصل کی وہ ظاہر کر رہی ہے کہ بادشاہ کی نظروں میں سب مذاہب کی یکساں عزت تھی اس کا طرز عمل ہی اس کے گفتار و کردار کا مظہر ہے۔ اس نے تخت نشین ہو کر نہ صرف اپنے بھائی کے زمانے کے بلکہ سلاطین سابق کے عہد کے بھی تمام قیدی

کر کے زندان خانے بالکل سنسان کر دیئے۔

ہندوؤں کی دلجوئی

زین العابدین کی تخت نشینی سے پیشتر ہی اس کے باپ اور بھائی کے زمانے میں کشمیر کے کئی ہندو بعض جدید قوانین کی سختیوں کی تاب نہ لا کر یا تو اسلام قبول کر چکے تھے۔ یا ترکِ وطن کر کے ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ جب زین العابدین خود تخت پر بیٹھا اور ملک سرکشوں اور باغیوں اور دودھ بھائیوں کے فتنہ و فساد سے پاک ہو گیا۔ تو اس نے رعایا کی آبادی اور سرسبزی کی طرف توجہ کی سب سے پہلے اس نے ہندوؤں کی دلجوئی کی جو کشمیر میں خال خال نظر آتے تھے۔ اس نے لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کی تفسیر و تشریح کے لئے بڑے بڑے علماء سے گفتگو کی۔ اور بتایا کہ میرے باپ اور بھائی کے زمانے میں لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کے خلاف عمل ہوتا رہا ہے انہوں نے غیر اقوام اور غیر ممالک میں اسلام کو ایک خوفناک مجسمہ بنا کر پیش کیا ہے حالانکہ اسلام ایک خوش نما قابل عمل اور آسانیاں پیدا کرنے والا مذہب ہے۔ جو فطرت کے عین مطابق ہے۔

چنانچہ زین العابدین نے باپ اور بھائی کے عہد کے تمام قوانین و آئین جو غیر قوم کے لئے تکلیف و پریشانی کا باعث تھے۔ بتدریج موقوف کر دیئے۔ جو لوگ ترک وطن کر چکے تھے۔ ان کو واپس بلوایا۔ ان کو بہت سی مراعات دیں اور ان کو اپنا بندۂ بے دام بنا لیا۔ ان تمام مراعات و احسانات کا ذکر علیحدہ ایک باب میں کیا جائے گا۔

بادشاہ کے جشن ہائے سالگرہ

بادشاہ اپنی سالگرہ ہر سال مناتا۔ اس تقریب پر جشن مسرت بڑی دھوم

دھام سے ہوتا مستحق غربا اور نادار لوگ خیرات وصدقات کی مدد سے اپنا پیٹ پالتے اور امراء و وزراء انعام واکرام حاصل کرتے۔ رات کو دریائے بہت (جہلم) کے کناروں پر اس آب وتاب سے جشن چراغاں ہوتا کہ تمام شہر بقعۂ نور بن جاتا۔ جن لوگوں کو کشمیر کے موجودہ فرمانرواؤں کے دربائی جلوس اور جشن چراغاں دیکھنے کا موقعہ ملا ہے۔ وہ اس گنگا جمنی منظر اور بوقلموں کیفیت کا کچھ نہ کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔

پانچواں باب

اہل کشمیر کی جنگی سپرٹ اور بادشاہ کے فوجی کارنامے

مصری اور یونانی جغرافیہ دانوں اور مؤرخوں کی تحریریں ممالک کشمیر کی وسعت کے متعلق

بادشاہوں اور راجوں کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ان کی وسیع فتوحات ہوا کرتی ہیں۔ کشمیر کے راجگان قدیم میں اکثر راجے کشمیر ہی پر قناعت نہیں کرتے تھے۔ اور کشمیر اور اس کے مقبوضات کو غیروں سے صرف بچائے ہی نہیں تھے۔ بلکہ بنگال۔ لنکا۔ افغانستان۔ تبت اور لداخ تک مار کرتے اور کامیاب ہو کر واپس آتے تھے۔ تمام دنیا کو زیرنگین کرنے کی خواہش گزشتہ بادشاہوں میں بھی تھی۔ شارلیمین کیوں جنگ آزمائیوں میں مصروف رہا۔ چارلس پنجم اور لوئی چہاردہم کیوں ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ نپولین کا مقصد

کیا تھا۔اور جرمنی کے آخری شہنشاہ قیصر ولیم نے آخر کس بات کے لئے لاکھوں جانیں قربان کردیں۔اور اب جرمن ڈکٹیٹر ہٹلر اور اس کے ساتھی جاپان اور اٹلی نے ساری دنیا کو لڑائی کی جس آگ میں دھکیل رکھا ہے۔اپنی ناکامیوں کے باوجود کیا اس سے عالمگیر حکومت کا خیال اس کے پیش نظر نہیں ہے۔

تسخیر عالم کا یہ جذبہ ہندوستان اور مشرق کے بڑے بڑے بادشاہوں مثلاً اشوک۔سمندر گپت۔ہرش۔علاء الدین خلجی۔تیمور۔اکبر اور اورنگ زیب وغیرہ کی طرح کشمیر کے راجوں اور بادشاہوں کے سامنے بھی تھا۔اور وہ اپنی سلطنت کو ہمیشہ وسعت دیتے رہتے تھے۔تاریخوں کے اوراق میں ان کی فتوحات کا ذکر بکھرا پڑا ہے۔ہم یہاں چند واقعات بعض غیر کشمیری مورخوں کی تاریخوں کے حوالوں سے درج کرتے ہیں۔

تاریخ پنجاب مصنفہ جج محمد لطیف کے صفحہ ۱۱ پر لکھا ہے۔اب ہم مصریوں کی تاریخ کا ذکر کرتے ہیں۔کلاڈیس ٹالمی (تاریخ پیدائش ۵۰ء مصر کا مشہور جغرافیہ دان اور ماہر علم ہیئت و نجوم اپنے جغرافیہ میں لیوکلہ نام ایک شہر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔دریائے اٹک کے مشرق کی طرف کسپیریا نام ایک ملک موجود ہے۔جو دریائے بداستن[1] (جہلم) چندر بھاگا (چناب) اور ایس (ایراوتی یعنی راوی) اٹک پھیلتا تھا۔اسی علاقہ میں لیوکل نام شہر آباد ہے۔ٹالمی نے جس ملک کو کسپیریا لکھا ہے۔مورخوں نے اس کو کشمیر بتایا ہے۔سٹین بھی جو راج ترنگنی پنڈت کلہن کا نامور مترجم اور شارح ہے۔کشمیر کے جغرافیہ قدیم کا ذکر کرتا ہوا کسپیریوں کے ملک کو کشمیریوں کا ملک لکھتا ہے۔

---

[1] بداستن وستہ یا وتستہ سے نکلا ہوا ہے۔جو دریائے جہلم کا قدیم نام تھا۔مغلوں کے زمانے میں اس کو دہت یا بہت کہتے تھے۔اب جہلم نام ہے۔

لیوکلہ نام شہر کے متعلق جج محمد لطیف اپنی تاریخ پنجاب میں لکھتے ہیں۔ کہ یہ لاہور ہی کا کوئی بگڑا ہوا نام ہے۔ میجر جرنل کننگھم جو ہندوستان کے قدیمی محقق تسلیم کئے گئے ہیں۔ وہ بھی بحث کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ لیوکلہ لاہور کے قدیم کھنڈروں کے قریب ہی کہیں آباد ہوگا۔ [1]

لیوکلہ کوئی الگ شہر تھا یا لاہور ہی کے مختلف ناموں میں سے ایک نام تھا۔ بہر حال ان سطور سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ملک کشمیر کی سلطنت اس زمانے میں لاہور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ٹالمی مصری جغرافیہ دان جس نے کسپیریا کے ملک میں لیوکلہ کا ذکر کیا ہے۔ دوسری صدی عیسوی کے نصف میں گزرا ہے۔ ان ایام میں کشمیر پر راجہ پرورسین اول بانی شہر سرینگر کی حکومت تھی۔ اس کے متعلق تاریخ کشمیر میں لکھا ہے۔ کہ اس نے پنجاب اور مالوہ اور ہندوستان کا ایک حصہ فتح کر لیا تھا۔ اور معمولی خراج لینے کے بعد اس نے یہ ممالک ان کے اصل وارثوں کو واپس کر دیئے تھے۔

بطلیموس نے بھی کسپیریا کے ملک سے کشمیر ہی مراد لی ہے۔ بلکہ اس نام سے کشمیر کا صحیح تلفظ بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ مثلاً کشمیر کو کشیر بھی کہتے ہیں کشمیر کا پرانا نام کشویر بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ کشویر کو یونانیوں نے جن میں بطلیموس جغرافیہ دان بھی تھا۔ کسپیر لکھدیا ہے۔ اور شاید وہ اپنی زبان

---

[1] تاریخ پنجاب جج محمد لطیف صفحہ ۱۱ [2] مختلف زبانوں میں لاہور کے مختلف نام رہے ہیں مثلاً لہانور۔ لوہ آور۔ لاؤپور۔ بہاور۔ راہ ور۔ لوہار۔ نہریا لوہر۔ لاہور۔ ایک لاہور تحصیل صوابی ضلع پشاور میں بھی ہے جو جہانگیر روڈ سے زیدہ کو جاتے ہوئے بائیں طرف سڑک سے کچھ فاصلے پر نظر آتا ہے۔ اس کی بنیاد ہندو راجگان لاہور کے زمانے سے بتائی جاتی ہے

میں کشمیر کے مترادف اس سے بہتر لفظ کا استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے کشیر۔ کشویر۔ کشمیر ایک ہی نام ہیں۔[1]

دربار چین اور دربار کشمیر کی باہمی سفارتیں

ہیونگ سانگ چینی سیاح دو سال تک کشمیر میں رہا ہے۔ اس کے بعد چین کے حکمران خاندان تنگ کے ذکر میں کشمیر کا نام آتا ہے۔ لکھا ہے کہ چین کے دربار شاہی میں کشمیر کا پہلا سفیر راجہ ملکتا پیڈ والے کشمیر کے عہد میں ۷۱۳ء میں آیا تھا۔ اور دربار کشمیر کا دوسرا سفیر اس کے نامور جانشین للتادیتہ کے زمانے میں چین کے دربار میں پہنچا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کی سیاسی عظمت اس وقت کس درجہ تک پہنچی ہوئی تھی جس طرح دربار کشمیر کے سفیر چینی دربار میں حاضر رہتے تھے۔ اسی طرح خاقان چین کے سفیر کشمیر میں آتے ہوں گے۔ کیونکہ باہمی ارتباط اور رسل رسائل کا سلسلہ سفراہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

راجہ میگواہن اور راجہ پرورسین ثانی کی فتوحات

راجہ میگواہن کشمیر کا مشہور راجہ گزرا ہے۔ اس نے جین مذہب قبول کرتے ہی اس کی اشاعت کے لئے ہندوستان پر حملے شروع کر دیئے۔ وہ فتوحات کا سیلاب بہاتا ہوا لنکا تک پہنچ گیا۔ ابوالفضل آئین اکبری کی جلد دوم میں اس کا ذکر کرتا ہے۔ یہ زمانہ ۱۸۰ء یا اس کے قریب کا تھا۔ راجہ پرورسین دوم نے کشمیر سے نکل کر بقول کلہن جزیرہ نمائے گجرات

---

[1] کشمیر کا جغرافیہ قدیم محقہ راج ترنگنی سٹین صاحب۔ [2] ۶۲۱ء و ۶۲۲ء یا ۶۳۰ء و ۶۳۱ء میں۔

اور مغربی ساحل ہند کو فتح کیا۔ شیلادت والئے مالوہ کو اس کے دشمنوں نے معزول کر رکھا تھا۔ پرورسین کی ہی مدد و اعانت سے اس نے دوبارہ تخت و تاج حاصل کیا۔ پرورسین نے واپس آکر ترکستان تک یلغار کی۔

راجہ مہر کل کی فتوحات کا سیلاب جنوبی ہند میں

ایلیٹ صاحب کی ہسٹری آف انڈیا میں لکھا ہے۔ کہ مسیح سے پانچسو سال قبل جنوبی ہند کے ایک حکمران کا نام راجہ ہال تھا۔ ایک مرتبہ ایک سوداگر نے اس راجہ کے ملک کا بنا ہوا کپڑا راجہ کشمیر کی رانی کے پاس فروخت کیا۔ رانی نے جب اس کپڑے کو پہنا۔ تو راجہ کو اس پر ایک مُہر نظر آئی جس پر راجہ ہال کے پاؤں کے نشان بنے ہوئے تھے۔ راجہ کشمیر نے سوداگر کو بلایا۔ اور راجہ ہال کا پتہ وغیرہ پوچھا۔ راجہ کشمیر نے قسم کھائی کہ میں اس توہین کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتا۔ میں جب تک اس کے پاؤں کاٹ کر نہ لے آؤں چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ چنانچہ راجہ کشمیر نے راجہ ہال پر چڑھائی کی اور اس کو شکست دی لیکن اس کے معافی مانگنے پر اس کا ملک اس کو واپس کر دیا۔ مگر اپنی قسم کو پورا کرنے کے لئے اس کی مورتی بنوائی۔ اور پھر مورتی کے پاؤں کاٹ کر قسم پوری کی۔

جب ہم ایلیٹ صاحب کی تاریخ کے اس واقعہ کو کشمیر کی تاریخ میں تلاش کرتے ہیں۔ تو وہاں ہمیں راجہ مہر کل کے حالات میں اسی قسم کا ایک ملتا جلتا واقعہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ایک دن اس نے اپنی رانی کے زرنگار لباس پر راجہ سنگلدیپ (لنکا) کی تصویر دیکھی۔ جل بھن کر کباب ہو گیا۔ قسم کھائی۔ کہ جبتک راجہ مذکور کو اس گستاخی کی سزا نہ دے لوں گا۔ دوسرے کام کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ چنانچہ راجہ نے اسی وقت مخالف کی سرکوبی کے لئے لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ اور تمام ہندوستان کو روندتا اور ملک کو زیر و زبر کرتا سمندر کے

کنارے پر جا پہنچا۔ وہاں مطیع راجگان کی مدد سے جہاز اور کشتیاں بہم پہنچا کر لنکا پر دھاوا بول دیا۔ وہ اجل رسیدہ بالکل بے خبر تھا۔ معمولی سے کشت و خون کے بعد قتل ہو گیا۔ مہرکل نے اس کے خاندان میں سے کسی اور کو راجہ بنا کر آئندہ کپڑوں پر راجہ کی تصویر کی بجائے سورج کا نشان بنائے جانے کا حکم صادر کیا۔

راجہ مہرکل کشمیر میں ایک خونخوار۔ ظالم اور شجاع راجہ گزرا ہے۔ ایلیٹ نے اس کا زمانہ مسیح سے پانچسو سال قبل بتایا ہے۔ لیکن تاریخ کشمیر میں اس کا زمانہ قریباً سات سو سال قبل مسیح درج ہے۔

غرض راج ترنگنی جو آج سے قریباً آٹھ سو سال قبل کی تاریخ ہے۔ اس قسم کے جرأت آفرین واقعات سے لبریز ہے۔ نیز زمانہ قدیم کے یونانی۔ مصری اور دیگر غیر ملکی مورخوں نے کشمیر کی سیاسی اہمیت اور اس کی وسعت کے متعلق جو بیانات شائع کئے ہیں۔ ان سے بھی اہل کشمیر کی غیر معمولی شجاعت و بسالت کا اظہار ہوتا ہے۔

لیکن یہ قانون قدرت ہے کہ جس قوم سے اخلاق فاضلہ اور عادلانہ حکومت کے خصائل مٹ جاتے ہیں۔ قدرت اس کی جگہ کوئی اور قوم جو فاتحانہ اخلاق و خصائل کی اہل ہوتی ہے۔ پیدا کر دیتی ہے۔ اور پھر وہی قوم جو حکمران شجاع اور غیور ہوتی ہے۔ محکوم ہو کر رفتہ رفتہ اپنی تمام اعلیٰ عادات سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہی حال کشمیر کے ہندوؤں کا ہوا۔ جب ان کے آخری حکمران عیش و عشرت فسق و فجور اور خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو گئے۔ تو قدرت نے ان پر ایک اور قوم کو مسلط کر دیا۔ وہ قوم مسلمان تھی۔ اور ان ایام میں شجاع اور غیور ہونے کی وجہ سے حکمرانی کے تمام اوصاف سے متصف تھی۔ مسلمان گو مذہباً کشمیری ہندوؤں سے مختلف تھے۔ لیکن سادات و قریش وغیرہ چند

ایک اقوام کے سوا ان کی اکثریت وطناً اور نسلاً کشمیری ہی تھی۔ اور جو لوگ غیر ممالک سے آئے تھے۔ وہ بھی کشمیری تمدن و معاشرت اور باہمی رشتہ داریاں اور میل جول اختیار کرکے کشمیر ہی کو اپنا وطن قرار دے چکے تھے۔

راجہ مکتاپیڈ عرف للتادت کی عالمگیر فتوحات

راجہ للتادت کشمیر کے بادشاہوں میں سب سے شاندار نہیں تو پُرشوکت بادشاہوں میں ایک ضرور تھا۔ اس کی وسیع و عظیم فتوحات پر اگر نظر ڈالی جائے۔ تو وہ نہ صرف کشمیر بلکہ ہندوستان کے جلیل القدر بادشاہوں میں شمار ہو سکتا ہے۔ آج سے آٹھ سو سال قبل کے مصنف پنڈت کلہن نے راج ترنگنی میں بڑی تفصیل سے اس کی فتوحات کا ذکر کیا ہے۔ راج ترنگنی کا یہ بیان ممکن تھا شاعرانہ اور خیالی نظر آتا۔ لیکن ہمیں اب اس کی تصدیق چچ نامہ سے بھی ہوتی ہے۔ جو فتوحات سندھ کا ایک شاندار مرقع ہے۔ جو اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک خط سے جو راجہ داہر نے محمد بن قاسم کے نام لکھا ہے۔ یہ بیان پایا جاتا ہے:۔ اگر میں تمہارے مقابلے کے لئے راجہ کشمیر کو لکھتا جس کے آستانے پر ہندوستان کے تمام راجے اپنا سر جھکاتے ہیں۔ اور جس کے زیر نگین نہ صرف ہندوستان ہے بلکہ مکران و توران کے علاقے بھی اس کے باجگذار ہیں جس کی غلامی کا جوا بڑے بڑے امیروں اور سرداروں نے از خود پہن رکھا ہے۔ اور جس کے خلاف کسی کو دم مارنے اور سر اٹھانے کی جرأت نہیں ہوتی۔ وغیرہ وغیرہ۔

للتادت کا سب سے پہلا دشمن" یاسو ورمن" مہاراجہ قنوج تھا۔ جو اس وقت تمام شمالی ہند کا واحد حکمران تھا جس نے گوڑ یا بنگال کے راجہ کو بھی شکست دیدی تھی لیکن جب یاسو ورمن کو للتادت کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑا۔ تو اس کی

ساری شیخی کرکری ہو گئی۔ اور وہ شکست کھا کر آخر للتادت کا درباری شاعر بن گیا۔ للتادت کی فتوحات کا سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ کلنگا۔ کرناتہ کا دیری کا علاقہ علاقہ کوکن کے سات راجے۔ دوارکا۔ سورٹھ۔ اونیتی اور مالوہ کے راجے ان سب کو اس نے ایک ایک کر کے فتح کیا۔ کرناتہ (کرناٹک) میں اس وقت ایک رانی۔ رانی رتہ یارٹہ کے نام سے مرہٹہ چلوکیا راجاؤں میں سے حکمران تھی۔ اور راجہ وجے دت کی بیوہ تھی۔

للتادت سندھ کی طرف نہیں گیا۔ اور اگر وہ جاتا۔ تو راجہ واہر یقیناً اس کی اطاعت کرتا۔ کیونکہ وہ اس کی برتری کو پہلے ہی تسلیم کرتا تھا۔ جیسا کہ اس خط سے جو سابقہ سطور میں درج ہو چکا ہے۔ ظاہر ہوتا ہے۔ مشرق۔ جنوب اور مغرب کی فتوحات کے بعد للتادت نے تبت اور ترکستان کا رخ کیا۔ دردستان اور تبت کو پامال کرنے کے بعد اس نے ترکوں کے بادشاہ مونی کو تین مرتبہ شکست دی۔ مصنف مذکور لکھتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا اور آخری واقعہ ہے کہ ہندوستان کا بادشاہ ہندوستان سے باہر جا کر خونخوار جنگجو اور وحشی تورانیوں کے علاقہ پر حملہ آور ہوا۔ ان فتوحات کو صحیح تصور کرنے میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں۔ کیونکہ ہمیں بچ نامہ میں نہ صرف ترکوں کے بادشاہ موتی کا حال ملتا ہے۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ کشمیر کے راجہ نے مکران (بلوچستان) اور توران (ترکستان) کو فتح کیا۔ ہندوستان ہمیشہ توران سے آنے والے گروہوں اور جتھوں سے ہزیمت اٹھاتا اور مغلوب ہوتا رہا ہے لیکن للتادت کی ان بیرونی فتوحات نے جو انقلاب پیدا کیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس انقلاب انگیز واقعہ کا ذکر نہایت فخر ومباہات سے ہونا چاہیے۔

للتادت صرف خاقان چین کو شہنشاہ تسلیم کرتا تھا۔ اور شہنشاہ چین

بھی ہندوستان کے تمام راجاؤں میں اسی کو "بادشاہ" سمجھتا تھا چنانچہ ۷۳۳ء میں شہنشاہ چین نے اپنی ایک سفارت وللتا دت کشمیر کے پاس بھیجی۔ اور اس کے ذریعہ اس کو بادشاہ کا خطاب پیش کیا۔ دونوں ہمعصر بادشاہوں میں باہمی تعلقات اس سفارت کے ذریعہ اور بھی استوار ہو گئے۔

کلہن کے بعد کشمیری مصنفوں کو للتادت کی تخت نشینی اور سال وفات میں کچھ غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔ اس کی حکومت ۷۰۰ء سے شروع ہو کر ۷۳۶ء میں ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جنگجو طبیعت اور اس کی غیر معمولی شجاعت اس کی عالمگیر فتوحات کے جنون و شوق کا اندازہ صرف اسی امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب وہ شمال کے وحشی قبیلوں کے ساتھ جنگ میں مصروف تھا۔ تو اس نے کشمیر میں اپنے وزراء کو پیغام بھیجا۔ کہ میں اب واپس نہیں آسکتا۔ میرے بیٹے کی بادشاہت کا اعلان کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ اپنے وطن میں واپس نہ آسکا۔[1]

محمود غزنوی کے دو ناکام حملے کشمیر پر

پنجاب اور ہندوستان کے اکثر علاقے برسوں تک سلطان محمود کے قدموں کی جولانگاہ بنے رہے۔ اس کی فوج جو بخارا، سمرقند، ماوراءالنہر اور افغان سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ جب غزنی سے باہر نکلتی۔ تو ہندوستان میں زلزلہ سا آجاتا۔ اور اجمیر قنوج، دہلی، لاہور اور دیگر ممالک کے راجے اپنی فوجیں جمع کر کے اس سیلاب کو روکنے کے لئے پنجاب و پشاور کی حدود میں جمع ہو جاتے۔ لیکن محمود تمام راجگان ہند پر غالب آتا۔ اور ملکوں کے ملک فتح کرتا چلا جاتا۔ اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔ جن میں پندرہ حملوں میں وہ کامیاب اور فتحمند ہوا۔ صرف دو حملوں میں اس کو ناکامی

[1] تاریخ قرون وسطیٰ ہند۔ انڈیا از سی۔ وی واد یا۔

کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور وہ دونوں حملے کشمیر پر تھے۔

اس کا گیارھواں حملہ ۱۰۱۶ء میں تسخیر کشمیر کے لئے تھا اس زمانے میں جس کو مورخین ۱۰۰۳ء سے ۱۰۱۶ء تک کا زمانہ بتلاتے ہیں۔ کشمیر پر ایک ہندو عورت دیدا رانی حکمران تھی۔ اس حملے میں محمود کو بہت سی تکلیفیں اٹھا کر ناکام واپس جانا پڑا۔ مورخ اس ناکامی کی مختلف وجوہ بتاتے ہیں۔ کوئی لکھتا ہے۔ اس کی فوج راستہ بھول گئی تھی۔ کسی نے لکھا جاڑا سر پر آپہنچا۔ برفباری نے اس کی فوج کو تباہ و پریشان کر دیا۔ تاریخ ہندوستان جلد اول کے صفحہ ۲۱۶ پر مولانا ذکاءاللہ دہلوی لکھتے ہیں۔ اس حملہ میں سلطان قلعہ لوہ کوٹ (پونچھ) تک آیا۔ یہ قلعہ نہایت مستحکم تھا۔ سلطان نے محاصرہ تو کیا۔ لیکن جب محاصرہ پر مدت گزر گئی۔ اور کشمیر کو کمک اور اطراف سے بھی پہنچ گئی۔ اور جاڑے اور برف کی بھی شدت ہوئی۔ تو سلطان محاصرہ ترک کر کے غزنی واپس آگیا۔ مولانا ذکاءاللہ لکھتے ہیں۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ ہندوستان میں لشکر اسلام کو اس طرح کا صدمہ پہنچا۔ جس میں صدہا جانیں ضائع ہو گئیں اور بے نیل و مرام واپس آنا پڑا۔

سلطان محمود غزنوی کا مصنف اسی واقعہ کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے " لوہ کوٹ کے آگے اس کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ محصورین[۱] کو برابر کشمیر سے مدد پہنچتی رہی یہانتک کہ برفباری شروع ہو گئی۔ اور محمود کو پہلی مرتبہ ہندوستانی مہم میں پیٹھ دکھانی پڑی۔ واپسی کے وقت دریائے جہلم طغیانی پر تھا۔ فوج کی بڑی تعداد اس میں غرق ہو گئی۔ اور سلطان بہ ہزار خرابی پانی کے طوفان سے نجات پا کر ناکام و نامراد غزنی پہنچا۔" محمود نے ۱۰۲۱/۱۰۲۲ء میں دوبارہ کشمیر پر چڑھائی کی۔ لیکن ناکام واپس آیا۔

---

[۱] محصورین میں راجہ بھیم۔ راجہ جے پال کا پڑپوتا اور اس کی فوج تھی بھیم شکست کھا کر کشمیر بھاگ آیا تھا۔

اور اسی ناکام مراجعت میں اس نے پنجاب میں مستقل حکومت کی بنا ڈالی (سلطان محمود غزنوی)

محمود کا بارہواں حملہ ۴۰۶ھ میں کشمیر پر ہوا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ راجہ لاہور بھاگ کر کشمیر چلا گیا تھا۔ اور راجہ سنگرام راج نے جو ودیدرانی کا بھتیجا تھا۔ اور اس وقت کشمیر کا حکمران تھا۔ اس راجہ کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ محمود نے ۴۱۲ھ کی ناکامی کشمیر کا زخم مٹانے کے لیے کشمیر پر فوج کشی کی۔ لیکن اس مرتبہ بھی ہندوستان جیسے عظیم الشان ملک کو تباہ کرنے والا سلطان آخر ناکام ہی پھرا۔ اس ناکامی کی وجہ بھی برفباری اور جاڑے کی شدت ہی بتائی جاتی ہے۔ تاریخ ہندوستان جلد اول ذکاء اللہ کے صفحہ ۲۱۷ پر تاریخ یمینی کے حوالے سے لکھا ہے۔ کہ اور ملکوں کے سپاہیوں کے علاوہ بیس ہزار صرف ماوراء النہری سپاہی تھے۔ جو جہاد کے ارادے سے سلطان کے ہمراہ تھے۔

غرض کشمیر کے حملوں سے سلطان کی ناکام واپسی کی کوئی وجہ ہو۔ اور مؤرخ اس کو خواہ کسی رنگ میں ظاہر کریں۔ بہرحال کشمیر ہی ایک ایسا ملک تھا جو اس کی شمشیر زنی سے بچ سکا۔

ل مولوی محمد حبیب بی اے آکسن اپنی کتاب سلطان محمود غزنوی میں لکھتے ہیں: "کشمیر کے راجہ سالی نے سلطان سے صلح کر لی اور محمود غزنوی کا مقدمۃ الجیش اپنے زیر کمان بنانا قبول کیا" لیکن کتاب الہند کا مصنف البیرونی جو سلطان مسعود بن محمود کے زمانے میں گزرا ہے لکھتا ہے۔ محمود نے چونکہ ہندوؤں کی سرسبزی کو تباہ کر دیا تھا۔ اور ہندو اس زمانہ میں غبار کی طرح پراگندہ ہو کر ایک افسانہ بن گئے تھے۔ اس لئے مسلمانوں کو وہ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ یہی سبب ہوا کہ ان کے علوم سلطان کے مفتوحہ علاقوں سے سمٹ کر بنارس اور کشمیر وغیرہ کی طرف چلے گئے جہاں ابتک ہماری رسائی نہیں ہوئی ہے۔ از کتاب الہند البیرونی جلد اول زبان اردو شائع کردہ انجمن ترقی اردو۔ مولوی محمد حبیب نے اس زمانہ کے راجہ کشمیر کا نام راجہ سالی لکھا ہے صحیح نام کشمیر کی تاریخ میں سنگرام ہے۔

سلطان شہاب الدین کے حملے افغانستان و سندھ پر

کشمیری مسلمان بادشاہوں میں سلطان شہاب الدین کشمیر میں نہایت نامور بادشاہ گزرا ہے۔ اپنی فتوحات عظیمہ اور شجاعتِ بے نظیر کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہاب الدین غوری کی غیور و فاتح روح اس کے رگ و ریشہ میں تڑپ رہی ہے۔

زینہ ترنگنی کا مصنف پنڈت زونراج اس کے متعلق لکھتا ہے۔ اگرچہ یہ بادشاہ جہاں جاتا تھا۔ کامیاب ہو کے آتا تھا۔ لیکن جوں جوں اس کو فتح ہوتی تھی۔ اس کی بہادری اور شجاعت کی آگ فتوحات کے خس و خاشاک کے جلانے کے لئے تیز ہوا کرتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے سمندر میں خواہ کتنے ہی دریا کیوں نہ گریں۔ پھر بھی اس کی پیاس کبھی نہیں بجھتی جس دن اس کو فتوحات کی کوئی خبر نہ ملتی تھی۔ وہ مغموم رہتا تھا اور سمجھتا تھا کہ میری زندگی کا یہ دن بالکل ضائع چلا گیا۔ آہو چشم عورتیں اس کا دل چھیننے کے لئے کوئی کشش نہ رکھتی تھیں۔ شراب نوشی۔ ماہ تاباں کی خوشگوار چاندنی سب اس کے لئے بے لطف تھیں جس طرح ایک بوڑھے آدمی کو اپنی جوان اور خوبصورت بیوی عزیز ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے ہر قسم کے ناز و نخرے برداشت کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی فوج کے خوبصورت جوانوں کو بیوی سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ اور گرمی ہو یا سردی دن ہو یا رات۔ بھوک ہو یا پیاس۔ روحانی تکلیف ہو یا جسمانی۔ کوئی چیز اس کی یلغار کے لئے روک نہ بن سکتی تھی۔

اپنی فاتحانہ یورشوں کے سلسلہ میں یہ اولوالعزم بادشاہ سب سے پہلے شمال کی طرف بڑھا۔ جہاں پارسیکا قوم آباد تھی۔ سرحد افغانستان کے حاکم گوبندخاں والئے دیانڈپور کے ملک میں پہلے اس کے بے پناہ تیر داخل ہوئے۔ اور پھر اس کی فوج

نے کوچ کیا۔ سندھو ملک (سندھ) کے حاکم نے اپنے آپ کو بادشاہ کی شان کے موافق تحائف پیش کرنے کے قابل نہ سمجھتے ہوئے اپنی لڑکی پیش کر دی۔ پھر گاندھار کی سلطنت میں داخل ہوا۔ پھر فتنگون کے ملک کو تباہ کیا۔ گجنی پوری (غزنی) میں جب اس کا داخلہ ہوا۔ تو لوگ خوف کے مارے سراسیمہ ہو گئے۔ اشت نگر (ہشت نگر) اور پوروشوپر (پشاور) سے اس نے بہت کچھ حاصل کیا۔ غرض اس بادشاہ کی فتوحات کا زینہ راج ترنگنی میں بڑی تفصیل سے ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ بادشاہ فتح اور ظفرمندی کے شوق میں اتنا طویل عرصہ اپنے ملک سے باہر رہتا تھا۔ کہ غیر ممالک اس کے لیے اپنے ہو جاتے تھے۔ اور اس کا اپنا ملک اس کے لئے بیگانہ اور اجنبی ثابت ہوتا تھا۔

اس کی فوج اس کے کمانڈر اور اس کے سپہ سالار سب کشت گیری تھے۔ اور اگر اس کی ہمت و جرات اور اس کے شوق ملک گیری و ملک بخشی کا ساتھ اس کی افواج بھی دیتیں اور وطن کی محبت ان پر غالب نہ آ جاتی۔ تو معلوم نہیں وہ کہاں تک پہنچتا۔ اور کس جگہ جا کر دم لیتا

تاریخ فرشتہ کا مصنف بھی اس کی فوجی طاقت کا اعتراف کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ یہ بادشاہ نہایت شجاع تھا۔ اس کی شجاعت کا یہ عالم تھا۔ کہ جس دن فتحنامہ کسی مقام سے نہ آتا تھا۔ اس دن کو ایام عمر میں شمار نہ کرتا تھا اور کدورت کے آثار اس کے چہرے سے ظاہر ہوتے تھے۔ یہ بادشاہ آب سندھ کے کنارے پہنچا۔ وہاں کے حاکم کو جام کہتے ہیں۔ اسے شکست دی۔ قندھار اور غزنی تک اس کے نام سے لرزتے تھے۔ یا سپ نگر کی راہ سے جواب

لے شہاب الدین کا بیٹا شہزادہ حسن خان سندھی بیگم ہی کے بطن سے تھا۔

باش لغز مشہور ہے۔ وہ پشاور میں گیا۔ اور مخالفوں کی جماعت کثیر کو
قتل کر کے کوہ ہندوکش میں داخل ہوا۔
کرنل سُرلزلی ہیگ نے بھی تاریخ ہند کے بارہویں باب میں شہاب الدین
کی فتوحات اور اس کی جنگی سپرٹ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔
"شہاب الدین ایک مشہور جنگجو۔ قابل اور منتظم بادشاہ تھا اس نے دو شہر
بھی آباد کئے اور زمینوں کی انتہائی احتیاط سے حد بندی کی تا کہ شاہی اراضیات
(خالصہ) پر مخالفانہ قبضہ نہ ہو سکے۔ آغاز حکومت میں اس نے سندھ پر حملہ
کیا اور سندھ کے کنارے اس نے جام کو شکست دی۔ وہاں سے واپس
آکر وہ پشاور گیا۔ جہاں اس نے افغانوں کو سخت ہزیمت دی۔ اور
افغانستان کو عبور کرتا ہوا کوہ ہندوکش کے دامن تک جا پہنچا۔ اس کا ارادہ
ہندوکش سے بھی آگے جانے کا تھا لیکن بعض ناموافق حالات نے اس کا
یہ ارادہ پورا نہ ہونے دیا۔ اور وہ واپس آگیا۔ واپسی پر وہ پنجاب کے میدانوں
کو روندتا ہوا دریائے ستلج کے کنارے جا پہنچا، جہاں اس نے ایک چھاؤنی
کی بنیاد ڈالی۔ یہیں راجہ نگر کوٹ (کانگڑہ) (۱۳۶۱ء) میں اس سے ملا۔ جو
دہلی کے بادشاہ فیروز شاہ تغلق کے علاقہ پر لوٹ مار کر کے واپس آرہا تھا
راجہ نے شہاب الدین کی آؤ بھگت اور خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ فروگزاشت
نہ کیا۔ بلکہ شاہی مہمان نوازی کے علاوہ اس نے بادشاہ کو مال غنیمت سے بھی
کافی سے زیادہ حصہ دیا۔ شہاب الدین اس کے بعد کشمیر کو واپس چلا گیا۔"
شہاب الدین کے بعد قطب الدین پھر سکندر بت شکن اس کے بعد
علی شاہ اور زین العابدین بڈشاہ یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے۔ یہ سب
بہادری و شجاعت و تیر و تلوار کے دھنی تھے اور ہر چند کہ بڈشاہ کے بعد

کشمیر کے بادشاہوں کی عیش پرستی اور مے نوشی اور شہزادوں کی باہمی خانہ جنگیوں نے ملک کو تباہی کے عمیق غار میں پھینک رکھا تھا۔ اور کسی غیر ملک پر حملہ کرنا تو کجا ان کو اپنا آپ سنبھالنا بھی مشکل نظر آرہا تھا تاہم اس گئے گزرے زمانے میں بھی کشمیر کی تاریخیں چند ایسے واقعات پیش کرتی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہرچند آگ بجھ چکی تھی۔ لیکن کچھ دھواں ابھی باقی تھا۔ اگر اس کو کوئی سلگانے والا ہوتا۔ تو وہی دھواں ایک بار پھر اپنی شرر باریوں سے جہاں سوزی کے سامان پیدا کرسکتا تھا۔

سلطان حسن شاہ کشمیری کی افواج سرحد پنجاب پر

چنانچہ شری ور زینہ راج ترنگنی میں سلطان حسن شاہ والئے کشمیر کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ جب تاتار خاں حاکم پنجاب نے راجہ اجے دیو والیٔ جموں اور راجہ راجپوری (راجوری) پر حملہ کردیا۔ تو ان دونوں نے اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے حسن شاہ سے امداد و اعانت کی درخواست کی۔ جب بادشاہ کے پاس دونوں راجوں کا یہ پیغام پہنچا۔ اس وقت بادشاہ کا سپہ سالار تازی بٹ بھی موجود تھا اس نے کہا ہمارے پڑوس کے چھوٹے چھوٹے والیان ملک اغیار کے حملوں سے خوفزدہ ہیں۔ اگر دشمنوں نے ان کو تباہ کردیا۔ تو ممکن ہے کل ہماری باری بھی آجائے۔ اس لئے ان کی امداد و اعانت بہت ضروری ہے اور اگر مجھے اجازت دی جائے۔ تو میں تاتار خاں کے تمام تار و پود کو تار تار کرسکتا ہوں۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے تازی بٹ فوج لیکر پہلے (راجوری) اور پھر جموں پہنچا۔ دونوں راجے جو تاتار خاں کے خوف سے نیم جان ہو رہے تھے از سر نو زندہ ہوگئے۔

سیالکوٹ میں تاتار خاں اور تازی بٹ کے درمیان ایک خونریز جنگ

ٹ تر لیر نے نند راج ترنگنی میں سیالکوٹ کا نام شری کالکوٹ لکھا ہے

ہوئی۔طرفین سے صدہا بلکہ ہزارہا نوجوان موت کے گھاٹ اتر گئے۔لیکن فتح آخر تازی بٹ کو ہوئی۔تاتارخاں شکست کھا کر لاہور کی طرف بھاگ گیا۔تازی بٹ نے سیالکوٹ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔اور شہر کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔سیالکوٹ کی اس تباہی کا ذکر طبقات اکبری۔فرشتہ۔سیر المتاخرین اور سیالکوٹ کی تاریخوں میں بھی درج ہے۔

سات سالہ بادشاہ کشمیر کی جنگی سپرٹ

اسی سلطان حسن شاہ کا بیٹا محمد شاہ تھا۔باپ کی وفات ۸۹۲ھ کے وقت اس کی عمر صرف سات سال کی تھی۔لیکن اس واقعہ سے جو آگے چل کر لکھا جائیگا۔یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کم سن شاہزادے میں بھی جنگی روح موجود تھی۔اس کا ثبوت بھی فرشتہ ہی کے حوالے سے دیا جاتا ہے۔جو معاملات کشمیر میں تاریخ رشیدی اور طبقات اکبری جیسی قدیم و مستند تاریخوں کا نچوڑ ہے۔فرشتہ لکھتا ہے۔

جب وہ چھوٹی سی عمر میں مسند حکومت پر فائز ہوا۔تو وزرا۔اور تمام وہ لوگ جن کے سپرد خزانے اور فراش خانے تھے۔طلائی و نقرئی ہتھیار قیمتی لباس اور متاع نفیسہ اس کے سامنے لائے۔یہ خورد سال بچہ سب کچھ بغور دیکھتا رہا۔لیکن اس نے نہ خزانوں کی طرف نظر کی۔نہ قیمتی ملبوسات کو ہاتھ لگایا۔نہ دوسرے سامان تعیش پر نظر ڈالی۔البتہ ہتھیاروں میں سے ایک کمان اور ایک تلوار ہاتھ میں لے لی۔اور کہا یہ میرے پاس ہے۔تو ہر چیز میرے قبضہ میں ہے۔اہل دربار اس خورد سال بادشاہ کی ذہانت پر آفرین اور جزاک اللہ کہتے اور اپنے مشاہدے کو اس کی بزرگی و مردانگی پر محمول کرتے تھے۔

سب نفائس دیکھکر بیکار اپنے ہاتھ میں   اک کماں رکھ لی تو اک تلوار اپنے ہاتھ میں

کیا اس "بزدل" ملک کے سوا کسی اور ملک میں بھی ایسی شہادت موجود ہے۔ کہ سات سال کے بچہ کو جب تخت حکومت نصیب ہوا۔ اور خزانے۔ جواہرات۔ عجائبات۔ اصطبل اور ملبوسات نفیس اس کے سامنے پیش کئے گئے۔ تو اس نے ان سب چیزوں کو کھلونے سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہو اور تلوار یا تیر کمان ہاتھ میں لے کر کہا ہو کہ اگر یہ میرے قبضے میں ہیں۔ تو بادشاہی کے لوازمات بھی میرے پاس سمجھنے چاہئیں۔

دسویں صدی ہجری کے وسط میں ہر چند کہ کشمیر کی حالت از حد خراب ہو چکی تھی۔ بادشاہ محض کٹھ پتلی ہوتے تھے۔ امراء وزراء کی سازشوں میں ملک اس قدر کمزور ہو گیا تھا۔ کہ دہلی کے بادشاہ اگر اس طرف توجہ کرتے۔ تو فتح کشمیر چنداں مشکل کام نہ تھا۔ بلکہ یہاں تک تو ہو گیا تھا کہ مرزا حیدر کاشغری نے ہمایوں بادشاہ کے نام کا سکہ بھی کچھ عرصہ کشمیر میں جاری کر رکھا تھا۔ خانہ جنگی کے علاوہ سنی شیعہ کے فسادات نے مذہب کے نام پر ملک میں جو خون خرابہ کر رکھا تھا اس نے بدامنی و بدنظمی کو اور بھی جلا دے رکھی تھی۔ تاہم ان میں ابھی کچھ دم خم باقی تھا جیسا کہ آئندہ کی سطور سے ظاہر ہو گا۔

اکبر کے حملے کشمیر پر

اسی اثنا میں اکبر بادشاہ کو جو ان دنوں لاہور میں مقیم تھا کشمیر کی ایک جماعت[1] نے جو رات دن کے فسادات اور بیگناہوں کے خون سے تنگ

---

[1] اس جماعت میں چند چک سرداروں اور دیگر امراء کے علاوہ شیخ یعقوب صرفی اور بابا داؤد خاکی بھی شامل تھے۔

آچکی تھی۔ اکبر کو تسخیر کشمیر کی دعوت دی۔ چنانچہ اکبر نے راجہ بھگوانداس کو پچاس ہزار فوج دے کر کشمیر بھیجا۔ اس وقت کشمیر میں یوسف شاہ چک کی حکومت تھی۔ مذہبی منافرت نے سنیوں اور شیعوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھے تھے۔ ملک میں قحط کی وبا نازل تھی۔ اور بقول صاحب تاریخ واقعات کشمیر "یک سیر برنج بہ دہ روپے رسید و شکم اسپاں و شتراں پارہ کردہ آب مے خورند۔"

اس پر بھی راجپوتوں، مغلوں اور کشمیریوں میں وہ خونریز جنگ ہوئی کہ ع زمیں را بہ دریائے خوں کردہ غرق کا سماں پیدا ہو گیا۔ لیکن آخر اکبر جیسے جلیل القدر شہنشاہ کی فوج کو جو نصف لاکھ سوار اور پیادوں پر مشتمل تھی۔ ناکام واپس جانا پڑا۔ دوسری دفعہ اکبر نے محمد قاسم خاں میر بحری کو تیس ہزار فوج دے کر پھر کشمیر بھیجا۔ یہ وہ وقت تھا کہ سنی شیعوں کے مکانات و معابد اور شیعہ سنیوں کے مکانات و معابد کو جلا کر خاک سیاہ کر دینا معمولی بات سمجھتے تھے۔ یہ لڑائی بھی جس نے آزادئ کشمیر کا خاتمہ کر دیا ؎

سناں آتش کیں برافروختہ پر مرغ را در ہوا سوختہ۔ کا نمونہ تھی

شمس چک[1] کی غیر معمولی شجاعت

لیکن کشمیری فوج میں شاہی خاندان کے ایک شخص شمس چک کا نام لیا جاتا ہے جس کے متعلق مشہور ہے۔ کہ صرف اس تنہا شخص نے ساٹھ مغلوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اور دشمن کے جم غفیر سے اپنی جان بچا کر کرناد کی طرف نکل گیا اسی شمس چک کے متعلق یہ شعر بھی مشہور ہے۔

بہ تیغ و بہ چوب و بہ سنگ و بہ مُشت ملک شمس چک شصت کس را بہ کُشت

کشمیر نے مغلوں کی غلامی ۹۹۴ھ میں اختیار کی۔ لیکن شکست کھا

[1] فرقہ چک کے حالات کے لئے دیکھو ضمیمہ ۵

چکنے اور اپنا ملک اپنے ہاتھ سے دے چکنے کے بعد بھی کشمیری اپنی کھوئی ہوئی آزادی کے لئے سالہا سال تک ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ چنانچہ جہانگیر کے زمانے میں ۱۰۲۱ھ تک ملک میں متفرق مقامات پر کشمیریوں اور مغلوں میں ہنگامہ آرائیاں ہوتی رہیں۔

اہل کشمیر کی فوجی سپرٹ کا مضمون کچھ طویل ہو گیا ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ اور ممالک کی اقوام تو درکنار خود کشمیر کے لوگ اپنے ملک کی اور اپنی قوم کی سیاسی تاریخ اور جنگی سپرٹ سے قطعی ناواقف ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ جب تک ہم اپنے موجودہ حالات کا گزشتہ تہذیب و تمدن کے ساتھ مقابلہ نہ کرلیں اپنی ترقی یا اپنے زوال کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کرسکتے ؎

داستان عہد گل را از نظیری بشنو   عندلیب آشفتہ تر گفت است این افسانہ را

اور چونکہ تاریخ ہی ازمنۂ قدیم کی ترقی یا زوال اور عبرت و نصیحت کا بہترین ریکارڈ ہے۔اس لئے ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔

غرض بڈشاہ میں بھی وہ تمام شجاعانہ و شاہانہ خصائل موجود تھے جو اُس کے آباؤ اجداد شہاب الدین قطب الدین اور سلطان سکندر شاہ میں پائے جاتے تھے۔ لیکن اس میں اور بہت سی خوبیاں تھیں۔ جو اس کے کسی پیش رَو میں موجود نہ تھیں۔ وہ نہایت بے تعصب اور عادل بادشاہ تھا۔ اور خون خرابے سے اس کو سخت نفرت تھی۔ وہ ملک گیری کا بھی زیادہ شائق نہ تھا۔

وہ لوگوں کی جانوں کو اپنی جان سے زیادہ قیمتی سمجھتا تھا۔ وہ خود بخود بغیر کسی معقول وجہ کے کسی ملک پر چڑھائی نہ کرتا تھا۔ البتہ جب مدافعانہ حملے کرتا۔ تو اس کی تیغ بے پناہ سے جان بچانا مشکل ہو جاتا تھا۔ سرحدی علاقوں میں بادشاہ کے جس قدر مخالف تھے۔ وہ ایک ایک کرکے خود بخود اس کے ماتحت ہوتے چلے گئے۔

بادشاہ کے ہاتھوں فرقہ چک کی تباہی

بادشاہ نے دُودھ بھائیوں کی اصلاح و سرزنش کے بعد فرقہ چک کی طرف توجہ کی جس کا رئیس پانڈو چک بادشاہ کے محبوب علاقہ زنگیر کی شاہی عمارات کو اس لئے تباہ کرجاتا تھا۔ کہ بادشاہ کا قرب اس کی غارت گریوں میں رکاوٹیں ڈالا کرتا تھا۔ آخر جب بادشاہ اس کے استیصال کا عزم مصمم لے کردارالحکومت سے کامراج کی طرف روانہ ہوا۔ تو پانڈو چک دردستان کی طرف بھاگ گیا لیکن بادشاہ نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اس کا پورا تعاقب کیا اور حاکم دردستان کو لکھا کہ پانڈو چک کو تلاش کرکے ما بدولت کے پاس بھیجدو۔ ورنہ اس کے ساتھ اپنی تباہی کے لئے بھی تیار رہو۔ حاکم دردستان کی حقیقت وحیثیت ہی کیا تھی۔ کہ وہ مقابلہ یا انکار کرتا۔ اس نے فوراً تعمیل کی۔ حاکم دردستان کے آدمی پانڈو چک کو گرفتار کرکے سری نگر لائے۔ جہاں بادشاہ نے اس کو قتل کرکے ملک کو اس کے فتنہ وشر سے نجات دلائی۔

شریور پنڈت نے بھی زینہ راج ترنگنی میں فرقہ چک کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ بادشاہ جانتا تھا کہ علاقہ کمراج کے چک مفسد اور لٹیرے ہیں۔ اور ملک کے اوباشوں کو اپنے ساتھ ملاکر لوٹ مار کا بازار گرم رکھتے تھے۔ اس لئے اس نے دودھ بھائیوں کے بعد سب سے پہلے انہی کی طرف توجہ کی۔ ان میں جو سب سے زیادہ شرارتی عنصر تھا اس کا قلع قمع کیا اس کے بعد اس کے ساتھیوں کی جایدادیں اور اراضیات ضبط کرلیں۔ لیکن اس علاقے سے نکال کر ایک اور علاقہ بنام مداداؔ میں ان کے گزارے کا انتظام کردیا

لہ مداداسے مطلب مدد یا مراز یعنی جنوبی کشمیر ہے۔ اسے مدد راج بھی کہتے ہیں۔

بادشاہ کاشغر سے بڈشاہ بادشاہ کشمیر کی جنگ

تبت[1] کلاں جس کو لداخ کہتے ہیں۔ اور تبت خورد جس کو سکردو کہتے ہیں۔ سلاطین کشمیر کی مملکت میں شامل تھے۔ لیکن سلطان علی شاہ کے زمانے میں سلطان کاشغر[2] نے ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور جب دونوں بھائی یعنی علیشاہ اور بڈشاہ آپس میں لڑ رہے تھے۔ وہ ہر دو تبت پر قبضہ کرنے کے بعد کشمیر میں بھی حملے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

---

[1] تبت کلاں ولداخ سطح سمندر سے ½ ۱۱ ہزار فٹ اور سکردو ۷۴۰۰ فٹ بلند ہے۔ یہاں کے باشندے بدھ اور تبتی اور مسلمان ہیں۔ لیکن ڈوگرہ حکومت کے بعد سے اب وہاں سکھ اور ہندو اور مسلمان پنجابی اور کشمیری بھی آباد ہو گئے ہیں۔ مسلمان سب سنی تھے مگر بڈشاہ کی وفات کے ۲۲ سال بعد ۹۰۰ھ میں میر شمس عراقی نے وہاں شیعہ عقائد کی تبلیغ کی اس کے بعد نوربخشی فرقہ میں بھی اکثر لوگ داخل ہو گئے۔ یہاں بعض جاگیردار راجے بھی ہیں۔ جو شیعہ مسلمان ہیں اور اپنے آپ کو سلطان سکندر کاشغری کی اولاد بتاتے ہیں اس کے لئے دیکھو ہماری تاریخ بلتستان زیر طبع۔

[2] کاشغر مشرقی ترکستان یا چینی ترکستان کا ایک مشہور شہر ہے۔ چینی ترکستان کو چینی زبان میں صوبہ سنکیانگ کہتے ہیں۔ اس صوبہ میں جس کی آبادی ۳۴ لاکھ ساٹھ ہزار ہے تین چوتھائی مسلمان آباد ہیں۔ جو تاجیک ترکمان اور ازبک قوموں پر مشتمل ہیں۔ زمانہ قدیم میں کاشغر پر اسلامی حکومت تھی۔ بلکہ تمام چینی ترکستان مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ اور ہر چند کہ یہ عرصہ سے چین کے ماتحت ہے۔ لیکن یہ صوبہ ہمیشہ شورشوں کا مرکز رہا ہے۔ اور کاشغر جس کی آبادی اسی ہزار سے بھی زیادہ ہے اس صوبہ کا سیاسی صدر مقام جانا آتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں یہاں مسلمان آئے۔ قتیبہ بن مسلم باہلی پہلا مسلمان جرنیل تھا جس نے کاشغر کو فتح کر کے ترکستان میں اسلامی حکومت کی بنا رکھی۔

چینی ترکستان میں جو شورشیں ہوتی رہی ہیں ان میں سب سے اہم شورش (بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۱ پر)

بادشاہ فرقہ کوچکاں اور فرقہ چک کے فسادات مٹا کر اب ان ممالک کی طرف متوجہ ہوا جو اس کے بھائی کے زمانے میں باہمی خانہ جنگیوں کی وجہ سے اس کے خاندان کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ اس کو تبت کے نکل جانے ہی کا صدمہ کچھ کم نہ تھا کہ بادشاہ کاشغر کے حملہ کشمیر کی خبروں نے اسے اور بھی برآشفتہ کر دیا۔

بادشاہ کی دلآویز شخصیت اس کے افسروں بلکہ اس کی تمام رعایا پر مقناطیسی اثر رکھتی تھی۔ اور اس کی رعایا کا ہر فرد اس کے ہر دشمن کا مقابلہ کرنے اور ناموس وطن کی خاطر خاک و خون میں لوٹنے کے لئے ہر وقت مستعد رہتا تھا۔ اس نے امرائے مملکت اور سرداران لشکر محمد ماگرے۔ ملک مسعود ٹھاکر۔ یلھت رینہ۔ احمد رینہ۔ ادتر رینہ[1] وغیرہ کو جمع کیا۔ اور ان "ترک تازاں و رستم نشان" کے مشورے سے نہ صرف کشمیر کو دشمن کے حملوں سے بچانے بلکہ تبت کو واپس لینے کی تیاریاں کیں

---

[1] حیدر ملک چاڈورہ مشہور مورخ کشمیر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ کہ ادتر رینہ جو بدشاہی فوج کے اس معرکہ میں سر لشکر تھے۔ میرے جد بزرگوار تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۰) یعقوب بیگ کی بغاوت تھی۔ جو انیسویں صدی کے اخیر میں ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں حاجی نیاز نے صوبہ سن کیانگ میں از سر نو اسلامی حکومت قائم کر لی تھی۔ لیکن حکومت چین نے اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب وہاں حکومت تو چین کی ہے۔ لیکن اثر روس کا ہے۔

کشمیر میں جن ترکستانی صوفیا و سادات نے ابتدا میں اسلام پھیلایا ہے۔ وہ کاشغر اور یارقند سے ہو کر گلگت کی راہ سے کشمیر پہنچتے رہے ہیں۔ یارقند کاشغر سے قریباً ایک سو میل جنوب مشرق کی طرف دریائے زرفشاں کے کنارے آباد ہے۔

ساعت سعید میں افواج نوشہرہ کی چھاؤنی سے باہر نکلیں۔ اور پہلی منزل لار میں ہوئی یہاں بادشاہ نے فوج کا جائزہ لیا جس کی تعداد مختلف مورخین نے مختلف بتائی ہے۔ صاحب "اسلامک کلچر ان کشمیر" لکھتے ہیں۔ ایک لاکھ پیادہ اور تیس ہزار سوار تھے۔ تاریخ ملا بہاء الدین۔ گلزار کشمیر۔ اور تاریخ حسن میں پیادہ فوج کی تعداد تو ایک لاکھ ہی ہے۔ مگر رسالہ کی تعداد بیس ہزار درج ہے مکمل تاریخ کشمیر میں سواروں کی تعداد پچاس ہزار بتائی گئی ہے۔ پیادہ فوج کی تعداد میں سب متفق ہیں۔ فتحیات کبرویہؔ میں لکھا ہے۔ "سلطان عساکر خود را در پرگنہ لار جمع نمودہ یک لک پیادہ و بست و پنج ہزار بقلم آمد"

بادشاہ کاشغر کی شکست

والئی کاشغر کو جب شکست ہوئی۔ تو اس نے جمعیت کثیر کشمیری افواج کے مقابلہ کے لئے بھجوائی۔ علاقہ تبت میں ایک موضع شیہ زئی ہے سو وہاں افواج آمنے سامنے ہوگئیں۔ محاربہ عظیم نے خون کی ندیاں بہا دیں۔ دونوں طرف کے سپاہیوں اور سرداروں نے داد مردانگی دی۔ بقول صاحب فتحیات کبرویہ۔ "آخر الامر بتائید الٰہی ہزیمت بہ کاشغریاں لاحق شدہ رو بہ فرار آوردند سلطان بہ فتح و ظفر و زی دار الامان کشمیر مراجعت نمود" بادشاہ اس لڑائی میں ایک کاشغری شہزادے کو بطور یرغمال ہمراہ لایا تھا جس کا ذکر طبقہ شعراء میں درج ہے۔

کاشمیری افواج کے حملے پنجاب اور حدود دہلی پر

شہاب الدین کے بعد کشمیر کے جو بادشاہ ہوئے۔ ان کی توجہ آباؤ اجداد کے مفتوحہ ممالک کی طرف کم ہوتی گئی۔ اور تغلق بادشاہوں اور تیموری حملہ آور اس کے بعد

ؔ یہ کتاب قلمی ہے اور غیر مطبوعہ ہے جہانگیر کے زمانہ میں تصنیف ہوئی ہے ورق ؔ پر تذکرہ صدر الفاظ ہیں۔

خضر خاں کے جانشینوں کی کمزوری و غفلت سے دہلی کے کئی صوبے خودمختار ہو گئے۔ اور پنجاب میں ہر چند کسی نے باقاعدہ سلطنت قائم نہ کی۔ تاہم گکھڑوں نے جن کے سرگروہ شیخا گکھڑ اور جسرت گکھڑ دو بھائی تھے۔ ہمیشہ اس کو فتنہ و فساد اور بدامنی و بے چینی کا گھر بنائے رکھا۔ یہاں تک کہ شمالی پنجاب سلاطین دہلی کے ہاتھ سے بالکل نکل گیا۔ بلکہ ایک وقت ایسا آیا۔ کہ بڈشاہ کو شہزادگی کے زمانے میں بھائی کی مراجعت پر جسرت گکھڑ کے پاس پناہ لینی پڑی۔ اور اپنی منتشر فوج کے ساتھ جب تک جسرت کی امداد اس نے شامل نہ کی۔ وہ تخت پر قابض نہ ہو سکا۔

جسرت کا بھائی شیخا گکھڑ تیمور کا مقابلہ کرتے ہوئے تیمور کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔ اب جسرت کو بادشاہ بننے کی بڑی تمنا تھی۔ لیکن لوٹ مار اور حرب و ضرب کے سوا چونکہ آئین ملکداری سے وہ بالکل نابلد تھا۔ اور کچھ تقدیر بھی ساتھ نہ دیتی تھی۔ اس لئے کئی مرتبہ کامیاب ہونے کے باوجود بھی اسے استقلال و اطمینان حاصل نہ ہو سکا۔

آخر اس نے اپنے قدیم رفیق شاہی خاں سے جو اب سلطان زین العابدین کے نام سے کشمیر میں جاہ و جلال کے ساتھ داد حکمرانی دے رہا تھا۔ اپنے احسانات کے بھروسہ پر امداد طلب کی۔ اس امداد کا ذکر چند دیگر مورخوں کے علاوہ صاحب طبقات اور صاحب تاریخ فرشتہ دونوں نے کیا ہے۔ صاحب طبقات لکھتے ہیں "جسرت کھوکھر (گکھڑ) بہ قوت سلطان اگرچہ نتوانست تسخیر دہلی نمود۔ اما تمام پنجاب را در تصرف آورد۔"

فرشتہ لکھتا ہے۔ سلطان نے دہلی و پنجاب کی تسخیر کے لئے افواج کثیر جسرت کے ہمراہ کی۔ اگرچہ جسرت بادشاہ دہلی کی برابری نہ کر سکتا تھا۔ لیکن

(کشمیری لشکر) کی قوت و اعانت سے اس نے پنجاب و ملحقات پر قبضہ کر لیا اس کے بعد تاریخ ہند جلد چہارم مؤلفہ مولوی ذکاء اللہ مرحوم میں بھی ان الفاظ کی تائید کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں جس زمانہ میں جسرت نے کشمیری افواج کی امداد سے پنجاب پر قبضہ کیا ہے۔ اس زمانہ میں دہلی کا بادشاہ بہلول لودھی تھا۔ صاحب سیر المتاخرین بھی جلد اول میں لکھتے ہیں سلطان زین العابدین نے جسرت کو ایک لشکر جرار فتح پنجاب کے لئے دیا۔ جہاں اس نے کشمیری فوج کی مدد سے خوب دست برد کی۔ اور گو دہلی کے بادشاہ پر فتح نہ پا سکا مگر پنجاب پر اس نے قبضہ کر لیا۔

ان تاریخوں کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ جسرت کشمیری فوج کی مدد سے تسخیر پنجاب ہی کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔ بلکہ وہ دہلی پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ واقعہ کب پیش آیا۔ اس کے متعلق سب تاریخیں خاموش ہیں لیکن جسرت کے حالات و واقعات پر غائر نظر ڈالنے سے یہ معمہ بھی حل ہو سکتا ہے ۸۲۶ھ یا ۸۲۷ھ میں جسرت رائے بھیم والیٔ جموں کو شکست دیتا ہے۔ اس کے بعد ۸۳۱ھ میں پھر جسرت کے حملۂ لاہور و جالندھر کی خبر ملتی ہے ۸۳۵ھ میں وہ پھر کہیں سے سر نکال کر جہلم۔ راوی اور بیاس کو عبور کر کے جالندھر جاتا اور ملک سکندر تحفہ حاکم لاہور کا گھوڑا گرفتار کر کے اور بیشمار مال و اسباب لوٹ کر لاہور آتا ہے لیکن دو چار مہینوں کے بعد ہی بادشاہ مبارک شاہ بن خضر خاں کے خوف سے وہ پھر کوہستان میں بھاگ جاتا ہے ۸۳۶ھ میں پھر اس کے حملۂ لاہور کی خبر ملتی ہے۔ اس زمانہ میں ملک الہ داد لودہی یہاں کا ناظم اس کو شکست دے کر لاہور و جالندھر پر قابض ہو جاتا ہے۔ ۹ رجب ۸۳۷ھ کو مبارک شاہ کے قتل ہو جانے پر سلطان محمد شاہ

اس کا جانشین ہوتا ہے۔ جو کئی سال کی خاموشی کے بعد ۸۴۰ھ میں جسرت کو لاہور سے باہر نکالتا ہے۔ اور ۸۴۵ھ میں ملک بہلول لودھی کو خان خاناں کا خطاب دیکر لاہور و دیپالپور کا حاکم بنا دیتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ جسرت کا قلع قمع کر دیا جائے۔ اس کے بعد صفحۂ تاریخ میں جسرت اور لاہور کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔

متذکرہ واقعات سے پایا جاتا ہے کہ ۸۲۶ھ (۱۴۲۳ء) سے ۸۴۰ھ (۱۴۳۶ء) تک جسرت لاہور پر امن وامان سے قابض رہا۔ اس کے تمام حملوں میں صرف ہی تین چار سال اس کو اطمینان کے ساتھ لاہور میں رہنا نصیب ہوا۔ ورنہ کبھی دو ماہ کبھی چار ماہ وہ لاہور پر قابض رہا۔ اور کئی دفعہ تو اسے ناکام ہی جانا پڑا۔ اس لئے یہ بات قرین قیاس ہی معلوم ہوتی ہے۔ کہ ۸۳۶ھ ہی میں بڈشاہ نے اس کو فوج اور خزانہ اور جملہ لوازمات جنگ سے مدد دی۔

زونراج بھی زینہ ترنگنی میں بڈشاہ اور جسرت گکھڑ کے دوستانہ تعلقات کو تسلیم کرتا ہے۔ لکھتا ہے۔ بادشاہ کا گکھڑوں کے سردار کے ساتھ کافی اتحاد تھا۔ ایک مرتبہ جسرت نے جب بادشاہ دہلی کے حملوں سے تنگ آکر کشمیر میں پناہ لی۔ تو بادشاہ اس کے ساتھ ایک شفیق دوست کی طرح پیش آیا۔

بادشاہ کشمیر کی وسعت سلطنت

زین العابدین کے حالات جب آیندہ صفحوں میں پڑھو گے۔ تو معلوم ہوگا کہ وہ صرف بادشاہ ہی نہ تھا کہ ہر وقت داد عیش دیا کرتا یا ہر وقت اپنا جاہ وجلال دکھایا کرتا۔ بلکہ کبھی وہ ایک ناصح اور واعظ بنکر بداخلاقی اور شراب نوشی کی برائیاں بیان کرتا ہے۔ کبھی وہ اپنی اور اپنے خاندان کی نیک نام شہرت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے فرزندوں کو دنیا کے نشیب و

فراز سے آگاہ کرتا ہے۔ کہیں وہ اپنے کسی فرزند کی بے اعتدالی پر اس شخص سے معافی مانگنے کے لئے اس کے گھر برہنہ پا جاتا ہے۔ جس کے ساتھ شہزادہ بداخلاقی سے پیش آتا ہے۔ کہیں وہ اپنی حملہ آور فوج کو رعایا کا مال چھیننے اور زراعت کو ان کی دست برد سے بچانے کے احکام جاری کرتا ہے۔ کہیں وہ رعایا کی تکالیف اور ان کے حقیقی مطالبات سے آگاہ ہونے اور ظالم اور راشی حکام کے طرز عمل سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے جاسوس مقرر کرتا ہے۔ ایک طرف وہ ایک زمیندار کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو زراعت و کاشت کو ترقی دینے کی تدابیر میں سرگرم رہتا ہے۔ دوسری طرف وہ ایک انجینیر نظر آتا ہے۔ جو نئی نئی عمارتیں تیار کراتا اور خشک علاقوں کی آبپاشی کے لئے نہریں کھدواتا ہے کبھی وہ ایک باغبان ہے۔ جو باغوں کی تیاریوں اور انواع و اقسام کے ثمردار و بے ثمر مگر سایہ دار درختوں کی آبیاریوں میں محو رہتا ہے۔ کبھی اس کو بنجر اور غیر آباد علاقوں میں نئی بستیاں بساتے اور نئے گاؤں آباد کرتے دیکھا جاتا ہے۔ کہیں وہ صلحاء و علماء کے ساتھ علمی مناظروں میں حصہ لیتا نظر آتا ہے۔ اور کہیں صاحب دل ہندو مسلمان بزرگوں کی خدمت میں ہم اسے کمربستہ پاتے ہیں۔ جس بادشاہ کے اس قسم کے خصائل ہوں جس کو اپنے ملک کی آبادی و شادابی کی تجاویز ہی سے فرصت نہ ملتی ہو وہ شجاعانہ اور فاتحانہ اوصاف رکھنے کے باوجود صرف ملک گیری کی ہوس کو پورا کرنے کے لئے اپنے وطن کو قتال و جدال میں کس طرح مبتلا کرا سکتا ہے؟

بایں ہمہ ہر دو تبت پر اس کا قبضہ تھا اور کاشغر کی سلطنت بھی جو گلگت سے قریباً ایک ماہ کی مسافت پر واقع ہے۔ اس کے زیر اثر تھی

زینہ ترنگنی اور زینہ راج ترنگنی اور اس کے بعد ابوالفضل کی آئین اکبری اور طبقات اکبری[1] اور تاریخ فرشتہ کی تحریروں کے مطابق سندھ بھی اس کے زیر اقتدار تھا۔ بلکہ اس کا بھانجا جو وہاں ہی قتل ہو گیا تھا اس کی طرف سے وہاں کسی علاقے کا ناظم تھا۔ پکھلی کا وسیع علاقہ جس کا نام اس زمانے میں ضلع ہزارہ ہے۔ اور جس کی حدود ایک طرف ضلع مظفر آباد کے ساتھ ملتی ہیں۔ دوسری طرف ضلع اٹک کے ساتھ وہ بھی اس کے ماتحت تھا۔ اس کے علاوہ اور کئی سرحدی ریاستیں سوات وغیرہ اور کئی سرحدی مقامات میں جو آج یاغستانی یا آزاد علاقے کہلاتے ہیں۔ اس کا رعب و داب قائم تھا۔

لارنس صاحب نے بھی اپنی تصنیف ویلی آف کشمیر میں تسلیم کیا ہے۔ کہ بڈشاہ کی حکومت کشمیر میں تو تھی ہی۔ مگر پنجاب سے پشاور و سرہند تک بھی اس کا قبضہ تھا۔ کشمیر کی تاریخیں بھی سرہند تک اس کی وسعت مملکت کا پتہ دیتی ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ تو صحیح ہے۔ کہ بڈشاہی مقبوضات یا زیر قیادت علاقے کشمیر سے باہر شمال کی طرف پکھلی تک پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن سرہند سے مراد اگر وہ سرہند ہے۔ جو اس وقت ریاست پٹیالہ میں واقع ہے۔ جہاں حضرت مجدد الف ثانی کی زیارت مرجع خلائق ہے۔ تو اس میں مورخوں نے جو غلطی کی ہے۔ اس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

جس سرہند پر بڈشاہی اقتدار کا حوالہ دیا گیا ہے۔ وہ لفظ صحیح طور پر سرہند نہیں۔ بلکہ اُنڈ یا ہنڈ ہے۔ اور یہ وہی مقام ہے جس کا قدیم نام اوہانڈپور تھا۔ یہ قصبہ آج بھی صوبہ سرحد میں موجود ہے۔ اور اس کے آثار اس کی قدامت کا

---

[1] چنانچہ صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں۔ "تمام ولایت کہ برکنار آب سندھ واقعہ است در تصرف سلطان در آمد"

پتہ دے رہے ہیں۔ بڈشاہ کی ماں اسی ادبانڈ پور کی شہزادی تھی۔ تفصیلات کے لئے دیکھو ضمیمہ ۔

پونچھ راجوری اور جموں کے علاقے بسب اس کے مقبوضات میں شامل تھے زونراج لکھتا ہے۔ بادشاہ نے فوج میں اس قسم کی سپرٹ پیدا کر رکھی تھی ۔ اور نظام سلطنت اس ترکیب سے قائم کیا تھا ۔ کہ بیرونی حملہ آوروں کے لئے کشمیر میں داخل ہونا مشکل ہو گیا تھا ۔

جب بادشاہ اپنے بھائی علی شاہ کو گرفتار اور نظر بند کر کے کسی کھٹکے کے بغیر کشمیر میں حکومت کرنے لگا ۔ تو علی شاہ کے معاون راجور و جموں اپنے اعمال و کردار کی وجہ سے اس کے آگے سر بسجود ہوئے ۔ تاریخ راجگان راجور میں راجۂ راجوری کی معافی کے متعلق لکھا ہے " چند روز بعد راجۂ راجور نے سلطان سے معافی چاہی ۔ چونکہ سلطان رحیم الطبع عالی حوصلہ اور بلند خیال تھا ۔ اس نے معافی دیدی اور ریاست او سلطنت میں ویسے ہی روابط ہو گئے ۔ جیسے کہ پہلے تھے ۔ راجہ جموں کو بھی اپنی حرکت پر نادم ہوتے اور معافی مانگنے کے بغیر کوئی چارہ نظر نہ آیا ۔ معافی بھی ملی اور جموں کی حکومت بھی ۔

سالکان رہِ ہمت چو ارادت بینند ملک کاؤس و فریدوں بہ گدائے بخشند

پانڈو چک ۔ نے اس کو کیسی کیسی تکلیفیں دیں ۔ اس کی عالیشان و سر بفلک عمارات کو نذر آتش کر کے خاک میں ملا دیا ۔ بادشاہ نے تنگ آکر گو پانڈو چک کو اس کی بد اعمالیوں کی سزا دیدی مگر اس کے بیٹے حسین چک کو نوازشات شاہی کا مورد بنا دیا ۔ اور رفتہ رفتہ چکوں نے وہ زور و اقتدار حاصل کیا ۔ کہ بڈشاہ کی وفات کے ۹۰ سال کے بعد ہی وہ کشمیر کے بادشاہ ہو گئے ۔

مفتوحہ ممالک کے ساتھ بادشاہ کا سلوک

بادشاہ جس ملک پر فتح پاتا۔ اس کی حیثیت و طاقت سے زیادہ خراج مقرر نہ کرتا۔ اور نہ اس سے نذرانہ اس قدر زیادہ طلب کرتا۔ کہ اس کو اپنی رعایا پر ظلم کر کے روپیہ فراہم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ اور اپنے باپ سلطان سکندر اور امیر تیمور کا واقعہ ہمیشہ یاد رکھتا جبکہ تیموری امراء نے اس کے باپ کو تیس ہزار گھوڑوں اور ایک لاکھ اشرفی کے نذرانے کا پیغام بھیجا تھا۔

چھٹا باب

بادشاہ کی اولاد اور دیگر رشتہ دار

بادشاہ کی بیہقی بیگم

بادشاہ کی سب سے بڑی اور سب سے پہلی بیگم بیہقی بیگم کے نام سے موسوم تھی۔ جو سید میر حسن منطقی بیہقی کے باپ سید نور الدین کی بہن اور سید تاج الدین کی دختر بلند اختر تھی۔ اس بیگم کا نام کوئی بی بی خاتون بتاتا ہے۔ کوئی تاج خاتون اور کوئی مخدومہ خاتون۔ کوئی صرف بیہقی بیگم کہتا ہے۔ مگر یہ بیگم چونکہ اپنے خاندانی قبرستان میں جو مزار کلاں کے اندر قبرستان سادات بیہقی یا سید داری کے نام سے موسوم ہے دفن ہے۔ اس لئے عام طور پر اس کو بیہقی بیگم ہی کہتے ہیں۔ اور

لہ آپ کا سلسلہ نسب چار واسطوں سے سید جلال الدین بخاری سے ملتا ہے۔
نفحات کبرویہ قلمی صفحہ ۳۱۲

جس قبر پر مخدومہ خاتون کا نام ہے۔ وہی قبر اس بیگم کی بتائی جاتی ہے۔
بیہقی بیگم اولاد نرینہ سے محروم تھی۔ لیکن اس نے بادشاہ کے مرشد سید حسن منطقی کے فرزند سید محمد امین اویسی کو جو اس کے اپنے ہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا لے پالک بیٹا بنا رکھا تھا۔ اور اس کو اپنے حقیقی بچوں کی طرح پالا تھا۔ مگر قدرت چونکہ اس بچے سے دنیائے تصوف کو آباد کرنا چاہتی تھی۔ اس نے بہت سی کوششوں کے باوجود اس ہونہار اور زیرک مگر صوفی منش بچے نے امور سلطنت کی طرف مطلق توجہ نہ کی
۸۸۰ھ میں بیگم نے اپنا اور شیخ بہاء الدین گنج بخش کا مزار تعمیر کرایا۔ ۸۸۹ھ میں شیخ بہاء الدین اپنی دردناک شہادت کے بعد اس مزار میں دفن ہوئے۔ اور آپ ہی کے مزار کی وجہ سے اس قبرستان کا وسیع احاطہ مزار کلاں[۱] کہلانے لگا۔ سانحہ شہادت کے ۱۹ سال بعد ۹۰۸ھ میں بیگم بھی انتقال کر گئی۔
شریور پنڈت زینہ راج ترنگنی میں بادشاہ کے آخری مصائب و تفکرات کے سلسلہ میں اس بیگم کی وفات کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔
انہی ایام میں بادشاہ کی پیاری ملکہ جس کا نام ودلع[۲] خاتون تھا۔ اور جو بیہقی سادات کے خاندان سے تھی۔ انتقال کر گئی۔ بادشاہ کو اس کی موت سے

---

[۱] دیکھو ضمیمہ ۶۔ [۲] شریور نے بیہقی بیگم کا نام وداع خاتون لکھا ہے۔ وداع تو الوداع اور رخصت کو کہتے ہیں۔ اس لئے ودلع یا وداہ ضرور کوئی بگڑا ہوا نام ہے۔ جیسا کہ زینہ ترنگنی اور زینہ راج ترنگنی میں اور بھی کئی ایسے نام آتے ہیں۔ جن کا تلفظ سنسکرت میں جا کر بدل جاتا ہے۔ اور پھر ترجمہ در ترجمہ ہوتے ہوتے کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔

بڑا صدمہ پہنچا۔

بیگم اس مزار کے احاطہ کلاں کے اندر اپنے خاندانی قبرستان میں جہاں سادات بھیقی کے اور افراد بھی دفن ہیں اپنی وصیت کے مطابق سپرد خاک کی گئی۔ بیگم بادشاہ کی رفیقہ ادل تھی۔ بادشاہ اس خیال سے کہ بیگم اولاد نرینہ سے محروم تھی ہمیشہ اس کی دلجوئی کرتا رہتا تھا۔ اور جب اس کی زندگی ہی میں وہ وفات پا گئی تھی تو ظاہر ہے۔ کہ کس دھوم دھام سے اس بیگم کا جہاں آج اس کا کوئی نام لیوا بھی نہیں ہے۔ جنازہ اٹھا ہو گا ؎

فسانہ میں نے پورا پڑھ لیا دنیائے فانی کا نظر افروز نکلی چاندنی گور غریباں کی

بیگم کی سنگین قبر کے تعویذ کے مشرقی و غربی گوشے جن پر ایک ایک شعر درج ہے۔ زمین دوز ہو چکے ہیں۔ زمین کھودنے کے بعد ان اشعار اور قبر کے فوٹو لئے گئے۔ اشعار حسب ذیل ہیں ؎

(شعر) طرف شرق ؎

وفات حضرت مخدومہ خاتون کہ سال ہشت صد ہفتاد بگذشت

(شعر) بجانب غرب ؎

شب (پڑھا نہیں گیا) ز ہفتم ماہ شوال ہفت و بیستم اعداد بگذشت

بادشاہ کی دوسری بیگمات

بھیقی بیگم نے ہر چند اپنے ایک خاندانی لڑکے محمد امین ادریس کو پال رکھا تھا اور بادشاہ بھی اس کے ساتھ بہت محبت کرتا تھا۔ لیکن شاہانہ تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے باوجود محمد امین چونکہ تصوف کی طرف زیادہ مائل تھا۔ امور مملکت سے بالکل دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ اس لئے بادشاہ نے اولاد نرینہ کے لئے ایک اور شادی کا انتظام کیا۔

زونراج اس موقعہ پر لکھتا ہے۔ کہ راجہ دشرت کی طرح بادشاہ کو بھی خدا نے چار بیٹے دیئے تھے۔ جو راجہ مدر[1] یعنی (مدردیش کے راجہ) کی دو بیٹیوں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے

کوئی مسلمان بادشاہ دو حقیقی بہنوں کو بیک وقت اپنے عقد میں نہیں رکھ سکتا۔ البتہ دونوں بہنوں کا عقد اس طرح ثابت ہو سکتا ہے۔ کہ ایک کے مرنے کے بعد دوسری سے نکاح کر لیا جائے۔ اور یقیناً راجہ مدردیش کی یہ دونوں بیٹیاں اسی طریق سے بادشاہ کے عقد میں آئی ہونگی۔

بادشاہ کی اولاد

بادشاہ کے چار بیٹے تھے۔ اور جیسا کہ زونراج نے لکھا ہے وہ راجہ مدردیش کی دونوں بیٹیوں کے بطن سے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بادشاہ کی یہ دونوں بیگمات صاحب اولاد تھیں۔ گو زونراج نے واضح طور پر یہ نہیں بتایا۔ کہ اس کا کونسا فرزند کس بیگم یا رانی کے بطن سے تھا۔ اس کے سب سے بڑے بیٹے کا نام ادہم خان تھا۔ اس سے چھوٹے کا نام حاجی خان تھا۔ جو بادشاہ ہو کر سلطان حیدر شاہ کہلایا۔ تیسرے کا نام جسرت خان تھا معلوم ہوتا ہے۔ اس نے یہ نام اپنے دوست جسرت گکھڑ کے نام پر رکھا تھا

---

[1] مدردیش کے مفصل حالات کے لئے دیکھو صفحہ ۳

King of Kashmir Page 86 Vol III

Like Dasharatha the King had four sons given unto him and thay were the dilight the peaple, and were born of the two daughters of the King of madra.

چوتھے کا نام بہرام خان تھا۔

ان لڑکوں نے جوان ہوکر اپنی بے اعتدالیوں خانہ جنگیوں اور باہمی منافقتوں سے ایسے اولوالعزم سلطان اور نیک دل بادشاہ کی زندگی مرتے دم تک تلخ رکھی۔

مسلمان مؤرخوں نے بادشاہ کے صرف تین فرزندوں ہی کا ذکر کیا ہے جسرت خاں کا نام صرف زونراج نے لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ یہ شہزادہ چھوٹی عمر ہی میں انتقال کر گیا ہوگا۔ اس کا نام سیاسیات کشمیر میں بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ مسلمان مورخوں نے بادشاہ کی کسی بیٹی کا بھی ذکر نہیں کیا۔ لیکن شری ور زینہ راج ترنگنی کے ترنگ چہارم اور شلوک ۳۰۵ سے ۳۱۲ تک ہیبت خاں کا ذکر کرتا ہوا لکھتا[۱] ہے۔ کہ وہ بادشاہ کی لڑکی کے بطن سے تھا اور بادشاہ کی وفات کے بعد قتل سادات (۸۸۹ھ) کے وقت سادات کا طرفدار رہکر مارا گیا تھا۔ اس کی تصدیق مزار کلاں کی اس قبر سے بھی ہوتی ہے۔ جو سادات بیہقی کے احاطہ میں واقع ہے۔ اور جس کے تعویذ پر لکھا ہوا ہے "ہیبت خان قرلغ نبیرہ سلطان علاؤالدین قرلغ پکھلی نواسہ سلطان زین العابدین مغفور"

شری ور کی زینہ راج ترنگنی سے صرف یہی معلوم نہیں ہوتا کہ شہزادہ ہیبت خاں ہی اس کی لڑکی کے بطن سے تھا۔ اور اس نے سلطان پکھلی ہی کو اپنی لڑکی دی

[۱] قرلغ کسی فرقے یا کسی قوم کا نام ہے کشیر کے مسلمان مورخوں نے نہ تو سلطان زین العابدین کی کسی بیٹی کا ذکر کیا اور نہ اس کے کسی نواسہ کا اس لئے ان کے ہاں تو قرلغ کا لفظ ہی نہیں ہے شری ور نے بھی صرف اسی قدر لکھا ہے کہ ہیبت خاں بادشاہ کی لڑکی کے بطن سے تھا الخ۔ ہیبت خاں کی قبر پر اس کے نام کے ساتھ قرلغ کا لفظ درج ہے تزک جہانگیری میں جہانگیر نے پکھلی کا ذکر کرتے ہوئے تھوڑی سی روشنی اس لفظ پر ڈالی ہے دیکھو تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم ص ۲۶۰ تا ۲۶۱

تھی۔ ملکہ زنیہ راج ترنگنی کے ترنگ سویم صفحہ ۲۲۲ میں سادات بیہقی ذکر کے دوران میں یہ بھی لکھا ہے کہ بادشاہ نے سید ناصر اور اس کے اقربا کو اس لحاظ سے کہ وہ پیغمبر (صلعم) کی اولاد سے تھے۔ اور قابل اور عزت کے مستحق تھے۔ اپنے دربار میں نہ صرف اعلیٰ مراتب عطا کئے اور جاگیریں عطا کیں۔ بلکہ اپنی لڑکیاں دے کر ان کی مزید عزت افزائی کی۔

سادات بیہقی میں سے سید ناصر کا بیٹا سید حسن بڈشاہ کا داماد تھا۔ بادشاہ کی اس لڑکی سے سید حسن کے ہاں دو اولادیں ہوئیں۔ ایک حیات خاتون جو سلطان حسن شاہ یعنی بادشاہ کے پوتے کی بیگم بنی۔ دوسری اولاد ایک نواسہ تھا۔ جس کا نام سید میر محمد تھا۔ گویا ہیبت خاں قرلغ اور سید میر محمد خالہ زاد بھائی تھے۔ اور دونوں بادشاہ کے نواسے تھے۔ اس کا ثبوت بھی زنیہ راج ترنگنی کے ترنگ سویم صفحہ $\frac{۲۵۳}{۲۵۴}$ سے سلطان حسن شاہ کے تذکرہ میں ملتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے جہانگیر ماگرے نے خلوت میں موقع پا کر سادات کے ظلم و تشدد کے متعلق حسن شاہ سے کہا "سادات کو قبل ازیں جلا وطن کر کے ملک کو ان کے مظالم سے نجات دی گئی تھی۔ مگر آپ نے ان کو جو ہماری شامت اعمال کا نتیجہ ہیں معافیاں دلا کر اور واپس بلا کر دوبارہ اس پُر امن ملک میں ہمارے سروں پر نازل کیا۔ اب جس طرح بڈشاہ کے پوتے کی حیثیت سے سلطنت پر آپ کا حق ہے۔ اسی طرح بادشاہ مغفور کے نواسے کی حیثیت سے سید میر محمد بھی اس ملک پر اپنا حق جتا رہا ہے۔"

زنیہ راج ترنگنی سے بھی یہ امر واضح طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ دونوں لڑکیاں بیہقی بیگم ہی کے بطن سے تھیں۔ یا ان میں سے کوئی راجہ مدر دیش کی لڑکی کے بطن سے بھی تھی۔ مگر اس خیال سے کہ سٹر لور نے

مدر دیش کی راجکماریوں کے بطن سے صرف چار لڑکوں ہی کا ذکر کیا ہے ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ بادشاہ کی دونوں لڑکیاں بیہقی بیگم کے بطن سے تھیں ۔ چونکہ وہ خود سادات خاندان سے تھی ۔ اس لئے اس نے ایک لڑکی اپنے بھتیجے سید ناصر کے بیٹے سید حسن کے ساتھ بادشاہ کو کہکر بیاہ دی ۔ اور دوسری لڑکی سلطان پکھلی کے ہاں جو غیر سید تھا ۔ ملکی مصلحتوں کی وجہ سے یا کسی اور بنا پر بیاہی گئی ۔

چونکہ بادشاہ کی ان تین بیگیات کے علاوہ اور کوئی بیگم نہ تھی ۔ ان میں سے دو کے ہاں چار فرزند تھے ۔ اور بیٹی کوئی نہ تھی ۔ کم از کم اس کے ہمعصر اور درباری مورخ نے ان راج کماریاں کے بطن سے اس کی کسی بیٹی کا ذکر نہیں کیا ۔ اس لئے لامحالہ بادشاہ کی دونوں بیٹیاں بیہقی بیگم ہی کے بطن سے تھیں ۔ جو اولاد نرینہ سے تو محروم تھی ۔ لیکن صاحب اولاد ضرور تھی

بادشاہ کے بھائی کی وفات

بادشاہ کو اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ محمد خاں سے کمال محبت تھی ۔ اس نے آغاز سلطنت ہی سے محمد خاں کو وکیل مطلق بنا رکھا تھا ۔ محمد خاں نے بھی پوری متابعت سے کام لیا ۔ جب بادشاہ تبت کی مہم پر گیا ۔ تو محمد خاں نے اندرون ملک میں کوئی خرابی نہ ہونے دی ۔ بلکہ ایسا انتظام کیا کہ بادشاہ نے واپس آکر اپنی دلی خوشنودی کا اظہار کیا ۔

لیکن ایسے فرمانبردار اور منتظم و مدبر و سعادت نشان بھائی کی موت نے اس کے دست و بازو کمزور کر دیئے ۔ بھائی کے مرنے کا اس نے بڑا غم کیا ۔ اور اس کے فرزند حیدر کو اس کا جانشین بنا کر اس کی دستار بندی کرائی اور بھائی کی جگہ مہمات ملکی کے تمام اختیارات اپنے بھتیجے کو سونپ دیئے ۔

زونراج نے زینہ ترنگنی میں شہزادہ محمد خاں کی موت کا جو سبب لکھا ہے اس کے متعلق دوسرے مورخین خاموش ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔ بادشاہ نے ایک شہزادے کو جلاوطن کر رکھا تھا۔ وہ کشمیر میں واپس آکر اپنے مصائب کا بدلہ اپنے دشمنوں سے لینا چاہتا تھا۔ لیکن اسے کوئی موقعہ نہ ملتا تھا۔ آخر وہ اس بہانے سے کشمیر میں داخل ہوا۔ کہ وہ کسی بادشاہ کا پیغام بادشاہ کشمیر کے نام لے کر آیا ہے۔ لیکن جب وہ کشمیر میں داخل ہوا۔ تو اس نے موقعہ پاکر شہزادہ محمد خان کو قتل کر دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ جلاوطن شہزادہ محمد خان کے ایسا سے ہی جلاوطن ہوا ہوگا۔ یا ممکن ہے۔ یہ وہی شہزادہ ہو جس کو سکندر بادشاہ کی بیگم شوبھا دیوی نے لے پالک بنا رکھا تھا۔ اور جو مدت سے کشمیر سے جلاوطن تھا۔ اس کے بعد زونراج خاموش ہے۔ اور نہیں معلوم ہوسکتا۔ کہ بادشاہ نے اپنے عزیز بھائی کے قاتل کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا۔ زونراج شہزادہ محمد خان کے اخلاق و عادات کی تعریف کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ وہ بہت اچھے کیریکٹر کا ٹھاکر رئیس یا جاگیردار تھا۔ زونراج نے اپنی تاریخ ۱۴۵۹ء تک لکھی ہے۔ اس کے بعد اس کا انتقال ہوجاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شہزادہ محمد خاں کی موت ۱۴۵۹ء سے پیشتر ہو چکی تھی۔

بادشاہ کا بھانجا

بادشاہ کے بھانجے کا نام قیام الدین تھا۔ بادشاہ کو بھائی کی طرح اس کے ساتھ بھی بڑی محبت تھی۔ بادشاہ نے اسے سندھو (سندھ) کے ملک میں کسی حصے کا حاکم و ناظم بناکر بھیجا تھا۔ وہاں وہ ایک جنگ میں ابراہیم کے ہاتھ سے مارا گیا۔ زونراج لکھتا ہے بادشاہ نے اس کی موت پر ایسا محسوس کیا کہ گویا اس کا دایاں بازو کٹ گیا ہے۔

بادشاہ کے دودھ بھائی

بادشاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی جب نگاہ دوربین سے چاروں طرف دیکھا تو اسے نظر آیا۔ کہ ملک میں فتنہ پردازوں کی ایک جماعت موجود ہے۔ جو اپنی ذاتی اغراض یعنی لوٹ مار کے لئے ملک میں شورش و سرکشی کے آثار پیدا کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے نہایت نرمی و ملائمت اور کمال حکمت و تدبر سے خون کا ایک قطرہ بہانے کے بغیر اس جماعت کے کئی سرکردہ لوگوں کو وظائف و جاگیر عطا کر کے یا تو اپنا فرمانبردار بنالیا یا حکمت عملیوں سے کام لے کران کو ذلیل و خوار اور کمزور و بے بجان کر دیا۔

لیکن فرقہ چکان ایسا عروج پا چکا تھا کہ اس کے بعض افراد جو کئی پشتوں سے سلاطین کے کوکہ یا رضاعی بھائی چلے آتے تھے۔ اور جو کشمیر میں دودھ بھائی کے نام سے مشہور تھے۔ سلطنت میں دخل انداز ہوتے تھے۔ اور اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے بعض اوقات بادشاہوں کے احکام کو بھی پس پشت ڈال دیتے تھے۔ زین العابدین ان کا تسلط و تغلب نائب السلطنت ہونے ہی کے زمانے سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اب جبکہ وہ بادشاہ ہو گیا۔ تو اس نے ان کا رعب و داب اور اثر و رسوخ کم کرنا شروع کر دیا۔

تاریخوں میں بادشاہ کے چار رضاعی بھائیوں کا ذکر ہے۔ دو کا ذکر تو جونراج نے زینہ ترنگنی میں کیا ہے۔ اور دو کا نام اس کے شاگرد شری ور نے اپنی تاریخ زینہ راج ترنگنی میں لکھا ہے۔ جونراج لکھتا ہے ایک کا نام مسعود اور ایک کا نام شیر تھا۔ لیکن یہ دونوں باہمی حسد و عداوت کی وجہ سے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اور ہرچند یہ بادشاہ کی عنایات سے مرفع الحال تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کو ذلیل و خوار دیکھنے کے ہمیشہ خواہشمند رہتے

تھے۔ بادشاہ نے ان کو بہت سمجھایا۔ اور مراعات چھین لینے کی دھمکی بھی دی اس خوف دلانے سے بادشاہ کی کوشش کچھ نہ کچھ کامیاب تو ہو گئی۔ اور انہوں نے باہمی مخالفت بظاہر ترک بھی کر دی۔ لیکن باطن دونوں کا صاف نہ ہو سکا۔

لیکن اس خدشہ کے مٹانے کا قدرت نے ایک اور سامان پیدا کر دیا۔ رات کا وقت تھا اور بادشاہ کا دربار لگا ہوا تھا۔ درباریوں میں ٹھاکر مسعود درجہ اختصاص رکھتا تھا۔ بادشاہ کے یہ دو دودھ بھائی بھی حاضر دربار تھے۔ باتوں باتوں میں کچھ ایسا سلسلہ چھڑا۔ کہ ان دونوں کی ٹھاکر مسعود سے تکرار ہو گئی۔ مسعود ٹھاکر بھرے دربار میں بادشاہ کی موجودگی میں اپنی بے عزتی نہ دیکھ سکا۔ اور دربار سے اٹھکر چلا آیا۔ اس وقت بدقسمتی سے نہ اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا۔ اور نہ ہی اس کا کوئی آدمی اس کے ساتھ تھا۔ شبیر بھی اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ درباریوں نے اور بادشاہ نے بھی یہ سمجھا۔ کہ اب یہ اس کو منانے اور واپس لینے کے لئے جا رہا ہے۔ لیکن اس ظالم نے رات کی تاریکی میں تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا سر قلم کر دیا۔ مسعود ٹھاکر کے بھائی کا نام ون ٹھاکر تھا۔ اس نے بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے لئے بادشاہ سے اجازت طلب کی۔ بادشاہ بھی اپنے دودھ بھائی کی اس حرکت پر رنجیدہ خاطر تھا۔ اس نے اجازت دیدی۔ اور ون ٹھاکر نے نہ صرف شبیر کو بلکہ اس کے ان ہمراہیوں کو بھی جو اس کے مقابلہ پر آئے قتل کر دیا۔

شرلوپر نے بادشاہ کے جن دودھ بھائیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے نام حسن اور حسین تھے۔ وہ لکھتا ہے۔ حبیب حاجی خاں نے ۱۲۵۲ء میں بادشاہ

سے بغاوت کی اور باپ بیٹے میں لڑائی چھڑی۔ تو بادشاہ کے رضاعی بھائی بادشاہ کی طرف سے شہزادے کے بالمقابل نبرد آزما تھے۔ ان دونوں کے مقابلے میں دو راجپوت جو نہایت خوبصورت اور وجیہہ جوان تھے۔ شہزادے کی طرف سے لڑ رہے تھے۔ ایک کا نام سورن[1] اور دوسرے کا نام سنہگیر[2] تھا۔ لیکن یہ دونوں خوبصورت نوجوان حسن اور حسین کے ہاتھوں سے قتل ہو گئے۔

لیکن بادشاہ کے آخری ایام میں اس کے حقیقی بیٹوں کی طرح اس کے دودھ بھائیوں نے بھی اس کی زندگی تلخ کر دی۔ چنانچہ شریور لکھتا ہے بادشاہ کے رضاعی بھائیوں نے جو بادشاہ کی عنایت سے ملک کے اعلیٰ عہدوں پر سرافراز تھے۔ اور جن سے بیوفائی کی توقع اسے خواب میں بھی نہ آ سکتی تھی۔ اس کی زندگی کے آخری لمحوں میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور اس کے باغی بیٹے حاجی خاں کے پاس پونچھ میں چلے گئے۔

ساتواں باب

بادشاہ کے فرزند حاجی خاں کی بغاوت اور باپ بیٹے کی جنگ

شہزادوں کی باہمی خانہ جنگیاں

اپنے فرزندوں کی باہمی خانہ جنگیوں اور عداوتوں کی وجہ سے بادشاہ کے

---

[1] Swarna [2] Suihanagar

آخری ایام بڑے تلخ گزرے۔ ادہم خاں سب سے بڑا تھا۔ اور اپنی خوبصورتی کی وجہ سے بادشاہ کو بہت عزیز تھا۔ لیکن اپنی شرارتوں اور شوخ چشمیوں سے ہمیشہ اس کی دل آزاری کا باعث بنا رہتا تھا۔ منجھلے بھائی حاجی خاں سے جس میں اکثر لڑکپن کی عادتیں پائی جاتی تھیں۔ اس کی سخت عداوت تھی۔ تیسرا بیٹا بہرام خاں بھی اپنے دونوں بھائیوں سے صاف نہ تھا۔ بادشاہ کے رضاعی بھائیوں نے جو شہزادوں کے اتالیق تھے۔ اپنے اغراض کی وجہ سے ایک کو دوسرے کا دشمن بنا رکھا تھا اور افسوس ہے کہ نہ وزرا اور نہ خود بادشاہ شہزادوں کی باہمی کشیدگی کو کسی طرح دور کر سکے۔ جب شہزادوں کے باہمی رشک و حسد نے ایک خوفناک اور تباہ کن صورت اختیار کر لی۔ تو ملک میں تین پارٹیاں تینوں شہزادوں کی اور ایک پارٹی بادشاہ کی ہو گئی۔ اور چاروں طرف بدامنی اور فتنہ و فساد کے آثار ظاہر ہونے لگے۔

شہزادہ ادہم خاں کی روانگی بجانب پونچھ

رفع شر کے لئے بادشاہ نے اپنے بڑے فرزند ادہم خاں کو پرنوتس دپونچھا کی طرف روانہ کر دیا اور کہا کہ اگر تم میرے احکام سے روگردانی کرو گے۔ تو تمہاری عزت و دولت اور زندگی سب خطرے میں ہے۔ شہزادے نے اپنے آدمیوں سے بہ حسرت رخصت طلب کی اور کہا مجھے بادشاہ نے جلاوطن کر کے پرنوتس دپونچھ) جانے کا حکم دیا ہے۔ اس لئے آج سے میرا تمہارا ساتھ چھوٹتا ہے۔ شہزادے کے آدمیوں نے کہا کہ ہم مرنا قبول کریں گے۔ لیکن آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ اور نہ آپ کے بے رحم بھائیوں کے رحم پہ ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔

ادہم خاں مہم تبت پر

آخر شہزادہ اپنی جماعت سمیت پونچھ چلا گیا۔ لیکن حاجی خاں برابر اس کے

در پے رہا جب بادشاہ نے دیکھا کہ ادہم خاں کی جلاوطنی کے باوجود حاجی خاں اس کے پیچھے اپنے آدمی بھیج رہا ہے۔ تو اس نے ادہم خاں کو واپس اپنے پاس بلا لیا۔ انہی ایام میں تبت سے شورش اور فساد کی خبریں آ رہی تھیں۔ بادشاہ نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھکر ادہم خاں کو ایک جرار لشکر دیا۔ اور بغاوت تبت کے فرو کرنے کے لئے دار الحکومت سے بہت دور بھیج دیا۔

ادہم خاں ہوا کی طرح گیا۔ اور ملک کو تہ و بالا اور باغیوں کا قلع قمع کر کے بگولے کی طرح واپس آگیا۔ بلکہ بہت سا مال غنیمت بھی بادشاہ کے پاس لایا اور اپنی مردانگی و شجاعت اور فتح و نصرت کی بدولت نوازش ہائے خسروانہ کا مورد ہوا۔ ادہم خاں کے اس طرح مظفر و منصور واپس آنے اور دوبارہ بادشاہ کی نظروں میں وقار و عزت حاصل کرنے سے حاجی خاں کو بڑا صدمہ ہوا۔ بھائیوں کی کدورت لڑائی کی صورت میں ظاہر ہونے والی ہی تھی کہ بادشاہ نے حاجی خاں کو لوہر (علاقہ پونچھ) کے پہاڑوں کا حاکم بنا کر بھیج دیا۔

بادشاہ جانتا تھا۔ کہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ اس لئے کبھی ادہم خاں کو پونچھ اور کبھی حاجی خاں کو پونچھ یا دیگر مقامات پر بھیج دیا کرتا تھا۔

شہزادہ حاجی خاں کی بغاوت

دراندازوں اور فتنہ پردازوں کا کام اسی وقت تک چل سکتا ہے۔ جب تک فریقین میں بدمزگی و نفاق قائم رہے۔ چنانچہ مفسدوں اور خودغرضوں نے حاجی خاں کو باپ اور بھائی کے خلاف بھڑکانا شروع کیا شرلور پنڈت لکھتا ہے ۲۸ سنہ لوکک[1] کا ذکر ہے۔ حاجی خاں کے

---

[1] مراد ۴۵۲۸ لوکک مطابق ۸۵۶ھ مطابق ۱۴۵۲ء

ایک مصاحب ول رائوتر[1] نے اس سے کہا کہ آپ کے بڑے بھائی اور ان کے مشیر کشمیر میں عیش کر رہے ہیں۔ اور بادشاہ کی قربت و مصاحبت کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔ اور ہم ان پہاڑوں میں خراب و خستہ پھر رہے ہیں۔ آپ کو خیال ہے کہ ہم تنہا ہیں یہ غلط ہے۔ کشمیر میں راجانک[2] پرھتی ہار اور کوبج مارگاپتی جو نہایت طاقتور اور صاحب اثر ہیں ہمارا انتظار کر رہے ہیں ہم کو قسمت آزمائی کے لئے ان پہاڑوں سے باہر نکلنا چاہیئے۔ ہم ادہم خاں کو ناکوں چنے چبا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں راجپوری (راجوری) کے لوگ ہمارے خیر خواہ ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ ہم ناکامیاب بھی ہو گئے۔ تو بادشاہ حدل ہے ہم معافی طلب کر لینگے۔ اور وہ ہمیں ضرور معاف کر دیگا لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم بہادر سپاہی جو آپ کے جان نثار ہیں آپ کی فتحمندی کی خاطر جان ہتھیلی پر لئے ہوئے ہیں۔

حاجی خاں نے اپنے دو اور مشیروں سے بھی اس امر میں مشورہ طلب کیا۔ جن میں ایک سفیری ڈامر اور دوسرا تلج تانترے تھا۔ انہوں نے حاجی خاں کو اس ناشائستہ حرکت سے منع کیا اور کہا کہ آپ کو جن لوگوں نے اس قسم کے مشورے دیئے ہیں۔ وہ خود غرض ہیں اور ملک کے امن و امان کے دشمن ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اہل و عیال کی محبت نے کشمیر جانے کے لئے بیتاب کر رکھا ہے۔ آپ ذرا غور فرمایئے۔ ہم ایسے بادشاہ کو کیسے شکست دے سکتے ہیں جو آپ کا باپ ہوا اور ابھی زندہ ہو۔ اور طاقتور حکمران ہو باد رکھئے۔ کوئی شخص اس وقت تک کشمیر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ جبتک وہ زندہ

[1] راوتر سے راتھر یا راٹھور مراد ہے [2] راجنک سے رینہ اور مارگاپتی سے قوم ماگرے مراد ہے۔

ہے۔ بادشاہ کو اپنی سعادت مندی سے خوش رکھو۔ تاکہ آرام و اطمینان، اور دولت و حکومت آپ کے استقبال کے لئے فرش راہ بنیں۔

ہمارے اور کشمیر کے درمیان بلند ترین پہاڑ واقع ہیں۔ اس لئے اس محفوظ ملک پر جو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ اور جو بادشاہ نے اپنی خوشی سے آپ کو سونپا ہے کوئی حملہ آور نہیں ہو سکتا۔ آپ یہاں آرام سے بیٹھے رہیے۔ بادشاہ ہم سے اور ہم بادشاہ کی زد سے بہت دور ہیں اور ایک کو دوسرے سے تعرض بھی نہیں۔ اس لئے نہ بادشاہ کو پریشان کیجئے۔ اور نہ بلاوجہ خود مصیبتوں کو دعوت دیجئے۔

لیکن حاجی خاں پر ایسے دانشمندانہ مشورے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ باپ کی زندگی ہی میں اس کے سر پر بادشاہ بننے کا بھوت سوار ہو رہا تھا۔ اور اس کے خود غرض مصاحب مبارک سلامت کے نعروں سے اس کو باپ اور بھائی سے جنگ کرنے پر آمادہ کر رہے تھے چنانچہ وہ راجپوری کو ایک طرف چھوڑ کر سیدھا ہورپور[1] آیا۔

باپ بیٹے میں جنگ کی تیاریاں

بادشاہ کو بھی حاجی خاں کی حرکات و سکنات کا پتہ لگ رہا تھا۔ وہ اپنی فوج لے کر دار الحکومت سے باہر نکلا۔ بادشاہ سب سے آگے تھا۔ فوج اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس کو اپنی ضعیف العمری اور اپنے روحانی صدمات کی وجہ سے اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا۔ اس لئے اس نے حکم دیا کہ یہ شعر سب لوگ پڑھتے جائیں یہاں صرف شعر کا مطلب ہی لکھا جاتا ہے۔

"جنگ کا خطرہ ہمیشہ ایک قسم کا الارم ہوتا ہے۔ اور جب کسی کو یہ خطرہ اپنے بیٹے ہی سے ہو جائے۔ تو سمجھنا چاہیئے۔ کہ اس بدنصیب باپ کی زندگی

---

[1] موجودہ نام ہیرپور یا ہرپور بجانب شوپیاں تحصیل کولگام

ختم ہو چکی ہے۔[۱]

جس گاؤں سے اور جس راستہ سے بادشاہ کا گزر ہوتا سب لوگ اس کی فتح وظفر کی دعائیں مانگتے اور کہتے افسوس ہے ایسے نیک دل اور انصاف کے دیوتا بادشاہ کو اس کے نالائق بیٹے نے بُرے مصاحبوں کی صحبت کی وجہ سے تکلیف دے رکھی ہے۔ بادشاہ اس قسم کی دعائیں لیتا آخر ایک مقام سو پل ن میں پہنچ گیا۔

بادشاہ کا پیغام باغی بیٹے کے نام

جب باپ اور بیٹے کی فوجیں ل شلا کے مقام پر ایک دوسرے کے مقابل ڈٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ تو خون پدری جوش میں آیا۔ اور بادشاہ نے خلق خدا کو خون ناحق سے بچانے کے لئے اپنے ایک معتبر برہمن کو بیٹے کے پاس پیغام دے کر بھیجا۔

"اے فرزند! والدین ثمردار درخت کی مانند ہوتے ہیں اور اولاد اس درخت کا پھل ہوتی ہے۔ اولاد کا فرض ہے کہ والدین کو خوش رکھے۔ ان کی متابعت کرے اور بڑھاپے میں ان کا سہارا ہو لیکن تم جو کچھ کر رہے ہو۔ کیا سعادتمند اولاد ایسا ہی کیا کرتی ہے۔ تم سے مجھے جو امیدیں تھیں۔ کیا تم نے ان پر پانی نہیں پھیر دیا۔ تم مفسد، شریر اور بدمعاش لوگوں کو اپنے ہاں پناہ دیتے ہو۔ اور میرے دشمنوں اور ملک کے امن وامان کے دشمنوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہو۔ یہ تمہارے لئے کہاں تک مناسب ہے۔ میری اطاعت سے منحرف ہو کر اور باپ سے بغاوت اور سرکشی کر کے کیوں اپنی عاقبت خراب کرتے ہو۔ اور میرے ہمسایہ ملکوں میں مجھے بدنام کرتے ہو۔ یاد رکھو یہ مرش کلش قبیلہ جو تباہی اور لوٹ مار کے لئے ہمیشہ کمربستہ رہتا ہے۔ زیادہ دیر تک تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ تم میری

[۱] دسلہ حاشیہ نمبر ۱۱۵ پر دیکھئے۔

اجازت کے بغیر کیوں لوہر کوٹ سے باہر نکلے۔ اور کشمیر کی طرف بُری نیت سے آئے۔ سنو اور خوب غور سے سُنو اگر میری قسمت میں ابھی کچھ اور دن اس ملک کی حکومت لکھی ہے۔ تو کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی مجھ پر غالب نہیں آسکتی۔ تم وادیٔ کشمیر سے باہر کے پہاڑی ملک پر حکومت کر رہے ہو۔ کیا وہ تمہارے لئے کافی نہیں اور اگر کافی نہیں تو کیا باپ کا ملک چھین کر دنیا میں رو سیاہی حاصل کرنا چاہتے ہو۔ اے فرزند! اس قسم کے باغیانہ اور احمقانہ خیال اپنے دماغ سے نکال دو۔ دو فوجوں کا اور باپ بیٹوں کا آپس میں جنگ کرنا اور اس جنگ میں ملک کے ہزارہا آدمیوں کا مارا جانا کیا تمہیں پسند ہے۔ اور کیا یہ ناقابل عفو گناہ تم اپنے سر لینے کے لئے تیار ہو؟"

اسی قسم کے الفاظ کہکر برہمن نے کہا بادشاہ کا پیغام تو ختم ہوگیا۔ اب میری ایک گزارش ہے۔ اس پر بھی غور فرمائیے۔ اور وہ یہ ہے کہ میں آپ کو سچ سچ کہتا ہوں۔ جس طرح ایک چڑیا کی حقیقت ایک شاہین کے سامنے ہے۔ اسی طرح آپ کی فوج خواہ وہ بہادری میں کیسی ہی لاف زنی کرے۔ بادشاہ کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

بادشاہی ایلچی پر شہزادے کے آدمیوں کا ظلم

حاجی خاں اس وقت سخت تذبذب میں تھا۔ وہ بادشاہ کے اس پیغام سے متاثر بھی تھا اور اپنی خود سر فوج سے [illegible] رتا تھا۔ ابھی وہ کوئی صحیح فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ اس کے سپاہیوں میں سے چ[illegible]ک عاقبت نا اندیشوں نے برہمن

(لہ حاشیہ صفحہ ۱۱۲) اصل شعر معلوم نہیں کہ [illegible] بان میں تھا یا فارسی میں یا سنسکرت میں۔ ہم نے زینہ ترنگنی کے انگریزی ترجمہ سے صرف اس کا مفہ[illegible] مطلب لکھدیا ہے۔ [illegible] سو جود [illegible] [illegible] اصل شعر یا ں ہو کر نا لا انہ ہاد

کے الفاظ کو اپنی توہین تصور کر کے اس کے کان کاٹ ڈالے اور سب نے اس کے خون سے اپنی پیشانیوں پر تلک لگائے۔

شہزادے پر باپ کے پیغام کا اثر

حاجی خاں فوج کے آدمیوں کو تو کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن ان کی باجیانہ حرکت پر جو ایک سفیر کے ساتھ کی گئی تھی۔ اور جو آئین سفارت کے بالکل خلاف تھی۔ وہ بہت نادم ہوا اس نے شہزادت کی دلجوئی کی۔ اور ابھے ہنبو نام ایک پرہتی ہار کے پاس جو اس کا مشیر تھا مشورہ کرنے کے لئے گیا۔ اور کہا مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے باپ اور بادشاہ کے پاس معذرت طلب کرنے کیلئے جاؤں وہ یقیناً میرے ساتھ پدرانہ شفقت سے کام لے گا۔ میرا بڑا بھائی میرے مدمقابل ہے۔ اور باپ لڑائی کے لئے آمادہ ہے۔ میں پدرکش اور برادرکش کہلانا نہیں چاہتا۔ میرے خیال میں اب لڑائی نامناسب ہے۔ میرے باپ نے ہمیشہ میری خطاؤں کو معاف کیا ہے اور وہ اب بھی مجھے معاف کرے گا۔

شہزادے کی بے بسی اپنے خود افسروں کے سامنے

جب تاج تانتر نے اور دوسرے فوجی افسروں اور مصاحبوں کو شہزادے کے ان خیالات کا علم ہوا۔ تو انہوں نے شہزادے کو درشت اور ناملائم الفاظ میں مخاطب کر کے کہا جب پہلے پہل ہم نے تم کو باپ کے ساتھ جنگ کرنے کو منع کیا۔ تو تم نے ہماری ایک نہ سنی۔ اب جبکہ بادشاہ ہم کو اپنا دشمن اور بدخواہ سمجھ چکا ہے۔ اور مفسد اور شریر بتا رہا ہے۔ تو ہم لوگوں کو آگ میں دھکیل کر خود علیحدہ ہو رہے ہو اگر تم باپ بیٹوں میں صلح ہو گئی۔ تو بتایئے ہمارا کیا حشر ہو گا۔ کیا ہمیں چن چن کر قتل نہ کیا جائے گا۔ لڑائی ہونے دیجئے۔ اگر ہم لڑائی جیت گئے۔ تو سارے ملک کے آپ ہی بادشاہ ہوں گے۔ اور اگر ہم ہار گئے۔ تو آپ پھر بھی معذرت طلب کر کے

بادشاہ کے پاس جاسکتے ہیں۔ ہم لوگ اپ جانیں ہتھیلیوں پر رکھکر آئے ہوئے ہیں یا مرجائیں گے یا مارلیں گے۔ اگر ہمارے مشورے پر آپ نے عمل نہ کیا اور باپ کے دہوکے میں آگئے، تو ہم کسی معاملہ میں آپ کا ساتھ نہ دینگے۔

جب شہزادے نے اپنے فوجی افسروں کی یہ دہمکیاں سُنیں۔ تو وہ بہت گھبرایا بلکہ اس کو اپنی جان کے بھی لالے پڑ گئے۔ آخر اس نے ہرچہ بادا باد کہکر بادل ناخواستہ لڑائی کی منظوری دیدی۔

مل شیلا کے مقام پر خونریز لڑائی

جب بادشاہ کا ایلچی کان کٹوا کر واپس آیا۔ تو بادشاہ اس کی یہ ہیئت کذائی دیکھکر بہت برافروختہ ہوا۔ اس نے اپنے کیمپ کے گرد ایک گہری خندق کھدائی اور خود ایک بلند ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ دونوں فوجیں اس کے سامنے تھیں مل شیلا کے مقام پر سامان حرب کے شور و شر اور گولوں اور بندوقوں کی آواز سے آسمان گونج اٹھا۔

شری ور زینہ راج ترنگنی میں اس لڑائی کی چشم دید کیفیت لکھتا ہے۔ ہم اس کے الفاظ میں مختصر طور پر یہاں اس لڑائی کا کچھ حال لکھتے ہیں۔

حاجی خاں لڑنے کو تو لڑ رہا تھا۔ مگر اس کی فوج کے ڈھول اور باجوں کی آواز سے یہ صدا آرہی تھی کہ میرا دل لڑنے کو نہیں چاہتا لیکن فوج کی خودسری کی وجہ سے مجبور ہوں۔ شری ور لکھتا ہے۔ کہ بڑھتی ہار اور حاجی خاں کے دوسرے افسروں کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اتنے میں بادشاہ کے دو ٹھاکر حسن اور حسین نام جو بادشاہ کے رضاعی بھائی بھی تھے دست بدست لڑائی کے لئے فوج سے باہر نکلے۔ ان کے مقابلہ پر دو جیہہ اور نوجوان راجپوت سورن اور سے ہنگر دوسری طرف سے آئے۔ ان میں دیر تک مقابلہ ہوتا رہا۔ آخر دونوں

راجپوت مارے گئے۔

اس موقع پر طرفین کی فوجیں اپنے افسروں کے احکام کے مطابق کبھی آگے بڑھتی اور کبھی پیچھے ہٹتی تھیں۔ شریویر لکھتا ہے۔ فوجی نقاروں کی آوازاور ان کی دل ہلا دینے والی گونج جس سے اردگرد کے پہاڑ بھی لرز جاتے تھے ہیں نے اس سے قبل کبھی نہ سنی تھی۔ فوج میں مرنے مارنے کا جوش ظاہر کر رہا تھا۔ کہ ان کو اپنی سدھ بدھ اہل وعیال کی خبر اور گھر بار کا کچھ خیال نہ تھا۔ ان حالات میں بادشاہی افواج نے پورا حق نمک ادا کیا۔ تیروں کی بوچھاڑ طرفین سے بارش کی طرح جاری تھی۔ بل شیلا کا میدان انسانی خون سے لالہ زار بنا ہوا تھا۔

باغی شہزادہ حاجی خاں کی شکست

طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک لڑائی ہوتی رہی۔ شہزادے کی فوج نے بھی بہادری دکھائی لیکن آخر یہ فوج بادشاہی فوج کی تاب نہ لاسکی۔ شہزادہ بچی کھچی فوج لیکر ہیراپور کے رستہ پونچھ کو روانہ ہوگیا۔ اس لڑائی میں اس کے بہت سے نامی سردار مرچکے تھے۔ تاہم پسپائی کے دوران میں اس نے ایک مقام پر سب کو جمع کیا۔ اور اپنے کئے پر بہت دیر تک افسوس کرتا اور روتا رہا۔ رات اس نے ایک پہاڑی پر بسر کی اور اپنے آخری فیصلہ کے مطابق وہ پونچھ جانے کی بجائے چتراوتش میں چھپا دیا گیا۔

ادہم خاں اپنے بھائی حاجی خاں کی گرفتاری کے لئے اس کا تعاقب کرنا چاہتا تھا۔ مگر بادشاہ جو دونوں کی باہمی عداوت سے واقف تھا ڈر رہا تھا۔ کہ ادہم خاں اسی بہانے سے اس کو ہلاک کر دے گا۔ ادہم خاں کو تعاقب کرنے کی اجازت نہ دی۔ بلکہ بادشاہ نے حکم عام جاری کر دیا کہ کوئی شخص شہزادے کا پیچھا کر کے اس کو دق نہ کرے

خا چترا وتش پہاڑ اور چترا کبر ... نام ہے اس کے متعلق کوئی مزید واقفیت بہم نہ پہنچ سکی۔

باغیوں کے سروں کا بلند مینار

بادشاہ نے اپنی انتہائی رحمدلی کو اپنی عاقبت نااندیشی پر محمول کیا اور حکم دیا کہ میدان جنگ میں جس قدر باغی قتل ہو گئے ہیں۔ ان سب کے سروں کو دارالحکومت میں جمع کیا جائے۔ اور ان سے ایک بلند مینار قائم کیا جائے۔ تاکہ پھر کسی اور ناخلف بیٹے یا کسی سرکش رئیس کو بغاوت کی جرات نہ ہو سکے۔ بلکہ قیدیوں میں سے بھی بہت سے آدمی قتل کئے گئے۔ اس قسم کی سزاؤں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ خانجی خاں سے خود بخود علیحدہ ہو گئے۔

شریور لکھتا ہے اس جنگ میں جو باپ بیٹے کے درمیان ملک کے بدخواہوں نے جاری کرا رکھی تھی۔ جانبین سے ملک کے بڑے بڑے نامور فوجی افسر اور ملکی مدبر قتل ہو گئے۔

آٹھواں باب

ولیعہد کی بغاوت اور جلاوطنی

ولیعہد سلطنت ادہم خاں کا کیرکٹر

بادشاہ کا بڑا بیٹا ادہم خاں، باپ کا منظور نظر بلکہ ولی عہد تھا۔ بادشاہ نے امور ملکی اور مہمات سلطنت میں بھی اس کو شامل کر لیا۔ لیکن اس قسم کے مراحم خسروانہ اور شفقت پدرانہ نے ایک نااہل پر کوئی اچھا اثر نہ ڈالا۔ وہ بھائی سے انتقام لینے کے لئے ہر وقت بے چین رہتا تھا۔ اور باپ کے منع کرنے کے باوجود

بھی یہ خیال اس کے دل سے نہ نکلتا تھا۔

سر لیپل گریفن نے اس کے خصائل اور خد و خال کا جو نقشہ کھینچا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ولی عہد کے غرور اور اس کی اخلاقی برائیوں نے اس سے بہت سے نامناسب اور ناواجب کام کرائے۔ وہ لکھتا ہے۔

علم اور عالموں سے اس کو کوئی سروکار نہ تھا۔ کتوں کے ساتھ اس کو بہت محبت تھی۔ شکار کا بہت شوقین تھا۔ اس کے محلات میں عورتوں کی کثرت تھی۔ ادنےٰ خصلتوں کے لوگ اس کی سرکار میں ملازم تھے۔

کامراج کے علاقے میں اس نے لوگوں پر اس قدر تشدد کیا کہ کسی کے پاس نقد جنس قسم کھانے کو بھی نہ رہا۔ عوام اس کے ظلم سے چیخ اٹھے۔ اس کی لوٹ نے گھروں کے گھر تباہ کر دیئے۔ جو لوگ خاندانی بارسُوخ تھے ان میں سے کسی کو بادشاہ کے حضور میں پیش کرنے کسی کو کوئی اعلےٰ عہدہ دلانے اور کسی کو کسی بہانے سے لوٹ لیا۔ اس نے اور اس کے ملازموں کے ہاتھوں دیہاتیوں کی بہو بیٹیوں اور عورتوں اور لڑکیوں کی عصمت محفوظ نہ تھی۔

بادشاہ نے جب بیٹے کے مظالم کے یہ حالات سُنے۔ تو اس قدر صدمہ محسوس کیا کہ کئی دن تک کھانا نہ کھایا۔ ادہم خاں ابھی کامراج میں ہی تھا۔ کہ بادشاہ نے اس قسم کی بدکرداریوں سے باز رکھنے کا اسے پیغام بھیجا۔ شہزادے کے آدمیوں نے بادشاہ کے مخبروں کو شہزادے سے ملنے بھی نہ دیا۔ اور پیغام سن کر یہ کہا کہ بادشاہ بڈھا ہو گیا ہے۔ مرنے کے قریب ہے۔ وہ یونہی شور مچاتا رہے گا۔

حاجی خاں کی شکست کے بعد ادہم خاں پانچ سال تک بڑے استقلال سے بادشاہ کا ولیعہد بنکر رعایا پر ظلم کرتا رہا۔ بادشاہ کبھی اس کو اس کی حرکات ناشائستہ سے منع کرتا اور کبھی محبت پدری اور مصلحت ملکی کے باعث مخلوق خدا

کو جنگ کی مصیبتوں سے بچانے کے لئے اس کی گستاخیوں اور بدکرداریوں کو نظر انداز کر دیتا۔

ادہم خاں کی بغاوت

شہزادہ جانتا تھا کہ بادشاہ اب چراغ سحری ہے۔ اس لئے عمداً اور علانیہ باپ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا۔ اس کے مصاحبوں اور فوجی سرداروں نے اس کو بادشاہ کے خلاف بہانا شک بھڑکایا کہ اس نے بہت سا لشکر جمع کر کے باپ پر حملہ کرنے اور اس کو گرفتار کر کے خود بادشاہ بننے کے لئے قطب الدین پورہ میں جہاں اس کے محلات تھے۔ ڈیرے ڈالدیئے بادشاہ کو بھی اس کی اس نالائق حرکت کا علم ہو چکا تھا۔ اس نے بھی اپنی فوج کو تیار رہنے کا حکم دیا۔ دونوں فوجوں کی تیاریوں سے شہر خصوصاً جینا نگر[1] میں جو بادشاہ کا دارالحکومت تھا اور جس کو تباہ کرنے کے لئے ادہم خاں نے یہ لاؤ لشکر جمع کیا تھا۔ لوگ اپنی جانوں کی سلامتی کے لئے دست بدعا تھے۔

بادشاہی حکم سے زینہ کدل کا انہدام

بادشاہ نے دتستہ پر ایک پل بنام زینہ کدل اپنے نام پر تیار کرایا تھا اس پر لکڑی اور پتھر کے بنے ہوئے چار برج تھے۔ اور شری وبر پنڈت کے قول کے مطابق اس سڑک پر جو درستان سے شہر میں آتی تھی۔ یہ سوال پل تھا جو بڑا مضبوط تھا۔ لیکن ادہم خاں کے اس حملے میں یہی پل جو اس نے بڑے شوق سے تعمیر کرایا تھا اس کے لئے سب سے زیادہ خطرے کا باعث ہو رہا تھا۔ بادشاہ نے وزرار کے مشورے سے نہایت رنج و قلق کے ساتھ اس پل کو گرانے کا حکم دیا اور چونکہ یہ پل بہت مضبوط تھا اس

[1] جینا نگر یا زینہ نگر عرف دارالحکومت نوشہرہ کا ذکر شاہی تعمیرات کے سلسلہ میں تفصیل سے ہوگا۔

لئے بڑی مشکل سے گرایا جا سکا۔[1]

اس موقع پر فارسی مورخوں نے لکھا ہے۔ کہ آخر بادشاہ نے اس کو سمجھا بجھا کر ملاقات کرنے کے بغیر ہی کامراج میں واپس جانے کا حکم دیا۔ لیکن شری ور پنڈت جس کی آنکھوں کے سامنے یہ تمام واقعات ہوتے رہے ہے لکھتا ہے حب ادہم خاں نے دیکھا کہ پل ٹوٹ چکا ہے تو محاصرہ ترک کرکے خود بخود واپس کامراج چلا گیا۔ اور یہی درست بھی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ پل ٹوٹ جانے کے بعد دریا کو عبور کرنے کے لئے بہت سی جانیں ضائع ہو جانیکا اندیشہ تھا۔

حاجی خاں حاکم پونچھ کے نام بادشاہ کا مکتوب

ہرچند ادہم خاں پل کی شکستگی کے بعد شکستہ دل ہو کر واپس چلا گیا لیکن بادشاہ اس کے ارادوں سے غافل نہ تھا۔ اس بیچارگی کے عالم میں جبکہ ضعیف العمری کے ساتھ اس کے فرزند کی بغاوت اس کے لئے سوہان روح ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے دوسرے بیٹے حاجی خاں کو جو اس کے حکم سے پونچھ ہی میں بہ ظاہر حاکمانہ مگر بہ باطن جلاد طنی کی زندگی بسر کر رہا تھا یاد کیا۔ اور اسے ذیل کا خط لکھ کر اپنے پاس بلایا۔

"اے فرزند من مجھ پر عمر کی اس آخری منزل میں مختلف قسم کے مصائب نازل ہو رہے ہیں جن کی مدافعت بظاہر بہت مشکل نظر آرہی ہے۔ اس وقت جبکہ میری زندگی خطرے میں ہے۔ مجھے خدائے برتر و توانا کی ذات کے بعد تمہارے سوا اور کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔ تم جس حال میں ہو کسی تاخیر کے بغیر میرے پاس آجاؤ۔ اگر تم نے غفلت اور کوتاہی سے کام لیا۔ تو قیامت کے دن میں اپنے مصائب کے لئے تمہارا دامنگیر ہونگا۔

[1] یہ واقعہ ۴۳۴۵ء لوکک کا ہے جس کے مطابق انگریزی ۱۴۵۹ء اور ہجری ۸۶۳ھ بتایا جاتا ہے

میری موت کے بعد تمہارا یہاں آنا محض بیکار ہے۔ میری زندگی کے آخری لمحوں میں میرا سہارا بنو۔ جو یقیناً تمہارے لئے بہت اچھے نتائج پیدا کریگا"
حاجی خاں اس وقت سدوارن[1] کے علاقے میں مقیم تھا۔ باپ کا خط پڑھتے ہی وہ کشمیر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ اپنی فوج سمیت درہ مل[2] کے نزدیک آیا۔ اور بادشاہ کو خبر ہوئی۔ تو اس نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے بہرام خاں کو اس کے استقبال کے لئے بھیجا۔ دونوں بھائی بڑے تپاک سے ملے۔ اور حاجی خاں نے اپنے چھوٹے بھائی سے بغلگیر ہو کر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔

سوپور میں جنگ عظیم

گوکامراج کے علاقہ میں ادہم خاں کی حکومت تھی۔ مگر سوپور سرکاری علاقہ میں شامل تھا۔ ادہم خاں نے دریا کو عبور کر کے کامراج کے شاہی بریگیڈ کے ساتھ جو وہاں مقیم تھا۔ جنگ کی۔ دردستان اور باقی اطراف کے لوگوں نے خونخوار ادہم خاں کے خوف سے بھاگنا شروع کیا۔ اسی افراتفری میں بہت سے آدمی دریا میں غرق ہو گئے لاشیں دریا میں تیرتی نظر آتی تھیں۔ اور دریا کا پانی خون کی کثرت سے لالہ رنگ بنا ہوا تھا۔ ان کے علاوہ دریا کو عبور کرتے ہوئے ادہم خاں نے دست بدست لڑائی کر کے کئی بادشاہی آدمی موت کے گھاٹ اتار دیئے۔

---

[1] سدورن کا تلفظ انگریزی میں اس طرح لکھا ہے۔ Sadvaruna یہ وہی مقام ہے جس کا موجودہ نام سورن ہے۔ اور جو پونچھ کی تحصیل ہینڈڈ کا سرد ترین اور فرحت بخش مقام ہے۔

[2] درہ مل کا موجودہ نام بارہ مولا ہے۔ جو جہلم ویلی روڈ پر شمالی کشمیر کے مشہور ضلع کا صدر مقام ہے۔

جب باپ کو یہ معلوم ہوئی کہ فرزند سعادت مند یہاں سے تو چپ چاپ چلا گیا ہے مگر سوپور میں جا کر کھل کھیلا ہے۔ تو اس کی تنبیہ کے لئے باہر نکلا رستہ میں اس نے ایک جماعت عظیم کو دیکھا جس میں اکثر زخمی تھے کئی ایک کے پاؤں جلے ہوئے تھے یہ بہت سے شور و غوغا اور واویلا کر رہے تھے ان میں کئی ایسے تھے جن کے دیہات اور مال و اسباب کو ادہم خاں نے جلا کر خاک سیاہ کر دیا تھا۔ ان مظلوموں کو اس حال میں دیکھکر بادشاہ کے دل پر بڑا اثر ہوا۔

جب بادشاہ کے ہاں ادہم خاں پیدا ہوا تھا۔ تو اس نے بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا سارے شہر میں چراغاں ہوا جشن شاہانہ نے شہر کو عروس البلاد بنا دیا تھا لیکن کیا خبر تھی۔ یہی بچہ جوان ہو کر دشمن جان ثابت ہوگا ؎

کیا خبر تھی انقلاب آسماں ہو جائیگا دولت کا ملنا نصیب دشمناں ہو جائیگا

اس موقعہ پر سشر یو لکھتا ہے "نالائق فرزند غیر ممالک کو فتح کرنے کی بجائے اپنے ہی باپ کے ملک کو غارت کر رہے تھے جس طرح خود غرض لوگوں نے ولی عہد کے زمانے میں بادشاہ بڈشاہ کو اس کے بڑے بھائی علی شاہ سے لڑوا دیا تھا۔ اور آخر علی شاہ گرفتار ہو کر ایک ملک کے بیٹے کے ہاتھ سے قتل ہو گیا تھا۔ اسی طرح بد باطن اور سیاہ دل لوگ۔ بادشاہ کو اور اس کے بیٹوں کو باہم لڑا رہے تھے۔ اس کے فرزندوں کے باہمی حسد نے بادشاہ پر اس کی زندگی تلخ کر دی تھی۔ خدا کرے کسی بادشاہ کے ہاں ایک سے زیادہ فرزند نہ ہوں۔"

حاجی خاں پونچھ سے کشمیر میں

غرض باپ اور بیٹے کی فوجیں سوپور (سوپور) میں دلنستہ کے دونوں کناروں پر تھیں۔ ادہم خاں کا لشکر دریا سے پار کامراج کے علاقے میں

تھا اور بادشاہ کی فوج سنگرامہ سے لیکر سوپور کے درمیان تین میل کے دوران میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس موقعہ پر حاجی خاں بھی اپنی فوج لے کر آ پہنچا۔ بادشاہ نے تین سال کے جلاوطن فرزند کو فرط مسرت کے ساتھ چھاتی سے لگایا۔ اور اسے آیندہ کے لئے بہت سی توقعات دلائیں۔

ادہم خاں کی فراری اور جلاوطنی

جب ادہم خاں نے سنا کہ حاجی خاں بھی پونچھ سے فوج لے کر باپ کی امداد کے لئے آ پہنچا ہے۔ اور بادشاہ نے بہرام خاں کو اس کے استقبال کے لئے بارہ مولا تک بھیجا ہے۔ تو اس پر ایسا خوف غالب آیا۔ کہ وہ لڑائی کرنے کے بغیر ہی فوج سمیت میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔ اور شاہی بھنگ کی راہ سے دریائے سندھ[1] (اٹک) کو عبور کر گیا۔

بادشاہ سوپور آیا۔ اس نے رعایا کے زخموں پر تسلی و تشفی کا مرہم رکھا جو کچھ ہوا اس پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا خدا کو یہی منظور تھا۔ کہ ان تکلیفوں اور مصیبتوں کے بعد تمہیں امن و امان نصیب ہو۔

بادشاہ اپنے سب سے بڑے فرزند کو ملک بدر کر کے اور شکست دیکر اپنے دوسرے دونوں فرزندوں سمیت دارالحکومت میں واپس آگیا۔

---

[1] فارسی مورخوں نے لکھا ہے کہ ادہم خاں آخر جان سلامت لے کر نیلاب (دریائے اٹک) کی طرف بھاگ گیا اور شاہی بھنگ شاید شاہیہ خاندان (اود بانڈپور عرف ہنڈ) کے کسی علاقہ کا بگڑا ہوا نام ہو۔

نواں باب

حاجی خاں کی ولی عہدی کا اعلان اور اس کا کیریکٹر

حاجی خاں کی ولیعہدی کا اعلان

بادشاہ نے سوپور سے واپس آکر اپنے بڑے فرزند آدہم خاں کی نافرمانی اور اس کی جلاوطنی کا ذکر کرنے کے بعد ولیعہدی سے اس کی علیحدگی کا اعلان کیا اور ایک دربار منعقد کر کے حاجی خاں کو خلعت ولیعہدی عطا کیا۔ بلکہ ایک کمربند اور ایک شمشیر کہ دونوں قیمتی جواہرات سے مرصع ومطلا تھے عنایت کر کے اپنی مزید خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ حاجی خاں نے بھی اخلاص وادب میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ تقصیرات سابق کی تلافی بوجہ احسن کی اور اپنے مصاحبین کو جو سفر وحضر میں اس کے رفیق تھے۔ بادشاہ سے سفارش کر کے منصب ہائے اعلےٰ تک پہنچایا۔ اور جاگیریں ان کے نام مقرر کرائیں۔ بادشاہ سلطنت کے تمام کاموں میں اسے شریک رکھتا اور جہاں جاتا اس کو اپنے ساتھ لے جاتا۔

حاجی خاں کی علالت شراب نوشی کی بدولت

حاجی خاں اب باپ کا خدمت گزار تھا۔ اور اس کے خلاف کسی سازش یا کسی بغاوت میں کوئی حصہ نہ لیتا تھا لیکن مے نوشی کا مرض اندر ہی اندر اس کو گھن کی طرح کھا رہا تھا شراب اس کی گھٹی میں پڑ چکی تھی۔ ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو رہا تھا۔ اور دل ودماغ اپنا صحیح کام کرنے سے عاری تھے۔ باپ نے بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو امراء، وزراء کو اس کے پاس بھیجا انہوں نے

اس عادت بد کے نشیب و فراز اس کو سمجھائے۔ مذہب نے جو احکام اس لعنت کے متعلق دے رکھے تھے۔ وہ اس کو بتلائے سلطنت پر جو اس کا اثر پڑیگا۔ وہ اس کو سمجھایا۔ لیکن حاجی خاں اس قسم کی ہدایت و نصیحت کو اس کان سنتا اور اس کان اُڑا دیتا۔

آخر وہ رفتہ رفتہ بیمار ہو گیا۔ اور بیماری روز بروز بڑھنے لگی۔ بادشاہ اس کو اپنی زندگی کا سہارا سمجھ رہا تھا۔ اس کی علالت کا اس کی صحت پر بھی اثر پڑنے لگا۔ اور اپنے ملک اور اپنی سلطنت کے متعلق جو امیدیں اس کو حاجی خاں سے وابستہ نظر آتی تھیں۔ وہ منقطع ہونے لگیں۔ آخر ایک دن اس نے اپنے فرزند کو اپنے سامنے بلوایا۔ اور اس کو بہت کمزور دیکھکر ایک آہ بھری اور یہ تقاضائے محبت پدری اس سے اس طرح مخاطب ہوا

بادشاہ کی تقریر شراب کے خلاف

اے فرزند احبیب تمہیں اس ام الخبائث کا چسکا نہ تھا۔ تمہاری صحت کیسی اچھی تھی۔ تم بہادر اور نوجوان تھے۔ لیکن آج میں تم کو جس حال میں دیکھ رہا ہوں۔ خدا اپنے فرزند کا اس طرح کا حال کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے مجھے رنج و قلق کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ شراب نوشی کی بدولت تمہاری قیمتی زندگی خطرے میں ہے۔ کیا تمہارے پاس تمہارا کوئی ایسا خیر خواہ نہیں ہے۔ جو اس لعنت سے تم کو بچائے۔ صحت کی خرابی اور بدنامی اور رسوائی کے علاوہ عاقبت کی تباہی کیا ان باتوں کی طرف تمہارا خیال نہیں گیا۔ کیا تم سمجھتے ہو۔ کہ شراب کے سوا دنیا میں اور کوئی ایسی چیز نہیں جس سے انسان فرحت بھی حاصل کر سکے۔ اور دنیا کی رسوائی اور اپنی صحت کی تباہی سے بھی بچے۔ کیا شراب ہی دنیا میں تمام نعمتوں کا بدل ہے۔ اپنے دماغ

توازن کو درست کرو اور بیوقوفوں کی طرح اپنے انجام سے غافل نہ رہو۔
دنیا میں ایسی ایسی عظیم القدر اور شجاع و شیر دل ہستیاں گزری ہیں۔
جن کا نام ہی سنکر ان کے دشمنوں کی روح فنا ہو جاتی تھی۔ پھر معلوم
ہے ان ہستیوں کو ان کے روباہ صفت دشمنوں نے کس طرح چار دل
شانے چت گرالیا۔ اس کا سبب صرف ان کی بکثرت شرابنوشی تھی۔
ملک جبر بقا[۱] کا نام تم نے سنا ہوگا۔ وہ زندگی بھر شراب کے نزدیک نہ گیا۔
اس نے اپنی طاقت کو برقرار رکھا۔ اپنے ہوش و حواس درست رکھے۔ دل و
دماغ کو ضعیف نہ ہونے دیا اور ساری عمر دشمنوں پر غالب رہا۔ لیکن
اس کے فرزند شاہ مسعود نے اوباشوں کی صحبت میں پڑکر نہ صرف باپ
کی سلطنت ہی شراب کے ایک پیالے کے عوض بیچدی۔ بلکہ اپنی زندگی سے
بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس کی مملکت کا سب سے بڑا شہر جو تمام نعمتوں سے
مالامال تھا۔ آج اس کے ناخلف بیٹے کی وجہ سے صرف ایک پرانی تباہ
شدہ یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔
تم کو پیالہ میں شراب کا رنگ سرخ نظر آتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔
کہ پیالے میں یہ شراب نہیں ہے۔ بلکہ شراب پینے والے کے دل و جگر کا
خون جمع کیا ہوا ہے۔ یاد رکھو شراب خانہ خراب کی وجہ سے انسان ایسے
ایسے گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے جن کا کوئی کفارہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے
جس طرح ہو سکے۔ اپنی اور ملک کی خاطر اپنی زندگی بچاؤ اور اس لعنت
سے نجات حاصل کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا۔ تو زندگی سے جلد ہاتھ دھو
بیٹھوگے۔ اور اگر زندہ بھی رہے۔ تو قسمت تمہارا ساتھ چھوڑ دیگی۔

[۱] معلوم نہیں ملک جبر بقا اور اس کا فرزند کس ملک کے بادشاہ تھے۔

شہزادے نے باپ کی اس طویل تقریر کا ندامت کے ساتھ مختصر الفاظ میں یہ جواب دیا کہ میں اس کو رفتہ رفتہ کم کردوں گا۔ شر یوں لکھتا ہے لیکن نصیحت کے الفاظ بدقسمتوں پر کوئی اثر نہیں کرتے۔ چنانچہ باپ سے رخصت ہوکر شہزادہ جب اپنے محلات میں گیا۔ تو باپ کی تقریر کا جو تھوڑا بہت اثر اس پر ہوا تھا۔ وہ اس کے بدطینت مصاحبوں نے دور کردیا۔ اور وہ پھر اسی طرح شراب میں بدمست رہنے لگا۔

باسیہ دل چہ سود گفتن وعظ نہ رود میخ آہنی در سنگ

وزراء کا پیغام جلاوطن ادہم خاں کے نام

بادشاہ حاجی خاں کی ناگفتہ بہ حرکات سے دن بدن آزردہ خاطر ہو رہا تھا اور چونکہ ترک شراب اس سے محال تھی۔ اور اوباشوں کی صحبت سے وہ کنارہ نہ کرتا تھا اس لئے بادشاہ نے کئی مرتبہ اس سے ناراضگی کا اظہار کیا۔ ان وزراء نے جو ہمیشہ کسی نئے انقلاب کے منتظر رہتے ہیں۔ ہوا کا یہ رخ دیکھکر بادشاہ کے بڑے فرزند ادہم خاں سے جو ملک کے باہر جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا خط وکتابت شروع کی۔ اور رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی۔ کہ انہوں نے حاجی خاں کی خرابی صحت اور بادشاہ کی ضعیف العمری بلکہ چندروزہ زندگی کے حالات لکھکر اسے کشمیر پر حملہ کرنے اور بادشاہ بننے کی دعوت دیدی۔

ادہم خاں کا حملہ کشمیر پر

بادشاہ نے جب یہ خبر سنی۔ کہ ادہم خاں وزراء کی سازش سے کشمیر پر حملہ کرنے والا ہے۔ تو اس کو سخت فکر دامنگیر ہوئی۔ یہ خبر رفتہ رفتہ پونچھ بھی جا پہونچی۔ جہاں حاجی خاں کا فرزند حسن خاں صاحب اختیار تھا۔ وہ راجوری کے رستے فوج لے کر ادہم خاں کا رستہ روکنے کے لئے آیا۔ چچا اور بھتیجے کے درمیان قلعہ آرڈر وشہ نے موقعہ پر گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں حسن خاں نے

نے شجاعت و مردانگی کے وہ جوہر دکھائے۔ کہ ادہم خاں بھی اس کا لوہا مان گیا۔
اس موقعہ پر فرشتہ لکھتا ہے۔ کہ حسن خاں نے دادا یعنی بادشاہ کا اس قدر احترام کیا۔ کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے ملک میں قدم رکھنا بھی اس نے مناسب تصور نہ کیا۔

آخر ادہم خاں کشمیر میں داخل ہو گیا۔ جب وہ باپ کے پاس گیا۔ تو حاجی خاں اور اس کا چھوٹا بھائی بہرام خاں شاہی محل کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ادہم خاں نے دونوں کے ساتھ مصلحتاً مصافحہ اور معانقہ کیا۔ اور دونوں بھائیوں نے باہم عہد و پیمان کر کے اور مقدس ہستیوں کا حلف اٹھا کر باامن رہنے کا اقرار کیا۔ یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن دل کسی کا صاف نہ تھا۔ ایک دوسرے کو شکست دینے بلکہ ہلاک کر دینے کے منصوبے سوچتا رہتا۔

دراندازوں اور خود غرضوں نے بھی سوچا۔ کہ اگر دونوں بڑے بھائیوں میں صلح صفائی ہو گئی۔ تو ہمارا اُلو کس طرح سیدھا ہو گا۔ چنانچہ کچھ تو بھائیوں کی اندرونی خیانتوں کی وجہ سے یہ منافقانہ صلح دیرپا نظر نہ آتی تھی۔ اور کچھ خود غرضوں نے ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکا کر ملک کی تباہی کے مزید سامان پیدا کرنے شروع کئے۔

لکھا ہے۔ کہ جب ادہم خاں باپ کے علم و اطلاع کے بغیر اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو اس نے بیٹے کی طرف کوئی التفات نہ کی بلکہ اس نے ضعف کے عالم میں بھی لڑکے کی اس حرکت پر اپنی ناراضگی اور رنجیدگی کا اظہار کیا۔

لہ حاشیہ صفحہ ۱۲۹ ایہی حسن خاں لب زین حسن شاہ کے نام سے کشمیر کا بادشاہ ہوا ہے۔ اور اسی کی فوج نے تاتار خاں حاکم پنجاب کو شکست دیکر ہندوؤں کے راجہ کو اس کے ظلم سے نجات دلائی تھی۔

بادشاہ کی توجہ تیسرے بیٹے کی طرف

بادشاہ نے یہ سوچکر کہ چونکہ دونوں بڑے بیٹے نالائق اور نافرمان ہیں اور ملک میں فتنہ وفساد پیدا کرکے رعایا کی تباہی کا باعث بنے رہتے ہیں۔ ایک دن بہرام خاں کو خلوت میں اپنے پاس بلایا۔ اور اس سے کہا کہ تم حاجی خاں سے ملے رہتے ہو۔ حاجی خاں کی طرفداری کسی دن تمہاری ہلاکت کا باعث ہوگی۔ ادہم خاں اور حاجی خاں کی باہمی مناقشت اور عداوت تم سے پوشیدہ نہیں ہے اس لئے تم ادہم خاں کے ارادوں سے بے خبر رہ کر کبھی محفوظ زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ وہ تو تمہارا دشمن ہے ہی۔ لیکن تم حاجی خاں کو بھی اپنا ہمدرد نہ سمجھو۔ وہ اپنے فرزند حسن خاں کو چھوڑ کر تم سے کس طرح محبت کرسکتا اور اس کے حقوق تم کو کس طرح منتقل کرسکتا ہے۔ اس لئے تم ان دونوں کا ساتھ چھوڑ کر میرے احکام کی تعمیل کو اپنی سعادتمندی کا نشان سمجھو۔ مجھ پر بھروسہ رکھو اور میرے پاس رہو۔ اگر تم نے میری اس نصیحت پر عمل نہ کیا۔ تو اے بیوقوف لڑکے تم اپنے بڑے بھائیوں کی باہمی دشمنی میں مفت میں کچلے جاؤ گے۔

بہرام خاں نے جواب میں عرض کیا۔ حاجی خاں مجھے آپ سے زیادہ عزیز جانتا اور مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس وقت اس کی طاقت کا مقابلہ مشکل ہے میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا۔ میری حفاظت کے لئے وہ ضرور اپنی جان لڑا دے گا۔ بادشاہ نے ناراضگی کے عالم میں کہا تم نے میری عزت وعظمت کا کوئی خیال ولحاظ نہ کیا۔ زندہ باپ کو چھوڑ کر اپنے بھائی کو جو تمہارے باپ کا نافرمان ہے۔ باپ کا مرتبہ دیتے ہو۔ جاؤ تمہاری سب امیدیں انشاءاللہ خاک میں مل جائیں گی۔

دسواں باب

آخری ایام میں بادشاہ کی پریشانیاں

بادشاہ کو قتل کرنے کے منصوبے

جہانگیر نے اپنی تزک میں بادشاہ کی خارق عادات کا جو اہلِ کشمیر میں مشہور ہیں ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے۔

بادشاہ زینہ لنک کے عبادت خانے میں تھا کہ ایک ناخلف شہزادہ اس کو تنہا سمجھکر اس کے قتل کرنے کے مقصد سے شمشیر کشیدہ آیا۔ مگر جب اپنے باپ پر اس کی نظر پڑی تو صلابت پدری سے سراسیمہ ہو کر اُلٹے پاؤں واپس آگیا۔ اسی اثنا میں سلطان بھی اپنے عبادت خانے سے نکل کر اسی بیٹے کے ساتھ کشتی میں بیٹھکر شہر کو روانہ ہوا۔ اثنائے راہ میں بیٹے سے کہا میں عبادت خانے میں اپنی تسبیح بھول آیا ہوں۔ جاؤ اور کشتی پر سوار ہو کر میری تسبیح لے آؤ۔ جب تسبیح لینے کے لئے عبادت خانے میں آیا تو دیکھا۔ کہ باپ سابق کی طرح عبادت میں مستغرق ہے۔ یہ بے سعادت از روئے شرمندگی واپس آکر باپ کے قدموں پر گرا۔ اور معافی کا خواستگار ہوا۔

بادشاہ بیٹوں کے اوضاع واطوار اور اخلاق و عادات سے واقف تھا۔ کہ وہ حکومت و ریاست کی طلب میں میری طبعی موت کے بھی منتظر نہیں رہنا چاہتے۔ چنانچہ تزک جہانگیری کے الفاظ میں اس نے اپنے فرزند کو معافی کا خواستگار دیا۔ گفتا بہانہ بریں ترک حکومت چہ گذشتن از حیات بسیار آسان است

امالبعد ازیں کارے نخواہید ساخت و مدت دولت شمایاں بقا نخواہد داشت دبہ اندک زمانے بہ جزائے عمل زشت نیست خود خواہد رسید۔ ایں سخن گفتہ ترک خوردن و آشامیدن نمود"

اس واقعہ کو کشمیر کے نامور مورخ حیدر ملک چاڈورہ نے بھی اپنی تاریخ میں لکھا ہے۔ البتہ اس نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ اس ناخلف کا نام جس نے بادشاہ کا کام تمام کرنا چاہا تھا ادہم خاں تھا۔ جو سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اس کے قول کے مطابق بادشاہ نے اس کو یہ شعر بھی پڑھکر سنایا تھا ؎

پدرکش بادشاہی را نہ شاید وگر شاید بجز ششماہ نپاید

بادشاہ کا یہ ایک وقت عبادت خانہ اور کشتی میں موجود ہونا صحیح ہو یا غلط لیکن اس میں کلام نہیں کہ جو الفاظ اس نے اپنی ناخلف اولاد کے متعلق بیٹے سے کہے تھے۔ وہ آخر پورے ہوکر رہے۔ یعنی پچاس ساٹھ سال کے بعد ہی سلطنت اس خاندان کے ہاتھ سے نکل کر کشمیر کے ایک دوسرے اولوالعزم خاندان چک کے قبضہ میں چلی گئی۔

بادشاہ پر بیٹوں کی نافرمانیوں کا اثر

بادشاہ بہت ضعیف العمر ہو چکا تھا۔ بیٹوں کی حرکات نے اس کی جان کو اجیرن کر رکھا تھا۔ حاجی خاں کو ولیعہد مقرر کر کے کچھ آرام کا سانس لیا تھا۔ کہ اس کی شراب نوشی نے کاروبار سلطنت میں خلل عظیم پیدا کر دیا۔ اس رنج اور صدمہ سے بادشاہ اس قدر بیمار ہوا کہ اس کو اسہال دموی یعنی خون کے دست شروع ہو گئے۔

بادشاہ کی اب یہ حالت تھی کہ کھانا پینا قطعاً ترک ہو چکا تھا ضعف پیری بیماری سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اہل نفاق کو بھائیوں کے لڑانے

کا موقع مل گیا۔ ہر شہزادہ اپنی اپنی جگہ ولیعہدی کا دعوے کرنے لگا۔ بہرام خاں نے جو سب سے چھوٹا تھا۔ سخنان نفاق سے دو بڑے بھائیوں میں اور بھی زیادہ کشیدگی پیدا کردی۔ چنانچہ ادہم خاں شاہی محلات سے رخصت ہو کر قطب الدین پور میں چلا گیا۔

امرائے دربار نے شہزادوں کی باہمی منافقت اور آئندہ فتنہ وفساد کا اندیشہ مدنظر رکھکر یہ فیصلہ کر دیا۔ کہ بادشاہ کا کوئی فرزند بادشاہ کی عیادت کے لئے نہ آئے۔

بادشاہ کو رعایا کی تباہی کا غم

بادشاہ نے امرا سے کہا میں نے اپنے دست و بازو سے حکومت حاصل کی اور طویل عرصہ تک بادشاہی کے لطف اٹھائے اور اپنے تدبر اور اپنے وزرا کی دانشمندیوں سے اس ملک کو اس درجہ تک پہنچایا کہ کشمیر کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ہے۔ میں نے مذہب کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ علم اور صاحبان علوم وفنون کی جی بھر کر قدر کی۔ موسیقی کے کمالات سے بھی کافی حظ حاصل کیا۔ رعایا کے آرام و آسائش کا بھی ہر وقت خیال رکھا۔ عمر بھی خدا نے کافی دی ہے۔ اب مجھے دنیا میں کوئی کام نظر نہیں آتا۔ صرف یہ فکر دامنگیر ہے۔ کہ اس ملک کی خشک کھیتی کو میں نے نصف صدی تک اپنے خون سے سینچا ہے۔ اور اپنے پسینے کے قطروں سے جس کی آبیاری کی ہے۔ میرے بعد اس ملک کا کیا حال ہوگا۔ اور میری عزیز رعایا کو ان نالائقوں کے ہاتھوں کس طرح امن چین نصیب ہوگا۔ میری صحت ان تفکرات کی وجہ سے مجھے جواب دے رہی ہے۔ اب میری یہی خواہش ہے کہ میں جلد تر اس دنیا سے رخصت ہو کر ابدی آرام حاصل کر دوں۔

بادشاہ نے ذرا دم لینے کے بعد پھر کہا اگر میرے فرزند آپس میں لڑتے لڑتے مر بھی جائیں گے۔ تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ کہ مجھے ان کی موت کا کوئی صدمہ نہ ہوگا۔ البتہ ان کی باہمی عداوتوں۔ لڑائیوں اور خانہ جنگیوں کی بدولت رعایا پر جو مصیبت اور تباہی آئے گی اس کا غم مجھے اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔ جب میری زندگی ہی میں میرے نالائق فرزندوں کی وجہ سے رعایا مصائب و آلام کا شکار ہوگئی ہے۔ تو بتاؤ میرے زندہ رہنے کا کیا فائدہ ہے؟

شہریور لکھتا ہے کہ بادشاہ اس قسم کے روحانی صدمات کی وجہ سے روز بروز اداس اور کمزور ہو رہا تھا۔ اور بری افواہوں کے پھیلنے سے شہر کے خرد و کلاں سب مضطرب الحال رہتے تھے۔

ایک دن ایک وزیر نے بادشاہ سے کہا جب فرزندوں کی طرف سے ناامیدی ہے۔ تو پھر یہ خزانۂ عظیم کس لئے رکھا ہے۔ بادشاہ نے کہا یہ آپ نے درست کہا ہے۔ لیکن سنو میں نے خزانہ کیوں محفوظ رکھا ہے۔ تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ میرے بعد میرے بیٹوں میں سے قتل و خون کے بعد آخر کوئی نہ کوئی بادشاہ تو بنے گا۔ اور بادشاہ ہو کر اگر اس نے خزانہ خالی دیکھا تو میری عزیز رعایا کو جو مجھے ان نالائق فرزندوں سے بھی عزیز تر ہے۔ لوٹ کر تباہ کر دے گا۔ اور اگر وہ خزانے کو بھرپور پائے گا۔ تو اس جمع شدہ خزانے کی بدولت میری عزیز رعایا اس کے آیندہ ظلم و ستم سے ایک حد تک محفوظ رہے گی۔ یاد رکھو اگر شیر کا پیٹ بھرا ہوا ہو۔ تو وہ اپنے غار میں مزے سے خراٹے مارتا رہتا ہے۔ لیکن اگر وہ بھوکا ہو تو وہ گائے بھیڑ بکری اور انسان اور ان کے علاوہ جو کچھ اس کو اس کی خوراک کے قابل ملے چیر پھاڑ کر تمام کر دیگا۔

شرپور لکھتا ہے۔ کہ وزیر بادشاہ کی اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔

بادشاہ کے آخری ایام کی تلخیاں

بادشاہ کی یاس انگیز علالت۔ اور شہزادوں کی عاقبت نااندیشیوں کی وجہ سے ملک میں اس قسم کا ماحول پیدا ہو چکا تھا۔ کہ ماتحت حکام بھی ایک دوسرے کا کہنا نہ مانتے تھے۔ بادشاہ سلطنت کے معاملات سے قریباً بے خبر رہتا تھا بادشاہ کو اپنے رضاعی بھائیوں سے جن کو اس نے بڑے بڑے عہدے دے رکھے تھے۔ بیوفائی کی کوئی توقع نہ تھی۔ لیکن وہ بھی بادشاہ کے آخری ایام میں اس کا ساتھ چھوڑ کر حاجی خاں کے پاس چلے گئے۔ کئی بے مروت لوگ جودن کو بادشاہ کے ساتھ صلاح ومشورے کرتے رہتے تھے رات کو حاجی خاں کے ساتھ ملی بھگت بن کر رہا کرتے تھے۔ بادشاہ جو محلات سے باہر نکلنا تو کجا بستر علالت سے اٹھنے کے قابل بھی نہ تھا۔ ان سیاہ دلوں کی اس قسم کی منافقت سے قطعی لاعلم تھا۔ آج جو بادشاہ کا خیر خواہ بن کے آتا تھا۔ دوسرے دن سُنا جاتا تھا۔ کہ وہ حاجی خاں کے طرفداروں میں ہے۔ یہانتک کہ بادشاہ کو اپنے کسی خیر خواہ پر کوئی اعتبار نہ رہا۔ اور نہ کوئی ایسا آدمی اسے نظر آتا جو اس کے دل کو تسکین دیتا اور بادشاہ اس کے سامنے اپنے درد دل کا اظہار کرسکتا ہے

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں ۔ معلوم کیا کسی کو راز نہاں ہمارا

بادشاہ نے ارشادات۔ حکمناموں اور فرمانوں پر دستخط کرنے ترک کر دیئے۔ تمام انتظام وزرا پر چھوڑ دیا۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے گہری سانس لی اور کہا افسوس ملک کے دشمنوں نے میرے گھر میں تفرقہ ڈال کر سارے ملک میں آگ لگا دی۔

بادشاہ سے اگر کوئی وزیر کچھ دریافت کرتا۔ تو وہ کوئی جواب نہ دیتا۔

وہ ہر وقت متفکر اور غمگین رہتا۔ ایک مرتبہ وزراء نے معاملات سلطنت کے متعلق چند امور دریافت کئے۔ بادشاہ نے آہستگی کے ساتھ جواب میں چند الفاظ کہے لیکن وہ کسی کی سمجھ میں نہ آسکے۔

بادشاہ کے بعض مصاحبین اور اعزّا کی موت

سچ ہے مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ انہی ایام میں بادشاہ کی پیاری ملکہ جو خاندان سادات[1] سے تھی۔ انتقال کر گئی۔ بادشاہ کو اس کی موت سے سخت صدمہ ہوا۔ بادشاہ نے اپنا ایک بھانجا قیام الدین نام سندھو کے ملک میں حاکم بنا کر بھیجا ہوا تھا۔ وہ بادشاہ کو بے حد عزیز تھا۔ بادشاہ نے جب سنا کہ وہ ابراہیم[2] سے لڑتے ہوئے قتل ہو گیا ہے۔ تو اس نے کہا کہ آج میرا دایاں بازو کٹ گیا ہے۔ دریا[3] خاں نام اس کا ایک معتبر مصاحب تھا اس کے مرجانے کا اسے بہت ملال ہوا۔ انہی ایام میں اس کے چند اور درباری بھی جن میں میر خوشامد[4] قابل ذکر ہے مر گئے۔ میر خوشامد کی خدمات سے بادشاہ بہت خوش تھا اور اس کو اپنا حقیقی خیر خواہ سمجھا کرتا تھا۔

---

[1] شریور نے اس بیگم کا نام دولع خاتون لکھا ہے۔ یہ بیگم بیہقی سادات کے قدیم خاندانی قبرستان میں دفن ہے۔ عام طور پر اس کو مخدومہ خاتون کہتے ہیں [2] شریور نے اس کا نام ادراہیم لکھا ہے [3-4] دریا خاں اور میر خوشامد کی نسبت جن کی وفات پر بادشاہ نے رنج و ملال کا اظہار کیا۔ نہ شریور نے کچھ تشریح کی ہے سوائے اس کے کہ وہ ایک معزز درباری تھے اور نہ کشمیر کے فارسی مورخوں نے ان کا کچھ ذکر کیا ہے البتہ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ملا دریا نام ایک شخص کو بادشاہ نے معمولی حالت سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا۔ بخطاب دریا خاں سرافراز ساخت و تمامی کاروبار مملکت بہ او سپرد۔ معلوم ہوتا ہے شریور نے جس کو (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۸)

خسرو بلکہ مطلب ہے۔ ان ایام میں کوئی نہ کوئی بری خبر بادشاہ کو سننی پڑتی تھی بادشاہ ان لوگوں کو ہمیشہ یاد کرتا رہتا تھا۔ جو اس کے رفیق اور خیر خواہ تھے لیکن موت نے ان کو بادشاہ سے جدا کر دیا تھا۔

ایک مرتبہ بادشاہ نے ان درباریوں سے جو اس کے پاس حاضر تھے۔ کہا میں نے اپنے ذاتی شوق اور ان وزراء کے مشورے سے جن کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے گزشتہ ایام گزارے ہیں۔ اپنے ملک کا نام تمام دنیا میں روشن کر رکھا ہے۔ افسوس یہ لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے ہیں ان کی موت کا غم میری زندگی کے آخری لمحوں تک میرے ساتھ رہے گا۔ اب میں بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کے لئے ہر وقت کمر بستہ ہوں ؎

ہوش و حواس و عقل و خرد جا چکے ہیں سب
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

بادشاہ کا ولیعہد مقرر کرنے سے انکار

بادشاہ کے پاس ایک دن چند درباری بیٹھے تھے۔ اور بادشاہ کی شدت علالت کی وجہ سے سب خاموش تھے۔ دفعتاً بادشاہ کا خیال اپنی نالائق اولاد کی طرف چلا گیا۔ اس نے وزراء سے کہا۔ ان حالات میں کہ میرے نالائق لڑکے ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ وزراء میں سے ایک نے کہا حضور والا جس کو لائق و افضل اور سعادت مند تصور کریں۔ کاروبار سلطنت اس کے سپرد کر دیں۔ تاکہ ملک میں نظام امن قائم رہ سکے۔ بادشاہ تمام فرزندوں کی نیتوں اور ان کی عارضی و منافقانہ صلح صفائی سے خوب واقف تھا۔ اس نے کہا ادہم خاں میں چند خصوصیتیں ضرور پائی جاتی ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳۱) اور یاد خاں لکھا ہے وہی دریا خاں ہے۔ بسر خسرو شاہد کے متعلق تاریخ گزشتہ بھی خاموش ہے

لیکن وہ بہت ہی جز و رس اور سخت گیر ہے اِس کے اخلاق بھی اچھے نہیں ہیں۔ اس لئے کوئی قابل اور مدبر شخص اس کے پاس نہیں ٹھہر سکتا۔ حاجی خاں بہت آزاد طبع ہے۔ وہ اس قدر فضول خرچ ہے کہ اگر اس کے قبضہ میں کوئی سونے کا پہاڑ بھی آجائے۔ تو وہ چند دنوں میں اسے ختم کر سکتا ہے۔ نیز شراب خوری کی وجہ سے اس کے توار بھی حکومت کے قابل نظر نہیں آتے۔ تیسرا فتنہ پرور اور احمق ہے وہ میرے ملک کو بہت جلد تباہ کر دے گا۔ میرے مرنے کے بعد جو ہو سو ہو۔ میں اپنی زندگی میں کسی نالائق اور نااہل کو تخت کشمیر پر بٹھا کر رعایا پر ظلم کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا ؎

عروس ملک کسے در کنار مے گیرد کہ بوسہ بر لب شمشیر آبدار زند

جو لوگ اپنی خود غرضانہ چالوں سے میرے فرزندوں کو باہم لڑاتے اور میرے خلاف ان کو بھڑکاتے رہتے ہیں جب میرے مرنے کے بعد کسی نالائق اور عیاش بادشاہ کی ان پر حکومت ہو گی۔ تو اس وقت ان کو میری قدر یاد آئے گی ؎

یاد آئے گی انہیں میری وفا میرے بعد

بادشاہ کی فاقہ کشی

انہی ایام میں رمضان کا مہینہ آیا۔ بادشاہ نے حسب معمول اس مبارک مہینے میں گوشت کا شوربہ تک ترک کر دیا۔ رمضان کے بعد کا ذکر ہے کہ بادشاہ کے درباری حکیم شیوبٹ نے ایک دن بادشاہ کے سامنے حسب معمول کھانا رکھا۔ بادشاہ نے ذرا کبیدہ خاطر ہو کر حکم دیا۔ کہ کھانا واپس لے جاؤ جو میں کھا سکتا تھا کھا چکا۔ شریور لکھتا ہے کہ بادشاہ نے اپنے روحانی صدمات کو کم کرنے کے لئے فاقہ کشی شروع کر دی تھی۔ اس نے کئی دن تک ضعف کے اس عالم میں بھی کھانے کی طرف کوئی توجہ ظاہر نہ کی۔ رعایا کے نیک دل اور ہمدرد بادشاہ کی صحت و

سلامتی کی دعائیں مانگتی اور اس کے اوصاف کے گن گاتی رہتی تھی۔

بادشاہ کی نظروں میں وزرار امرار بیٹوں دوستوں اور آشناؤں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس کے تفکرات کو دور کرسکتا لیکن، بادشاہ کے فرزندوں پر کوئی اثر اس کی فاقہ کشی کا نہ ہوا۔ وہ برابر اپنے جوڑ توڑ میں مصروف رہے۔

بادشاہ کی تسکین خاطر کے لئے شریور کی کوششیں

بادشاہ کا قیام شاہی محل کے درمیانی کمرے میں رہتا تھا۔ وہ اس کمرے سے کسی دوسرے کمرے میں جانے کے قابل بھی نہ تھا۔ اور ویسے بھی وہ اپنے آپ کو اس کمرے میں محفوظ خیال کرتا تھا۔ جب بادشاہ فاقہ کشی کی زحمت سے اور بھی زیادہ کمزور ہونے لگا۔ تو شریور پنڈت نے جو بادشاہ کی طبیعت سے بہت حد تک واقف تھا۔ اس کی تسکین خاطر کے لئے یہ تجویز نکالی کہ اس کو ایک کتاب کی جو روحانیت کے مضامین سے لبریز تھی کتھا سنانی شروع کی۔ وہ لکھتا ہے :-

میں نے کئی راتیں بادشاہ کے پاس بسر کیں۔ اور ہر رات کو اسے سم ہتا (نام کتاب) پڑھکر سنایا کرتا۔ میں اس کتاب کو اس خوش الحانی سے پڑھا کرتا۔ اور پھر اس کے مضامین کی شرح اس تفصیل سے کرتا کہ بادشاہ کو لطف خاص حاصل ہوتا۔ اور میں سمجھ لیتا کہ میں کسی حد تک اس کی تسکین خاطر کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ شریور نے اپنی تاریخ میں سم ہتا کے ایک اشلوک کا ذکر بھی کیا ہے

ف سم ہتا (Sam hitta) یہ کتاب آج تک احمد اور ملا نادری کی تاریخوں کی طرح بالکل ناپید ہے۔ آخری دونوں تاریخیں فارسی میں تھیں۔ جو بڈشاہ کے عہد میں لکھی گئیں اور یہ روحانی کتاب سنسکرت زبان میں تھی۔

جس کا ترجمہ جے سی دت نے انگریزی میں کیا ہے۔ اور یہاں انگریزی سے اردو میں لکھا جاتا ہے۔

"مجھے یہ امر نہایت ہی حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ کہ نیک آدمیوں کا یہ زندہ سراب آسمان کے رنگ کی طرح معدوم ہو جانے والا ہے۔ اور اس کی کوئی یاد بھی باقی نہ رہے گی۔

اے رگھو کے بیٹے یہ طویل ہو یا خوشگوار سمجھ لے کہ یہ حیات مستعار ایک غیر فانی اور خیالی سلطنت کی طرح لمبا خواب[1] ہے۔ اگر یہاں پیدائش۔ بڑھاپا موت اور محبوب ترین چیزوں سے جدائی کا سلسلہ نہ ہوتا۔ اور ہر چیز آنی جانی نہ ہوتی۔ تو کون تھا۔ جو اس دنیا میں پیدا ہونے کی خواہش نہ کرتا۔ آدمی جن چیزوں کی تمنا چھوڑ دینگے۔ ان سے آزاد ہو جائیں گے۔ علائق دنیا سے قطع تعلق کرنے کے بغیر آدمی مسرت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔

بتر لویر کے قول کے مطابق بادشاہ نے سم ہتا کے مندرجہ صدر شلوک کے علاوہ اس کتاب کے اور بھی کئی شلوک زبانی یاد کر لئے۔ ان میں کئی ایسے تھے جو اس کے حسب حال تھے۔ وہ ان کو بار بار پڑھتا تھا۔ ان سے روحانی حظ اٹھاتا تھا۔ اور دیر تک ان کے معانی و مطالب پر غور کرتا رہتا تھا۔

لیکن یہ تسکین بھی عارضی تھی حقیقی تسکین اس کو مرتے دم تک نصیب نہ ہو سکی۔ کیونکہ اس کے فرزند اس کے آئین و قوانین کی خلاف ورزی کر کے ملک میں جو اودھم مچا رہے تھے۔ اس کی خبریں اس کو لحظہ بہ لحظہ ملتی رہتی تھیں۔ اور وہ ایک ہی سرد آہ بھر کر رہ جاتا تھا۔

---

[1] بقول حضرت فانی بدایونی ؎

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

گیارھواں باب

شہزادہ ادہم خاں کی موت اور دوسرے شہزادوں کے حالات

ادہم خاں کو بادشاہ سے کورا جواب

ادہم خاں بادشاہ کی حفاظت اور اس کی خدمت کے بہانے اب بادشاہ کے پاس رہنے کا آرزومند تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اپنے دوسرے دونوں بھائیوں کی مخالفت کی وجہ سے وہ اپنی حفاظت کے بھی ناقابل تھا۔ آخر اس نے ایک دن بادشاہ کی خدمت میں یہ عریضہ ارسال کیا کہ بہرام[1] حاجی خاں کے ساتھ مل کر میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ میرے لئے اب آپ کی پناہ میں آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ مجھے اجازت دیجئے۔ کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل کر سکوں۔

اس پر شرلیر لکھتا ہے اگر بادشاہ پہلے کی طرح صحتیاب اور طاقتور ہوتا تو ادہم خاں کی حفاظت کر سکتا مگر اب تو وہ خود دوسروں کی امداد و اعانت کا محتاج تھا چنانچہ بادشاہ نے اس کو کہلا بھیجا۔ مجھے اب سلطنت کے کاروبار ملکہ اپنی زندگی سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ تمہارے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جاؤ اور جس طرح اپنے آپ کو بچا سکتے ہو بچاؤ۔ ادہم خاں مایوس ہو کر قطب الدین پورہ میں چلا گیا۔ اور وہاں جا کر بھی اسے حاجی خاں کے خوف سے اطمینان قلب نصیب نہ ہو سکا۔

---

[1] شرلیر بہرام کو ہر جگہ برہمہ ہی لکھتا ہے۔

بادشاہ کے مرنے کی افواہیں

شاہزادوں کی باہمی مخالفت اور بادشاہ کی خطرناک علالت بلکہ اس کے قریب المرگ ہونے کی وجہ سے سارے ملک میں انتشار پیدا ہو رہا تھا۔ اس کے انتقال کی افواہیں ہر روز اڑتی تھیں۔ اور چونکہ ہر افواہ کے ساتھ بدامنی اور بدنظمی کا اندیشہ رہتا تھا۔ اس لئے وزراء ہر روز ڈھنڈورے کے ذریعہ ان افواہوں کی تردید کرتے اور رعایا کو اپنے اپنے مذہبی طریقوں پر بادشاہ کی صحت و سلامتی کے لئے دعاؤں کی طرف توجہ دلاتے تھے۔ اس ڈھنڈورے کے علاوہ امراء سلطنت نے امن پیدا کرنے کی ایک یہ تجویز بھی نکالی کہ زندگی سے ناامید بادشاہ کو تکلیف و تکلف کے ساتھ شاہی محل کی ڈیوڑھی کے سامنے لے جاتے۔ جہاں سب لوگ اسے بآسانی دیکھ سکتے۔ وہاں اسے مسند شاہی پر بٹھاتے اور نقارے بجاتے رہتا کہ لوگوں کو بادشاہ کے صحتیاب ہونے کا یقین آجائے۔ اور شورہ پشت لوگ اور شہزادے بدامنی سے باز رہیں۔

اسی سلسلہ میں ہاتھی اور گھوڑے سجا کر بادشاہ کے سامنے سے گزارے جاتے۔ لوگ جوق در جوق بادشاہ کی زیارت کو آتے۔ اور اس کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگتے۔ شیر لیر لکھتا ہے۔ بادشاہ نے اس حال میں بھی جب اپنی عزیز رعایا کو دیکھا۔ تو اس کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ دوڑ گئی۔ ان کے دیکھنے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

بہرام خاں اور حاجی خاں

یہ دونوں بھائی اپنے بڑے بھائی ادہم خاں کے سخت دشمن تھے۔ ان میں بہرام خان زیادہ فتنہ انگیز تھا جب شہر میں یہ خبریں پھیلنی شروع ہوئیں۔

کہ بادشاہ اب رفتہ رفتہ صحتیاب ہو رہا ہے۔ اور وہ شاہی محل کی ڈیوڑھی پر لوگوں کا سلام بھی لیتا۔ اور ہاتھی گھوڑ دل کا ملاحظہ بھی کرتا ہے تو بہرام خاں اپنی آنکھوں سے بادشاہ کی حالت دیکھنے کے لئے شاہی محل میں گیا۔ لیکن جب اس نے بادشاہ کو دیکھا تو سمجھ لیا کہ یہ آخری سنبھالا ہے اور بادشاہ اب صرف چند دنوں کا مہمان ہے۔

چنانچہ واپس آکر اس نے حاجی خاں سے کہا کہ بادشاہ مردہ بدست زندہ کی مثال ہے۔ اسے دنیا ومافیہا کی کوئی خبر نہیں۔ وزرا محض ہمیں خوفزدہ اور مایوس کرنے کے لئے اسے جھروکے میں لے آتے ہیں۔ اس وقت موقعہ ہے۔ ہمارے پاس کافی جمعیت ہے۔ ادہم خاں ہمارے خوف سے قطب الدین پورہ میں مقیم ہے چلو شاہی محلات پر قبضہ کرکے وزرا کو گرفتار کرلیں۔ اور کشتیوں کے پل کو توڑ دیں۔ تاکہ ادہم خاں اس طرف نہ آسکے۔

حاجی خاں نے کہا یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا میں باپ کے آخری لمحوں میں اس کی روح کو صدمہ پہنچاؤں۔ جو کچھ تم چاہتے ہو۔ وہ اپنے وقت پر ہو جائے گا۔ لیکن اس وقت جو کیفیت تم نے بادشاہ کی بیان کی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ میں اس سے اب ایک لمحہ بھی علیحدہ نہ رہوں چنانچہ حاجی خاں باپ کے پاس چلا گیا۔ اور یہ رات اس نے بادشاہ کے پاس بسر کی۔

وزرائے دربار کے عہد و پیمان حاجی خاں کے ساتھ

ادہم خاں نے جب یہ سنا کہ بادشاہ کے ہوش و حواس میں بھی فرق آرہا ہے۔ اور اس پر کئی کئی گھنٹے بیہوشی بھی طاری رہتی ہے۔ تو اس خیال سے کہ معلوم نہیں کس وقت اس کا دم نکل جائے۔ وہ فوج لیکر زینہ نگر یعنی راجدھانی نوشہرہ کی طرف آیا تاکہ دونوں شہزادے لڑ کر تخت پر قبضہ کرلے۔

لیکن اسی دوران میں حسن[۱] مہتمم خزانہ اور دیگر وزراء نے حاجی خاں کے ساتھ عہد و پیمان کر کے اس کو ولیعہدی اور جانشینی کی مبارکباد دی۔ بلکہ شاہی محل میں بلا کر خزانہ اور دیگر تمام لوازمات شاہی اس کے سپرد کر دیئے۔

وزراء نے جب یہ سنا کہ ادہم خاں بھی دارالحکومت کی طرف آرہا ہے تو انہوں نے اس کو قطب الدین پورہ میں واپس جانے پر مجبور کیا۔ اور اس کی واپسی کے ساتھ ہی قسمت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

جب حاجی خاں کی فوج نے یہ سُنا۔ کہ وزرائے دربار نے اس کے ساتھ عہد و پیمان کر لیا ہے۔ تو وہ بھی لوٹ میں حصہ لینے کے لئے مسلح ہو گئی۔ ابھی ملیو اور پرتھی ہار اور بعض دوسرے افسروں نے شہزادے کی فوج کو محلات میں آنے سے روکنا چاہا۔ لیکن فوج نے ایک نہ سنی۔ بلکہ ان کو بیعزت کیا۔

حاجی خاں کو خبر ہوئی۔ تو اس نے اپنی فوج کو ایسی حرکات سے منع کیا اس کا دلی منشا اس وقت بادشاہ کے پاس ہی رہنے کا تھا۔ لیکن اس کو چونکہ ہر وقت اپنی فوج کے بے قابو ہونے کا اندیشہ رہتا تھا۔ اس لئے باپ کے ان آخری لمحوں میں وہ فوج کے ساتھ ہی رہا۔

اسی اثنا میں دادا کی وفات کی افواہیں سُنکر حاجی خاں کا فرزند حسن خاں بھی پونچھ سے سری نگر آگیا۔ جس سے حاجی خاں کی طاقت و قوت اور بھی زیادہ

[۱] (حاشیہ صفحہ ۱۴۴) شریور جس طرح سلطان زین العابدین کا نام ہر مقام پر شری جین العابدین لکھتا ہے اسی طرح اس کے دارالحکومت زینہ نگر کا نام شری جینا نگر لکھتا ہے [۲] طبقات اکبری میں اس کو حسن کچھی لکھا گیا ہے اور لکھا ہے کہ امرائے بڈشاہی میں وہ بزرگ تر تھا اس کو حیدر شاہ کے مصاحب لولی حجام نے قتل کرا دیا تھا فرشتہ لکھتا ہے حسن خاں کچھی را کہ بیشتر ازیں در بیت ادہمی مہ نمودہ بود لولی حجام بہ قتل آمد شریور نے اپنی زینہ راج ترنگنی میں پونچھ کا نام ہر مقام پر پرنتس ہی لکھا ہے جو پونچھ کا قدیم نام ہے۔

ہو گئی۔ جب ادہم خاں وزراء کے مجبور کرنے سے تارہ بل کے رستے اپنے ہمراہیوں سمیت واپس جارہا تھا۔ تو اس کے سب سے چھوٹے بھائی بہرام خاں نے اس کا تعاقب کر کے اس کے کئی آدمی ہلاک کر دیئے۔

ادہم خاں نے ان کا بدلا اس طرح لیا۔ کہ اس کو جو کوئی رستہ میں ملتا۔ وہ مسافر ہوتا یا راہرو، سرکاری آدمی ہوتا یا غیر سرکاری۔ وہ سب کو موت کے گھاٹ اتارتا۔ وہ درحقیقت اپنے مستقبل سے اس وقت بالکل مایوس ہو چکا تھا۔

ادہم خاں کا حسرتناک انجام

طبقات اور فرشتہ اور دیگر تاریخوں میں لکھا ہے۔ کہ ادہم خاں نہایت شجاع اور جواں مرد تھا۔ اور کچھ شک نہیں۔ کہ اگر وہ اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے بادشاہ کو ناراض نہ کر لیتا۔ تو وہ بادشاہ کا بہترین جانشین ثابت ہوتا۔ اس کی شجاعت کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ ہر چند اس کے تعاقب میں ایک جماعت تھی۔ اور اس کے ہمراہ چند ہی آدمی تھے۔ تاہم وہ مردانہ وار دشمنوں کو کاٹتا، مارتا اور چیرتا ہوا نکل گیا۔

ادہم خاں اب کشمیر سے ہجرت کر چکا تھا۔ اور ہر چند اب تخت کشمیر حاصل کرنے کی اسے توقع نہ تھی۔ کیونکہ اس کی تباہ حالی کی وجہ سے اس کے ساتھی بھی اس برے وقت میں اس کو جواب دے چکے تھے۔ لیکن جب اسے یہ خبریں پہنچیں۔ کہ حاجی خاں باپ کی وفات کے بعد ایک حجام بنام لولا کو مصاحب و مشیر بنا کر لہو و لعب میں مبتلا ہے۔ اور کئی نامی آدمی اس حجام کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں۔ اور ملک میں ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ تو اس کے دل میں پھر ایک دفعہ کشمیر پر قبضہ کرنے کا ولولہ پیدا ہوا۔ اس لئے

بے سروسامانی کی حالت میں بھی اس نے ایک خاصی فوج جمع کر لی۔ اور فوج بھی لوٹ مار کی امید پر مرنے مارنے کے لئے ہمہ تن تیار تھی۔ اس اثنار میں مانک دیو راجہ جموں پر مغلوں نے حملہ کر دیا۔ راجگان جموں (مدر دیش) اور سلاطین کشمیر کے جو تعلقات تھے۔ ان کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے انہی تعلقات کی بنا پر راجہ مانک دیو نے ادہم خاں سے امداد طلب کی۔ اس نے بھی سوچا۔ کہ اس مدد و اعانت کے معاوضہ میں کشمیر پر حملہ کرنے کے لئے مجھے بھی مانک دیو سے مدد ملے گی۔ چنانچہ حملۂ کشمیر کا ارادہ ملتوی کر کے وہ راجہ کے ہمراہ مغلوں کی لڑائی میں شامل ہو گیا۔ لیکن دوران جنگ میں اتفاقاً ایک تیر اس کے منہ پر آ کر لگا۔ جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا

ے مارا دیارِ غیر میں مجھکو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

شر لوپر نے حکومت سلطان حیدر کا ذکر کرتے ہوئے مانک دیو کی امداد اور ادہم خان کی موت کے متعلق حسب ذیل سطور لکھی ہیں: "اس دوران میں مانک دیو کی ایک منظم فوج مدر دیش میں ترشکوں کے ساتھ لڑتی ہوئی تباہ ہو گئی۔ ادہم خاں بھی اپنے ماموں راجہ مانک دیو کی حمایت میں ترشکوں کے ساتھ جنگ کر رہا تھا۔ لیکن ایک تیر نے جو سیدھا اس کے منہ پر آ کر لگا تھا۔ اس کو ہلاک کر دیا۔"

حاجی خاں کو جو اس وقت حیدر شاہ کے نام سے کشمیر کا بادشاہ تھا خبر ہوئی۔ تو اس نے بہت افسوس کیا۔ اور راجہ جموں کی معرفت اس کی نعش منگوا کر باعزاز تمام اپنے باپ کے مقبرے کے نزدیک دفن کرائی۔ راجہ نے بھی بڑی عزت وحرمت کے ساتھ اس کی نعش بادشاہ کے پاس کشمیر میں بھجوا دی۔

لہ حاشیہ دیکھو صفحہ ۱۴۸ پر)

بارھواں باب

بادشاہ کی وفات

بادشاہ کے آخری لمحے

ہرچند ضعیف العمری بجائے خود ایک بیماری ہے۔ لیکن بادشاہ ۶۹ سال کی عمر میں بھی جوان ہی نظر آتا تھا۔ اگر اس کے بیٹے اس کو روحانی صدمات نہ پہنچاتے۔ تو شری ور کے قول کے مطابق وہ ہمیشہ جوان ہی رہتا۔ اس عمر میں

(۱) حاشیہ صفحہ ۱۴۷) تاریخ فرشتہ میں بھی صفحہ ۳۴۷ پر ادہم خاں کے واقعہ مرگ کے ذکر میں لکھا ہے "و بہ رفاقت ملک دیو (ملک دیو غلط ہے صحیح مانک دیو ہے) راجہ جموں بہ جنگ مغولانے کہ دراں نواحے آمدہ بودند۔ رفتہ تیرے بر دہن او خوردہ۔ بہماں زخم درگزشت شاہ از خبر وفات او متاثر شدہ فرمود۔ تا قالب اورا از جنگ گاہ آوردہ نزدیک مقبرہ پدر مدفون نمودند" لیکن ان دو شہادتوں کے باوجود جن میں شری ور کی شہادت چشم دید ہے سری نگر میں یہ مشہور ہے کہ محلہ سیہہ یار میں جو ایک چھوٹا سا قبرستان ہے۔ اور جہاں کبھی ملک سیف الدین سیہہ بٹ وزیر سلطان سکندر بت شکن کے مکانات تھے۔ شہزادہ ادہم خاں مدفون ہے۔ راقم الحروف خود بھی ۱۹۳۶ء میں وہاں گیا۔ مقبرہ کا تعویذ سنگ سیاہ کا ہے۔ اور اس پر بہت کچھ لکھا ہوا ہے۔ جو افسوس کہ پڑھا نہیں جاتا البتہ مشرقی و مغربی جانب یہ مشہور رباعی جو کشمیر کی اکثر قبروں پر لکھی ہوئی نظر آتی ہے درج ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۹ پر)

بھی کہ وہ پون صدی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کی ڈاڑھی میں جو اس کے چہرے پر نہایت خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ صرف چند بال ہی سفید نظر آتے تھے۔

لیکن جب فرزندان ناہموار باہمی لڑائیوں میں مصروف ہوں۔ بلکہ باپ کا مقابلہ کرنے اور اس کی جان لینے سے بھی دریغ نہ کرتے ہوں۔ اور دوراندازمصاحبین فتنہ پردازیوں اور فتنہ سازیوں سے ایک دوسرے کو گرانے اور ذلیل کرنے اور اس کے فرزندوں میں عداوت و منافقت پیدا کرنے کے درپے رہتے ہوں۔ تو ان روحانی صدمات کی وجہ سے موت و حیات کی جو کشمکش ہے۔ اس کو کسی بدنصیب باپ کے لئے دائمی رخصت کا پیغام لانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔

بادشاہ اب ہر وقت بیہوش سا رہتا تھا۔ اس کو اس بات کا کوئی علم نہ تھا کہ اس کے فرزند کیا کر رہے ہیں۔ اور اس کے وزرا رکن سازشوں میں مصروف ہیں۔ وہ کوئی بات کرنے کسی بات کے سننے اور کسی بات کا جواب دینے سے قطعی عاجز تھا۔ اس کے منہ میں جو کچھ ڈالا جاتا تھا۔ اس کے نگل لینے کی طاقت بھی اس میں نہ تھی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۲) سے

زیں جہاں رفتیم و دل برداشتیم — با جہاں داراں جہاں بگذاشتیم

ایمنے جستیم از دست اجل — اے دریغا ما غلط پنداشتیم

ایک جانب "وفات ماہ رمضان" کے الفاظ بھی ہیں لیکن سنہ نہیں ہے ایک قبر کو اس کے فرزند سلطان فتح شاہ کی قبر بتایا جاتا ہے بعناب کے بے برگ بار بوٹے قبرستان میں جا بجا پھیلے ہوئے ہیں مناقب السادات مولفہ مولوی محمد شاہ سادات مفتی کے صفحہ ۴۰ پر محلہ سیہ یار والی قبر ہی کو ادہم خاں کی قبر لکھا گیا ہے جو درست نہیں ہے ادہم خاں یقیناً مقبرہ بڈشاہی میں دفن ہے محلہ سیہ یار ملک سیہ بٹ کے نام سے مشہور ہے۔

شریور لکھتا ہے۔ آخری وقت میں کبھی کبھی اس کے ہونٹ ہلتے نظر آتے تھے۔ لیکن یہ کسی کو معلوم نہ ہو سکتا تھا۔ کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور کس کو کہہ رہا ہے۔ عام خیال اس وقت یہی تھا۔ کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق اپنے آخری لمحوں میں خدا کا نام لے رہا تھا۔

بادشاہ کی وفات

جمعہ کا دن تھا۔ دوپہر کا وقت اور جیٹھ کا مہینہ۔ چاند اپنی مسافت کا بارہواں دن ختم کرنے والا تھا۔ کہ بادشاہ کی حالت دگرگوں ہوگئی۔

ندائے قدس کا نزولِ اجلال آفتاب عالمتاب کی شکل میں ساری دنیا پر چھا رہا تھا۔ اسی وقت اس جلیل القدر بادشاہ کی مقدس اور سعید روح لقائے محبوب کے شوق میں رفیق اعلیٰ سے جا ملی۔ اور اپنے فداکاروں کو تڑپتا چھوڑ گئی۔

شریور لکھتا ہے میں بادشاہ کے آخری لمحوں میں اس کے پاس موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ نہایت اطمینان اور شانتی کے ساتھ وہ آخری سانس لے رہا ہے۔ ساعت وفات کے قریب اس کا چہرہ بارونق ہوگیا تھا۔ اس کی پیشانی پر موت کے پسینہ کے چند قطرے نزع کے عالم میں نظر آئے جن کی شان اور چمک اس وقت گوہر آبدار سے کم معلوم نہ ہوتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بھی قطرات اشک موتیوں کی طرح ٹپک رہے تھے۔ اور اس کے مرنے کے بعد بھی ان کا کچھ سلسلہ جاری رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی عزیز رعایا کے مستقبل کے غم میں روتا ہوا اس جہاں سے رخصت ہو رہا ہے۔

بادشاہ کی موت دنیائے شریعت و طریقت کے لئے ایک سانحہ عظیم تھی۔ اس کی موت ملکی ترقی، فارغ البالی اور ہنر نوازی و معارف پروری کے لئے ایک صدمہ روح فرسا تھی۔ امراء وزراء، عالم اور صوفی و مشائخ اور شاعر، ہندو

اور مسلمان سب اس مقدس انسان کے انتقال اور اس متاع عزیز کے لٹ جانے پر جس کو وہ مرشد عالم و عالمیان سے کم نہ سمجھتے تھے۔ بصد قلب وزبان سے ماتم کناں تھے۔ کاش یہ ہر دلعزیزی و مقبولیت اس کے جانشینوں کو بھی نصیب ہو سکتی۔

بادشاہ کا صحیح سال وفات

کشمیر کی تاریخوں میں بادشاہ کا سال وفات ۸۷۸ھ اور ۸۷۹ھ درج ہے۔ یوم وفات کا کہیں ذکر نہیں۔ عمر ۶۹ سال اور مدت حکومت کسی نے ۵۲ سال کسی نے ۵۰ کسی نے ۵۱ لکھی ہے۔ لیکن جیسا کہ بادشاہ کی وفات کے ضمن میں ذکر کیا گیا ہے شریور جو بادشاہ کے آخری لمحوں میں اس کے پاس موجود تھا۔ اس کا یوم وفات جمعہ لکھتا ہے۔ بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ دوپہر کے وقت اس کے مرغ روح نے قفس عنصری سے پرواز کی۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ مہینہ جیٹھ کا تھا۔ اور تاریخ بارہ۱۲ جیٹھ تھی۔ نیز وہ اپنے محبوب بادشاہ شری جینا کی حکومت ۵۰ سال بتاتا ہے۔

اور لکھتا ہے۔ کہ وہ گزشتہ صدی کے ماہ جیٹھ سنہ ۹۶ لوکک[۱] میں تخت نشین ہوا تھا۔ اور موجودہ صدی کے ماہ جیٹھ سنہ ۴۶ لوکک میں اس نے انتقال کیا۔ عمر اس کی ۶۹ سال تھی۔

لوکک سنہ ۴۶ کے مطابق عیسوی سنہ ۱۴۷۰ تھا۔ اور ۱۲ جیٹھ کے مطابق ۲۰ مئی کی تاریخ تھی۔ اس وقت ہجری کا سال ۸۷۴ھ تھا۔ ذیقعد کی ۲۵۔

---

[۱] ۹۶ سے مراد ۴۴۹۶ لوکک اور ۴۶ سے مراد ۴۵۴۶ لوکک ہے۔

تاریخ تھی۔ایام حکومت میں مختلف مورخین نے سال دو سال اور عمر میں جو چار سال کا فرق ظاہر کیا ہے۔وہ قمری و شمسی حساب کی وجہ سے نظر آرہا ہے درحقیقت سال وفات اور مدت حکومت وہی صحیح اور درست ہے۔جو شرلوبر نے لکھی ہے۔کیونکہ اس سے زیادہ معتبر سند اور کسی کی نہیں ہوسکتی۔

بادشاہ کی تجہیز وتکفین

شرلوبر لکھتا ہے۔بادشاہ کی وفات کے بعد شہر بے رونق اور سنسان دکھائی دیتا تھا کسی شخص نے اس دن شہر میں کھانا نہیں کھایا۔نہ کسی مکان سے دھواں اٹھتا نظر آیا۔ہر گھر بجائے خود ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ اور ہر شخص یہی سمجھ رہا تھا۔کہ بادشاہ نہیں۔بلکہ اس کے اپنے خاندان کا کوئی بزرگ ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگیا ہے۔آخر اس متبرک نعش کو بیش قیمت لکڑی کے تابوت میں رکھا گیا۔چند آدمیوں نے اس تابوت کو کندھوں پر اٹھایا۔اور نعش پر شاہی چتر کا سایہ کیا گیا۔ اس موقعہ پر وزرا امرا عام وخاص چھوٹے بڑے امیر وغریب مرد وعورت ہندو مسلمان سب آہ وزاری کر رہے تھے۔

جب بادشاہ کا جنازہ شہر میں سے گزر رہا تھا تو تمام لوگ روتے اور سینہ کوبی کرتے تھے۔اور اس قسم کے ماتمی الفاظ ان کی زبان سے نکل رہے تھے۔کہ ان کو سنکر پتھر سے بہتر دل بھی پگھل جاتا تھا۔بادشاہ کی نعش پر نہایت قیمتی کپڑے ڈالے گئے تھے۔اور لوگ اشک آلود

---

[1] دیکھو زینہ راج ترنگنی از شرلوبر پنڈت۔ترنگ اول فصل ۷

آنکھوں سے نعش کو دیکھ رہے تھے۔ آخر بادشاہ کی نعش بادشاہی قبرستان میں لائی گئی۔ جہاں اس کے بزرگ اسلاف اور اس کے خاندان کے کئی شہزادے ہمیشہ کی نیند سو رہے تھے۔ بادشاہ کی قبر اس کے باپ کے پہلو میں بنائی گئی اور وہ نادر الوجود ہستی جس نے اپنی انصاف پرور علم دوست اور بے تعصب حکومت کی وجہ سے کشمیر کی عظمت کا سکہ ہندوستان کے علاوہ عرب و روم ایران و خراسان تک بٹھا رکھا تھا۔ فوجی جاہ و جلال کے ساتھ سپرد خاک کر دی گئی۔

شر لوبر جو شاہی مزار تک جنازے کے ہمراہ تھا۔ لکھتا ہے سب لوگوں نے اپنے مراسم کے مطابق نعش کے صندوق کو قبر میں رکھنے کے بعد اپنے ہاتھوں سے اس پر مٹی ڈالی۔ بادشاہ کی قبر پر ایک بلورین پتھر رکھا گیا۔ اس پر بادشاہ کی وفات کے اشعار کندہ کر لئے گئے۔ یہ پتھر ان تمام پتھروں سے بڑا اور قیمتی تھا۔ جو دوسرے بادشاہوں اور شہزادوں کے مزاروں پر پہلے سے موجود تھے۔

بادشاہ کی وفات کے بعد بھی کئی دن تک ایک جم غفیر دعائیں مانگنے کے لئے آتا رہا۔ اور کئی لوگ تو بے اختیار ہو کر رو دیا کرتے تھے جمعہ کے دن اس کثرت سے لوگ وہاں جاتے تھے کہ تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی تھی۔

ولیعہد حاجی خاں باپ کی قبر پر

شر لوبر نے یہ نہیں بتایا کہ بادشاہ کے پاس اس کی موت کے وقت کون کون تھا۔ وہ صرف اپنا ہی نام بتاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت اور بھی کئی درباری وہاں موجود ہونگے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کے فرزندوں میں سے اس کے انتقال کے وقت کوئی اس کے پاس نہ تھا

اس کا بڑا فرزند ادہم خاں اپنے دونوں بھائیوں کے خوف سے کشمیر سے باہر چلا گیا تھا حاجی خاں اور بہرام خاں دونوں باہم متفق تھے لیکن وزرا نے ان کو بھی آخر وقت تک بادشاہ کے پاس نہیں آنے دیا بلکہ شہر لوررلکھتا ہے کہ حاجی خاں نے شاہی قبرستان میں آکر باپ کا منہ دیکھا جہاں وہ اس کو بالکل سویا ہوا نظر آیا۔ وہ باپ کا منہ دیکھکر زار زار روتا رہا۔ اور بے اختیار ہو کر کہتا رہا۔ سکندر میرا دادا بڑا خوش قسمت ہے۔ جو اپنے ہر دلعزیز فرزند کے ساتھ اس وقت ملاقات کر کے خوش ہو رہا ہے۔ اور مجھ فرزند پر افسوس ہے۔ کہ میں اپنے مشہور عالم باپ کی آخری ساعتوں میں بھی اس کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔

والد محترم آپ جنت میں تن تنہا چلے گئے۔ آپ نے ہر تقریب میں مجھے ساتھ رکھا۔ یہاں کیوں نہ مجھے ساتھ نہ لیا۔ آپ وہ تھے کہ آپ کو شاہی بستر کے بغیر نیند نہ آسکتی تھی۔ اب آپ اس منوں مٹی کے نیچے کس طرح آرام سے سو رہے ہیں ؎

"زیر خاک آمدہ اے دیدہ بینا چونی
تیرہ شود دیدۂ بینا ز غبارے تیرہ"

ہم نالائق فرزندوں نے آپ کا آرام حرام کیا۔ آپ کی زندگی اجیرن کر دی اور ہماری ہی ان نافرمانیوں کی وجہ سے آپ ہم سے ناراض ہو کر ایسی جگہ چلے گئے ہیں۔ جہاں سے کوئی واپس نہ آسکا۔"

والد محترم میں آپ کے خوبصورت چہرے کو اپنے تصور اور آپ کی تصویر دونوں میں دیکھ رہا ہوں۔ اب مجھے نصیحت آمیز باتیں کون سنائے گا۔ آپ کے بغیر مجھے دن رات کی مانند ہے اور سدا بہار باغ پرانے کھنڈر ہیں۔ اور زندگی مجھے موت کی ہیبت ناک شکل میں نظر آرہی ہے۔

میرے بادشاہ اور میرے باپ! کسی طرح واپس آؤ۔ اور اپنے شرمسار

بیٹے کو اپنا منہ دکھاؤ۔ اور اس نالائق کی تسلی کے لئے کوئی لفظ اپنی شیریں زبان سے نکالو۔"

شریور لکھتا ہے۔ شہزادہ وہاں رو رو کر نڈھال ہوگیا۔ آخر وزرا اس کو بہ مشکل تمام شام کے بہت دیر بعد واپس لائے۔ اور اس نے وہیں متنک[1] کی رسم ادا کی۔

شہزادے نے باپ کی قبر پر ہی یہ حکم نافذ کیا۔ کہ اس کی ذاتی جاگیر میں سے سالورہ[2] نام گاؤں اس مزار کے ساتھ اس لئے وقف کیا جائے کہ گرمیوں کے ایام میں اس کی آمدنی سے یہاں مسافروں کو پانی پلانے کا انتظام کیا جائے۔ اور جو لوگ اس خدمت پر مامور ہوں۔ ان کو اس گاؤں میں کاشت کے لئے اراضی مفت دی جائے۔

معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کا انتقال چونکہ مئی اور جیٹھ کی پسینہ بہا دینے والی گرمیوں میں ہوا تھا۔ اور شہزادے نے گرمی کو خاص طور پر محسوس کیا۔ اس لئے صرف پانی کی سبیل کے لئے ہی ایک گاؤں اس

---

[1] متنک کی رسم قدیم ہندوانہ رسم ہے۔ یہ رسم لاش کو جلانے سے قبل لاش کے گرد پھیرا کر ادا کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرنے والے کا فرزند یا کوئی اور جانشین اپنی تقصیرات کی معافی چاہتا ہے۔ اور خدمت ادا نہ کر سکنے پر اپنی ندامت کا اظہار کرتا ہے۔ پنڈتوں میں اس رسم کو آلت کہتے ہیں یہی رسم بادشاہ کے ولی عہد نے بھی قبر کے گرد طواف کرکے ادا کی۔

[2] یہ گاؤں اب بھی تحصیل خاص میں موجود ہے۔ اور علاقہ گاندربل میں کھیر بھوانی کے نزدیک واقع ہے۔

نے وقف کر دیا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ بادشاہ کی قبر کی حفاظت وتعمیر وغیرہ کے لئے کیا کچھ انتظام نہ ہوا ہوگا[1]

شہزادہ اپنے کئے پر بہت کچھ نادم تھا۔ لیکن بادشاہ کی روح تو اس کی آہ وزاری کے جواب میں یہی کہتی ہوگی ؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

بادشاہ کی تصویر اور اس کا حلیہ

شہزادہ حاجی خاں جو باپ کی وفات کے بعد حیدر شاہ کے نام سے کشمیر کا بادشاہ ہوا۔ بادشاہ کی قبر پر جب یہ الفاظ کہتا ہے "میں آپ کے خوبصورت چہرے کو آپ کے تصور اور آپ کی تصویر دونوں میں دیکھ رہا ہوں۔ تو خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ بادشاہ کی تصویر بھی ضرور موجود تھی۔ اور جب بادشاہ کو صنعت وحرفت اور موسیقی وشاعری اور دوسرے فنون لطیفہ کا قدردان بلکہ بانی اور سرپرست پایا جاتا ہے۔ تو ضرور اس کے زمانے میں مصوروں کی بھی قدر افزائی ہوتی ہوگی۔ اور اس نے خود اپنی تصویر بھی بنوائی ہوگی۔ مگر افسوس ہے سعی موفور کے باوجود بادشاہ کی تصویر نہ مل سکی۔ البتہ اس کے درباری شاعر اور مؤرخ پنڈت شری ور نے اس کے خدوخال کا دھندلا سا نقشہ بنایا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

بادشاہ کا سینہ بہت کشادہ تھا۔ ناک لمبی اور خوشنما اور نازک تھی اور مشکہ[2]

---

[1] بادشاہ کا قبرہ زینہ کدل سے چند قدم آگے برلب دریا ڈاک خانہ مہاراج گنج کے سامنے ہے۔ یہ شاہی قبرستان جو روز بروز معدوم ومحدود ہو رہا ہے۔ اپنی تشنگی وتنگی کی وجہ سے عبرت گاہ عالم ہے [2] مشک سنسکرت لفظ ہے کشمیری شوگا ہر اور طوطے کو کہتے ہیں

جانور سے مشابہت رکھتی تھی بادشاہ کی آنکھیں کنول کے پھولوں کی طرح بڑی بڑی اور روشن تھیں۔ پیشانی خوبصورت تھی۔ اور داڑھی میں جو اس کے چہرے پر بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ چند سفید بال بھی موجود تھے۔

زین العابدین بڈشاہ اور شہنشاہ اکبر

بڈشاہ بادشاہ کو کشمیر میں اور اکبر کو سارے ہندوستان میں عظیم شہرت و ہردلعزیزی حاصل ہے۔ اور اس ہردلعزیزی میں ان دونوں کا مقابلہ بھی کیا گیا ہے۔ اکبر چونکہ سارے ہندوستان کا شہنشاہ تھا۔ بڈشاہ کی حکومت چونکہ کشمیر کے علاوہ کاشغر تبت پنجاب اور سرحدی علاقہ کے بعض حصص پر بھی تھی۔ اس لئے بقول صاحب "اسلامک کلچر ان کشمیر" ان کی مماثلت و مشابہت وسعتِ ملک کے لحاظ سے نہیں بلکہ وسعت اخلاق کے لحاظ سے ہونی چاہیئے۔

بڈشاہ کے دربار میں بھی ابوالفضل فیضی، بدایونی اور ٹوڈرمل جیسے یگانہ روزگار مصاحب موجود تھے۔ لیکن دقت یہ تھی۔ کہ بڈشاہ کے حالات کی کتابیں اور تاریخیں کشمیر کی چہار دیواری ہی میں محدود رہیں۔ اور انقلاب روزگار نے آج ان میں سے بھی کئی ایک کو صفحۂ عالم سے مٹا رکھا ہے۔ اکبر کے عہد کی تاریخیں اس کی توسیع حکومت کے ساتھ ساتھ سارے ہندوستان میں پھیلتی گئیں۔ اور جب ہندوستان میں مطابع کا اجراء ہوا۔ تو ان کی شہرت نے ان کو زیور طبع سے آراستہ ہونے کا موقعہ بھی دے دیا۔

نیز اس کے دربار میں اہل فرنگ بھی آئے۔ اور انہوں نے اپنے ملکوں میں جاکر مشرقی درباروں کا بطور عجائبات ذکر کیا۔ اور بادشاہ کے حالات پر جس نے نصاریٰ کو اپنے ملک میں ہر قسم کا آرام دیا۔ بلکہ ان کا بڑا اعزاز کیا تھا۔ کتابیں لکھیں۔ اور شائع کیں۔ اور مدارس کی تاریخ ہند نے نمایاں

طور پر اکبر کو اپنے صفحات میں جگہ دی۔ پھر اکبر کے حالات جب مولانا آزاد دہلوی نے اردو زبان میں لکھے۔ تو انہوں نے اپنی مشہور جادو نگاری سے اس کی شہرت کو بقائے دوام کا خلعت پہنایا۔

چھاپے کی برکت سے نہ صرف اکبر کے عہد کی بلکہ اس سے پہلے زمانے کی کئی کتابیں بھی آج عام طور پر مل سکتی ہیں۔ لیکن کشمیر کی جتنی فارسی۔ کشمیری[1] یا سنسکرت کی تاریخیں اور دیگر علوم و فنون کی کتابیں ہیں۔ اہل کشمیر کی تنگدلی و جہالت کی وجہ سے ہنوز پردۂ گمنامی میں ہیں۔ بلکہ اکثر ضائع ہو چکی ہیں۔ کچھ انگریزی اور جرمن سیاح خرید کر لے گئے ہیں۔ اور کچھ مالکان کتب کی نااہلیت کی وجہ سے کیڑوں کی نذر ہو رہی ہیں ورنہ زین العابدین کے حالات میں ملا نادری نے تاریخ نادری اور رسوم پنڈت نے زینہ حیرت اور بعض مصنفوں نے اس کے عہد میں جو تاریخی کتابیں فارسی اور سنسکرت زبان میں لکھی ہیں۔ ان کا ترجمہ اگر کہیں شائع ہو جائے تو دنیا کو بڈشاہ کی طرز حکومت اور اس کی لازوال ہر دلعزیزی کا شاید کچھ علم نہ ہو سکے۔ کیا کسی اور مسلمان بادشاہ کے حالات بھی آج تک سنسکرت زبان کی تاریخوں میں لکھے گئے ہیں۔

یہ دعوے نہایت وثوق سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ زین العابدین سوائے توسیع مملکت کے تمام باتوں میں اکبر سے زیادہ رتبہ رکھتا تھا۔ اور یہ تو ایک

لے دربار اکبری عہد اکبری کی شاندار تاریخ ہے۔ تہ اس کے مقابلے میں بڈشاہ کے حالات اردو زبان میں لکھے تو مجھ جیسے ہیچدان نے تہ دیباچہ اسرار الابرار میں لکھا ہے

[1] تواریخ کشمیر بعضے بہ لغت کشمیری و بعضے بہ زبان پارسی۔

کھلی ہوئی بات ہے۔ کہ زین العابدین نے ۸۷۴ھ میں انتقال کیا۔ اور اکبر ۹۶۳ھ میں تخت نشین ہوا۔ یا بہ الفاظ دیگر اکبر زین العابدین کی وفات کے ۸۹ سال بعد تخت پر بیٹھا۔ اور جب اس نے ۹۹۵ھ میں کشمیر پر قبضہ کیا اور اس کو بڈشاہ کی ہر دلعزیزی کا علم اور اس کے عہد کی تاریخوں اور کتابوں کا پتہ چلا۔ تو اس نے بڈشاہ کے حالات دریافت کرنے کے لئے کشمیر کی تاریخوں اور کتابوں کے ترجمے کرائے اور بڈشاہ کی اور اس کی اس قابل تقلید طرز حکومت سے بھی یقیناً بہت واقفیت پیدا کی۔

بڈشاہ خود عالم تھا۔ کئی زبانوں سے آگاہ تھا۔ علم حدیث وفقہ میں درجۂ اجتہاد نہ رکھتا ہو۔ لیکن ان علوم پر اس کو کامل عبور تھا۔ مذہبی کتابوں کے لئے سرزمین حجاز تک زاد راہ دے کر لوگوں کو بھیجتا تھا۔ علماء و مشائخ کی قدر کرتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اکبر دین و مذہب سے بالکل کنارہ کش تھا۔ اس نے بڑے بڑے عالموں کو اور مفتیوں کو شراب پلا دی۔ وہ علماء و مشائخ کا مضحکہ اڑاتا تھا۔ اور ایک نئے دین کا بانی بنا تھا جس کا نام اس نے "دین الہٰی اکبر شاہی" رکھا تھا۔

وہ کبھی آگ کو پوجتا کبھی مریم و عیسےٰ کی تصویروں کو چومتا۔ کبھی آفتاب کی پرستش کرتا۔ کبھی ماتھے پر ٹیکہ لگاتا۔ اور کبھی شاہی خاندان کے کسی فرد کی موت پر ہندوؤں کی طرح سر منڈا اور داڑھی منڈواتا۔ اور اس طرح غیر مسلموں میں ہر دلعزیزی حاصل کرتا۔ بڈشاہ اپنے آخری سانس تک اپنے مذہب پر قائم رہا۔ نہ اس نے آفتاب کی پرستش کی نہ آگ کی۔ نہ اس نے بتوں کو پوجا لیکن بایں ہمہ اس کو تمام ہندوؤں نے بڈشاہ سے بڈشاہ یعنی ہندوؤں کا بادشاہ بنا دیا۔ اس نے ہندوؤں

اور بت خانوں کی جو مسمار اور منہدم تھے۔ از سر نو تعمیر کرائی۔ اور ساتھ ہی مسجدوں کی تعمیرات سے بھی غافل نہ رہا۔ اس نے ہندو جوگیوں اور باعمل سنیاسیوں سے ہمیشہ عقیدت وارادت کا اظہار کیا۔ لیکن مسلمان علما، ومشائخ سے بھی کبھی منہ نہ موڑا۔ اس نے ہندوؤں کے علم وفن کی کتابیں ہندوستان کے مختلف ممالک سے منگائیں۔ اور سنسکرت کو ترقی دینے کی تدابیر نکالیں بلکہ یجر وید کا ایک نسخہ جب اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو اس نے اس کی تصیح کے لئے ایک آدمی کو دکن میں بھیجا۔ لیکن عربی فارسی کی ترویج واشاعت کو بھی اپنا فرض سمجھا۔ اکبر کی پرائیویٹ زندگی عیش وعشرت کا نمونہ تھی۔ راجپوت راجاؤں اور مسلمان امرا کی لڑکیوں نے جو اس کے رشتۂ مناکحت میں بندھی ہوئی تھیں۔ محل شاہی کو اندر کا اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔ اور عہد اکبری کا مینا بازار جس میں صرف عورتیں اور بیگمات ہی شامل ہوتی تھیں۔ اب تک مشہور ہے۔ اس کے خلاف زین العابدین نے یکے بعد دیگرے تین بیگمات کیں۔ جن میں ایک بیگم نرینہ اولاد سے محروم تھی۔ تزکیہ نفس اور ضبط نفس کی یہ ایسی لاجواب مثال ہے۔ کہ اس زمانہ کے کسی مشرقی بادشاہ کو بہت کم نصیب ہوئی ہوگی۔

جس نے دین اسلام میں اپنا علیحدہ مذہب قائم کرکے ایک نیا رخنہ پیدا کر دیا ہو۔ اور اس کی تخریب وتضحیک کے درپے رہا ہو۔ اس سے نماز روزے کی پابندی کی کیا توقع ہو سکتی ہے لیکن بڈشاہ اس کے

---

[1] دیکھو حاشیہ صفحہ ۱۵۹ گلدستۂ کشمیر میں پنڈت ہرگوپال لکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے بادشاہ کی ہنود نوازی کی وجہ سے اس کا نام بڈشاہ مشہور کر رکھا تھا۔

مقابلہ میں نماز روزے کے علاوہ چلہ کشی جیسی سخت ریاضت بھی کیا کرتا تھا۔ اور اس کی شہادت خود اکبر کا بیٹا جہانگیر اپنی توزک میں دیتا ہے۔

اکبر نے مذہب پر ملکی مصلحتوں کو ترجیح دی۔ اور اس کو ضعف پہنچا کر دوسرے لوگوں کو خوش رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن بڈشاہ نے ملکی مصلحتوں سے بھی کام لیا۔ غیر اقوام کو بھی خوش رکھا۔ اور دامن اسلام بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر کے مقابلہ میں وہ بہت زیادہ خراج تحسین واحترام حاصل کر رہا ہے۔

راقم الحروف یہانتک لکھ چکا تھا کہ لفٹنٹ کرنل سر ولزلی ہیگ۔ کی ہسٹری آف انڈیا جلد سوم نظر سے گزری جس کے صفحہ $\frac{281}{282}$ پر تاریخ مصنف نے مختصر الفاظ میں اکبر اور بڈشاہ کے اخلاق عادات کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

" زین العابدین کو کشمیر کا اکبر اعظم کہنا چاہیئے۔ اگرچہ اس میں مغل اعظم جیسی فطری لیاقت۔ فتوحات کی کشش اور جوش کی کمی تھی۔ اور اس کا منتہائے نظر اس تنگ دامن سلطنت سے آگے نہ بڑھ سکا۔ پھر بھی علم وفضل کا وہ ذخیرہ جس کو اکبر اعظم اپنی جوانی کی لاپرائیوں سے حاصل نہ کرسکا۔ بڈشاہ کے پاس وافر موجود تھا۔ اکبر تو صرف مذہبی بے تعصبی کا درس ہی دے کر رہ گیا لیکن زین العابدین نے اپنی مذہبی سرگرمیوں کے ساتھ مساوات اور رواداری پر سختی سے عمل کیا۔ اس لحاظ سے وہ اکبر کی نسبت بہت زیادہ روشن خیال اور حقیقی طور پر رواداری کا مجسمہ تھا "

" وہ جان لینے کے معاملہ میں اکبر کی طرح نرم دل تھا۔ اس نے شکار کی ممانعت کر رکھی تھی رمضان کے مہینے میں وہ گوشت قطعاً ترک کر دیتا تھا۔ لیکن

اخلاقی محاسن سے وہ بلاشک وشبہ اکبر سے بہت بلند درجہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنی بیگم کے سوا عمر بھر کسی غیر عورت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ بالکل زاہد خشک ہی نہ تھا۔ بلکہ فرصت کے موقعوں پر گویئے۔ رقاص۔ سازندے نٹ۔ نقارچی۔ بازیگر وغیرہ اس کی خوش دلی و تفریح کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ وہ آتشبازی کے فن کا ماہر تھا۔ اس کی قابلیت اس کے زمانہ کی صنعتوں کے لئے ہی وقف نہ تھی بلکہ اسے کشمیر میں آلات حرب اور توپ و تفنگ کا بانی کہا جاتا ہے۔"

تیرھواں باب

بڈشاہ اور اس کے ہمعصر اور زمانہ مابعد کے مصنف و مؤرخ

بڈشاہ علوم و فنون کا قدردان تھا۔ مصنف، شاعر اور اہل ہنر اس کی موت کے ساتھ ہی اپنے مستقبل کی بہتری سے مایوس ہو گئے چنانچہ اس کے فرزند اور جانشین سلطان حیدر شاہ کے عہد میں ایک حجام نے اس کے دربار میں یہاں تک رسوخ حاصل کر لیا کہ اس نے دربار کے منتخب اور چیدہ ارکان چن چن کر کسی نہ کسی بہانے قتل کرا دیئے بادشاہ دن رات شراب کے نشہ میں مست رہتا تھا۔ اور یہ حجام قرب شاہی حاصل کر کے ہر قسم کے احکام اس سے لکھوا لیتا تھا۔

بڈشاہ کی حکومت ملک کے لئے رحمت الٰہی کا نمونہ تھی بعض مصنفوں اور مورخوں نے اس کے عہد حکومت کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے

ان کا ذکر سالقہ سطور میں کہیں کہیں آچکا ہے۔ اور آئندہ کے ابواب میں بھی حسب موقعہ ان کا ذکر آتا رہے گا۔ لیکن یہاں چند ایک تاریخوں کے مختصر سے اقتباسات علیحدہ علیحدہ درج کئے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ کشمیری اور غیر کشمیری اہل الرائے کے نزدیک اس بادشاہ کا کیا مرتبہ اور کیا درجہ تھا؟

پنڈت شری ور مصنّف زینہ راج ترنگنی کی رائے

شری ور لکھتا ہے بادشاہ کیا مرا؟ شعرا اور اہل علم کی قدر دانی بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہوگئی۔ جو کتابیں ہمیشہ کھلی رہتی تھیں۔ اب وہ طاق نسیاں ہوگئیں۔ ہنرور اور اہل فن لاوارث رہ گئے۔ مصنفوں اور مورخوں نے لکھنا چھوڑ دیا۔ ملک کے اہل علم وفضل جو سرکاری قدردانیوں پر ملکی زبان کی ترقی اور فلسفہ و منطق اور صرف ونحو کی چھان بین اور تحقیقات کیا کرتے تھے اب دم بخود تھے۔ یہ بادشاہ ہی کی علم پروریوں کا ایک کرشمہ تھا۔ کہ ملک میں نہ صرف ملکی علما و فضلا ہندو مسلمان کی کثرت تھی۔ بلکہ بیرون کشمیر سے بھی بڑے بڑے علمار اور نامی اہل ہنر اس کی شہرت سنکر یا خود اس کی دعوت پر کشمیر میں آکر اپنی قابلیتوں کے جوہر دکھلاتے تھے۔ یہ ملکی وغیر ملکی علمار سنسکرت زبان کے علوم وفنون کو فارسی اور کشمیری زبان میں منتقل کیا کرتے تھے۔

شری ور لکھتا ہے۔ ایسے قدر دان۔ ہردلعزیز اور نیک دل بادشاہ کے مرنے کے بعد تعجب ہے کہ ہم سخت جان زندہ کس طرح رہ گئے ؎

شرمندہ جی کے کیوں ہوئے ہم ہجر شاہ میں
اب مر رہے ہیں اس کی پشیمانیوں میں ہم

مرزا حیدر کاشغری عالم کشمیر و مصنف تاریخ رشیدی کی رائے

"سلطان زین العابدین پنجاہ سال سلطنت کردہ در تعمیر کشمیر کوشیدہ تمام طوائف را رعایت کرد۔ و نظر در کفر و اسلام نہ انداختہ و در زمان وے کشمیر شہرت یافتہ۔ وتا این زمان آثار وے ظاہر است"[1]

محمد نظام الدین ہروی مصنف طبقات اکبری کی رائے

"وخود نیز در تشخص مہمات کوشش بلیغ مے نمود۔ و بہ جمیع طوائف بہ جہت کسب و دانش صحبت مے داشت۔ و در مجلس او اہل دانش از ہنود و مسلمانان ہمہ وقت حاضر مے بودند و در علم موسیقی مہارت تمام داشت و در تعمیر و تکثیر زراعت ہیچ کس از حکام کشمیر ایں توفیق نیافتہ بودند"[2]

محمد قاسم مصنف تاریخ فرشتہ کی رائے

"وخود تشخیص قضایا مے کرد۔ با جمیع طوائف مردم صحبت داشت وچوں کسب علوم و فنون کردہ بود۔ ہمیشہ مجلس او پُر از دانایان مسلمان و ہنود مے بود۔ علم موسیقی را ورزیدہ بود و اکثر اوقات او بہ تعمیر ولایات و تکثیر زراعات و برآوردن آب ہا مصروف گشت و حکم عام کردہ بود۔ کہ در تمام ولایت ہر چیز اگر کس دزدیدہ شود رئیسان قریات تاوان دہند۔ و قواعد و ضوابط خود را بر تختہ ہائے مس کندہ در ہر شہرے و دیہے گزاشتہ تا رسوم ظلم از ولایت کشمیر بر افتاد گویند بر تختہ ہائے مس نوشتہ بود کہ ہر کہ بیاید و بدیں دستور کار نکند۔ بہ لعنت خدا گرفتار باد"

1۔ تاریخ رشیدی غیر مطبوعہ ورق ۲۴۲ مزاد ازیں تا سنہ تا ایام فرمانروائی مرزا حیدر۔

2۔ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ صفحہ ۲۰۹ تا صفحہ ۲۰۲۔ مقالہ دہم حالات کشمیر۔

شہنشاہ جہانگیر کی رائے توزک جہانگیری میں

شہنشاہ جہانگیر نے اپنی توزک میں جہاں کہیں بڈشاہ کا ذکر کیا ہے۔ بڑے ادب و احترام سے کیا ہے۔ وہ اس کی ایک کرامت کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے "یکے از ناخلف زادگان بہ قصد قتل او، در آں عبادت خانہ او را تنہا یافتہ شمشیر کشیدہ در مے آید۔ چوں او بر سلطان مے افتد۔ بنا بر صلابت پدری و شکوہ صلاح سراسیمہ و مضطرب گشتہ مے گردد۔ بعد از لحظہ سلطان از عبادت خانہ برآمدہ باہماں پسر در کشتی مے نشیند۔ روانہ شہر مے گردد۔ در اثنائے راہ بہ آں پسر مے گوید کہ تسبیح خود را در عبادت خانہ فراموش کردہ ام۔ بر زورقے سوار شدہ۔ تسبیح را خواہی آورد۔ پسر بہ عبادت خانہ درآمدہ پدر را دراں جا مے بیند۔ آں بے سعادت از روئے شرمندگی تمام در پائے پدر افتاد۔ عذر خواہی تقصیر خود مے نماید"

حیدر ملک چاڈ ڈورہ مورخ کی رائے

"در رعیت پروری مثل وے پادشاہے در تواریخ معتبرہ کم نشان دادہ اند و بہ سبب اخلاق کریمہ و اوصاف حمیدہ او جمیع رعایا۔ مرفہ الحال بودند" صفحہ ۳۲

اکثر شعرا و فضلا و اہل کمال نظر برآں کہ سلطان قابل بود۔ میل تمام بہ صحبت ایشاں داد۔ بخدمت سلطان آمدہ بہرہ ور و منتفع مے گردیدند" صفحہ ۳۴

نرائن کول عاجز مصنف تاریخ کشمیر کی رائے

"سلطان ارباب ہنر و حرفہ را از قبیل کاغذ ساز از سمرقند و بلخ طلبیدہ در پرگنہ پھاگ وجہ معاش برائے آں مقرر ساخت و بسیارے بہ

کتب عربی و فارسی بہ فرمودہ او بہ ہندی کردہ کتاب مہا بھارت کہ از کتب مشہور ہند است بہ فارسی ترجمہ شدہ۔ سلطان بہ زبان ہندی و تبتی و فارسی وقوف تمام و مہارت کلی داشت"

خواجہ محمد اعظم مصنف تاریخ اعظمی کی رائے

" سلطان بصفات حمیدہ متصف بود و رعیت پروری بسیار مے نمود لغیر لباس کردہ شب ہا برمے آمد۔ تا حسن و قبح عمل خود بشنود" در ایام او ہنود و مسلمین بلکہ جمیع اہل ادیان نزاع باہم نداشتند۔ ہمہ را در مقام خود جا میداد۔ بلکہ از ہر ملتے بہ جہت منفصل قضایا شخصے را از ہمہ آئین تعین مے کرد۔ ازیں جہت اورا بڈشاہ مے گفتند یعنی پادشاہ کلاں ہرجا از ہر طائفہ کہ مجمع مے شد حاضر مے گشتند۔ گویا وسعت مشربے داشت و صلح کل مے خواست " " اگرچہ ترویج اسلام و تائید سنت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام بہ مرتبہ پدر توفیق نیافت لیکن در ترویج علوم و اعزاز و علماء و فضلاء بلغا و اہل حرفہ و رعیت پروری بہ ابلغ وجوہ کوشش مے نمود۔ و تدارک ظلم و داجو کہ اراضی۔ و بہ ویرانی داشت حتی المقدور آباد فرمود"

دلوان کرپارام مصنف گلزار کشمیر کی رائے

" از دیار بعیدہ درختان میوہ دار از قسم انگور و سیب و زعرور طلبیدہ باغ مرتب نمودہ و در اکثر تالاب ہا سنگارہ و تخم نیلوفر نشاندہ۔ اہل فضل کمال ہر فرقہ را بہ جود و نوال بہرہ مند مقاصد مے داشت تالیف راج ترنگنی بزبان شاستری ابتدائے جے سہم دیو سنگھ تا عہد خود از قدردانی ہائے او ست از بلاد دور بہ علم طلب داشتہ برہمنان را صدقہ میداد و ہزار ار دلج داد۔ گذاشت کہ ہیچ کسے بے شغل و عمل معطل مے ماند۔ (صفحہ ۱۶۶)

پنڈت بیربر کاہیجرو مورخ کی رائے

" در رعیت پروری و دادگستری ہمت بہ اہتمام تمام برگماشت و در عہد حکومتش ہندو و مسلمین را باہم نزاعے نہ بود۔ ازیں جہت بہ رسم بڈشاہ کہ بہ اصلاح کشمیر بادشاہ کلاں رامے گویند۔ اشتہار یافت (ورق ۷۰ مختصرالتواریخ)

پنڈت ہرگوپال کول مصنف تاریخ گلدستہ کشمیر کی رائے

" اس کے عہد میں کسی غریب پر زبردستی مذہبی تعصب نہ ہونے پاتا تھا لوگوں کے املاک جو بعض سینہ زوروں نے زبردستی دبا رکھے تھے۔ اس نے واپس دلائے۔ ہر فرقہ کے اہل فضل و کمال کو یہاں آباد کیا۔ اور ان کی معاش خاطر خواہ مقرر کی بہت سے مدارس بھی بنوائے۔ صدہا کتب کا ترجمہ فارسی۔ عربی۔ ہندی اور شاستری میں کرایا۔ شاستری پستکیں جو کشمیر سے معدوم ہوگئی تھیں۔ اور مقامات سے طلب کرائیں۔ طبی کتب بھی اس کے حکم سے تصنیف کی گئیں۔ جیسے منگوے کے عہد سے لے کر اپنے عہد تک کے حالات شاستری زبان میں لکھوائے۔ کئی شاستر دور دور سے منگوا کر برہمنوں کو مفت دیئے۔ جو ہندو یہاں سے بھاگ گئے تھے ان کو ان کے علمار فضلا سمیت طلب کرکے بلوایا۔ اور نقد و جنس عنایت کرکے یہاں آباد کیا۔ زراعت اور تجارت کو اس نے ازحد ترقی دی اور کئی گاؤں اور کئی قصبے اپنے نام پر آباد کئے۔ یہ بادشاہ اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ میں بے نظیر تھا"[۱]

---

[۱] صفحہ ۱۱۰ و ۱۱۲

لفٹنٹ کرنل سر ولزلی ہیگ مصنف ہسٹری آف انڈیا کی رائے

"وہ عالم اور علم نواز ہونے میں اپنے باپ کا پورا مقلد تھا لیکن باقی تمام امور میں اپنے باپ سکندر بت شکن کی ضد تھا۔ اس کے دربار میں عام برہمنوں اور فاضل ہندوؤں کے لئے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اس کی نیاضی سے اس کی رعایا اور اس کا ملک برابر فیضیاب ہوتا تھا۔ اس نے بلا تمیز مذہب و ملت عوام الناس کو وہ آسائشیں بہم پہنچائیں جن کی اجازت ان کے پیشروؤں کے قوانین نہ دے سکتے تھے۔ اس نے مندروں کو جو ضبط سرکار تھے۔ آزاد کر دیا۔ وہ زاہد خشک ہی نہ تھا۔ بلکہ فرصت کے اوقات میں گوئیے۔ رقاص۔ ماہران موسیقی۔ بازیگر اور مداری بھی اس کی دل لگی و تفریح کا باعث ہوا کرتے تھے۔

چودھواں باب

بادشاہ کے ہمعصر سلاطین اور ان میں سے بعض کے ساتھ دوستانہ تعلقات

جس زمانہ میں کشمیر کی مملکت پر سلطان زین العابدین نہایت جاہ و جلال اور استقلال سے حکومت کر رہا تھا۔ ان ایام میں گو ہندوستان یکے بعد دیگرے خاندان تغلق و سادات ہی کے ماتحت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ امر واقع ہے کہ ہندوستان کے اکثر صوبوں میں خود مختارانہ حکومت

تھی۔ البتہ فرق یہ تھا کہ تخت دہلی پر جو قابض ہوتا تھا ہندوستان کی بادشاہت اسی کی سمجھی جاتی تھی۔

چنانچہ دہلی کے علاوہ ہندوستان میں دکن مالوہ گجرات۔ سندھ۔ بنگال۔ بہار اور ممالک مشرق یعنی جونپور وغیرہ سب جگہ الگ الگ بادشاہ تھے۔ ہم بادشاہ کے ہمعصر سلاطین اور راجگان کا بیان کچھ ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے جن کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم تھے ان کا بھی تذکرہ کریں گے۔

شاہان دہلی

بڈشاہ کے پچاس سالہ عہد حکومت میں دہلی نے چار بادشاہ دیکھے۔ ابوالفتح مبارک شاہ[1]۔ سلطان محمود شاہ[2]۔ سلطان علاؤالدین[3]۔ یہ تینوں سید خضر خاں[4] بانی خاندان سادات کی اولاد سے تھے۔ ان تینوں کی مسلسل کمزوریوں کی وجہ سے ہر صوبہ تخت دہلی سے خودسر ہو رہا تھا۔ بلکہ انہی ایام میں جسرت گکھڑ نے اپنی اور بڈشاہ کی فوجیں سرحد دہلی تک پہنچائیں۔ لیکن جب سلطان بہلول لودی نے خاندان سادات کی بجائے افغان حکومت کی ۸۵۵ھ میں بنیاد رکھی۔ تو اس نے بڈشاہ بادشاہ کشمیر کے پاس جو اس کا ایک طاقتور ہمسایہ تھا۔ تحائف و نفائس بھیجکر رابطۂ مودت[5] محکم کیا۔ بہلول ۸۹۳ھ تک دہلی کا بادشاہ رہا۔ سری ور نے بھی اس بادشاہ کے ساتھ بڈشاہ کے دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ دہلی کا بادشاہ ہمارے بادشاہ کی شہرت

---

[1] تخت نشینی ۸۲۳ھ [2] تخت نشینی ۸۳۷ھ [3] تخت نشینی ۸۴۹ھ [4] صوبہ دار لاہور تھا۔ امیر تیمور ہندوستان کو تباہ کرکے ۸۰۱ھ میں سمرقند واپس جاتے ہوئے اس کو دہلی کا بادشاہ بنا گیا [5] طبقات اکبری۔

عظمت کی وجہ سے اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے پر مجبور تھا۔ کرنل سر ہیگ نے بھی بہلول لودی اور بڈشاہ کے دوستانہ تعلقات کا ذکر کیا ہے

شاہان دکن

بڈشاہ کے طویل عہد حکومت میں دکن میں حسب ذیل تین بادشاہوں نے یکے بعد دیگرے حکومت کی۔ سلطان احمد شاہ بہمنی اس کے بعد نظام شاہ اور اس کے بعد محمود شاہ بہمنی (۸۸۷ھ تک) لیکن شاہان دکن کے ساتھ بادشاہ کشمیر کے تعلقات کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

شاہان ملک گجرات

بڈشاہ کی پچاس سالہ عہد حکومت میں تخت گجرات نے حسب ذیل پانچ بادشاہوں کے قدم چومے۔ سلطان احمد شاہ بانی احمد آباد ۸۴۶ھ۔ اس کا بیٹا سلطان محمد شاہ اور اس کی معزولی کے بعد ۸۵۵ھ میں سلطان قطب الدین تخت احمد آباد پر بیٹھا۔ اس کے بعد ۸۶۳ھ میں احمد شاہ بانی احمد آباد کے دوسرے بیٹے داؤد شاہ نے تخت احمد آباد پر قدم رکھے۔ لیکن ابھی اس کو ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا۔ کہ سلطان قطب الدین کے چھوٹے بھائی محمود شاہ نے بادشاہ گجرات کا لقب حاصل کیا۔

شری ور نے زینہ راج ترنگنی میں گجرات کے نام کے لحاظ سے گجرات کے بادشاہوں کو گُجر بادشاہ لکھتا ہے۔ وہ سلطان محمد کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے کہ محمد سلطان[1] بادشاہ گُجر نے خاص قسم کے اعلیٰ درجہ کے نفیس

---

[1] شری ور سلطان محمد شاہ کا نام محمد سورتران (محمد سلطان) لکھتا ہے۔ اسی طرح کشمیر کے ایک موضع سلطان پور کا نام سورتران پور لکھتا ہے۔

اپنے ملک کے بنے ہوئے پارچات تحفے کے طور پر بھیجے۔ جن کا نام کھنہ بہاس اور گلات تھے۔ فارسی مورخین نے بھی لکھا ہے کہ احمد آباد گجرات کے بادشاہ نے اپنے آدمیوں کے ہاتھ اکثر تحائف و نادرات ایک عریضۂ شوق کے ہمراہ بڈشاہ کو ارسال کئے۔ لیکن بادشاہ کا نام انہوں نے محمد شاہ کی بجائے محمود شاہ لکھا ہے۔ اور وہی صحیح ہے۔ کرنل ہرسیگ نے بھی سلطان محمود ہی نام لکھا ہے۔ اور ساتھ بیگرہ کا لفظ بھی ایزاد کیا ہے۔ جو شاہان گجرات کا لقب تھا۔

شاہان بنگال و بہار

بڈشاہ کے ابتدائی چار برس میں بنگال و بہار میں سلطان احمد بن سلطان جلال الدین بادشاہ تھا۔ اس کے بعد ناصر الدین نے ایک ہفتہ ناہر شاہ نے ۳۲ سال اور باربک شاہ نے ۱۷ سال حکومت کی۔ ان بادشاہوں کے ساتھ بھی بڈشاہ کے تعلقات وابستہ نہیں تھے۔

سلاطین جونپور

سلاطین مشرق میں بزمانہ بڈشاہ ابراہیم[1] شرقی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا محمود[2] شرقی تخت پر بیٹھا۔ محمود کے بعد اس کا فرزند کلاں محمد شاہ صرف پانچ ماہ بادشاہ رہا۔ اس کے بعد حسین شاہ بادشاہ ہوا۔ جو بڈشاہ کی وفات کے زمانے تک زندہ تھا۔ سلاطین شرقی کے ساتھ بھی بڈشاہ کے کسی قسم کے تعلقات نہ تھے۔

شاہان سندھ

بڈشاہ کے طویل زمانہ حکومت میں تخت سندھ نے پانچ بادشاہوں

---

[1] سال وفات ۸۴۴ھ [2] سال وفات ۸۶۲ھ

کی قدمبوسی کی ہے۔ جام[1] تغلق بن جام سکندر۔ جام مبارک۔ جام سکندر۔ جام سنجر۔ جام نظام الدین عرف جام نندا۔ یہ ۸۶۶ھ میں بادشاہ ہوا۔ اور اکسٹھ سال حکومت کرتا رہا۔ ارغون قوم نے ۹۲۷ھ / ۱۵۲۱ء میں جام نندا سے سندھ چھین لیا۔

جام نندا کی حکومت ۹۲۶ھ تک رہی ہے۔ بڈشاہ نے اس کے زمانے میں ۸۷۴ھ میں انتقال کیا۔ صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں۔ بادشاہ سندھ نے گھوڑے اور دیگر تحائف اور بہت سا اسباب شاہانہ بڈشاہ کے پاس بھیجا۔ بلکہ ایک قصیدہ بھی بادشاہ کی شان میں لکھکر روانہ کیا۔ صاحب طبقات رقمطراز ہیں۔ کہ قصیدہ پڑھکر بادشاہ کشمیر نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا وہ اس قسم کا بادشاہ ہے کہ خود بادشاہ اس کی شان میں قصیدہ مدحیہ لکھتے ہیں۔ اور یہ اعزاز روانہ کرتے ہیں۔

[1] جام خاندان کو سام بھی کہتے ہیں۔ یہ خاندان سمر خاندان کے بعد ۷۵۲ھ میں سندھ کا حکمران ہوا۔ بعض مورخوں نے ان کی حکومت کی ابتدا مختلف سنین میں بتائی ہے۔ مثلاً مصنف بیگ لرنامہ لکھتا ہے۔ ۷۳۴ھ / ۱۳۳۴ء میں یہ خاندان تخت سندھ پر بیٹھا۔ اور ایک سو تیرانویں سال تک رہا۔ مصنف تاریخ طاہری لکھتا ہے۔ ۸۴۳ھ / ۱۴۳۹ء میں اس خاندان نے سندھ پر قبضہ کیا اور صرف ۸۴ سال اس نے حکومت کی۔ تحفۃ الکرام لکھتا ہے یہ خاندان ۵۲۷ھ میں تخت نشین ہوا۔ اور ایک سو چھتر سال تک حکمران رہا۔ لیکن مسٹر ایچ ایم ایلیٹ ہسٹری آف انڈیا جلد اول میں ایک طویل بحث کے بعد لکھتے ہیں تاریخ طاہری نے اس خاندان کی جو مدت حکومت لکھی ہے۔ وہ اس لئے غلط ہے۔ (بقیہ حاشیہ دیکھو صفحہ ۱۷۳ پر)

سندھ کا یہ کون بادشاہ تھا۔ اس کی تشریح و توضیح کسی نے نہیں کی۔ یہاں بھی یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ نہ صرف شرلویرنے ہی سندھ کو بڈشاہ کے زیر اقتدار لکھا ہے۔ بلکہ ابوالفضل اور صاحب طبقات کی تحریروں کے مطابق بھی زین العابدین سندھ تک جا پہنچا تھا۔ اور شرلویر نے یہ بھی ایک جگہ لکھا ہے۔ کہ بادشاہ کا بھانجا سندھ کے کسی حصہ کا حاکم تھا۔ کرنل سرہیگ نے جام نظام الدین والئے سندھ کو بادشاہ کا ہمعصر لکھا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے۔ کہ اس سے اس کے بہت خوشگوار تعلقات تھے۔

مملکت پنجاب

بڈشاہ کے زمانے میں پنجاب ہر قسم کی بدامنیوں اور بے چینیوں کا مرکز تھا۔ شاہان دہلی یہاں اپنے گورنر (ناظم) بھیجا کرتے تھے۔ لیکن گکھڑوں کا فرقہ کبھی ان کو چین سے بیٹھنے نہ دیتا تھا۔ بلکہ بڈشاہی فوج نے ہی جسرت گکھڑ کو یہاں استقلال دلایا۔ چنانچہ صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں:۔ "جسرت بہ قوت سلطان اگرچہ نتوانست تسخیر دہلی نمود۔ اماتمام پنجاب را در تصرف آورد" جسرت گکھڑ اور شیخا گکھڑ کا نام تیمور کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲) کہ جب فیروز تغلق بادشاہ دہلی نے ۷۶۲ھ ۱۳۶۱ء میں سندھ پر حملہ کیا۔ تو اس وقت سندھ کے بادشاہ کا لقب جام تھا۔ لیکن جب اس سے ۳۰ سال قبل محمد تغلق نے سندھ کے حاکم پر حملہ کیا تو حاکم سندھ سمر خاندان سے تھا۔ کہ جام یا سام خاندان سے۔ اس لئے تحفۃ الکرام نے جام خاندان کی حکومت کی ابتدا میں ۷۳۴ھ کا جو ذکر کیا ہے۔ وہی درست ہے۔

حملۂ ہند ۱۰۰۰ھ سے بھی بہت پہلے تاریخ کے صفحات پر نظر آرہا ہے جسرت گکھڑ ۸۵۵ھ تک جب بہلول نے دہلی کی سلطنت پر قبضہ کیا ہے زندہ تھا۔ بادشاہ کشمیر سے اس کے تعلقات ہمیشہ شگفتہ رہے ہیں۔

راجہ پنج ند

کہا جاتا ہے کہ پنج ند سے مراد پنجاب کا ملک ہے۔ کیونکہ یہ پانچ دریاؤں کی سرزمین ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ پنج ند کا لفظ آج بھی موجود ہے۔ اور گو وہ پنجاب ہی میں ہے۔ لیکن اس سے پنجاب مراد نہیں ہے۔ اس کی کچھ کیفیت سطور ذیل سے معلوم ہوگی۔ جب دریائے سندھ (اٹک) جو جھیل مانسرور سے نکلتا اور گلگت اور لداخ اور کشمیر کے دیگر بلند ترین مقامات کو طے کرتا ہوا اٹک کے مقام پر پہنچتا۔ اور وہاں سے دریائے کابل کو اپنی آغوش میں لیکر مٹھن کوٹ (ضلع مظفر گڑھ پنجاب) کے مقام پر آتا ہے۔ تو پنجاب کے پانچوں دریا اس مقام پر اس کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ دریائے سندھ ان سب کو اپنے ہمراہ لیتا ہوا کراچی (سندھ) کے قریب بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے مٹھن کوٹ ہی وہ مقام ہے۔ جہاں پنجاب کے دریا باہم مل کر پنج ند کے نام سے موسوم ہو جاتے ہیں۔ اور یہ نام عرصہ دراز سے چلا آتا ہے۔ دریائے پنج ند ہی سے وہ عظیم الشان نہر نکالی گئی ہے۔ جو ریاست بہاولپور کے وسیع علاقے کو سیراب کرتی ہے۔ اور اسی وجہ سے پنج ند محکمہ نہر کا ایک بھاری ڈویژن ہے۔ چونکہ سندھ کے ملک میں بھی بڈشاہ کا اقتدار تھا۔ اور سندھ کے قریب ہی پنج ند واقع ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں پنج ند کے علاقے کا کوئی علیحدہ حکمران تھا جو سندھ

کی طرح بڈشاہ کے زیر اقتدار تھا یا بڈشاہ کو تحفہ تحائف بھیجکر اس سے اپنے تعلقات قائم کرنا چاہتا تھا۔ زینہ راج ترنگنی کے مصنف نے نہ ہنج ند کا جائے وقوع بتایا ہے۔ اور نہ راجہ ہنج ند کا نام لکھا ہے۔ شائد اس معمہ کا حل آنے والے مصنفین کے لئے رکھدیا ہو۔

بہرحال زینہ راج ترنگنی کی تحریر کے مطابق راجہ ہنج ند نے اپنا خاص گھوڑا جس کا نام تاجک تھا۔ اور جو بہت خوبصورت، قدآور اور تیز رفتار تھا بطور تحفہ ارسال کیا۔ سریور لکھتا ہے۔ کہ یہ گھوڑا جب بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا۔ تو طلائی زیورات اور ساز وسامان سے مرصع اور مزین تھا۔ اس کی ٹانگیں اس کا سر اور اس کا زین پوش سنہری چمک دمک سے دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کررہا تھا۔

راجہ کنبھ[1]

کنبھ کے ملک میں ناری کنجر کے نام سے ایک نہایت ہی اعلےٰ درجہ کا کپڑا بنا جاتا تھا۔ راجہ نے اس کپڑے کے چند تھان بادشاہ کے پاس بطور تحفہ ارسال کئے۔ یہ کپڑا ملکہ کشمیر یعنی بادشاہ بیگم نے بہت پسند کیا۔

راجہ گوالیار

گوالیار کو اکبر کے زمانے تک علم موسیقی میں خاص شہرت رہی ہے۔ تان سین جس نے اکبر کے دربار میں آکر ہندوستان میں بقائے دوام کی شہرت حاصل کی۔ گوالیار ہی کا رہنے والا تھا۔ یہاں کے فرمانروا بھی اس فن سے خاص نسبت رکھتے تھے۔

---

[1] راجہ کنبھ (Kumbha) کو راجہ کمبایت بھی کہتے ہیں۔ جو آج صوبہ بمبئی میں کمبایت کے نام سے ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔

بقول صاحب طبقات اکبری راجہ گوالیار کا نام ڈونگر سین تھا۔ جب اس نے بادشاہ کشمیر کی فیاضیوں اور علم نوازیوں کی شہرت سنی اور بالخصوص جب اسے یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ کو علم موسیقی سے بہت رغبت ہے۔ اور وہ موسیقی دانوں کی بہت قدر کرتا۔ اور خود بھی اس علم میں مہارت تامہ رکھتا ہے۔ تو اس نے موسیقی اور سنگیت کی دو تین کتابوں کے نسخے اپنے معتبروں کے ہاتھ کشمیر بھیجے۔ بلکہ صاحب طبقات یہ بھی لکھتے ہیں۔ کہ راجہ گوالیار نے کتابوں کے علاوہ بادشاہ کے پاس اور بھی کئی تحفے بھیجے اور سلسلہ اخلاص و اتحاد قائم کیا

دیگر تاریخوں کے علاوہ بیربر کاچرو بھی مختصر التواریخ میں انہی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "راجہ گوالیار چوں اطلاع یافت کہ سلطان را بہ علم موسیقی رغبت است دو سہ کتاب ایں فن مرسل داشتہ سلسلۂ اخلاص و اتحاد مرعی داشت"۔

خود شری ور نے بھی ایک جگہ اس قسم کا ذکر کیا ہے لیکن وہ گوالیار کی جگہ گوپال پور اور ڈونگر سین کی جگہ راجہ کا نام نگر سین لکھتا ہے اور چند کتابوں کی بجائے صرف ایک کتاب کا ذکر کرتا ہے جس کا نام سنگیت چوڑہ منی (Sangita chudamani) تھا۔

اس کتاب میں گانے کی بہت سی ترکیبوں کے علاوہ علم موسیقی کے قواعد و ضوابط اور کئی قسم کے گیت درج تھے۔ شری ور لکھتا ہے نگر سین کے مرنے کے بعد جب اس کا فرزند تخت نشین ہوا۔ تو وہ بھی بادشاہ کو برابر تحفہ تحائف ارسال کرتا رہا۔

راجہ ڈونگر سین کا سال وفات ۸۷۲ھ ہے۔ اور بڈشاہ کا

سال وفات ۸۷۸ھ ہے۔ گو یا راجہ بادشاہ کی زندگی ہی میں انتقال کر گیا تھا۔ یہاں تک تو شرلوبر کی تائید ہے۔ اور گوالیار وکشمیر یا گوپال پور وکشمیر کے تعلقات و مراسم جو قائم تھے۔ ان پر سرسری نظر ڈالنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بڈشاہ نے نگرسین یا ڈونگر سین کی تعزیت اور جدید راجہ کی مسند نشینی پر مبارکباد کے لئے ضرور اپنے معتبر گوالیار میں بھیجے ہوں گے۔ کرنل ہیگ۔ نے اپنی ہسٹری آف انڈیا جلد سوم کے صفحہ ۲۸۲ پر لکھا ہے۔ کہ راجہ گوالیار کے ساتھ بادشاہ کا رشتہ محبت موسیقی کی وجہ سے استوار تھا۔

والیٔ تبت

شرلوبر نے مہمل و مختصر الفاظ میں لکھا ہے۔ کہ کسی راجہ نے ہمارے بادشاہ کو راج ہنس جانور کا ایک جوڑا ارسال کیا۔ بادشاہ نے اس جوڑے کو شاہی تالاب میں چھوڑ دیا۔ لیکن فارسی مورخوں نے اس کو زیادہ وضاحت سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ والیٔ لاسہ (تبت سرحد چین) نے دو جانور جن کو راج ہنس٭ کہتے ہیں۔ جو نہایت خوش رنگ و خوش شکل تھے۔ جھیل مانسرودر سے پکڑ کر بادشاہ کے پاس بھجوائے۔ ان جانوروں کی خاصیت یہ تھی۔ کہ پانی اور دودھ ملا کر ان کے روبرو رکھ دیا جائے۔ تو وہ اپنی منقاروں سے دودھ کے اجزا پانی سے جدا کر لیتے تھے۔ بادشاہ نے ان کی اس خاصیت کا خود مشاہدہ کیا۔ اور جب دیکھا کہ ان جانوروں نے پیالوں سے دودھ کے اجزا پی لئے ہیں۔ اور باقی پانی ہی پانی رہ گیا ہے۔ تو وہ اس تحفہ سے بہت محظوظ ہوا۔

٭ راج ہنس کی عمر کا اندازہ ماہرین نے ایک سو سال بتایا ہے۔

بادشاہ خراسان

ترلوپر نے لکھا ہے۔ کہ خراسان کے بادشاہ کا نام مرزا ابو سعید ہے اس کے ماتحت اور بھی کئی بادشاہ ہیں۔ ایک بھاری مسلح فوج وہ ہمیشہ موجود رکھتا ہے۔ اس کے ملک میں گھوڑے بکثرت ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے دور دور تک مشہور ہیں۔ شمال کے اس زبردست بادشاہ نے بھی ہمارے بادشاہ کے ساتھ۔ الطبۂ اتحاد قائم کیا۔ اور اپنے خاص قاصدوں کے ہمراہ اعلےٰ نسل کے گھوڑے اور عمدہ قسم کے خچر بطور تحفہ بھیجے۔

طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ میں بھی ان تحائف و تعلقات کا ذکر ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے: "خاقان سعید ابوسعید شاہ از خراسان اسپان تازی بادپیما واشتران رہوار و اعلےٰ وشتراں قوی ہیکل بادیہ پیما برائے او ہدیہ فرستاد و شاہ ازیں معنے بسیار خوشحال شد"

بادشاہ نے ان تحائف کے عوض زعفران کشمیری کاغذ۔ عرق بید مشک عطر گلاب سرکہ۔ اعلےٰ قسم کے شال اور بلور کے صاف برتن اور کئی تحفے سلطان ابوسعید مرزا کے پاس بھیجے۔

آذربائیجان وگیلان

ان ممالک میں اس وقت جو بادشاہ تھا کسی مورخ نے اس کا نام نہیں لکھا صرف اتنا لکھا ہے کہ گیلان کے بادشاہ کے ساتھ بھی بادشاہ کشمیر کے تعلقات قائم تھے۔ صرف کرنل سرہیگ ایک ایسا مصنف ہے جس نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں بادشاہ گیلان وآذربائیجان کا نام جہان شاہ تھا۔

شاہان مالوہ ومانڈو

مالوہ میں جو راجہ بکرماجیت اور راجہ بھوج کا ملک ہے۔ بڈشاہ کے

زمانہ اول میں ہوشنگ اور ۸۳۸ھ میں اس کا بیٹا محمد شاہ تھا۔ ۸۳۹ء میں محمود خلجی نے اس خاندان کو تباہ کر کے اپنی حکومت قائم کی بشر لیور نے زینہ راج ترنگنی میں محمود خلجی کو مانڈو کا راجہ کھل شاہ لکھا ہے۔ چونکہ مانڈو بھی مالوہ ہی کے ماتحت تھا اور اپنے مشہور قلعہ اور دارالحکومت ہونے کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس نے شر لیور نے اپنی تاریخ میں اس کو مانڈو ہی کا فرمانروا ظاہر کیا ہے۔ اور کھل شاہ یا کھلش کا لفظ صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ خلجی کا بگڑا ہوا ہے۔ بلکہ شر لیور نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے۔ کہ میرا بادشاہ مالوہ کے ملک تک بھی شہرت رکھتا ہے۔ بادشاہ مالوہ نے بیش قیمت پارچات کے کئی تھان جو درن رام یا دراندام کے نام سے مشہور تھے۔ بڈشاہ کے پاس بھیجے۔ شر لیور لکھتا ہے۔ ہمارے بادشاہ نے بھی ان ملبوسات کے عوض فرمانروائے مانڈو کو کئی تحفے ارسال کئے۔ ان تحائف میں ایک نظم بھی تھی۔ جو کشمیری زبان میں تھی۔ اور بادشاہ کی اپنی تصنیف کردہ تھی۔ جب مانڈو کے بادشاہ کو بڈشاہی معتمدوں کے ذریعے اس کشمیری نظم کے مطالب و معانی اور اس کے اعلیٰ مضامین سے آگاہی ہوئی۔ تو تمام تحائف سے زیادہ اس نے اس نظم کو پسند کیا۔ اور اس پر اپنی مسرت کا اظہار کیا۔

محمود خلجی نے ۸۷۳ھ میں یعنی بڈشاہ سے ایک سال قبل انتقال کیا۔

حاکم ملک منڈ لک

منڈ لک[1] کے حاکم نے جو دارالحکومت کا سپرنٹنڈنٹ بھی تھا۔ بڈشاہ کی خدمت میں اظہار عقیدت کیے۔ ایک قیمتی گھوڑے کے علاوہ انواع و اقسام کے کئی جانور بھی بھیجے۔ جن میں مچ کند (Much Krunda) نام جانور بہت خوبصورت تھا۔

[1] منڈ لک کے جائے وقوع کا کوئی علم نہیں ہو سکا۔

مکّہ معظمہ مصر اور روم

اسی طرح شاہان مصر، روم، مکہ معظمہ اور باقی ممالک کے بادشاہ بھی بادشاہ کشمیر کو تحائف و ہدایا بھیجا کرتے۔ اور اس کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم رکھنا باعث فخر سمجھتے تھے۔ بلکہ ترکستان و سیستان[1] تک کے بادشاہوں نے اس کے ساتھ رابطۂ دوستی قائم کیا۔ غرض ہندوستان کے علاوہ بیرون ہند میں بھی بادشاہ کی شوکت وسطوت اور اس کی رعایانوازی کا کافی چرچا تھا۔ صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں: "حاکم مکہ معظم و مکرم و مصر و گیلان وغیر آں نیز تحفہ و ہدایا فرستادہ ہمیں شیوہ را مرعی مے داشتند۔"

غرض کشمیر کے فرمانرواؤں میں سلطان زین العابدین ہی سب سے پہلا بادشاہ تھا جس نے ممالک غیر کے فرمانرواؤں کے ساتھ سلسلہ اتحاد قائم رکھنے کی ضرورت محسوس کی۔ بلکہ اکثر والیان ملک نے خود تحفہ تحائف بھیجکر اس کے ساتھ تعلقات قائم کئے۔ یہ سب بادشاہ اور والیانِ ملک بادشاہ کشمیر کی دوستی پر فخر کرتے اور اس کی خوبیوں کے مداح تھے۔

پندرھواں باب

بادشاہ کے عدل وانصاف کے چند واقعات

ایک جلیل القدر درباری کو پھانسی کی سزا

ایک دفعہ ایک جلیل القدر سید میر شاہ نامی نے جو بادشاہ کے معتمد ل

---

[1] اسلامک کلچر ان کشمیر۔

میں تھا۔ شراب کے نشہ میں اپنی بے گناہ عورت کو مارتے مارتے جان سے مار ڈالا بادشاہ نے عورت کی مظلومی پر رحم و لطف کی نظر ڈالی۔ اور مقرب درباری کے اعزاز و منصب کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس جرم کے عوض کہ اس نے بے زبان عورت کو بے گناہ ہلاک کر ڈالا۔ پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا۔

گائے کی چوری پر بادشاہ کا دانشمندانہ فیصلہ

جیاپیڈ پور (اندرکوٹ) کے ایک برہمن کی گائے ایک مرتبہ گم ہو گئی۔ کئی دن کے بعد وہ مدد راج (مراز جنوبی کشمیر) کے کسی تیرتھ پر اشنان کرنے کی غرض سے روانہ ہوا۔ جب وہ شادی پور کے متصل پہنچا۔ تو وہاں اس نے ایک چراگاہ میں اپنی گائے کو شناخت کر لیا۔ جب مال مویشی گھروں کو جانے لگے۔ تو وہ بھی اپنی گائے کے پیچھے روانہ ہوا۔ کہ دیکھیں وہ کہاں جاتی ہے۔ جب گائے اپنے نئے مالک کے گھر پہنچی۔ تو برہمن نے اس شخص سے کہا کہ یہ گائے تو میری ہے۔ نئے مالک نے کہا۔ یہ گائے میری ہے۔ اور یہ بچھڑا بھی اسی کا ہے۔ دونوں میں ہاتھا پائی ہوتی رہی۔ جب کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ تو یہ معاملہ عدالت تک پہنچا۔ اور اس کی اپیل ہوتے ہوتے بادشاہ کے دربار میں آئی۔ بادشاہ نے دونوں کے بیانات سنے۔ اور حکم دیا۔ کہ سنگھاڑوں کا ایک ڈھیر لاؤ۔ عوام اور اہل دربار حیران تھے۔ کہ اس مقدمہ سے سنگھاڑوں کا کیا تعلق؟

آخر سنگھاڑے لائے گئے۔ بادشاہ نے کچھ گائے کے آگے رکھوائے۔ اور کچھ بچھڑے کے آگے۔ گائے تو کھا گئی۔ لیکن بچھڑے نے منہ تک نہ لگایا۔ چونکہ جیاپیڈ پور میں سنگھاڑے کثرت سے ہوتے ہیں۔ اور وہاں مویشی اس کثرت سے کھانے کے عادی ہیں۔ اس لئے بادشاہ کو یقین ہو گیا۔ کہ گائے جیاپیڈ پور کے برہمن ہی کی ہے۔ اور اس نے بچھڑا ایسے مقام پر دیا ہے

جہاں سنگھاڑے نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ سنگھاڑے کھانے کا عادی نہیں ہے۔ اس پر بادشاہ کے حکم سے گائے جیاپیڈپور کے برہمن کے حوالے کی گئی۔ اور زبردستی کے مالک کو چوری کی سزا دی گئی۔

تنازعہ اراضی کا دلچسپ فیصلہ

مولراج نام ایک برہمن نے اپنی قابل فروخت اراضی کے دس ٹکڑے کر رکھے تھے۔ ایک ٹکڑا اس نے فروخت کر دیا۔ اور مشتری کو بیعنامہ بھی لکھدیا۔ لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ چالاک مشتری نے اس کے فرزندوں کی غریبی اور مولراج کے انتقال کی وجہ سے بیعنامے کے کاغذ میں باقی نو ٹکڑوں کی فروخت کا بھی اندراج کر دیا۔ تاکہ اگر اس کا کوئی وارث بعد میں دعوےٰ کرے۔ تو وہ چل نہ سکے۔

مولراج کے بڑے بیٹے کا نام نونراج تھا۔ وہ کمزور تھا۔ اور اس کے مقابلے میں مشتری دولتمند اور صاحب رسوخ تھا۔ تاہم اس غریب نے کچھ عرصہ کے بعد بادشاہ اور اس کے ماتحت عملہ کے انصاف کے بھروسہ پر دعوےٰ کر دیا۔ آخر جب بادشاہ کے سامنے یہ بیعنامہ پیش ہوا۔ تو بادشاہ نے حکم دیا کہ بیعنامے کے کاغذ کو پانی میں ڈبو دیا جائے۔ چنانچہ جب کاغذ کو پانی میں ڈالا گیا۔ تو ایک نئی سطر جو نو ٹکڑوں کی فروخت کے لئے جعلی طور پر بڑھائی گئی تھی۔ کاغذ پر سے حرف غلط کی طرح فوراً اڑ گئی۔ اور باقی الفاظ پر پانی نے ذرا دیر کے بعد اثر کیا۔

زونراج لکھتا ہے میں اس مقدمے کے وقت بادشاہ کی عدالت میں موجود تھا۔ مدعی کی صداقت آمیز چیخ پکار۔ اور اس کے دل ہلا دینے والے داد بلا کا میرے دل پر بڑا اثر ہو رہا تھا۔ بادشاہ نے اپنے وزراء سے کہا۔

دیکھو جعلی اور غلط الفاظ جو بعد میں اضافہ کئے گئے تھے۔ کس طرح فوراً ہی رٹ گئے ہیں۔

اس کے بعد بادشاہ نے اس غاصب دولتمند کو مناسب سزا دی۔

ایک یوگی کی ہلاکت پر ایک عرب کو عبرتناک سزا

بادشاہ کے پاس جو عرب مکہ معظمہ سے کچھ کتابیں لایا تھا۔ اس کا نام سید سعد اللہ تھا نوزراج نے اس کا نام یادن سیدل لکھا ہے۔

دار الحکومت میں ایک جوگی تھا۔ جو روحانیت کا ماہر اور جذبات پر قادر تھا۔ کئی کئی دن بغیر کھانے پینے کے گزار دیتا تھا۔ اپنی آنکھیں بند رکھ سکتا تھا۔ حبس دم میں بھی اس کو کمال حاصل تھا۔ اور تپسیا (عبادت) کے وقت وہ دنیا و مافیہا سے بالکل غافل ہو جاتا تھا۔ نوزراج لکھتا ہے۔ بادشاہ اس خدا دوست یوگی کا بڑا عقیدت مند تھا۔ اور اس کی دعا اور برکت سے بادشاہ کے ہاں فرزند اول (ادہم خان) پیدا ہوا تھا۔ جس کی پیدائش پر بادشاہ نے ایک بہت بڑا جشن کیا تھا۔

سید سعد اللہ عرب اس خیال سے کہ بادشاہ کو ایک غیر مسلم سے اس قدر عقیدت کیوں ہے؟ اس یوگی کے خلاف تھا۔ اس نے اس حسد کے باعث کوئی بہانہ تلاش کر کے یوگی کو جان سے مار ڈالا۔ عام لوگوں پر بھی اس واقعہ کا بڑا اثر ہوا۔ لیکن بادشاہ نے تو اس قدر صدمہ محسوس کیا کہ اس نے یہ اندوہناک خبر سنتے ہی کھانا پینا ترک کر دیا۔

دوسرے دن بادشاہ نے اپنے مذہبی رہنماؤں، عالموں۔ قانون دانوں اور پیشواؤں کو بلوایا۔ اور ان کے ساتھ سعد اللہ عرب کے متعلق مشورہ کیا۔ ان سب نے سعد اللہ کے قتل کا مشورہ دیا۔

بادشاہ کی رحمدلی کی وجہ سے سعد اللہ جان سے تو بچ گیا۔ لیکن بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو گدھے کی ننگی پیٹھ پر دُم کی طرف سوار کر کے شہر کے ہر بازار میں تشہیر کیا جائے۔ اس کی ڈاڑھی پیشاب سے تر کی جائے اس کا سر مونڈ دیا جائے۔ اور مردہ یوگی کی انتڑیاں نکال کر ان سے اس کے ہاتھ باندھ دیئے جائیں۔ اور جو شخص اس کو دیکھے۔ وہ سب کام چھوڑ کر اس کے منہ پر تھوکنا شروع کر دے۔

نوزاج لکھتا ہے۔ ہر چند کہ سعد اللہ عرب زندہ تھا۔ لیکن یہ سزا جو اس کو دی گئی تھی۔ اس کی موت سے کم نہ تھی۔

سوکن کے جلاپے میں بچہ کے قتل کا مقدمہ

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کسی عورت نے سوکن کے جلاپے سے تنگ آکر اپنے شیر خوار بچہ کو قتل کر دیا۔ اور بچہ کے قتل کا الزام اپنی سوکن پر لگا دیا۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا۔ کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ کہ کوئی عورت اپنے شیر خوار بچہ کو خود بخود ہلاک کر سکتی ہے۔ اس لئے اس مقدمہ نے اور اس قضیہ نے بہت طول کھینچا۔ یہاں تک کہ آخر بادشاہ کی عدالت تک نوبت پہنچی۔ بادشاہ اپنی فراست و دانشمندی سے بعض اوقات اہم معاملات بھی جلد سے جلد طے کر لیا کرتا تھا۔ اس مقدمے میں بھی اس نے یہی کام کیا۔ اس نے مفروضہ ملزمہ کو خلوت میں بلوایا اور معافی کا وعدہ دے کر اصل حقیقت دریافت کرنا چاہی لیکن وہ عورت بدستور اس جرم کے ارتکاب سے انکار کرتی رہی۔ آخر بادشاہ نے اس سے کہا۔ کہ اگر واقعی تم بے قصور اور بے گناہ ہو۔ تو کپڑے اتار کر اور برہنہ ہو کر دربار میں سے گزر جاؤ۔ ملزمہ نے کہا اگر بادشاہ سلامت

مجھ بے گناہ کو سزا ہی سکتا ہوں سمجھتے ہیں۔ تو اس سزا سے یہ بہتر ہے کہ مجھے تلوار سے ہلاک کر دیا جائے یا پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جائے۔

طبقات اکبری میں لکھا ہے۔ کہ عورت نے شرم و حیا سے سر نیچا کر لیا۔ اور کہا "مزد من گردن بہ ازیں عمل است: بہ خون خود راضی شدم ولیکن اختیار ایں عمل بہ خود قرار نمے توانم داد"۔

بادشاہ نے اس کے بعد مدعیہ کو بلایا۔ وہ بھی اپنی بیگناہی اور سوکن کے ملزمہ ہونے کی ضد پر اڑی رہی۔ بادشاہ نے اس کو بھی برہنہ ہو کر دربار میں سے گزر جانے کا حکم دیا۔ وہ عورت اپنی بیگناہی ثابت کرنے کے لئے فوراً تیار ہو گئی۔ بادشاہ نے اسے منع کیا۔ اور جلادوں کو حکم دیا کہ اسے تازیانے لگائیں۔ آخر اس عورت نے چند تازیانے کھانے کے بعد اپنے بچہ کو ہلاک کرنے کا اقبال کر لیا۔ اور کہا میں نے جو کچھ کیا۔ اپنی سوکن کو ذلیل کرنے کے لئے کیا۔ لیکن چاہ کن را چاہ درپیش۔

بادشاہ نے اس کو کیا سزا دی۔ اس کی تشریح تو صحیح کہیں نہیں ہے البتہ یہ لکھتا ہے۔ کہ بادشاہ کے حکم سے آخر اس نے اپنے کیے کی سزا پائی۔ فرشتہ لکھتا ہے: "چوں اقرار بہ فعل زشت خود کرد و سلطان را یقین شد کہ قاتل اوست بہ فرمود تا بہ سیاست رسانند"[۱]۔

ایک بدمست شاہی مصاحب کو عبرت انگیز سزا

بادشاہ کے مقربوں اور مصاحبوں میں ایک مسلمان تھا جس کو شراب پینے کی عادت تھی۔ ایک مرتبہ شراب کے نشہ میں اس نے ایک پنڈت کو اس قدر زد و کوب کیا۔ کہ اس کی جان ہی نکل گئی۔ پنڈت کے وارثوں

[۱] تاریخ فرشتہ جلد دوم در ذکر سلطان زین العابدین صفحہ ۳۴۴

نے بادشاہ کے پاس فریاد کی۔ بادشاہ نے مقدمے کو قاضیوں اور ججوں کے پاس بھیجنے کی بجائے اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اس کے وارثوں کے بیان اور گواہی کی شہادتیں لے کر حکم دیا۔ کہ چونکہ ان تمام شہادتوں سے ظاہر ہے کہ اس کی نیت اس کو ہلاک کرنے کی نہیں تھی۔ شراب کے نشہ میں اس نے متوفی کو کوئی ایسی ضرب لگائی جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس لئے اس کو پھانسی کی سزا تو نہیں دی جاتی۔ البتہ اس روسیاہ کو الٹے منہ گدھے پر سوار کر کے تمام شہر میں پھرایا جائے۔ تاکہ اس کو شراب نوشی کا انجام اور تقرب شاہی کے گھمنڈ میں اپنی اس حرکت قبیحہ کا نتیجہ معلوم ہو جائے۔ اور باقی لوگ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں

بادشاہ پا برہنہ ایک برہمن کے مکان پر

مورخین ہنود لکھتے ہیں کہ بادشاہ کا ایک لڑکا کشتی میں سوار ہو کر دریا کی سیر کر رہا تھا۔ جب عالی کدل پہنچا۔ تو ایک نوجوان اور خوش شکل پنڈتانی کو دریا کے گھاٹ پر پانی بھرتے دیکھا۔ جب اس نے گھڑا سر پر رکھا۔ تو شہزادے نے تماشہ دیکھنے لئے گھڑے کو غلہ کا نشانہ بنایا۔ جس سے گھڑا الٹ گیا۔ مگر اس کی پاکدامانی نے پانی کو اس کے سر پر معلق رکھا۔ اس نے گھر جا کر اپنے خاوند کو اس واقعہ سے آگاہ کیا۔ وہ بیچارہ کیا کر سکتا تھا۔ بظاہر صبر تلخ کا گھونٹ پی کر خاموش ہو گیا لیکن اس کی بے صبر آنا خاموشی پکار پکار کر کہہ رہی تھی ؎ یہ تو سوچو کہ مرا صبر پڑیگا کس پر؟

مورخین ہنود کا بیان ہے کہ شہزادہ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایسا بیمار ہوا کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ جب بادشاہ کو اصل معاملہ سے آگاہی ہوئی۔ تو اس نے بہت افسوس کیا۔ وہ پا برہنہ برہمن کے مکان

پڑ گیا۔ اور معذرت طلب کر کے دعائے صحت کا طلبگار ہوا۔ برہمن نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ کہ جب شہزادے اپنی رعایا کی بہو بیٹیوں کے ساتھ ایسا سلوک کرینگے۔ تو غریب رعایا کا کہاں ٹھکانا ہو سکتا ہے۔ آخر برہمن نے شہزادے کی صحت کے لئے دعا مانگی۔ جو بارگاہ حقیقی میں قبول ہوئی۔ بادشاہ کے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ اور وہ رعایا اور برہمنوں کی دلجوئی میں اور بھی سرگرمی سے کام لینے لگا۔۔

سولھواں باب

بڈشاہی تعمیرات

بڈشاہ کا تعمیری شوق

زونراج اور اس کے شاگرد شریور نے بڈشاہ کی تعمیرات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان تاریخوں کے اقتباسات اسی باب کے آئندہ صفحات میں درج ہوں گے۔ کشمیر کے یہ دونوں نامور شاعر و مصنف بڈشاہ کے عہد ہی میں گزرے ہیں۔ ایک شریور تو بڈشاہ کے بعد بھی اس کے پوتے سلطان فتح شاہ کے عہد تک زندہ رہا ہے۔

مرزا حیدر کاشغری جو کشمیر میں صاحب حکومت بھی رہا ہے کشمیر کے قدیم فارسی مورخوں میں نامور حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بڈشاہ کے شوق تعمیرات کا ذکر کرتا ہوا اس کی کئی عمارتوں اور اس کے کئی باغات بالخصوص زینہ لنک کی دلچسپ کیفیت سے اپنی تاریخ کے اوراق کو زینت

دیتا ہے۔ اسی طرح بخشی نظام الدین احمد اپنی کتاب طبقات اکبری میں جو بڈشاہ کی وفات سے قریباً سوا سو سال بعد لکھی گئی ہے۔ بڈشاہی تعمیرات کا ذکر کرتا ہے۔ جہانگیر بھی اپنی تزک میں کشمیر کے اس جلیل القدر بادشاہ کی بزرگی و برتری کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ لکھتا ہے "او را بڈشاہ (شاہ کلاں) مے گویند خوارق عادات او بسیار نقل مے کنند۔ آثار و علامات و عمارات او در کشمیر بسیار است۔"[۱]

رئیس الملک حیدر ملک جہانگیری اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔ "اکثر بہ شکار رغبت داشت در ہر شکارگاہ عمارتے ساختہ بود" مابعد کی تاریخوں تاریخ فرشتہ تاریخ خواجہ اعظمی سیر المتاخرین وغیرہ میں بھی اس کی تعمیرات کا بالتفصیل ذکر ہے غرض یہ بادشاہ اس قدر تعمیری دلچسپیاں اور جدید عمارات و باغات کا اس قدر شوق مبداء فیاض سے لے کر آیا تھا کہ یقیناً اس لحاظ سے وہ اپنے زمانے کا شاہجہان تھا۔

اس نے طب کو رواج دیا حکیم حاذق اور طبیب کامل جگہ جگہ سے بلوائے۔ دارالحکومت (سری نگر) میں شفا خانوں کی تعمیرات کا عام ذکر ہے ممکن ہے بعض دیگر مشہور مقامات میں بھی شفاخانے تعمیر کرائے ہوں۔ آمد و رفت کے راستوں میں سڑکیں بنوا لیے اور مسافر خانے اور جگہ جگہ پل تعمیر کرائے۔ بادشاہ نے اپنی مملکت کو دارالامان اور کشمیر کو جنت نظیر بنا دیا تھا۔ سچ ہے

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا　　　پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

چنانچہ زونہ رنجہ ترنگنی میں لکھتا ہے۔ بادشاہ نے کشمیر کے ہر ایک بڑے گاؤں میں ایک ایک ... مسافر خانہ تعمیر کرایا۔ اور اس کی مرمت و حفاظت کا گاؤں والوں کو ذمہ دار قرار دیا۔ اور جنگلوں میں جن چشموں نے چھوٹے

---

[۱] تزک جہانگیری مترجمہ سید احمد خاں مطبوعہ ۱۸۶۴ء صفحہ ۲۹۷ ترجمہ انگریزی جلد دوم صفحہ ۱۸۲

مکانات تعمیر کرائے تاکہ آنے جانے والوں یا سیر و تفریح کرنے والوں کو وہاں آرام ملے۔ ان مکانوں کو آجکل کے فاریسٹ ریسٹ ہاؤس تصور کرنا چاہیے۔

زین العابدین کے زمانے میں چوبی طرز عمارت نے نمایاں ترقی حاصل کی۔ بادشاہ ہنر پرور تھا۔ وہ ذات صفات اور من و تو کی پرورش کی بجائے علم و ہنر کی قدردانی میں زیادہ مطمئن تھا، لہٰذا اس نے سمرقند، بخارا، ہندوستان اور وسط ایشیا سے جو اہل ہنر و صاحب فن اس نے بلوائے۔ ان میں فن تعمیرات کے ماہرین بھی تھے۔ بادشاہ ان کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ وہ بھی قدردان بادشاہ کی خوشنودی مزاج کی خاطر اپنے کمالات جی کھول کر دکھلاتے تھے۔ آج کشمیر کی عمارتوں میں جو بھی کچھ رنگینیاں دیکھ رہے ہو اور چھتوں کے نقش و نگار میں جس صنعت پر آفرین و مرحبا کہتے ہو، یہ سب بڈشاہی قدردانیوں کا ظہور ہے۔

بڈشاہی تعمیرات کا امیر عمارت

تاریخوں میں لکھا ہے کہ بڈشاہ دیگر علوم و فنون کے ساتھ فن تعمیر میں بھی خاص دلچسپی لیتا تھا۔ زینہ لنک اور بعض دوسرے مقامات کی تعمیر اس کے اپنے دل و دماغ کا نتیجہ تھی۔ تعمیرات اور انجینئرنگ کا ایک خاص محکمہ بھی تھا اور اس کا افسر اعلیٰ یا امیر عمارت اودے بانڈ کے نام سے اس کا اپنا ایک ہموطن تھا۔ زونراج زینہ ترنگنی میں اس کے متعلق لکھتا ہے۔ یہ بہت قابل اور دوراندیش شخص تھا۔ دیگر عمارات کی طرح زینہ لنک کی حفاظت و نگرانی بھی اسی کے سپرد تھی۔ یہ شخص فن نقاشی میں ماہر تھا۔ اس نے عجیب عجیب نقش و نگار سے شاہی مکانات و محلات کو مزین کیا۔ پرانے شاہی مکانات کی تعمیر و مرمت اور حفاظت بھی اس کے سپرد تھی۔ گویا اس زمانے میں بھی محکمہ آثار قدیمہ قائم تھا۔ جراودے بانڈ

میر عمارت ہی کے سپرد تھا۔

بڈشاہ نے اپنے طویل اور پُرامن عہد حکومت میں جس قدر باغات احداث کرائے پل بنوائے۔ نہریں کھدوایئں۔ نئے شہر اور محلے اور دیہات آباد کئے مساجد و منادر آباد اور مرمت اور تعمیر کرائے۔ ان کی تفصیل تو بہت طویل ہے۔ ہم چند ایک کا ذکر کرتے ہیں۔

بڈشاہی عمارات کی مختصر فہرست

زینہ لنک[1] - زینہ کدل[2] - زینہ تزاگ[3] - زینہ بازار[4] - زینہ سمھو[5] (در پرگنہ اڈون) زینہ ڈب[6] - زینہ گیر[7] - زینہ مرگ[8] (در علاقہ پائین) زینہ کوٹ[9] متصل اندرکوٹ[10] زینہ نگر[11] یا نوشہرہ دار الحکومت - زینہ مٹن[12] - برلب ڈلر - زینہ کنڈل[13] کامراج - زینہ تھک یا زینہ تنک (بجانب مانس بل) زینہ پورہ[14] پرگنہ اڈون - باغ بڈشاہی[15] دانتی پورہ - سونالنک[16] در تالاب ڈل - پل سوپور[17] بر دریائے وتستہ - سلطان پور[18] (کامراج) جامع مسجد شوپیاں[19] - جامع مسجد بارہ مولا[20] مسجد کاڈایار[21] (زینہ کدل)۔ مزار السلاطین[22] - مسجد جامع نوشہرہ[23] (در محلہ نوشہرہ) خانقاہ سید مدنی[24] - خانقاہ چرار شریف[25] خانقاہ سید ہلال[26] موضع اشم - خانقاہ سید برخوردار[27] (سری نگر) مندر زشتی شور[28] یعنی مندر شنکر اچاریہ یا تخت سلیمان - ہلال پور[29] متصل زینہ تنک - بڈکوٹ[30] - بڈشر[31] بڈمقام[32] وغیرہ وغیرہ

اب متذکرہ صدر عمارتوں میں سے جن کا کچھ حال تاریخوں نے بتایا ہے یا راقم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جھیل ولر میں زینہ لنک کی تعمیر

زونراج نے زینہ راج ترنگنی میں تفصیل کے ساتھ زینہ لنک کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس جھیل کا قدیم نام مہاپدم بتاتا ہے۔ اور لکھتا ہے۔ وہ الفاظ یہ

کوس ٹ کے دور میں پھیلی ہوئی ہے۔ کشمیر کے قدیم ہندو راجے اور مسلمان بادشاہ اس ہیبت ناک جھیل میں خوف کی وجہ سے بہت کم آیا کرتے تھے۔ کیونکہ ہوا کی وجہ سے اس میں بڑی بڑی لہریں اٹھا کرتی تھیں۔ جن سے ہر وقت کشتی کے ڈوب جانے کا اندیشہ رہتا تھا۔

زینہ لنک کے متعلق زونراج بڈشاہی مورخ کا بیان

زونراج یہاں بادشاہ کی اولوالعزمی کو اس کی زبردست روحانی طاقت سے منسوب کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ بادشاہ اپنی اسی طاقت کے بل پر کشتی لئے ہوئے اس جھیل میں اس طرح دوڑتا پھرتا تھا۔ جیسے اس کے نزدیک یہ سطح آب ایک خشک زمین تھی۔

چونکہ جھیل بہت بڑی تھی۔ بادشاہ نے اس کے کسی حصہ کو خشک کر کے اس میں آرام گاہ بنانے کے لئے ایک مکان بنانے کی تجویز پر غور کیا۔ اور شہر کے پرانے اور بوڑھے آدمیوں سے اس امر کے متعلق ذکر کیا۔ واقف کار لوگوں نے جھیل مہا پدم کی مفصل داستان بیان کی اس کے بعد بادشاہ کو خواب میں کسی غیبی طاقت نے اشارہ کیا کہ اس جھیل میں کوئی عمارت تعمیر کرنے کا جو عزم تم نے کیا ہے۔ وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ اس اشارے سے بادشاہ کی ہمت بندھ گئی۔ اور آخر اس نے بہت غور و فکر کے بعد یہ تجویز سوچی کہ جھیل کے کسی بلند مقام پر دیودار لکڑی کی کشتیاں پتھروں سے بھر بھر کر ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۱) ڈلر یا اڈر کشمیری زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی سوراخ کے ہیں۔ اور چونکہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ زمین میں سوراخ ہونے کی وجہ سے ایک عظیم چشمہ نکلا تھا اس لئے مہاپدم کی جگہ کشمیری زبان کا لفظ ولر مشہور ہو گیا۔ ؎ زمانہ حال میں یہ جھیل گرمیوں میں تیرہ میل لمبی اور دس میل چوڑی ہوتی ہے اور سردیوں میں اس سے آدھی رہ جاتی ہے۔

دوسرے کے اوپر ڈبو دی جائیں۔ یہاں تک کہ زمین کا کچھ حصہ خشک نکل آئے اور اس پر عمارت تعمیر کر دی جائے۔ بادشاہ اس ترکیب سے اپنے ارادہ میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس نے زینہ لنک کے نام سے اس پر ایک عمارت تعمیر کی۔

مسلمان مصنّفوں کے بیان

بعض کے مورخوں نے اور بھی تفصیل سے زینہ لنک کی عمارت کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ بادشاہ ایک دن سید جان بازدلیؒ کے ہمراہ دریا کی سیر کرتا ہوا ولر کی طرف جانکلا۔ جب عین وسط ولر میں پہنچا۔ تو بادشاہ نے سید صاحب سے کہا کہ یہ جگہ بڑی خوفناک ہے۔ اس کے چاروں طرف دریا حائل ہے جب اس کا پانی موجزن ہوتا اور طوفان پیدا کرتا ہے۔ تو لوگوں کو اس مصیبت سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ نظر نہیں آتی۔ سب ورطۂ ہلاکت میں ڈوب جاتے ہیں۔ اور کوئی بھی اپنی جان ساحل تک سلامت نہیں لے جا سکتا۔

اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ولر کے عین درمیان ایک جزیرہ آباد کردوں جس پر ایک عبادت خانہ اور ایک احاطہ تعمیر کردوں۔ تاکہ ولر کے مسافروں کو اس میں آرام و آسائش کی کوئی جگہ نظر آئے۔ لیکن یہ کام بہت مشکل ہے اس میں ہمت مرداں کے ساتھ دعائے بزرگاں کی بھی ضرورت ہے۔ کہ الفاظ "زندہ دلاں مدد گار۔ بادشاہاں است"[1]

میں آپ سے اس کام کے لئے فاتح خیر کی درخواست کرتا ہوں۔ سید جان باز نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی۔ بادشاہ اور سید راتوں کو سولپور میں

[1] اسرار الابرار تصنیف بابا داؤد مشکاتی بہ عہد شاہجہاں غیر مطبوعہ۔

ٹھہرے۔ صبح طلوع آفتاب کے ساتھ ہی سید تو بارہ مولا روانہ ہو گئے۔ اور بادشاہ سری نگر چلا گیا۔

اب یہ خبر ہر برنا و پیر اور ہر کوچہ و بازار میں جا پہنچی۔ کہ بادشاہ وُلر میں ایک محل تیار کرنے والا ہے۔ اس کے لئے زمستان سازگار زمانہ تھا۔ کیونکہ اس موسم میں پانی کم ہو جاتا اور ماہی گیر بعض ایسی چیزیں دستیاب کر لیتے تھے۔ جن سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہاں کسی زمانے میں کوئی عظیم الشان شہر آباد رہ چکا ہے۔

جب یہ موسم آیا۔ تو بادشاہ نے بڑے بڑے غواص بلوائے۔ جو چھ چھ سات سات گھنٹے تک پانی کے نیچے رہ سکتے تھے۔ حکم دیا کہ وُلر کے وسط میں جا کر سطح آب کے نیچے سب کچھ چھان مارو۔ جو جگہ بلند اور سخت نظر آئے۔ اس کو دیکھو اور بتاؤ۔ تاکہ وہاں بہ سہولت تمام عمارت بن سکے۔

وُلر میں ایک بُت خانے کے آثار

چنانچہ بڑی کوشش کے بعد ایک سنگی بُت خانے کے نشان ملے۔ بادشاہ کو اطلاع ہوئی۔ فرط خوشی سے خود کشتی پر سوار ہو کر آیا۔ غواصوں کو حکم دیا۔ کہ اس بُت خانے کے اندر جائیں۔ اور دیکھیں۔ وہاں کیا کچھ ہے غواصوں نے پھر غوطے لگائے پانی کے اندر جا کر بُتخانے کے کونے کونے کی تلاشی لی۔ آخر غواص وہ بُت[1] جن کو ہندو مورتیاں کہتے ہیں نکال لائے۔

[1] تاریخ ملا بہاء الدین میں چار مورتیوں کا ذکر ہے۔ چنانچہ ملا بہاء الدین لکھتا ہے "غواصاں بہ کوشش تمام در بتخانہ رفتہ چہار بت یافتند و برآوردند بُت روئیں بودند و بُت طلائی" لیکن صاحب اسرار الابرار تاریخ حسن اور مؤلف مکمل تاریخ کشمیر اور دوسرے مؤرخ صرف دو مورتیوں کی تصدیق کرتے ہیں۔

زینہ لنک کی بنیاد و تعمیر

جہانگیر نے اپنی توزک میں جہاں سلسلۂ جشن دوئمین نوروز کا ذکر کیا ہے۔ وہاں کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے بڈشاہ کے متعلق بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ ایسا ہی لکھا ہے جیسا ایک بادشاہ کو دوسرے بادشاہ کے متعلق لکھنا مناسب تھا۔ اسی سلسلہ میں زینہ لنک کا ذکر اس نے ذرا تفصیل سے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کشمیر میں زین العابدین کی جس کو بڈشاہ یعنی شہنشاہ معظم بھی کہتے ہیں بہت سی علامات و عمارات ہیں۔ منجملہ ان کے ایک آبگیر کے درمیان جس کا نام اولر ہے۔ اور عرض و طول جس کا ۳ کوس سے زیادہ ہے۔ ایک عمارت زینہ لنک بنائی ہے۔ جس کی بنیاد رکھنے میں بڑی کوشش سے کام لیا گیا ہے۔ اس آبگیر کی تہ عمیق ہے۔ بادشاہ نے اول اول کشتیوں میں پتھر بھر بھر کر اس میں ڈالے۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ پھر کئی ہزار کشتیاں پتھروں سے بھر کر اس میں ڈبوئیں۔

اس کے بعد بقول صاحب اسرار الابرار سلطان نے ایک نہایت طویل طویل کشتی تیار کرائی جس کو در اصل چھوٹا سا جہاز کہنا چاہیئے۔ اس کشتی کو بادبانوں کے ذریعے جھیل ولر میں اس مقام پر ڈالا گیا۔ جہاں سے وہ بت خانہ نکلا تھا۔ کشتی میں مٹی اور پتھر بکثرت ڈالا گیا۔ اس کو ہموار سطح بنا کر اس پر زینہ لنک کی بنیاد رکھی گئی۔

جہانگیر لکھتا ہے۔ بادشاہ نے پانی کے اوپر اس طریق سے جو زمین پیدا کی۔ وہ سو گز مربع تھی۔ اس کے چاروں طرف اس نے عمارات بنوائیں ایک عبادت خانہ بھی تعمیر کرایا اکثر اوقات وہ کشتی میں بیٹھکر آتا اور بہت سے چلے کھینچتا

ل صفحہ ۲۵۹ مرتبہ سر سید احمد خاں مرحوم مطبوعہ ۱۸۶۵ء

خواجہ محمد اعظم نے بھی "واقعات کشمیر" میں زینہ لنک کی بنا کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے جس جگہ بادشاہ نے یہ لنک تعمیر کیا۔ وہاں ایام زمستاں میں کمی آب کی وجہ سے زمین خشک نکل آتی تھی۔ اور ایسی عمارت کے آثار بھی وہاں ظاہر ہوتے تھے جس کو ہم بت خانہ یا ہندوؤں کا مندر کہہ سکتے ہیں۔ بادشاہ کو جب یہاں مکان بنانے کا خیال آیا۔ تو اس نے ایک بہت بڑی کشتی گجرات کی کشتیوں کے نمونے پر تیار کرا کے وہاں غرق کرائی۔ اور پھر اس پر پتھر اور مٹی ڈال کر وہاں زمین پیدا کی۔ اور اس پر عمارت اور مسجد کی بنیاد رکھی۔ اور نام اس مقام کا اپنے نام پر زینہ لنک رکھا۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ یہاں عمارت کی بنیاد رکھتا اس نے اس خیال سے کہ مندروں میں سونے چاندی کی مورتیاں بھی ہوتی ہیں غواصوں کو حکم دیا۔ کہ وہ غوطہ زنی کر کے دیکھیں کہ اس کے اندر کیا کچھ ہے۔ چنانچہ غواص اپنی مسلسل غوطہ زنیوں کے بعد دو طلائی بت اندر سے نکال لائے۔

زینہ لنک کی بنا کے تاریخی قطعات

یہ عالی منظر کاشانہ جو زینہ لنک کے نام سے مشہور تھا۔ تین طبقوں پر تھا۔ پہلا طبقہ پتھروں سے اور دوسرا اینٹوں سے اور تیسرا لکڑی سے تیار کیا گیا تھا۔ بادشاہ نے اس محل اور عبادت کدہ کی تیاری میں سید جان بازولی جیسے خدا رسیدہ بزرگ سے دعائے خیر د کامیابی کرائی۔ خود محنت و جانکاہی سے اس کو اختتام تک پہنچایا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ عمارت پایۂ تکمیل تک پہنچی ہو گی تو اسے بے انتہا خوشی حاصل ہوئی ہو گی۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے کو علاوہ عمارات کے اس نے باغ دلکشا اور مختلف اشجار سے سجایا۔ امرا و وزرا نے مبارکبادیں دیں۔ بادشاہ نے ایک جشن کے ذریعہ اپنی مسرت کا اظہار کیا چنانچہ

صاحب واقعات کشمیر لکھتے ہیں:- "وبعد اتمام عمارت لنک جشن عظیم کرد وداد دہش بسیار کرد شعراء قصائد وتواریخ گفتہ اند" لیکن تمام تاریخوں میں صرف ایک قطعہ تاریخ ہی درج ہے۔ جو حسب ذیل ہے ؎

این لقعہ چو بنیاد فلک محکم باد — مشہور بہ زین ڈب در عالم باد
شاہ زین عباد تا در وجشن کند — پیوستہ چو تاریخ خودش خورم باد

سرخوش جو کشمیر کا ایک مشہور خوش گو اور خوش نویس شاعر تھا۔ زینہ لنک کے متعلق کسی شاعر کے دو قطعات اپنی بیاض میں درج کرتا ہے ؎

یہ مصرع پڑھا نہیں گیا حروف کی خرابی سے — درصدف ہیچو درے ما و اکرد
لنک از دولت دریا دستے — خاک بر حلقئے — دریا کرد
دردل ڈل شاہ امشب بزم عشرت ساز کرد — بر رخ عالم ———— پڑھا نہیں گیا
شعلۂ شمع وچراغ بزم گاہ آگے پڑھا نہیں جا سکا — از ہوائے معتدل در آب ڈل ہم ناز کرد

سرخوش نے یہ نہیں لکھا کہ یہ شاعر کون تھا اور کس زمانہ میں تھا۔ لیکن شاعر کے اس مصرع ع دردل ڈل شاہ امشب بزم عشرت ساز کرد۔ میں لفظ امشب ظاہر کرتا ہے۔ کہ شاعر خود اس بزم عشرت میں شامل تھا۔ اور اس نے اس جشن میں یہ قطعہ بادشاہ کے روبرو پڑھا تھا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ دریا دل بادشاہ نے یہ قطعہ سنکر قدردانی کے موتی نہ برسائے ہوں گے۔

زینہ لنک کا طول وعرض

جہانگیر جس کی حکومت کشمیر کا زمانہ بڈشاہ سے قریباً ڈیڑھ سو سال بعد ہوا ہے۔ اس جزیرے کی وسعت سو مربع گز لکھتا ہے۔ مرزا حیدر جو بڈشاہ سے قریباً ستر سال بعد کشمیر میں سلطان نازک شاہ کے نام پر حکومت کرتا رہا ہے۔ اس کی وسعت دو سو مربع گز اور اس کی گہرائی ۳۰ فٹ یا دس گز لکھتا ہے۔

اور یہ بھی لکھتا ہے۔ اس جزیرے میں بادشاہ نے ایک دلکش محل کے علاوہ بہت سے درخت بھی نصب کرائے۔ یہاں تک کہ اس خوش نما نظارے کا اور ایسی موزون جگہ کا کوئی اور مقام مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ لہ

اس کے بعد پیرزادہ حسن شاہ اپنی تاریخ حسن میں اس جزیرے کی وسعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "جزیرہ وسیع کہ طول از شمال تا جنوب یکصد درعہ و عرض ۵۰ درعہ بے باشد بلند افراشتہ" جزیرے کی وسعت کے متعلق تینوں مورخوں کے بیان مختلف ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تینوں صحیح ہیں مرزا حیدر کے زمانہ میں جو بڈشاہ کا قریب ترزمانہ ہے۔ جزیرہ لنک اپنی پوری شان و شوکت پر ہوگا۔ اس لئے اس کی وسعت اور اس کی خوش حالی میں بھی چنداں فرق نہ آیا ہوگا۔ جہانگیر کے زمانے میں اس کو بڈشاہ کے بعد ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ پہلے باہمی خانہ جنگیوں پھر انقلاب سلطنت کے بعد زینہ لنک کس مپرسی کی حالت میں رہا ہوگا۔ اس لئے اس کی خرابی و بربادی کی وجہ سے عمارت جوں جوں گرتی جاتی ہوگی۔ پانی نزدیک آتا ہوگا۔ اور اس طرح اس جزیرے کی وسعت کم ہوگئی ہوگی۔ تاریخ حسن کا مصنف بھی جو وسعت اس کی لکھتا ہے۔ صحیح سمجھنی چاہیے۔ اس لئے کہ عمارت اور چہار دیواری اور اشجار وغیرہ کے انہدام سے تمام کھنڈرات آب ہوگئے ہوں گے۔

زینہ لنک کی موجودہ حالت

تاریخ حسن میں جس کی تصنیف کو آج تقریباً ساٹھ سال گزر چکے ہیں۔ لکھا ہے "مسجد رنگین تا حال موجود است تعمیر ساخت" یہ وہی مسجد رنگین ہے جس کو جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے "عبادت کدہ بہ جہت پرستش

لہ بحوالہ اسلامک کلچر ان کشمیر صفحہ ۲۱۳

خود داده"۔

اسی طرح خواجہ محمد اعظم اپنی تاریخ اعظمی میں جس کی تصنیف کو آج دو سو سال کا عرصہ گزرا ہے۔ زینہ لنک کے قطعہ تاریخ خودش خرم باد کے چاروں مصرعوں کے متعلق لکھتے ہیں "یہ تاریخ تاحال ایک پتھر پر منقش ہے۔ لیکن جب راقم السطور ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۹ء میں زینہ لنک کے کھنڈر دیکھنے گیا۔ تو نہ وہاں قطعہ تاریخ کسی پتھر پر منقش تھا۔ اور نہ مسجد اپنی نگینیوں کے ساتھ موجود تھی۔

زینہ لنک جس کے تین آشیانے تھے۔ یعنی ایک پتھروں کا ایک اینٹوں کا ایک لکڑی کا۔ ان میں سے کوئی بھی سلامت نہ تھا۔ بالائی آشیانوں کا تو وجود ہی نہ تھا۔ جو طبقہ سب سے نیچے تھا۔ اس کے کچھ بُرے بھلے آثار قائم تھے۔ چوہے ہر طرف دوڑ رہے تھے۔ پتھروں کے ڈھیر چاروں طرف لگے ہوئے تھے۔ اور توت[1] کے چند درخت اپنے خشک پتوں اور بوسیدہ وجود سے اپنی کہنگی کا ثبوت دے رہے تھے۔ اور اس عالیشان عمارت پر جس کے متعلق جہانگیر نے لکھا ہے کہ کشمیر کے اور بادشاہوں نے بھی زینہ لنک کے تین ضلعوں میں عمارتیں بنائیں لیکن کوئی عمارت زین العابدین کی عمارت کے پائے کو نہ پہنچی۔ حسرت واف‌سں کے بادل چھا رہے تھے[2]

---

[1] تاریخ ملا بہارالدین میں لکھا ہے "سلطان مذکور برآں جزیرہ درخت ہائے توت وغیرہ اشجار میوہ دار وگل ہائے رنگا رنگ نہال کرد" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں توتوں کی بنیاد اسی زمانہ سے ہے

[2] یہ ۱۹۱۸ء کی کیفیت تھی۔ ۱۰-۲۱ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو میرے عزیز دوست ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی ایم اے ڈی لٹ مصنف "کشیر" وکتب متعددہ زینہ لنک دیکھنے کے لیے ولر کی طرف گئے۔ انہوں نے وہاں زینہ لنک کی خستہ حالی کی جو کیفیت (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۹ پر دیکھیں

زینہ لنک یا خرم آباد

قطعہ تاریخ خرم آباد کی وجہ سے اس عمارت کا نام خرم آباد بھی مشہور ہو گیا۔ بادشاہ اس کو زینہ لنک بھی کہتا تھا اور خرم آباد بھی۔ لیکن عوام میں زینہ لنک کے نام نے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔

سوپور سے صفاپور تک طویل ستھو

سوپور سے صفاپور تک ۹ یا دس میل کا فاصلہ ہے۔ بادشاہ نے زینہ لنک یا خرم آباد کی حفاظت کے لئے ایک طویل ستھو بنایا۔ اور ایک گاؤں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۸) لکھی ہے وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

" وہ محل جو سلطان زین العابدین بڈشاہ نے یہاں تعمیر کیا تھا اور جس کی شان و شوکت کا پتہ یہ قطعہ دیتا ہے ؎

این بقعہ چو بنیاد در فلک محکم باد
مشہور بہ زین و زیب در عالم باد

تا زین عباد اندر آں جشن کنند
پیوستہ چو تاریخ خودش خرم باد

اب بالکل کھنڈر پڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زینہ لانک کے چار یا ربل یا گھاٹ تھے۔ اب وہ ایک افتادہ سنگین خوبصورت ستونوں کے سوائے کچھ نہیں۔ البتہ مسجد کے گنبد کا ایک چوتھائی شکستہ حصہ اور بوسیدہ چوبی دروازہ باقی ہیں۔ وہ معمر بتلاتے ہیں کہ قریب تیس سال قبل مسجد کا گنبد سالم تھا۔ چنانچہ پیر حسن شاہ نے بھی تاریخ حسن میں اس کی تصدیق کی ہے لیکن آثار قدیمہ کے تغافل نے اسے بھی گرنے سے نہ روکا۔ شاید بمحل مرمت بڈشاہ کی اس موتی مسجد کو برقرار رکھتی۔ مسجد کی اینٹیں کافی وزنی ہیں۔ اور ان کی سرخی سے ان کی طاقت اور توانائی ٹپکتی ہے۔ زینہ لانک کا ٹیلہ میلوں دور سے نظر آتا ہے۔ مگر راستہ اب ڈل کے پانی سے نہیں۔ بلکہ نیم خشک زمین سے ہے۔ منظر واقعی دلفریب (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۰ پر دیکھیں)

ز اود گام اس ستھو کی مرمت وغیرہ کے لئے وقف کر دیا۔ بقول صاحب وجیز التواریخ ایک گاؤں نہیں بلکہ دو تھے اور سالہا سال تک ان کا مالیہ اس ستھو کی مرمت و حفاظت پر صرف ہوتا رہا۔ آج بھی شاہ گنڈ جہانگیر گنڈ حاجن اور خاص سوپور میں اس ستھو یعنی دیوار بندی کے آثار موجود ہیں۔ اس ستھو پر جو پتھر صرف ہوا ہے۔ وہ موضع تاپر[ل] کے شکستہ حال مندر نرندری شور سے حاصل کیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۹ کا)

ہے۔ کیوں نہ ہو۔ ہندوستان بھر کی تازہ پانی کی سب سے بڑی جھیل اور دنیا کے سب سے اونچے پہاڑ ہمالیہ کا سلسلہ اور اس دلکش مقام پر محل اور اس محل میں سامان عیش و آرام واقعی بادشاہ کی دماغی کلفت کو دور کرتا ہوگا اور مسجد مولا کی یاد دلا کر سلطان کو اسی مولا کی مخلوق کی خدمت کی جانب راغب کرتی ہوگی۔ ایک شولنگ اندازاً ۴۹ انچہ لمبا اوندھا پڑا ہے۔ نہ معلوم یہ کب اور کیسے یہاں اس خرابے میں آیا اور کیوں اس افتادگی کی صورت میں اپنی بے محلی کا رونا رو رہا ہے؟

ل کشمیر کے محکمہ آثار قدیمہ نے تاپر کے اس مندر کا کھوج نکالا ہے۔ یہ مندر سرینگر سے ۲۲ میل اور پٹن سے آگے چار میل پر واقع ہے۔ یہاں کریوہ ہے۔ اور سڑک کے کنارہ پر ہے بلندی کی وجہ سے خشک ہے۔ اس کے ارد گرد خشک فصلوں کے کھیت ہیں۔ ہوا سہانی اور خوشگوار ہے اور منظر بھی لطف اندوز ہے۔ راقم نے ۱۹۳۲ء میں اس مندر کو کھدائی کے دوران میں دیکھا۔ نومبر ۱۹۳۲ء کے ہفتہ اول میں ڈاکٹر صوفی بھی وہاں گئے۔ انہوں نے کشمیر کے سربرآوردہ روزانہ اخبار ہمدرد مورخہ ۱۱ نومبر میں اس کی مندرجہ ذیل کیفیت لکھی۔ "محکمہ آثار قدیمہ کی کوشش سے تاپر کا مندر اب قابل ملاحظہ ہے۔ پنڈت مدھوسودن کول صاحب ایم اے۔ ایم۔ او۔ ایل شاستری سپرنٹنڈنٹ محکمہ اور ان کے عملے نے محنت اور کاوش سے کھدائی کا کام سرانجام دیا ہے۔ ۶۰۰ سو روپیہ ۱۹۳۲ء کی کھدائی پر صرف اور سولہ سو روپیہ سال رواں میں۔ گویا تین ہزار اب تک خرچ ہو (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۱ پر)

گیا تھا جیسا کہ سطور ذیل سے ظاہر ہوگا۔ "از صفاپور[1] تا سوپور[2] رسد مکھے بنا کردہ سنگ ہائے
بت خانہ تا بہر کہ پیش از عمل او خراب شدہ بود آوردہ استحکام نمود"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۰) چکا ہے۔ اور ابھی کام باقی ہے۔ مکمل کھدائی پر اس مندر کی اصل ہیئت کا پتہ چلیگا۔
فالحصول کا خیال ہے کہ آب و تاب کے لحاظ سے نارپر کے کھنڈر بڑے ہی دلچسپ ہیں۔ بنیادی حصہ
جو نمودار ہے۔ اپنی عظمت اور وسعت کا پتہ دیتا ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس مندر کو
کشمیر کے اور کھنڈروں پر خاص فوقیت ہے۔ اور وہ تفوق زیادہ تر اس کے رقبہ اور اس کی
وسعت کی شان کو نمایاں کرتا ہے۔ اور ایسا نظر آتا ہے کہ حال ہی میں بنا ہے۔ اور چونکہ بارہ مولا
جانے والی سڑک سے قریب ہے سیاح اس کو بآسانی دیکھ سکتا ہے۔

بنیادی حصے یہ مندر ½ ۶۰ فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہے۔ دیواروں کی موٹائی ۴
فٹ ہے۔ درمیانی حصہ اندازاً ۶ فٹ اونچا ہے۔ باقی گر چکا ہے بعض پتھر ۱۳ سے ۱۴ فٹ لمبے
اور ۴ فٹ چوڑے نظر آتے ہیں۔ اس قدر بھاری پتھر اس زمانے میں کہاں سے اور کیسے اٹھا کر لائے
گئے حیرت کا موجب ہے۔ یہی بات پریہاسا پورا اور پٹن وغیرہ کی نسبت بھی کہا جا سکتا ہے۔

پنڈت کلہن اپنی راج ترنگنی میں اس مندر کا ذکر نہیں کرتا اور مندر کی مرمت کے دو
کتبے جو دستیاب ہوئے ہیں۔ وہ ۱۵۰۰ء کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شاید یہ مندر راجہ
پرتاپ آدتیہ کا بنایا ہوا نہیں بعد کا ہے اور کلہن نے ۱۱۴۹ء میں راج ترنگنی مکمل کی جس میں
اس خوبصورت مندر کا ذکر مفقود ہے۔ ممکن ہے۔ کہ مزید کھدائی پر کچھ انکشافات ہوں۔
اور شاید قدیم تاریخ کشمیر پر کچھ نئی روشنی پڑے۔

[1] از مختصر التواریخ کشمیر مصنفہ پنڈت بیربر کاچرو (غیر مطبوعہ) بہ عہد مہاراجہ گلاب سنگھ۔
[2] اس تھو یا سد مکم کے تمام رسو پور میں بھی دریا کے کنارے پائے جاتے ہیں۔ نگرام سے آتے
ہوئے ڈاکخانہ کے پاس سے جو رستہ نرسری کی طرف جاتا ہے اور اس رستہ کے بائیں جانب جو
مکانات ہیں۔ وہ اسی قدیم تھو پر آباد ہیں۔

زینہ لناب میں جشن عظیم

جب یہ شاہی عمارت تکمیل کو پہنچ گئی۔ تو بادشاہ نے ایک جشن عام کی تیاریاں کیں۔ اسباب نشاط و سرور اور آلات عیش و طرب حکم شاہی کے ساتھ ہی مہیا ہو گئے۔ ارکان دولت حاضر ہوئے۔ نذر و نیاز اور پیشکش کا دربار منعقد ہوا۔ بادشاہ نے داد و دہش کے منہ کھول دیئے۔ غریب امیر سب نہال ہو گئے۔ شعرا نے قصائد لکھے اور انعامات حاصل کئے۔ بلکہ اکثر مستحقین کو توقع سے زیادہ ملا۔ بقول شاعر ؎

دہ لوگ تری داد و دہش دیکھ لیں آکر
جو کہتے ہیں ملتا نہیں قسمت سے زیادہ

بادشاہ کو میر سید اویسی سے بہت محبت تھی۔ لیکن وہ باوجود بادشاہ کا منہ بولا فرزند کہلانے کے بادشاہوں کی صحبت سے کنارہ کش رہتے تھے۔ اور ذوق تنہائی پر دونوں جہان کی مسرتیں قربان کر دیا کرتے تھے۔ بادشاہ نے اس جشن عظیم کی شرکت کے لئے ان کو بہ اصرار بلوا بھیجا۔ بعض امرا نے پیغام دعوت کے ساتھ ہی یہ فقرہ بھی جڑ دیا کہ بادشاہ کا مزاج آپ سے رنجیدہ ہے اس دعوت کو نہ ٹالئے۔ نیز یہ دعوت ایک عجیب و غریب عمارت کی تکمیل پر شکرانہ الٰہی کے سلسلہ میں ہے۔ اس کی ابتدا بھی ایک بزرگ (سید جان باز دلی) کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ اس کی افتتاحی رسم میں آپ جیسے صوفی منش شہزادے کی شرکت باعث برکت ہے۔ غرض امراء وزرا کسی نہ کسی طرح میر اویسی کو اس بزم میں لے آئے۔ وہ بظاہر شریک تھے مگر بباطن سب سے الگ تھے ؎

ہر کسے جام تنعم بہ کف و ساغر عیش
فارغ از عیش و تنعم دل غمگین من است

رنگ میں بھنگ

تقسیم انعامات اور پیشکش کی رسومات کے بعد جب ہنگامۂ شادی و طرب شروع ہوا۔ اور مجلس نشاط و سرور گرم ہوئی۔ اور بعض امور نامشروعہ کا اظہار ہوا؎ تو بقول صاحب اسرار الابرار میر اویسی کی غیرت یہ حرکت برداشت نہ کر سکی۔ مچھلی کی طرح تڑپے اور تڑپ کر دریا میں ایسے غائب ہوئے کہ غواصان شناورکیش اور ملاحان سیاحت اندیش کی تمام کوششوں کے باوجود وہ دُریگانہ اس بحر بیکراں سے نہ نکل سکا۔ سلطان کا سارا عیش منغص ہوگیا مجلس طرب درہم برہم ہوگئی۔ نہایت اندوہگین ہوکر واپس شہر کو روانہ ہوا جب اشم پرگنہ محمد آباد میں شنکر رلیشوہار کے پُر از انہار و اشجار باغ کے برابر پہنچا۔ جو لب دریا واقع تھا۔ تو کیا دیکھتا ہے۔ کہ میر قدس سرہٗ دریا کے کنارے کنارے جلد جلد قدم اٹھائے چلے جارہے ہیں۔ بادشاہ کشتی میں سوار تھا۔ یہ دیکھکر اس کے قالب مردہ میں جان آئی۔ کشتی سے اتر کر باغ میں آیا۔ بہت ندامت و افسوس اور عذر کا اظہار کیا۔ کشتی پر سوار کرا کے اپنے ہمراہ لایا۔ ارکان دولت نے مبارکبادیں دیں۔ بادشاہ نے اس خوشی میں شہر کے تمام غربا کے لئے بادشاہی دعوت کے احکام جاری کئے؎

علاقہ زنگیر کی آبادی و رونق

زنیہ لنک یا خرم آباد کی تعمیر (۸۳۲ھ) کے بعد جب بادشاہ دولاب کی سیر

لہ صاحب اسرار الابرار تاریخ اعظمی تاریخ حسن وغیرہ نے لکھا ہے کہ میر نے امور نامشروعہ دیکھکر غیرتِ شریعت کے ثبوت میں اپنے آپ کو دریا میں ڈال دیا۔ البتہ صاحب فتحیات کبرویہ لکھتے ہیں کہ اسی دوران میں میر پر ایک ایسی حالت طاری ہوئی۔ کہ وہ تڑپ کر دریا میں جا پڑے ۔ ؎ میر سید این اویسی کے باقی حالات باب مشائخ و علماء میں پڑھئے۔

کوزنطلاء اور رستہ میں اس نے وُلیب سے لیکر نالہ پہرو کے بائیں ہاتھ میلوں تک کف دست میدان دیکھا۔ اور پانی کا نام ونشان نہ پایا۔ خصوصًا اس وسیع علاقے میں جو چند ایک مواضعات تھے۔ ان کے باشندوں کی تباہ حالی اور ان کی فصلوں کی بربادی نے اس پر بڑا اثر کیا۔ تو اسی وقت اس نے اس خشک و بنجر مردہ علاقہ کی سرسبزی و شادابی کا ارادہ کرلیا۔

اس علاقہ کو آباد کرنے سے پیشتر اس نے پہرو کے مقام سے ایک نہر نکالی جس کا ذکر نہروں کے بیان میں آئے گا۔ ساتھ ہی پہاڑوں کے دامن اور میدان میں کئی جدید گاؤں آباد کرائے۔ جن کو اس نہر نے مالامال کردیا۔

زینہ گیر کی رونق و آبادی میں بادشاہ نے حد سے زیادہ سرگرمی دکھائی۔ اس علاقہ میں جو باغ اس نے تعمیر کرایا۔ وہ دو میل مربع میں تھا۔ درختوں۔ پھلوں اور نہروں سے آراستہ باغ کے چاروں کونوں پر بلند عمارات تھیں اردگرد امیروں اور سرداروں کی عمارات گلزاروں کی ترتیب سے آراستہ تھیں۔[1]

جونراج اور سری ور نے بھی اپنی راج ترنگینوں میں زینہ گیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔ بادشاہ نے لولاب کے اس جنوبی علاقہ کو آباد کرکے اپنے نام پر موسوم کیا تھا۔ اور یہاں بکثرت نہریں جاری کرائی تھیں۔[2]

مکمل تاریخ کشمیر میں[3] تو اور بھی وضاحت سے زینہ گیر کی آبادی کا ذکر لکھا ہے۔ بادشاہ نے نوآبادی زینہ گیر میں موضع تریہگام کے متصل

[1] از تاریخ کشمیر اردو قلمی مصنفہ خواجہ حسن ملک (پبلک لائبریری سرینگر کشمیر) [2] راج ترنگنی ترجمہ شہائن صاحب کا اردو ترجمہ صفحہ ۲۰۰ تا ۲۰۳ حصہ دوم درذکر سلطنت زین العابدین مصنفہ راقم الحروف۔ [3] راقم الحروف اپنی اس تصنیف یعنی تاریخ کشمیر کے حوالے ۱۹۲۶ء میں تریہگام گیا۔ جو موضع ہردوشیوہ نزیل سوپور سے قریبًا ۲۶ یا ۲۷ میل دور لولاب کے متصل (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۵ پر)

ایک وسیع اور فراخ باغ بنوایا جو پورے دو میل مربع میں واقع تھا۔ اس کے چاروں گوشوں پر عالیشان اور سر بفلک قصر جن میں سے ہر ایک عجوبۂ روزگار تھا بنوائے ماں کے ارد گرد اراکین دولت اور اعیان مملکت نے بھی اپنی اپنی بے نظیر عمارتیں بنوائیں۔ جنہوں نے اس باغ کو باغ رضواں بنا دیا۔

علاوہ ازیں دیگر ممالک قریب و بعید سے قسم قسم کے میوے دار بوٹے اور رنگ برنگ کے خوشبودار پھول منگا کر لگائے۔ جس سے یہ باغ وادیٔ کشمیر میں بے مثال ہو گیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۰) پہاڑ کے پیچھے واقع ہے۔ ترہیگام سے دو میل کوپہ وارہ کی جانب اور تین میل ترہیگام سے آگے موضع سالورہ کی طرف بعض قدیم عمارتوں کے آثار ہیں۔ جو آثار قدیمہ ترہیگام اور کوپہ وارہ کے درمیان سڑک کے کنارے دوسرے اور تیسرے میل کے درمیان تھے۔ وہ میں نے ترہیگام آتے ہوئے رستہ ہی میں دیکھ لئے تھے۔ موضع سالورہ کے کھنڈر دیکھنے کے لئے میں ۹۔ اگست کو گیا۔ وہاں بہت سے لوگ بلوائے۔ جن میں ایک ضعیف پنڈت بہت واقفکار تھا۔ وہاں ایک قلعہ کے آثار اور کچھ کھنڈر نظر آئے جس کی چار دیواری کے اندر کی پیداوار قلعہ کی ویرانی کی خبر دے رہی تھی۔ قلعہ مہاراجہ گلاب سنگھ بانیٔ حکومت ڈوگرہ نے راجہ شیر احمد خان والی کرناہ کی دست برد سے اپنے ملک کو بچانے کے لئے بنایا تھا۔ اس موضع میں بہت سے چشمے ہیں۔ لیکن دو چشمے بہت پرانے ہیں۔ جو ایک قدیم مسجد کے پاس ہیں۔ جن کے متعلق مجھے بتایا گیا۔ کہ یہاں حضرت مخدوم صاحب آئے تھے اور ان کو ان کے مرید بابا عبد اللہ نے آباد کیا تھا۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ پچیس تیس سال ہوئے۔ یہ مسجد جل گئی تھی۔ اور جب خواجہ عزیز جو ککڑ دریس بارہ مولا (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۶ پر دیکھیں)

مرزا حیدر نے بھی باغات و عمارات زینہ گیر کی بہت تعریف لکھی ہے لہ

لارنس صاحب نے بھی اپنی کتاب ویلی آف کشمیر میں زینہ گیر کے باغات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ زین العابدین جہاں کہیں گیا۔ باغات و عمارات بناتا گیا۔ باغات میں اس کے چار باغ اپنے زمانے میں بہت مشہور تھے۔ (۱) باغ زینہ گیر (۲) باغ نوشہرہ راجدھانی (۳) باغ زینہ پور (۴) باغ زینہ کوٹ لیکن آج ان باغات کا کھوج ملنا بھی ناممکن ہے۔

زنگیر میں نیشکر کی کاشت

نیشکر یعنی گنا سرد ملکوں میں نہیں ہوتا۔ آج بھی اس کی کاشت کشمیر میں صرف مظفر آباد تک ہے۔ جو پہاڑی ملک ہے۔ اور گرمیوں کے موسم میں جس کی گرمی پنجاب سے کم نہیں ہوتی۔ مگر وادی کشمیر میں جو بارہ مولا سے اسلام آباد اور پہلگام اور ویری ناگ اور ادھر سوپور سے زینہ گیر اور لولاب اور ادھر پچھی پورہ کے وسیع علاقہ تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی کبھی پیداوار نہیں ہوئی زین العابدین سب سے پہلا بادشاہ ہے جس نے زینہ گیر کے وسیع باغ میں اس کی کاشت کا تجربہ کیا۔ نیشکر کی فصل ہوئی تو سہی مگر کچھ اچھی نہ ہوئی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۵) نے اس کی مرمت کرائی۔ تو اس کی دیواروں کو کھودنے سے قدیم زمانہ کے دو بہت بڑے مٹ دگھڑے نکلے تھے۔ بہرحال جس غرض کے لئے گیا تھا وہ پوری نہ ہو سکی جس زمانہ (۱۹۱۰ء) میں راقم الحروف نے مکمل تاریخ کشمیر کی جلد دوم لکھی تھی میرا خود جانا تریگام نہیں ہو سکا تھا۔ اب تحقیق و تفتیش اور خود موقعہ پر جانے سے معلوم ہوا ہے کہ تریگام کے متصل بڈشاہ کا کوئی عظیم الشان باغ نہ تھا۔ تاریخوں میں جن باغات و عمارات متصل تریگام کا ذکر ہے۔ وہ علاقہ زنگیر کے عین مرکز میں تھا یعنی وہاں جہاں اب موضع سید پورہ آباد ہے اور (بقیہ حاشیہ دیکھو صفحہ ۲۰۷ پر)

اس لئے بادشاہ نے اس پر کچھ توجہ نہ کی۔

زونراج نے بھی کشمیر میں نیشکر کے بوئے جانے کا ذکر کیا ہے۔ وہ زینہ گیر کی بجائے مارتنڈ کے ارد گرد نیشکر کے پودوں کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتاتا کہ بادشاہ کو اس میں کامیابی ہوئی کہ نہیں۔ بہر حال ملک سرد ہونے کی وجہ سے نیشکر کی فصل نہیں ہوئی ہوگی۔ مارتنڈ کا مندر کریوہ اسلام آباد میں بہت مشہور ہے۔ مگر کامراج میں بھی بادشاہ نے مارتنڈ کے نام سے ایک مندر تعمیر کرایا تھا۔ شائد زونراج کا اسی مارتنڈ سے مطلب ہو۔

نہر زینہ گیر کا اجراء

زینہ گیر کی آبادی کے لئے بادشاہ نے نالۂ پہرو سے جو نہر نکالی اس کی بڑی شاخ تو دامن کوہ کے مضافات کو سرسبز و شاداب کرتی ہوئی سیدھی ولر میں داخل ہوئی۔ اور ان شاخوں نے تمام دیگر ملحقہ دیہات کو جن میں زیادہ تر بادشاہ کے اپنے آباد کردہ تھے۔ اور جو اس وسیع میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ نہال و آباد کر دیا۔ اس زمانے کے کئی گاؤں انقلاب زمانہ کے ہاتھوں تباہ ہوگئے۔ کئی مٹ گئے۔ لیکن آج بھی زینہ گیر میں چالیس سے زیادہ گاؤں آباد ہیں۔

زینہ گیر میں بادشاہی "زینت محل"

سوپور اور ہندواڑہ کی سڑک پر دائیں ہاتھ جہاں دسواں میل آتا ہے وہیں سے وزیر سوبھارام کا باغ اور ان کی مزروعہ اراضی شروع ہو جاتی ہے۔ دسویں میل سے چند قدم آگے ہندواڑہ کو جاتے ہوئے بائیں ہاتھ قدیم نہر بڈشاہی کے آثار کے علاوہ سڑک کے کنارے ایک گلاسرا چنار نظر آتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۰) جہاں سید حسین قمی رضوی کا مزار ہے۔ جیسا کہ اسلامک کلچر ان کشمیر کے فاضل مولف نے بھی لکھا ہے۔ (۱) تاریخ خواجہ محمد اعظم عہد محمد شاہی سال تصنیف ۱۱۴۰ھ

جس کے نیچے ایک سیاہ پتھر پڑا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ جب ادھر آتا تھا۔ تو اسی چنار کے نیچے جو آج بے برگ و بار ہے۔ اور اسی پتھر پر جو آج تمازت آفتاب سے پھٹا پھٹا دکھائی دیتا ہے۔ نماز پڑھا کرتا تھا۔ اس چنار۔ اور اس "سنگین جائے نماز" کے پاس ہی ایک قدیم قبرستان کے آثار نظر آتے ہیں۔ آج سے پندرہ بیس سال قبل یہاں صرف وزیر سوبھارام ہی کا باغ تھا۔ اور اس میں بھی اب تک کئی قبروں کے نشان ملتے ہیں۔ لیکن اب وہاں دو اور وسیع باغ بن گئے ہیں۔ اور قبرستان کی بہت سی زمین زیر کاشت آگئی ہے۔ اس سے اندازہ لگ سکتا ہے۔ کہ یہ قبرستان کس قدر وسیع و عریض تھا۔

بہت عرصہ ہوا ایک پیر مرد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بزمانہ بدشاہ دامن کوہ میں ایک بہت بڑا شہر آباد تھا۔ اسی برباد شہر کے لوگوں کو فرشتہ اجل نے اس قبرستان میں تھپک کر سلا رکھا ہے تجسس اور کوشش کے باوجود اس سے زیادہ کچھ اور معلوم نہ ہوسکا۔

لیکن سنہ ۱۹۴۲ء میں سرینگر میں پھر ایک قدیم بیاض دیکھنے کا موقع ملا۔ جو بہت بوسیدہ تھی۔ اور جس میں سے اکثر الفاظ پڑھے نہیں جاتے تھے اس بیاض میں مولانا ذہنی[1] کے اشعار زنگیر کے زینت محل کے متعلق ملے۔ آج بھی اس علاقہ میں جو مزروعہ زمین ہے۔ اس کے اکثر حصہ کو زننہ کھاہ (زینت کھاہ) یعنی آبی مزروعہ زمین کہتے ہیں۔ تریہ گام کے چکول نے بادشاہ کے اس محل کو آگ لگا کر تباہ کر دیا تھا۔ مغلوں کے زمانہ میں اس کی از سر نو تعمیر ہوئی۔

---

[1] ملا ذہنی دور شاہجہانی میں کشمیر کا ایک نامور شاعر اور بابا نصیب الدین غازی المتوفی سنہ ۱۰۴۶ھ کا مرید تھا۔

ذہنی نے تعمیر نگر پر جو اشعار لکھے۔ ان میں سے جو بآسانی پڑھے جاسکے ہیں۔ وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

نو بہاراست و باد محض عبیر | نو نگاراست و خاک عطر خمیر
لالہ با جام بادہ مست آمد | کرد فرموش داغ را تدبیر
نرگس از خواب جست آشفتہ | شدہ سوسن معبتر تعبیر
شاہ زین العباد صاحب تاج | کہ جہاں را از وبود توقیر
بازہ از فضل ایزد مطلق | کرد زینت محل دگر تعمیر
زینہ گیر است باغ فرحت بخش | کہ ندارد بزیر چرخ نظیر
داشت ویراں بسیط ہامونے | کرد از آبیاری اش تعمیر
آنکہ دریا بکوزہ مے آرد | بہر لب تشنگاں زروے ضریر
سال تاریخ ایں بنائے متیں | کلخ ...... کشمیر
یافت ذہنی زبارگاہ شہی | خلعت خاص و ولت کشمیر

اس علاقہ کی زیر کاشت زمین میں کہیں کہیں اینٹوں۔ چونا اور پتھروں کے نشان ملتے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہاں اس زمانہ میں کوئی طویل پختہ فرش نہر کے کنارے تھا۔ اور یہیں کہیں غالباً زینت محل بھی آباد تھا۔

زینہ گیر کی آمدنی وقف تھی

بادشاہ خود عالم تھا۔ وہ علم کا عاشق اور عالموں کا قدردان تھا۔ اس کے دربار میں ہند و مسلمان دونوں قوموں کے عالم زانو بہ زانو اور دوش بدوش بیٹھتے تھے۔ اور بادشاہ کو اپنے علم کے کمالات سے خوش کرتے تھے۔ بادشاہ نے جب زینہ گیر کو آباد کیا۔ تو اس نے اس کی تمام آمدنی

تمام محصولات اور تمام فصلیں علماء و فضلاء کے لئے وقف کر دیں۔

زنگیر کے متعلق[1] بادشاہ کا فرمان اپنے جانشینوں کیلئے

شر یور نے جہاں کہیں علاقہ زنگیر کا ذکر کیا ہے۔ اس کو جینا گری (jainagri) لکھا ہے۔ بادشاہ کو اس علاقہ کی مستقل فلاح و بہبود اور زمینداروں کی خوش حالی کا یہاں تک خیال تھا کہ اس نے اپنے جانشینوں کے لئے تانبے کی تختی پر فرمان کندہ کرایا۔ یہ فرمان شر یور نے سنسکرت زبان میں لکھا ہے۔ ہم اس کا مفہوم انگریزی ترجمہ سے یہاں اردو میں لکھتے ہیں۔

شری زین العابدین اپنے جانشین بادشاہوں سے استدعا کرتا ہے کہ وہ زنگیر کے زمینداروں سے پیداوار کا صرف ⅙ حصہ وصول کیا کریں۔ میں نے اس وسیع ٹکڑے کو اپنی ذاتی لاگت سے قابل کاشت بنایا ہے۔ میں نے اس علاقے میں ایک عالیشان محل بھی تعمیر کرایا ہے آنے والے بادشاہوں کو چاہئے کہ وہ اس علاقہ کے علاوہ میرے اس محل کی بھی نگہداشت کریں۔

شر یور لکھتا ہے۔ بادشاہ کا یہ فرمان شری دکاشیش نے تانبے کی ایک پلیٹ پر کندہ کرایا۔ یہ فرمان سوپور کے شاہی محل میں موجود رہتا تھا[2]

باغ زینہ گیر و عمارات بڈشاہی کی تباہی

وٹلب سے درگہ مولا اور پہرو تک جو میدان بالکل خشک اور کشمیر کا

---

[1] از مکمل تاریخ کشمیر اردو حصہ دوم مطبوعہ و تاریخ کشمیر اردو غیر مطبوعہ مصنفہ خواجہ حسن ملک (پبلک لائبریری سرینگر)

[2] افسوس ہے آج تانبے کی اس پلیٹ کا کہیں کھوج نہیں ملتا۔

گرم ترین حصہ تھا۔ بادشاہ نے نہروں کے اجرا باغات کے احداث جدید دیہات کی بستیوں اور اپنے قیام سے خطہ جنت بنا دیا تھا۔ مگر افسوس چشم فلک اس کو سرسبز و شاداب نہ دیکھ سکی۔ اور بادشاہ کی زندگی ہی میں دو تین مرتبہ اس کے محبوب ترین باغ زینہ گیر اور شاہی محلات کو تباہی و بربادی کا منہ دیکھنا پڑا۔ جس کی کچھ تفصیل اس طرح ہے۔ کہ موضع تریہگام میں جو زینہ گیر سے تئیس چوبیس میل کے فاصلے پر ہے۔ قوم چک کا رئیس پانڈو چک جو بڑا ذی اقتدار تھا۔ رہتا تھا۔ زینہ گیر میں شاہی عمارات کی تعمیر اور بادشاہ کی بکثرت آمد و رفت سے اس کو اپنی رہزنی اور لوٹ مار میں تکلیف محسوس ہوئی۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب بادشاہ دارالحکومت میں تھا۔ پانڈو چک اپنے اٹھائی گیروں کے ساتھ رات کو آکر تمام عمارتوں کو جلا کر خاکستر کر گیا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی۔ اس نے فوج بھیجکر تریہگام کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ لیکن پانڈو چک ہاتھ نہ آیا۔ وہ اپنی جماعت کو لے کر اپنے اصل وطن دردستان کی طرف بھاگ گیا۔ اور پر خطر اور ہیبت ناک پہاڑوں میں زندگی بسر کرنے لگا۔ بادشاہ نے عمارات منہدمہ کی از سر نو تعمیر کرا دی۔ پانڈو چک کو بھی خبر ہوئی۔ وہ پہاڑوں سے نکلا۔ دن کو چھپ رہتا اور رات کو سفر کرتا۔ یہاں تک کہ وہ اسی طرح زینہ گیر کی شاہی عمارات تک جا پہنچا۔ اس نے نظر بچا کر پھر آگ لگائی اور دردستان میں بھاگ گیا۔

بادشاہ نے ان عمارات کی پھر مرمت کرائی۔ اور پانڈو چک کی گرفتاری کے احکام سختی سے جاری کر کے حاکم دردستان کے نام ایک تاکیدی حکم بھیجا کہ پانڈو چک جو سلطنت کا بدخواہ اور باغی ہے۔ لوٹ مار پر گزارہ کرتا ہے

تمہارے کوہستان میں چھپا ہوا ہے۔ بہتر ہے اس کو جلد تر گرفتار کر کے دارالخلافہ میں بھیجدو۔ ورنہ دردستان تباہ کر دیا جائے گا۔ حاکم دردستان کی بادشاہ کے آگے کیا ہستی تھی۔ اس نے انعام کا لالچ دیکر پانڈو چک کی گرفتاری کا ڈھنڈورا پٹوا دیا۔ چنانچہ وہ بدکردار اپنی جماعت کے ہمراہ گرفتار ہوا۔ اور پابجولاں بادشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا۔

بادشاہ پانڈو چک کی شرارتوں اور بدکرداریوں سے برافروختہ بلکہ آگ بگولا ہو رہا تھا۔ حکم دیا کہ اس بدنہاد کو تازیانے لگاؤ۔ اور جب تک اس کے ناپاک جسم سے روح علیحدہ نہ ہو جائے۔ ضرب تازیانے میں کوئی کمی نہ ہو۔

چنانچہ جب اس ناپاک وجود سے دنیا پاک ہو گئی۔ تو بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ اس کی جماعت اور اس کے ساتھیوں کو ایک ایک کر کے لاؤ اور تلوار کے گھاٹ اتار تے جاؤ۔ صرف ان کی عورتیں اور بچے زندہ چھوڑے گئے۔ بادشاہ نے ان کو ضلع ہرل پرگنہ ونتر میں رہنے کی اجازت دی۔ اور ان کے گزارے کے لئے کچھ وظیفہ مقرر کر دیا۔

بادشاہ کی زندگی میں شاہی عمارات زینہ گیر کو جو صدمات پہنچتے تھے بادشاہ ازسر نو تعمیر درست کر کے ان کی تلافی کر دیتا تھا۔ لیکن جب چک بادشاہوں کا زمانہ آیا۔ اور وہ کشمیر کے بادشاہ ہو کر خانہ جنگیوں میں مصروف اور ملک کی آبادی وفلاح سے غافل رہنے لگے۔ تو ان عمارات کو ناقابل برداشت صدمہ پہنچا۔ خصوصاً غازی چک سنہ ۹۵۲ھ لغایت سنہ ۹۶۳ھ کے زمانے میں۔ باہمی حسد وعداوت کی وجہ سے یہ عمارتیں ایسی نذر آتش ہوئیں۔ کہ پھر ان کا وجود قائم نہ رہ سکا۔ اور نہ کسی سلطان کی طرف توجہ کی۔

چک بھی آئے اور اپنی نوبت بجا کر چلے گئے۔ ان کے بعد مغل بادشاہ آئے۔ جو شوق تعمیرات میں بادشاہ بڈشاہ کی طرح دلچسپی رکھتے تھے۔ مگر ان کو جنوبی کشمیر اور خاص دارالخلافہ کی رونق و آبادی و دلبستگی نے زینہ گیر جیسے خشک علاقے کی طرف توجہ کرنے کی مہلت نہ دی۔ ان کا دور بھی ختم ہوا۔ تو درانی خاندان نے یہاں اپنے قدم جمائے۔ ان کے عہد میں صرف اتنا ہوا کہ حضرت سید حسین صاحب قمی رضوی کی زیارت مبارک کی جو باغ زینہ گیر کے اندر تھی مرمت ہو گئی۔

افغانوں کے بعد کشمیر میں اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور سکھ یہاں کے بادشاہ بنتے ہیں۔ جن کو قدرتاً اسلامی عمارات سے کوئی دلچسپی نہ ہو سکتی تھی۔ غرض شاہی عمارات و باغات کے جو تھوڑے بہت نشان باقی تھے۔ وہ بھی رفتہ رفتہ مٹ گئے۔ یہاں تک کہ اور تو اور زینہ گیر ہی کے بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس چھوٹے سے موضع سید پورہ میں کبھی بادشاہی باغات و محلات بھی تھے۔

بڈشاہی عمارات کے موجودہ کھنڈر سید پورہ زینگیر میں

سید پورہ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جہاں اڑھائی تین سو نفوس کی آبادی ہے۔ ایک محلہ سنیوں کا ہے ایک شیعوں کا۔ اور دونوں کی آبادی قریباً قریباً مساوی ہے۔ شیعہ محلہ کے متصل بہت سے قدیم آثار ملتے ہیں۔ ایک نہر جو آج مسدود ہے وہ بڈشاہ کے زمانے میں باغ کے تمام رقبہ کو سیراب کرتی تھی اسکے شمال کی طرف ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے۔ جو قدیم پتھروں سے اٹا پڑا ہے۔ اس پر توت کے دو درخت ہیں۔ یہ جگہ جو شاہی مسجد تھی۔ آج صرف مٹی کا ایک ٹیلہ ہے

اس ٹیلے سے ذرا آگے حضرت سید حسین قمی کا مزار ہے جس کے بیرونی دروازے کے ساتھ بعض لمبے پتھر ہیں۔ جو تراشیدہ ہیں۔ ایک پتھر تین گز سے بھی طویل دیکھا گیا۔ زیارت کے باہر چنار کا ایک درخت ہے۔ جو بہت پرانا ہے۔ یہاں مشہور ہے۔ کہ یہ درخت بڈشاہ ہی کے زمانہ کا ہے۔ اور حضرت سید حسین اس کے نیچے کبھی کبھی قیام فرمایا کرتے تھے۔

زیارت کے عقب میں مسدود نہر کے اندر ایک کنواں ہے۔ جس کا پانی نہایت سرد اور شیریں ہے۔ اس کی ساخت بتاتی ہے۔ کہ یہ بھی بہت قدیم ہے۔ کنوئیں کی منڈیروں پر لکڑیوں کی بجائے لمبے لمبے قدیم وضع کے پتھر رکھے ہوئے ہیں۔

کنوئیں کے بالمقابل نہر کے پاس مگر نہر کے عین کنارے زیارت سے مغرب کی طرف مسجد کے ٹیلے کی طرح ایک بلند ٹیلہ ہے۔ جس کو بادشاہی ٹینگ یعنی بادشاہی ٹیلہ کہتے ہیں یہیں بڈشاہ کے محلات تھے۔ اس ٹیلے کے ساتھ ہی ایک قبرستان ہے جس کی زمین سے عوام پتھر وغیرہ نکالتے رہتے ہیں۔ چنانچہ راقم الحروف نے بھی چند پتھر جو بہت پرانے تھے۔ یہاں منتشر حالت میں دیکھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پتھروں کی ایک طویل دیوار دور تک چلی گئی ہے۔ غرض جہاں شاہی محلات تھے۔ اب وہاں قبرستان ہے۔

بادشاہی ٹیلے سے کچھ فاصلہ پر جنوب کی طرف کچھ نشیبی زمین ہے جس کو وزیر ڈب کہتے ہیں۔ اور جس کا ترجمہ اردو میں وزیر منزل ہی ہو سکتا ہے۔ غالباً یہاں وزیر اعظم یا دیگر وزرار کے مکانات ہوں گے۔

حضرت سید حسین قمی کے روضہ پر سنی مسلمان بھی آتے ہیں۔ لیکن اہل تشیع میں روضہ کی بڑی وقعت ہے کشمیر کے علاوہ سکردو بلتستان تک

کے شیعہ یہاں آتے ہیں۔ لارنس صاحب نے اسی زیارت کی وجہ سے دو بند دلبستوں تک اس گاؤں کو مالیہ میں رعایت دی تھی۔

موضع براٹ (متصل سید پورہ) سے لیکر نالہ نہرو یعنی شمالی حدود سوپور تک جو دو اڑھائی میل کا فاصلہ ہے۔ وہاں پرانے زمانے کے کچھ آثار کبھی کبھی ملتے رہتے ہیں۔ مثلاً زمین کھودنے پر مٹی کے بڑے بڑے برتن اور تراشیدہ پتھر اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس باغ اور عمارت کی حدود موضع براٹ تک تھیں۔ جہاں اب بھی قدیم زمانہ کے کئی پتھر پڑے ہوئے ہیں۔

گاؤں کے اکثر مکانات کی پہلی منزلیں پتھر کی ہیں۔ اور گاؤں کے نزدیک جس قدر کھیت ہیں۔ ان سب کی چار دیواری بھی بالعموم پتھروں ہی سے بنی ہوئی ہے۔ حالانکہ سید پورہ کوہستانی نہیں۔ میدانی علاقہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ باغ زینہ گیر کی چار دیواری یا سرکاری عمارات کے جو پتھر تھے۔ وہ انہدام کے بعد گاؤں والوں نے آپس میں تقسیم کرلئے ہیں۔ آہ! سچ کہا ہے مرزا داغ نے ؎

فلک نے لوٹ کے کٹوا دیا حسینوں سے
سمجھ لیا کسی مردہ کا اس نے مال مجھے

کشمیر میں پلوں کی تاریخ

کشمیر کے ایسے مقامات میں جہاں دریاؤں اور نالوں نے خشکی کا سفر تکلیف دہ بنا رکھا ہے۔ زمانہ قدیم میں کشتیاں چلتی تھیں۔ یہ کشتیاں جو مسافروں کو دریاؤں اور ندی نالوں سے آر پار لے جایا کرتی تھیں بعض مخیر لوگوں کی طرف سے اور ان کی کثیر تعداد والئے ملک کی طرف سے عوام کی آسائش کے لئے ہوتی تھی۔ آج بھی یہ کیفیت

نالہ پہرو اور بعض دوسرے نالوں پر جہاں پُل کم ہیں یا نہیں ہیں۔ دیکھی جا سکتی ہے۔

ہندو عہدِ قدیم کے پُل

ہندو عہد قدیم میں دریا پر کوئی پختہ پل نہ ہوتا تھا۔ بلکہ کشتیوں کے پل ہوتے تھے۔ اور ان کشتیوں کو زنجیروں کے ذریعہ ایک دوسرے سے باندھ دیا جاتا تھا۔ کلہن اور شری ور کی راج ترنگنیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دشمن کی طرف سے خطرہ ہوتا یا آگ کے پھیل جانے اور پل کے جل جانے کا اندیشہ ہوتا۔ تو ان پلوں کو فوراً توڑ دیا جاتا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ پل مستقل نہیں عارضی ہوا کرتے تھے۔

البتہ راجہ پرورسین[1] ثانی کے زمانے میں کشتیوں کے ایک بہت بڑے پل کی کیفیت معلوم ہوتی ہے جس کا نام راجہ نے بھرت ستھو رکھا۔ برت یا بھرت کون تھا۔ اور پل کا نام اس نام پر کیوں رکھا گیا۔ اس کے متعلق اوروں کا تو کیا ذکر کشمیر کا قدیم اور نامور مورخ پنڈت کلہن تک بھی خاموش ہے۔[2] یہ پل دریا کے کس حصہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کا کچھ پتہ نہیں۔ تاہم اندازہ لگایا جاتا ہے کہ ایسٹمہ[3] میدان سے جس کا

---

[1] عہد حکومت ۱۰۲ء تا ۱۶۲ء

[2] چونکہ دریا کا نام وتستہ یا تبستہ تھا۔ جو بگڑتے بگڑتے دت یا بہت بن گیا۔ اس لئے ممکن ہے کہ برت ستھو یا بھرت ستھو کا اصل لفظ دت ستھو یا بہت ستھو ہی ہو۔ [3] ایسٹمہ جو ۱۱۲۳ء میں ایک جزیرہ تھا اور اسلامی عہد کشمیر میں جو ایک وسیع میدان جنگ بھی بنا رہا۔ آج ایک آباد اور بارونق بازار اور ایک گنجان محلہ ہے وسیع سڑکیں اور عالیشان عمارتیں یہاں موجود ہیں۔ گاؤکدل سے چند قدم آگے دائیں طرف کچھ تھوڑا سا حصہ نمبل کا موجود ہے۔ وہاں بھی بھرتی ڈال کر خشک زمین پیدا کی جا رہی ہے اور سڑک کے کنارے چوبی دکانیں بن گئی ہیں۔

نام اس زمانہ میں جزیرہ "کشککسو امن تھا" غود فاصلہ پر تھا۔

سیٹین صاحب کا خیال ہے۔ کہ پردسین کا پل موجودہ چوتھے اور پانچویں پل کے قریب کہیں واقع ہوگا۔ یہ جگہ شہر کے عین مرکز میں ہے۔

۱۱۲۳ء میں راجہ سسل کا عہد تھا۔ دسری نگر میں عظیم آتشزدگی کا وقوعہ ہوا۔ شہر کے مٹھ مندر۔ مکانات۔ منڈیاں۔ اور دوسری عمارات سب جل کر راکھ ہوگئیں۔ آگ کے خوف سے بہت سے دریائی عنلی نے اور کشتیوں کے پل بچالئے گئے۔ لیکن یہ بہرت ستھو جو کشتیوں کا عظیم الشان پل تھا۔ اس تباہ کن آتشزدگی سے نہ بچ سکا۔ اور تباہ ہو گیا۔

اسلامی عہد کا سب سے پہلا پل

اسلامی عہد میں سب سے پہلے سلطان سکندر نے پلوں کو عام کیا۔ اور مقطوں میں کئی پل بنو لئے۔ ایک پل نالہ مار پر بھی بنوایا۔ جسے چودھری ہیش نے ۱۰۸۰ھ میں بعہد عالمگیر مرمت کرایا۔

علی شاہ کی سلطنت چھ سات سال سے زیادہ نہ رہی۔ تاہم ۸۲۶ھ یعنی مرنے سے پیشتر جو چند کام اس نے اچھے کئے۔ ان میں نہر تارا پل کے چار پل[1] دریائے بہت کا ایک پل بھی تھا۔ جو اس نے کشتیوں کی بجائے لکڑیوں سے تعمیر کرایا۔ اور اس کا نام اس نے اپنے نام پر عالی کدل رکھا۔

معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ہندو عہد قدیم کے پل یا تو آتشزدگی کی نذر ہو چکے تھے یا طوفان آب کے باعث دریا میں بہ گئے تھے۔ کیونکہ کوئی مورخ اس وقت کسی قدیم پل کی موجودگی کا پتہ نہیں بتاتا۔ بلکہ

---

[1] پل اشرف۔ کدل تارہ پل۔ کدل مرجان پور۔ کدل نازورہ

ایک مورخ[1] جس کی تصنیف کو آج دو سو سال گزر چکے ہیں لکھتا ہے۔ جب زین العابدین تخت نشین ہوا۔ تو شہر میں صرف ایک ہی پل تھا جس کا نام عالی کدل تھا۔ اور جس کو بڈشاہ کے بھائی علی شاہ نے تعمیر کرایا تھا۔ لوگ بالعموم دریا کو سفینہ اور کشتیوں کے ذریعہ عبور کیا کرتے تھے۔

بڈشاہ کا زینہ کدل

زین العابدین نے بادشاہ ہو کر دریا کو کشتیوں کے ذریعہ عبور کرنے کی جو مشکلات تھیں۔ ان پر غور کیا۔ اور اس مقام پر جہاں مہاراج گنج آباد اور مزار السلاطین واقع ہے۔ ایک مستقل پل دریا پر تعمیر کرایا۔ اور نام اس کا اپنے نام پر زینہ کدل رکھا۔ اور اس کو اس شوق اور محنت اور لاگت سے بنوایا۔ کہ یہ پل بھی اس کے ہفت زینوں میں شمار ہونے لگا۔

سرینگر میں دریائے جہلم پر سات پل ہیں۔ سب سے پہلا پل ۸۲۶ھ سے پیشتر تعمیر ہوا۔ اس کے بعد مختلف بادشاہوں نے پلوں میں اضافہ کیا۔ چنانچہ ۵۰۰ سال سے یہی سات پل سرینگر میں بغیر کمی بیشی کے موجود ہیں۔ زینہ کدل آج دریا کا چوتھا پل ہے۔ یہ پل سب پلوں سے زیادہ بارونق اور آباد ہے۔

شری ور نے بھی اپنی راج ترنگنی میں اس پل کا ذکر کیا ہے۔ ہیٹن صاحب[2] مترجمہ راج ترنگنی کے نوٹوں میں لکھتے ہیں۔ اس کی ساخت ایسی ہی ہے۔ جیسی آج کل کشمیر کے پلوں کی ہوتی ہے۔ ہندو انجینیر پتھر کا کام کرنے اور سنگتراشی کے کام میں صاحب کمال تھے۔ اس زمانہ میں دریا پر اتنا لمبا چوڑا پل پتھروں کا بننا چونکہ دشوار تھا۔ اس لئے وہ کشتیوں کے پل بنوا کر کام لیتے رہے۔ لیکن جب مسلمان آئے تو وہ لکڑی کا کام زیادہ اچھی طرح

(1) حاشیہ صفحہ ۲۱۹ دیکھئے) (2) حاشیہ دیکھو صفحہ ۲۱۹ پر)

کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ بآسانی اس مشکل پر غالب آ گئے۔

بڈشاہی ہفت پل

اس پل کے علاوہ بڈشاہ نے جس شوق سے اس پل کو تعمیر کرایا تھا۔ اور پھر اپنے فرزند کے حملوں سے شہر کو بچانے کے لئے جن مجبوریوں کے ساتھ اس کو توڑا۔ اس کا ذکر باب ہشتم میں ہو چکا ہے۔ اس بادشاہ نے نالہ مار پر سات چوبی پل تعمیر کرائے۔ جن کے نام حسب ذیل ہیں۔

نائد کدل۔ بوری کدل۔ صراف کدل۔ کاویری کدل۔ راجوری کدل۔[ل] کاوہ ڈار کدل۔ ان کے علاوہ بادشاہ نے شادی پور۔ سوپور۔ نائد کھائی۔ ملر تار۔ جوگی لنگر[سنگم] اور کئی مقامات پر بہت سے پل تعمیر کرائے۔ انقلاب گیتی نے آج ان کو بھی معدوم کر دیا ہے۔

(ا ز حاشیہ صفحہ ۲۱۸) لے فتحیات کبرویہ مصنفہ شیخ عبد الوہاب گنائی سال تصنیف ۱۱۵۳ھ کتب غیر مطبوعہ صاحب سلاطین کشمیر صفحہ ۴۴ پر لکھتے ہیں کسی مورخ نے اس پل کی تعمیر کے سنہ کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن تاریخ حسن حصہ اول میں زینہ کدل کی تعمیر ۸۲۲ھ بتائی گئی ہے۔ جو راقم الحروف کے خیال میں اس لئے غلط ہے کہ بڈشاہ کی تخت نشینی ہی ۸۲۳ھ میں ہوئی تھی بس ۸۲۲ھ میں وہ اپنے نام پر پل کس طرح تعمیر کرا سکتا تھا۔ صاحب احسن التواریخ مولوی عزیز الدین صاحب قاضی کشمیر مرحوم اس کا سال تعمیر ۸۰۸ھ بتاتے ہیں۔ اور بڈشاہ کی تخت نشینی ۸۲۳ھ کے مطابق وہ بھی غلط ہے۔ پنڈت انند کول بامزئی نے اپنی تصنیف میں لکھا ہے۔ کہ زینہ کدل کی تعمیر ۴۴۳۵ لوکک میں ہوئی ۳۵ لوکک کے مطابق عیسوی ۱۴۰۹ء اور ہجری ۸۶۳ھ ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے یہ پل گو کشمیر کے تمام پلوں میں بارونق ہے۔ لیکن اس کی حالت روز بروز خستہ و خراب ہو رہی تھی اسی لئے موجودہ فرمانروائے جموں و کشمیر مہاراجہ سر ہری سنگھ بہادر کے عہد میں اس کی از سر نو تعمیر شروع ہوئی۔ چودہ سال کے بعد ۱۹۳۷ء میں تکمیل تک پہنچی۔ اس پر تقریباً پچاس ہزار روپے لاگت آئی۔ اور اب یہ پل امیرا کدل کی پائیداری سے کسی طرح کم نہیں ہے بلکہ اس کے طفیل حبہ کدل بھی امیرا کدل کے بعد (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۰ پر دیکھو)

اندرکوٹ میں دودھ اور شربت کے حوض

زین العابدین عجیب قسم کی طبیعت لے کر آیا تھا۔ شرلور لکھتا ہے۔ جیاپیڈ پور میں بادشاہ نے دو حوض تعمیر کرلئے۔ ایک حوض میں دودھ بھرا رہتا تھا۔ اور ایک میں کوئی نہ کوئی شربت موجود رہتا تھا۔ اور یہ دونوں چیزیں ہر شخص ہندو ہو یا مسلمان۔ یہاں سے مفت حاصل کرسکتا تھا۔

جامع مسجد بارہ مولا

یہ معلوم نہیں کس سال بادشاہ نے بارہ مولا کی جامع مسجد تعمیر کرائی لیکن اس قدر سب مورخ لکھتے ہیں۔ کہ "بنائے اولش از بڈشاہ بود" بڈشاہی خاندان تک اس کی حالت اچھی تھی۔ چکوں کے عہد میں یہ مسجد مسمار ہونے لگی۔ جب مغل حکومت کا یہاں دورودرہ ہوا۔ تو اس کی از سرنو مرمت ہوئی۔ سکھوں کے زمانہ میں شیخ غلام محی الدین ناظم کشمیر نے اس کی چھت کو درست کیا۔ ۱۳۰۲ھ میں کثرت بارش و نزالہ باری نے اس کو سربسجود کردیا۔ ۱۳۱۲ھ تک یہی حالت رہی۔ ۱۳۱۳ھ میں خواجہ عبدالصمد ککڑو مرحوم رئیس بارہ مولا نے اس کو پھر زندہ کردیا۔ مرمت مسجد کا قطعہ تاریخ حسب ذیل ہے۔

سجدۂ شکر سرکن اے سامع — کا خترِ دنیا شدہ لامع
کرد اندر بنائے مسجد جد — خواجہ عبدالصمد زہے جامع

۱۳۱۳ھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۴) شہر کا دوسرا پل ہے۔ از سرنو بن گیا ہے۔ اور اس پر بھی امیرا کدل اور زینہ کدل کی طرح موٹر تانگہ چل سکتا ہے۔ نہ راجوری کدل راجوری کے راجہ کی لڑکی نے بادشاہ کی اجازت سے تعمیر کرایا تھا۔ اور اسی کے نام پر راجوری یا راجوری کدل کہلایا۔

زدند ا ملیم از سر تعمیر   گشتہ معمور مسجد جامع

تصنیف کتاب کے دوران میں جامع بارہ مولا کی حالت پھر خستہ و خراب دیکھی گئی۔

جامع مسجد سرینگر

اس مسجد کی بنا جو آج روئے زمین کی بہترین اور قابل دید عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔ حضرت میر سید محمد ہمدانی کے ایما سے سلطان سکندر بت شکن نے رکھی تھی۔ حضرت خواجہ صدرالدین کہ خراسانی النسل تھے۔ اور کشمیر میں اقامت گزین تھے۔ اس کے میر عمارت تھے۔ ابھی مسجد نا تمام تھی۔ کہ سلطان بت شکن کا انتقال ہو گیا۔ آخر بادشاہ روئے زمین حضرت سلطان زین العابدینؒ کے عہد میں یہ مسجد خواجہ صدرالدینؒ کی زیر نگرانی کہ "در صنعت معماری نظیرش نہ بود" تکمیل کو پہنچی۔ سچ ہے ؎

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

بڈشاہ نے تکمیل جامع کی طرف تخت نشین ہوتے ہی توجہ کی۔ جیسا کہ صاحب تواریخ خلیل لکھتے ہیں: "وے در ۸۳۸ھ مسجد جامع

۱؎ تواریخ خوارق السالکین سال تصنیف ۱۱۰۶ھ غیر مطبوعہ ۲؎ فتحیات کبرویہ صفحہ ۲ میں لکھا ہے آپ ۲۲ ربیع الاول ۱۱۲۱ھ کو انتقال فرما گئے مدفن زینہ کدل محلہ قطب الدین پورہ صاحب فتحیات نے خواجہ صدرالدین کا سال وفات ۸۲۱ھ غلط لکھا ہے اگر وہ بڈشاہ کے زمانہ میں موجود تھے اور مسجد شوپیاں اور مسجد جامع سرینگر ان کی زیر نگرانی تعمیر ہوئی ہیں۔ تو ان کا سال وفات ۸۴۱ھ کے بعد ہونا چاہیے۔ کیونکہ مسجد شوپیاں کی تعمیر کے بعد ان کا انتقال ہوا ہے۔ اور مسجد شوپیاں انہی کی نگرانی میں تعمیر ہوئی تھی۔

دامرمت کردند میم المسجد تاریخ اوست" بادشاہ نے مسجد سے شمال کی طرف ایک مدرسہ بھی تعمیر کرایا جس کی نگرانی اور اعلیٰ مدرسی قاضی محمد علی بنجاری کے سپرد ہوئی۔ اور جنوب کی طرف دارالافتا قائم کیا جہاں چار عالم اور مفتی احکام شریعت کے مطابق فتوے دیا کرتے تھے۔

تاریخ حسن میں ہے "از تعمیرات سلطان زین العابدین بارہا ترمیم یافت" صاحب تواریخ خوارق السالکین لکھتے ہیں۔ حضرت سید محمد لودستانی بھی۔ جو مسجد کے کارکنوں میں تھے۔ اپنے مرشد خواجہ

ؔ یہ مسجد کئی دفعہ بوجہ آتش زدگی وغیرہ خراب ہوتی رہی اور گو ساتھ ہی ساتھ شاہان وقت اس کی مرمت بھی کرتے رہے۔ لیکن اس مسجد کی مرمت کا جو انتظام مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ کے زمانے میں ان کے مشیر مال خان بہادر شیخ مقبول حسین سی آئی ای مرحوم نے کیا۔ اس کی نظیر مشکل سے ملیگی۔ شیخ صاحب نے جو ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۷ء تک ریاست جموں وکشمیر میں ریونیو منسٹر رہے۔ جامع مسجد کی تعمیر کے لئے سب سے پہلے گورنمنٹ ہند سے پانچہزار روپیہ لیا۔ پھر مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ سے نقد اور لکڑی کی معقول امداد حاصل کی۔ اس کے بعد مسجد کی تعمیر و مرمت کی مستقل امداد کا یہ طریقہ تجویز کیا کہ مالیہ کے ساتھ فی روپیہ دو پیسے تا اختتام مرمت زمینداران کشمیر سے ان کی خوشی بہ رضا کے مطابق وصول کئے جانے کے احکام جاری کئے۔ یہ رقم سالانہ ز ۲۵ ہزار کے قریب پہنچتی تھی۔ اور یہ ایسا سلسلہ تھا کہ آپ کے جانے کے بعد بھی جاری رہا۔ آخر یہ مسجد کئی برس کی مرمت کے بعد قریباً گیارہ لاکھ روپیہ کی لاگت سے بہ عہد مہاراجہ سر ہری سنگھ بہادر فرمانروائے حال تکمیل کو پہنچی۔ یہ مسجد دنیا کی لاثانی عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔

صدر الدین کے ہمراہ بہ عہد بڈشاہ کشمیر میں اقامت گزین تھے۔ جامع مثنویاں کی مرمت کے زمانے میں مزدوری کرتے تھے۔ جو کچھ کماتے تھے فقراء کو تقسیم کر دیتے تھے۔ ان کی فیاضیوں بلکہ ان کی کرامتوں کے متعلق مشہور ہے ؎

گدائیے در مے خانہ طرفہ اکسیر است
گر ایں عمل بہ کنی خاک زر توانی کرد

خانقاہ شیخ نور الدین ولی شیخ العالم

بادشاہ حضرت شیخ نور الدین ولی رحمۃ اللہ علیہ کا جو عوام میں شیخ العالمین کے لقب سے مشہور ہیں۔ بہت عقیدت مند تھا۔ ان کا عالیشان مقبرہ سب سے پہلے اسی نے تعمیر کرایا جس محبت و خلوص سے بادشاہ نے اس مزار مبارک کی تعمیر میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ اور جو نقش و نگار اس نے مزار کی عمارت میں پیدا کئے اور نجار دل نے لکڑی کے کام میں اپنا کمال جس خوبی سے ظاہر کیا۔ اگر بڈشاہی عہد کی یہ تعمیر آج بجنسہ موجود ہوتی۔ تو اس زمانے کی صنعت کاری آج ہمارے لئے سبق آموز واقعہ ہوتی۔ لیکن افسوس بقول تاریخ حسن" ایں خانقاہ در عہد چکاں بحادثۂ آتش افروختہ شد" یعقوب شاہ چک بادشاہ کشمیر نے اپنے غیر مطمئن عہد حکومت میں اس تعمیر کی پھر تجدید کی۔ ۱۱۲۹ھ میں کہ مغلوں کی حکومت تھی۔ اور محمد شاہ بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہند تھا پھر اس کو حادثۂ آتش سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک وسیع اور دو منزلہ چوبی مسجد بھی اس کے ساتھ ملحق تھی۔ اس کا بھی کچھ حصہ جل گیا آخر خدا کے دو بندوں خواجہ غلام و خواجہ محمود نے کہ اہل دل رئیسوں

ہیں سے تھے۔ اس خانقاہ کی تجدید کی ۱۸۲۶ء میں اس عالیشان روضہ کی مرمت پھر ملک حیدر سے ہوئی۔ اور باوجود حکومت یا کسی بہت بڑے رئیس کے حصہ نہ لینے کے بہت بڑے پیمانے پر ہوئی۔

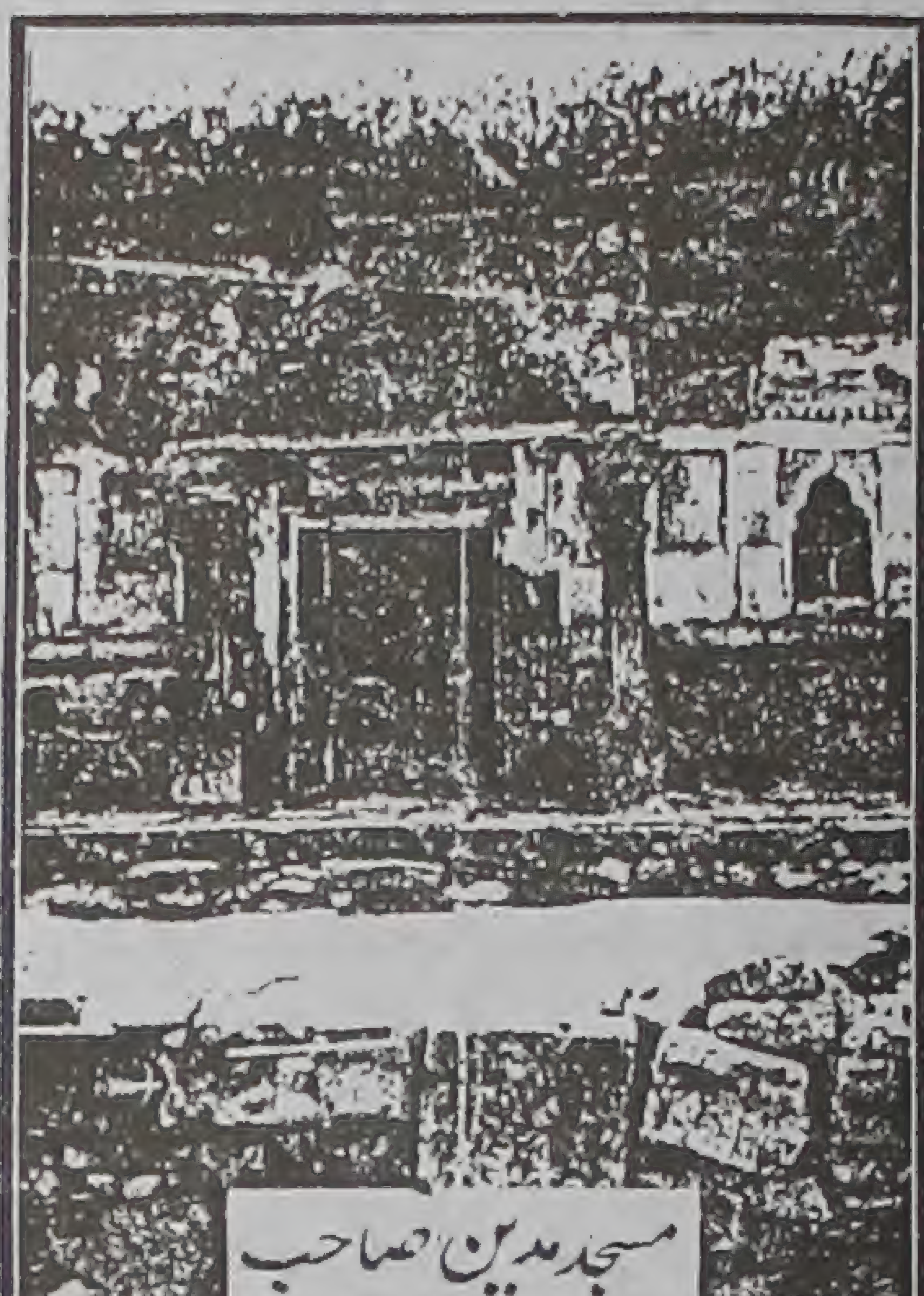
خانقاہ فیض پناہ

میر محمد امین اویسی اپنے پیر طریقت سید ہلال کے پاس کہ صاحب علو حال اور آسمان کمال تھے۔ موضع اشم میں (جو پرگنہ محمد آباد کے نام سے بھی موسوم تھا) اکثر رہا کرتے تھے۔ اور چونکہ بادشاہ کو میر اویسی کی خاطر حد سے زیادہ منظور تھی۔ اس لئے بادشاہ نے موضع مذکور میں ایک عالیشان خانقاہ تعمیر کرائی۔ جو نقش ونگار سے آراستہ اور فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ تھی۔ اس خانقاہ میں مسجد مدرسہ اور طلباء کے لئے حجرے اور درویشوں اور خادموں کے لئے مکانات تھے۔ نام اس خانقاہ کا تاریخوں میں خانقاہ فیض پناہ درج ہے۔ یہ خانقاہ دریائے بہت کے مشرقی کنارے پر تھی۔ حضرت میر اویسی کے انتقال کے بعد اس کی رونق کم ہوگئی۔ جہانگیر کے زمانے میں حضرت خواجہ خاوند محمود اس کے چوب وچگل اٹھا کر شہر میں لے آئے۔ اور خانقاہ نقشبندیہ کی بنا ڈال گئے۔

خانقاہ سید برخوردار

اس عمارت کی ۸۶۹ھ میں بادشاہ نے تکمیل کی۔ سید برخوردار اس زمانے میں بہت بڑے صاحب یمن و برکت بزرگ تھے۔ بادشاہ نے ان کے خادموں اور ان کے لنگر وغیرہ کے لئے محلہ دانا میں یہ عالیشان خانقاہ تعمیر کرائی۔

۱؎ تاریخ خواجہ اعظمی مولفہ خواجہ محمد اعظم ۲؎ تاریخ حسن صفحہ ۲۵ قلمی۔



مسجد مدین صاحب

خانقاہ سیّد مدنی

حضرت سید مدنی بہت بڑے عالم اور بزرگ تھے۔ سلطان نے ۸۴۹ھ میں جو ۱۴۴۳ء کے مطابق ہے۔ یہ خانقاہ بصورت مسجد نبوی اس لئے کہ حضرت سید محمد مدینہ شریف کے رہنے والے تھے۔ آپ کے خدام کے لئے تعمیر کرائی۔

اسرار الابرار میں آپ کے حالات بالتفصیل درج ہیں۔ آپ سلطان سکندر بُت شکن کے زمانے میں امیر تیمور صاحب قرآن کی طرف سے بطور سفارت بادشاہ کشمیر کے پاس آئے تھے۔ یہ مقام بہت پسند آیا۔ اس لئے وطن واپس جاکر اہل وعیال کو ہمراہ لے آئے۔ اور رینہ واری میں قیام فرمایا۔ سکندر نے جب اپنے امراو وزرا اور جاسوسوں کے ذریعہ معلوم کیا۔ کہ آپ انیس الورع اور عارف حق اور موحد مطلق ہیں۔ تو آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اپنے قرب وجوار میں ان کے لئے عالیشان خانقاہ تعمیر کرائی۔ چنانچہ آپ رینہ واری سے نوشہرہ میں تشریف لے آئے۔ آپ کا مزار بڈشاہ کے زمانے میں تعمیر ہوا۔

حضرت سید مدنی کا مقبرہ ایک چھوٹی سی عمارت میں ہے۔ جو شاید اپنی شکستگی اور تباہ حالی کی وجہ سے فراموش کر دیا گیا ہے۔ بقول مسٹر نکولس نے اس کی رنگین ٹائیلوں کا کام ایک قدامت پسند کے لئے غیر معمولی دلچسپی کا سرمایہ ہے۔ اس رنگین کام کے بعض حصے اب بھی مقبرہ کی دیواروں پر اپنے مختلف شوخ رنگ میٹے ہوئے نقش ذرگار کی صورتیں دکھا رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹائیلوں کا کام مغلیہ عہد سے قبل بھی کشمیر میں رائج تھا۔ اس قسم کی قدیم صنعت اب کشمیر میں اس درجہ معدوم ہے

لہ از اسلامک کلچر ان کشمیر صفحہ ۲۰۹

کہ مزار السلاطین کے ڈومٹ اور اس عمارت کے سوا اس قسم کی کسی اور عمارت کا نشان ملنا قریباً ناممکن نظر آتا ہے [1]

بج بہارہ میں بڈشاہی عمارت

بج بہارہ میں بادشاہ نے کسی بزرگ کے لئے خانقاہ تعمیر کرائی۔ یا اپنے لئے کوئی محل تعمیر کرایا۔ یا سیر و سیاحت کے لئے رہنے میں کوئی آرام گاہ بنائی۔ اس کے متعلق صحیح حالات نہیں ملے۔ البتہ مولانا داؤد مشکواتی جو بڈشاہ سے قریباً پونے دو سو سال کے بعد شاہجہان کے زمانے میں ہوئے ہیں۔ بج بہارہ میں بڈشاہی عمارت کا پتہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔ کہ سیر تبت سے واپس آکر جب میں حضرت شیخ نصر الدین ابوالفقر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تو شنکر ریشی قدس سرہ کہ وہ بھی حضرت کے مریدوں میں تھے حضرت کی ملازمت میں موجود تھے۔ شنکر ریشی نے مجھ سے کہا۔ تمہارے آنے سے پہلے میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ کہ حضرت شیخ نے بج بہارہ میں ایک شاندار عمارت بنائی ہے۔ اور اس جگہ جہاں سلطان زین العابدینؒ نے اپنے زمانے میں ایک عمارت کہ منظر ہائے گوناگون رکھتی تھی۔ تعمیر کرائی۔ آپ نے بھی برج ہائے بلند اور مینار ہائے فلک نما قائم کئے ہیں۔ مولانا داؤد مشکواتی فرماتے ہیں۔ کہ میں نے عرض کیا۔ کہ یہ جگہ خوب ہے۔ یہیں قیام کرنا چاہئے۔ یہ سنکر حضرت شیخ ابوالفقر نے میرے جواب کو قبول کیا۔ لیکن فرمایا کہ اس خواب کی تعبیر اگر تم بتا سکتے ہو۔ تو بتاؤ۔ میں نے عرض کیا۔ قصر سلطان رتبہ عالی کی علامت ہے شنکر ریشی

---

[1] مزید حالات کے لئے دیکھو ضمیمہ ش

نے کہا۔ یہ بھی خوب ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں۔ کہ حضرت شیخ اب ہم سے جدا ہونے والے ہیں۔ اس لئے ان کا آخری قیام اسی بج بہارہ میں ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔[1]

سوپور میں بادشاہی محل

راجہ اونتی ورما کے انجنیئر سویہ نے سوپور کو آباد کیا۔ پہلے اس کا نام سویہ پور تھا۔ رفتہ رفتہ سوپور ہو گیا۔ اسی مقام پر قدیم زمانہ ہنود کا دریائے وتستہ مسلمان عہد حکومت کا دریائے بہت اور زمانہ حال کا دریائے جہلم جھیل ولر کے بحر بے پایاں سے باہر نکل کر پنجاب کو روانہ ہوتا ہے۔ سوپور کسی زمانے میں بہت نامور شہر رہا ہے۔ اب بھی اس کی آبادی دس گیارہ ہزار سے کم نہیں ہے۔ اس کی آتش زدگیاں زمانہ قدیم ہی سے مشہور چلی آتی ہیں زین العابدین نے سوپور کو بہت رونق بخشی تھی۔ بقول مؤرخ سترپور کرم راجیہ یعنی کمراز کا سرکاری ہیڈ کوارٹر ان دنوں سوپور ہی تھا۔ تمام دفاتر اور تمام سرکاری محکمے اسی جگہ تھے۔ بادشاہ نے خود بھی دریا کے کنارے ایک قصر شاہی تعمیر کر رکھا تھا۔ اور جب کبھی اس طرف آتا تو یہاں اسی جگہ قیام کرتا تھا۔

سوپور میں آتشزدگی سے قصبہ کی تباہی

سترپور لکھتا ہے بڈشاہ کے زمانے میں یہاں ایک عظیم آتشزدگی ہوئی۔ سارا شہر جو بلند اور رفیع تر مکانات سے آراستہ تھا چشم زدن میں خاک اور خاک سے راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ سرکاری دفاتر اور محکمہ جات کی عمارتوں کے ساتھ ہی تمام سرکاری کاغذات بھی جل گئے۔ صرف محل شاہی جو عام مکانات سے بہت دور دریا کے کنارے ایک طرف واقع تھا بچ رہا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی۔ بہت افسوس کیا۔ اور

[1] اسرار الابرار مصنفہ مولانا داؤد مشکواتی غیر مطبوعہ سال تصنیف ۱۰۶۳ھ یہ عہد شاہ

شہر کواز سر نو بڑی شان و شوکت سے تعمیر کرایا۔

شریور سوپور کی آتشزدگی کے متعلق لکھتا ہے۔ سرکاری دفاتر کے تمام کاغذات اور بھوج پتروں پر جو تحریریں اور احکامات تھے۔ وہ الماریوں سمیت جل گئے۔ بادشاہ نے ان قیمتی تحریروں کے ضائع ہونے پر اپنے دلی رنج کا اظہار کرتے ہوئے حکم دیا کہ کسی توقف کے بغیر اس کو از سر نو تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں بادشاہ کی توجہ اور شاہی اعانت نے اس کو پھر ایک خوبصورت شہر بنا دیا۔

چونکہ سیلاب اور زلزلوں کی تباہ کاریوں کے باعث کشمیر کی عمارتوں میں لکڑی کثرت سے لگائی جاتی ہے۔ اور لوگ برفانی سردی سے بچنے کی خاطر کانگڑی کے استعمال کے لئے بھی مجبور ہیں۔ اس لئے آتشزدگی کے واقعات اکثر رونما ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم شاہی عمارات اور محلات کے بھی کوئی آثار باقی نہیں رہے۔ راقم کے دیکھتے ہی دیکھتے سوپور کئی دفعہ آتشزدگی کے حادثات سے دوچار ہوا۔ اور کئی دفعہ از سر نو تعمیر ہوا۔

سوپور میں جھولے کے بڈشاہی پل

سوپور کی آتشزدگی نے دریا کے پل پر بھی اثر کیا۔ یعنی پل کا کثیر حصہ جل گیا جس سے دریا ناقابل عبور ہو گیا۔ بادشاہ نے جلے ہوئے پل کی جگہ لوہے کے تاروں سے جھولے کا پل تعمیر کرایا۔ اور حکم دیا کہ پل کے عین درمیان ایک محل تعمیر کرایا جائے۔

شریور ایک جگہ دو پلوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ بادشاہ نے دریا پر دو جھولے دار پل تعمیر کرلئے۔ جن کے درمیان ایک شاہی مکان بھی تھا۔

معلوم ہوتا ہے کشمیر میں اور شاید ہندوستان میں بھی یہ پل سب سے پہلا جھولے دار پل تھا۔

(لہ حاشیہ دیکھو صفحہ ۲۲۹ پر)

بارہ مولا میں بڈشاہی محل

بادشاہ نے ایک محل بارہ[1] مولا میں تعمیر کرایا اور حکم دیا کہ اس کو گرا کر اس کے مصالحہ سے سوپور میں ایک اور محل تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ اسی محل کے کمروں میں سرکاری کا غذات رکھے گئے اور دفاتر قائم کئے گئے۔

اندرکوٹ یا جیاپیڈپور میں بڈشاہی محل

کلہن نے راج ترنگنی میں اس شہر سے متعلق لکھا ہے۔ کہ راجہ جیاپیڈ نے اس کو جھیل کے وسط میں راکششوں کی مدد سے تعمیر کرایا تھا۔ یہاں بہت سے مندر بھی تھے۔ راجہ کے علاوہ وزراء کی عمارتیں بھی تھیں۔ جیاپیڈ کے نام کی رعایت سے اس کا نام جیاپور پیڈ رکھا گیا۔ مگر وہ زیادہ مشہور نہ ہوا۔ بلکہ جھیل کے وسط میں ہونے کی وجہ سے عوام اس کو ابھینتر کوٹ یا اندرونی قلعہ کہنے لگے۔ اور یہی نام اس شہر کا مشہور و مقبول ہو گیا۔ ابھینتر کا لفظ رفتہ رفتہ اندر کے لفظ سے بدل گیا۔ اور ابھینتر کوٹ کی جگہ اندرکوٹ کے نام نے شہرت حاصل کر لی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۳) غالباً اسی شاہی محل کے کھنڈروں پر افغانوں نے اپنے زمانے میں قلعہ تعمیر کیا۔ اور جب سکھوں کا دور آیا۔ تو وہ اس قلعہ کی مرمت کر کے اس کو اپنے استعمال میں لانے لگے۔ ڈوگروں کے عہد میں۔ اس قلعہ نے پھر کھنڈروں کی صورت اختیار کر لی۔ جس کو راقم الحروف نے بھی بارہا دیکھا ہے۔ اب چند سال سے بڈشاہی محل کی بنیادوں پر مسلمانان سوپور نے ایک عالیشان اور وسیع جامع مسجد تیار کر لی ہے۔

[1] شریور ہر مقام پر بارہ مولا کو ورہ مولا لکھتا ہے۔ اور آج بھی یہ قصبہ اکثر زبانوں پر ورہ مولا کے نام سے ہی مشہور ہے۔

یہ شہر راجہ جیاپیڈ نے دریائے وتستہ کے بائیں کنارے شادی پور سے نیچے پانچ میل کے فاصلہ پر آباد کیا تھا۔ اس کے چاروں طرف پانی تھا۔ اس راجہ کے بعد کئی اور راجاؤں کی بھی یہاں سکونت رہی ہے۔

کشمیر کی آخری ہندو رانی کوتا اسی اندرکوٹ میں رہتی تھی۔ اور یہیں ۱۳۳۹ء میں وہ اس جہان سے رخصت ہوگئی۔ اس زمانہ تک یہ مقام کچھ نہ کچھ آباد تھا۔ لیکن جب سلطنت کا انقلاب ہوگیا۔ تو اس شہر میں تغیر عظیم واقع ہوا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ اپنے انتہائی زوال کو پہنچ گیا۔

بڈشاہ کا زمانہ آیا۔ تو جہاں رعایا کو امن چین سے سانس لینا نصیب ہوا وہاں قدیم عمارات کی بھی خدا نے سنی۔ اندرکوٹ کے متعلق سریور اپنی راج ترنگنی میں ترنگ ۱ میں لکھتا ہے۔ کہ سلطان زین العابدین نے اس شہر کو جو زوال پذیر ہو چکا تھا از سر نو بحال کیا یا بہ الفاظ دیگر جو مندر منہدم ہو گئے تھے۔ ان کی مرمت کرائی۔ شاہی مکانات کی جن کے کھنڈر ان کی فلک نمائی کا پتہ دیتے تھے سابقہ شان پیدا کر دی۔ لوگ جو شکستہ دل تھے۔ ان کی ہر طرح تسلی کی اور ان کو وہاں آباد کیا۔

اس کے بعد سریور لکھتا ہے۔ بادشاہ نے اس کے بعد جہلم کے کنارے اپنے لئے ایک نیا شاندار محل تعمیر کرایا۔ بادشاہ کو فن تعمیرات سے جو ذوق ہے اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ وہ لکڑی سے منقش کام لینا خوب جانتا تھا۔ جس کو سریور شاندار محل لکھتا ہے۔ اس میں خدا جانے بادشاہ نے اپنی خوش سلیقگی اور خوش مذاقی اور تعمیری دلچسپیوں کے کیا کچھ ثبوت نہ دیئے ہونگے۔

سریور اس مقام یعنی اندرکوٹ کا نام اپنی تاریخ میں ہر جگہ جیاپیڈ پور لکھتا ہے یہاں بادشاہ نے پتھروں کا ایک بلند چبوترہ اپنی نشست کے لئے

بنوایا جھیل سے سیلابی پانی نکال کر اس کو خشک کیا یا اور اس کے گرد سرکاری دفاتر کے لئے مکانات تعمیر کرائے۔ بادشاہ یہاں ہر سال ناگ یاترا اور گھن چکر کے تہواروں پر ہندو عابدوں اور تپسیوں کو پانچ دن تک متواتر اپنی طرف سے شاہی دعوت دیا کرتا تھا۔

اندرکوٹ[1] آج بھی موجود ہے۔ اور نالۂ شادی پور کے کنارے آباد ہے۔ یہاں شیعہ مسلمانوں کی بھی بستی ہے۔ قدیم زمانہ کے آثار بھی دیدۂ عبرت کیلئے

---

[1] اندرکوٹ (سنبل) کے متعلق ڈاکٹر صوفی نے اپنی سیاحت تازہ (۲۰-۲۲-اکتوبر ۱۹۴۳ء) کی جو مختصر کیفیت بیان فرمائی ہے۔ وہ ۲۷-اکتوبر ۱۹۴۳ء کے روزانہ اخبار ہمدرد سرینگر سے ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ "اندرکوٹ جو کسی زمانہ میں کشمیر کا پایہ تخت تھا۔ آج ایک چھوٹے سے گاؤں کا حقیر حصہ ہے۔ سنبل جو ضلع بارہ مولا کا ایک گاؤں بر لب جہلم اور کشمیر کی مشہور جھیل مانسبل سے ایک میل دور ہے۔ ۲۲۸۱ کی آبادی پر مشتمل ہے۔ اور خاص اندرکوٹ کی کل کائنات ۱۷۱ نفوس ہے۔ کشمیر کا یہ سابقہ دارالسلطنت اب صرف ۳۴ گھروں تک محدود ہے۔ آبادی مسلمان ہے۔ اندازاً نصف شیعہ اور نصف سنی۔ یوں اندرکوٹ کا رقبہ جو قدیم ایام میں میلوں تک پھیلا ہوگا۔ اب چار سو کنال ہے اور خاص اندرکوٹ کا گاؤں ۳۷ کنال اور ۱۰ مرلے ہے۔ اندرکوٹ کے کھنڈر اپنی تباہی اور بربادی کے نوحہ خواں ہیں۔ ایک جگہ صرف پتھروں کے ڈھیر کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ ایک آدھ پتھر جو موجود ہے۔ اپنی سنگ تراشی کے کمال کا پتہ دیتا ہے۔ بتلایا جاتا ہے کہ اکثر پتھر غائب ہو کر لوگوں کی عمارتوں کے کام آئے ہیں سوزادو سید صالح دشاہ ہمدان کے ہمعصر صوفی کا مزار ہے لیکن وہ بوسیدہ مقبرہ جو اس سے پرے واقع ہے کشمیر کے اولوالعزم اور نامور بانی خاندان شہیری سلطان شمس الدین کا ہے۔ کسی زمانہ میں جہلم (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۲ پر دیکھیں)

بڑے بڑے گراں ڈیل پتھروں کی صورت میں بکھرے پڑے ہیں۔ یہ مقام سنبل سے جنوبی و غربی گوشہ کی طرف واقع ہے۔ بڈشاہ کا شاندار محل راجہ جیا پیڈ کے فلک مرتبہ ایوانات امراء و وزرا کی عالیشان عمارتیں سب اپنے بانیوں کے ساتھ پیوند خاک ہو چکی ہیں۔ اگر کچھ پتہ ملتا ہے۔ تو انہی بکھرے ہوئے پتھروں کی بے زبانی سے۔ جو بقول شاعر ؎ مرمٹوں کا نشان ہیں گویا۔

وانتی پورہ میں باغ بڈشاہی

یہ مشہور و آباد قریہ سرینگر سے جانب جنوب بفاصلہ ۔ میل دریائے جہلم کے مشرقی کناروں پر اسلام آباد کو جاتے ہوئے برسر راہ آتا ہے۔ راجگان ماسبق کے عہد حکومت میں ورما خاندان کے نامور راجہ اونتی ورما کا دارالحکومت بھی رہا ہے۔ امتداد زمانہ اور انقلاب حکومت کے ہاتھوں یہ بھی بے رونق و غیر آباد ہو گیا۔

بڈشاہ نے جہاں اور پرانے استخوانوں میں جان ڈالی۔ اس قریہ کی طرف بھی توجہ کی۔ چنانچہ یہاں ایک اعلیٰ اور وسیع پیمانے پر باغ تعمیر کرایا۔ اس باغ کے عین وسط میں تعمیرات شاہی نے قریہ کی رونق

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۶) اندرکوٹ کے قریب تر تھا۔ دریا کا کنارہ اب دور ہو گیا ہے۔ نالہ بہت قدیم نالہ تھا بڈشاہ نے اس پر ایک پل بھی بنوایا تھا۔ ۱۹۰۹ء تک یہ نالہ چلتا رہا۔ بلکہ سرینگر سے سوپور تک چھوٹی کشتیاں اسی نالہ کے راستہ آیا جایا کرتی تھیں۔ مگر اب یہ نالہ بند کر دیا گیا ہے۔ اور اس کا پل یہاں سے اکھاڑ کر بندوارہ کے مقام کلن گام میں نالہ پہرو پر لگا دیا گیا ہے۔ راقم الحروف اس نالہ کے ذریعہ بارہا سوپور سے سرینگر اور سرینگر سے سوپور آیا ہے۔ کلن گام کا پل بھی نالہ پہرو پر نیا تعمیر ہوا ہے۔

دوبالا کردی۔ میر سید حسن منطقی بیہقی کے لئے بھی باغ میں ایک مکان بنوایا آپ بالعموم یہیں رہا کرتے تھے۔ اسی مکان میں آپ نے وفات پائی اور بالآخر اسی باغ میں دفن ہوئے۔

ڈل میں بادشاہی عمارت یعنی سونالنک

ڈل بظاہر ثقیل شکست اور بھدا سا نام ہے۔ لیکن اپنے پانی کی صفائی اور لطافت اور اپنی بیش بہا پیداوار اور اپنی زمین چرلئے جانے کی وجہ سے تمام کشمیر میں بلکہ دور دور مشہور ہے۔ ڈل کا طول مشرقی سمت گگری بل سے لے کر نیل بل تک تخمیناً تین میل ہے۔ اس کا عرض خواجہ یار بل سے لے کر نشاط باغ کے دروازہ تک ۲ میل اور اس کے دور (محیط) کا اندازہ محققین نے دس میل تک لگایا ہے۔

زمانہ سلف میں جب کشمیر کا پانی کم ہو کر یہاں خشک زمین نکلی۔ تو ڈل کا موجودہ طول و عرض بھی ایک وسیع میدان بلکہ صحرا تھا۔ پرانی کتابوں میں نام اس صحرا کا "تالتی مرگ" درج ہے۔ جب راجہ پرورسین ثانی نے دریائے وتستہ کا پانی کوہ ماران کے نیچے لانے کی تجویز کی۔ تو نادہ پور کے مقام پر ایک طویل و مضبوط بند بنایا جس نے دریا کے پانی کو پہاڑ کے قدموں میں لاکر بچھا دیا۔

---

۱ سری نگر سے اسلام آباد کو جاتے ہوئے سڑک کے بائیں طرف مرتفع زمین پر یہ مزار چند درختوں کے اب تک موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ باغ کی تباہی و ویرانی کے بعد لوگوں نے اس کو قبرستان بنا لیا۔ کیونکہ سڑک کے ساتھ ساتھ باغ کی حدود تک قبریں ہی قبریں نظر آتی ہیں۔ ۲ تاریخ حسن صفحہ ۷۶ ۳ عہد حکومت ۱۰۲ء لغایت ۱۶۲ء۔

راجہ ورلبٹ وردن کے زمانے میں جب باوجود بہت سی احتیاطوں کے نہ تھمنے اور نہ رُکنے والی طغیانی آگئی۔ تو یہی میدان جہاں پر دیسین کے زمانے سے صرف تھوڑا سا پانی وہ بھی کوہ ماراں کے دامن میں جمع رہتا تھا۔ ایک وسیع اور طویل و عریض جھیل بن گیا۔

جھیل ڈل میں بادشاہ کی سیر

شرلویر لکھتا ہے۔ اس ملک میں ایک بڑی گہری جھیل ہے۔ جس کا نام ڈل ہے۔ اور جو ازمنہ قدیم میں سریش وری کے نام سے مشہور تھی۔ ڈل کے کنارے سریش وری کا جو تیرتھ ہے۔ بادشاہ نے وہاں دو گھاٹ قائم کئے۔ اس تیرتھ ہی کی وجہ سے ڈل کا نام بھی سریش وری تھا۔ بادشاہ شاہی کشتی پر سوار ہو کر ڈل کی سیر کیا کرتا۔ اس زمانے میں ڈل دارالحکومت یعنی نوشہرہ تک پھیلا ہوا تھا۔ بادشاہ کی کشتی شاہی جھنڈے کی وجہ سے دُور ہی سے پہچانی جا سکتی تھی۔

ڈل میں سونہ لنک[1] و روپہ لنک

ڈل تین حصوں میں منقسم ہے۔ ایک ڈل کلاں جس کے کنارے حضرت بل اور نسیم باغ واقع ہیں۔ اس کا نام سونہ لنک بھی ہے۔ دوسری ڈل خورد جس کا احاطہ کوہ سلیمان یا ہری پربت سے نشاط باغ تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جس کے ایک کنارے گیگار واقع ہے۔ اس کا نام روپہ لنک ہے۔ تیسرے سدرہ کھون جو ہری پربت یا کوہ ماراں کے نیچے ہے۔ اور نہایت عمیق ہے فارسی مورخوں نے لکھا ہے کہ ڈل کلاں میں سلطان زین العابدین نے بہت سی بھرتی ڈال کر ایک مصنوعی جزیرہ سونہ لنک کے نام سے احداث

---

[1] عہد حکومت ۱۴۲۰ء لغایت ۱۴۷۰ء [2] لنک یا لنگا جزیرے کو کہتے ہیں۔

کیا، اور اس پر ایک محل تعمیر کرایا جس کی تین منزلیں تھیں۔ چنانچہ صاحب تاریخ حسن لکھتے ہیں "قصرے سہ آشیانہ دار برآں عمارت کردہ بود" لیکن شریور کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈل میں یہ جزیرے (قدرتی تھے یا مصنوعی) بہر حال وہ بڈشاہ سے پہلے ہی موجود تھے۔ البتہ اس نے یہاں ایک محل ضرور تعمیر کرایا جس کا نام اس نے سداپوری محل رکھا تھا۔

بادشاہ جب ڈل کی سیر کو آتا یہاں دیر تک قیام کرتا۔ امراء و زراء ساتھ ہوتے۔ کبھی ملکی مشورے ہوتے کبھی سیاسی گتھیاں سلجھائی جاتیں۔ کبھی معرفت و تصوف کے پھول جھڑتے۔ کبھی روحانیت کی برکھا ہوتی کبھی اس ظرافت و دل لگی سے بھی کام لیا جاتا جس کو استہزا نہیں بلکہ کالملح فی الطعام کہتے ہیں۔ بادشاہ کے بعد اس شاہی محل کا کیا حال ہوا تاریخ کہتی ہے۔ "بہ حادثہ زلزلہ شکست"

ڈل کے تیرنے والے کھیتوں میں میوہ دار درخت

محل کی تیاری کے بعد بادشاہ کی مشہور بیگم شری نے بہت سی خیرات کی۔ اور لوگوں کو کھانا کھلایا۔ جن میں ہندو مسلمان صوفی اور بزرگ بھی تھے خصوصاً برہمنوں کی ایک معقول تعداد تھی۔ سب نے بادشاہ کے حق میں دعائیں کیں۔

بادشاہ نے عجیب حکمت عملی سے ڈل کے اندر تیرنے والے کھیتوں میں میوہ دار درخت لگوائے۔ اور اس مقام کو ایسی رونق دی کہ لوگ اس کو دور دور سے دیکھنے کے لئے آتے تھے۔

شریور کی اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈل میں تیرنے والے کھیتوں اور ان میں سبزی ترکاری اور پھل پھول پیدا کرنے کا رواج بڈشاہی زمانے ہی سے چلا آتا ہے۔

جزیرہ سونہ لنک عہد مغلیہ و افاغنہ میں

زوال خاندان شہمیری اور تباہی چکاں کے بعد جب کشمیر میں مغل اعظم یعنی شہنشاہ اکبر نے کہ وہ بھی بڈشاہ کی طرح اپنی طبیعت کی بوقلمونیوں سے عجائبات روزگار سے تھا۔ قدم رکھا۔ تو اس کے جانشینوں نے جو بڈشاہ کی بزرگی و رعایا پروری اور اس کی شان و شوکت کے قائل تھے مرمت و ترمیم کے بعد سونہ لنک کے کھنڈروں کو پھر قصر شاہی بنا دیا۔

افغانوں کے عہد میں جوان شیر امیر خان۔ کشمیر کا ایک نامور گورنر گزرا ہے۔ وہ بڑا امیر طبع اور عیش دوست تھا۔ اس نے سونہ لنک کے چھوٹے سے جزیرے کو مغل بادشاہوں اور گورنروں سے بھی زیادہ رونق دی۔ صاحب تاریخ حسن لکھتے ہیں: "امیر خاں آں ترمیم کردہ بسبیل دولاب بالائے چنار آب کشیدہ در صحن عمارت فوارہ روح افزا برداشتہ بہ تماشائے آں صرف اوقات مے کرد۔" اس زمانہ میں سونہ لنک کا کیا حال تھا مصنف تاریخ حسن لکھتا ہے: "درایں زماں عمارتش ویراں۔" لیکن آج ۱۳۵۶ھ میں اس جزیرے کی جو حالت ہے۔ وہ چونہ اور پتھروں کے ڈھیر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ایک دو توت کے درخت ہیں۔ اور ایک چنار کا درخت اب آپ اپنی کہنگی و قدامت کا اشتہار دے رہا ہے۔

زینہ کوٹ

اس کا ذکر سب سے پہلے زونراج نے اپنی راج ترنگنی کے شلوک ۱۲۴۸ میں جین کوٹ کے نام سے کیا ہے۔ زونراج لکھتا ہے۔ یہ گاؤں

۱؎ سرینگر کا مشہور پل امیرا کدل اسی کے نام پر ہے۔ عہد حکومت ۱۱۸۰ھ لغایت ۱۱۸۳ھ از زمانہ احمد شاہ ابدالی۔

زین العابدین نے لھان پور کامرکج کے جنوب، مشرقی کونہ میں جہاں زمین ہمیشہ دلدلی رہتی تھی۔ آباد کیا تھا۔ یہاں بادشاہ نے کئی مکانات تعمیر کرائے۔ ہر مکان پر ریشمی جھنڈیاں لہرایا کرتی تھیں۔ جو ان کے سرکاری مکان ہونے کی علامت تھیں۔

ایک پرانی بیاض میں[2] زینہ کوٹ کے متعلق چند سطریں نظر سے گزری ہیں۔ صاحب بیاض ملا احمد کاشمیری ملک الشعرائے دربار بڈشاہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ موضع زینہ کوٹ میں جب سلطان نے عمارات شاہی کی تکمیل کرلی تو ترکم چینی[3] نام ایک صنعت کار سنگتراش نے بادشاہ کے لئے سنگ سیاہ کا ایک حوض بنایا۔ جس کے فرش میں سنگ سفید لگایا گیا تھا۔ ملا احمد نے اس حوض کی تعریف میں ایک نظم لکھی تھی۔ افسوس ہے۔ وہ نظم مکمل نہیں مل سکی بیاض بہت پرانی اور بوسیدہ ہے۔ اور اکثر مقامات سے کاغذ کرم خوردہ اور پھٹا ہوا ہے۔ اس نظم کا صرف ایک شعر سلامت ہے۔ ایک شعر کا پہلا مصرعہ سالم اور دوسرا نصف موجود ہے۔ باقی نظم کیڑوں کی خوراک ہو گئی ہے چنانچہ یہ اشعار حسب ذیل ہیں۔

حوضے کہ دست ترکم چینی زبہر شاہ　　　باصد صفائے دست زسنگ سیاہ بست

---

[1] لھان پور راجہ جیاپیڈ کا آباد کردہ ہے۔ اور اس کا موجودہ نام مال ہے۔

[2] یہ بیاض خواجہ محمد اسمٰعیل صاحب ناقی مرحوم تبنت بقالی سرینگر کے پاس دیکھی گئی۔

[3] معلوم ہوتا ہے کہ کسی چینی صنعت کار کا نام تھا۔ اس سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ کہ بادشاہ نے فن تعمیرات کے سلسلہ میں چین تک سے بھی اہل صنعت طلب کئے تھے۔

فرش سفید در تہِ آب زلال حوض ~~پڑھا نہیں گیا~~ آن دل ماہی بہ ماہ لبست

زینہ کوٹ میں جو سنبل کے نزدیک ہے بادشاہی عمارات کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔ حمام اور حمام کے صحن کے پتھر اور حوض کے نشانات اب بھی ایک دردمند کے سینہ میں زخم بے نشان پیدا کرنے کے لئے تیر بے کمان کا کام دے رہے ہیں۔

زینہ بازار

یہ بازار زینہ کدل سے نائد کدل تک چلا گیا ہے۔ اس زمانہ کی رونق اور آبادی پر غور کرو۔ اور یہ بھی دیکھو کہ بادشاہ کو اپنے آباد کردہ مقامات سے کس قسم کی دلبستگی و دلچسپی ہوتی تھی۔ پھر اندازہ لگاؤ کہ اس بازار میں کیا کچھ رونق نہ ہوتی ہوگی۔

زین پور یا زینہ پور

اس کا نام سنسکرت کی تاریخوں میں جین پور یا جین نگر درج ہے۔ یہ گاؤں زین العابدین نے مدوراجیہ (مراج) میں آباد کیا۔ اور بعد میں اپنی رونق و شادابی کی وجہ سے ایک پرگنہ مشہور ہو گیا۔ یہ موضع ایک کریوہ پر آباد ہے۔ سری نگر سے اس کا فاصلہ بجانب گوشہ جنوب قریباً ۵ میل ہے۔ اس کی بنا کے متعلق مشہور ہے۔ کہ شیخ شمس الدین بغدادی ایک بزرگ تھے۔ جو بڈشاہ کے زمانے میں کشمیر آئے۔ جب اس کریوہ پر پہنچے۔ تو اس کی غیر آبادی کے باوجود جب یہاں کی ہوائے دلکشا اور فضائے روح افزا دیکھی

۱۔ پیر شمس الدین حیرت یاندانی سری نگر نے ایک پیوند لگا کر مصرعہ کو اس طرح روشن کیا۔ ع پیوند نور آن دل ماہی بہ ماہ لبست۔

۲۔ تاریخ خواجہ اعظم مرتب خواجہ محمد اعظم دیدہ مری

تو اسی ویرانے کو اپنا مسکن بنا لیا۔ فقرا کی ایک جماعت بھی ساتھ تھی۔ مطبخ ہر وقت گرم رہتا تھا۔ اور جو آتا تھا۔ وہ خالی نہ جاتا تھا۔ بادشاہ نے بھی شیخ بغدادی کی شہرت سنی۔ اس کو بلوانے کی بجائے خود وہاں جانا مناسب سمجھا۔ چنانچہ گیا۔ اور ارادت مندی کا تحفہ لیکر گیا۔ بادشاہ نے شیخ کی خاطر یہاں زینہ پور کے نام سے ایک شہر آباد کیا۔ ایک نہر جاری کی جس کی سدبندی آج تک زینہ سخو کے نام سے مشہور ہے۔ اس نہر کی آبپاشی سے کئی شہر آباد و سرسبز ہو گئے۔ شیخ بغداد کا مزار بھی زینہ پور ہی میں مرجع خلائق ہے۔

شیخ کے ساتھ بادشاہ کو عقیدت تھی۔ اس لئے وہ اکثر یہاں آیا کرتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ جب شیخ نے اپنی عبادت میں ہرج آتے دیکھا۔ تو بادشاہ سے فرمایا "فقیراں ہمسر بادشاہاں ہستند و بادشاہ در یکجا کجا مے گنجند" بادشاہ تو عجائبات کا مجموعہ تھا۔ اس نے وہاں جانا ترک کر دیا۔ اسی واقعہ کے بعد بادشاہ نوشہرہ کی راجدھانی کو آباد کرتا ہے۔

جونراج نے بھی زینہ ترنگنی میں اس کا ذکر جین پوری کے نام سے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ کہ بادشاہ نے پرگنہ کدال[1] میں جین پوری (زین پور) نام ایک قصبہ اپنے نام پر آباد کیا۔ اس قصبہ میں بھی برہمنوں کو خاص مراعات شاہی سے ممتاز کیا۔ اور زین پور کی سرسبزی و شادابی کے لئے بادشاہ نے

[1] علاقہ کدال یا پرگنہ کدال کا موجودہ نام موضع اڈون کے نام پر اب پرگنہ اڈون ہے یہ موضع وج برور کے جنوب مغرب میں تین میل کے فاصلے پر دریائے دشو کا کے بائیں کنارے پر ہے۔ اس دریا کا قدیم سنسکرت نام دشو کا ہی ہے۔ لیکن اس زمانے میں یہ دریا دشو کے نام سے مشہور ہے۔

ایک نہر بھی جاری کرائی۔ تاریخ اعظمی میں بھی زینہ پور کا ذکر کشمیر کے چک بادشاہ حسین شاہ کے سلسلہ میں آتا ہے۔ اس زمانہ میں بھی زینہ پور خاص شہرت رکھتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے۔ زین العابدین کی وفات کے قریباً ایک سو سال بعد تک زینہ پورہ کو خاصی اہمیت رہی ہے۔ چنانچہ خاندان چک کے بادشاہ حسین شاہ والئے کشمیر نے اپنے آخری عہد میں جب اپنے چھوٹے بھائی علی خاں کو مملکت و حکومت سپرد کر کے تخت پر بٹھایا۔ تو آپ موضع زینہ پورہ میں جو زین العابدین کا آباد کردہ تھا اور طراوت و نظارت اور باغ و بہار کی وجہ سے دارالسرور تھا۔ چلا آیا اور وہیں ۹۷۷ھ میں جان بحق ہو گیا۔

علی خاں نے بادشاہ ہو کر اپنا نام علی شاہ رکھا۔ ۹۷۸ھ میں تخت پر بیٹھا۔ اس کا بھائی حسن خاں ہنگامہ برپا کر کے تخت و سلطنت کے دعوے کے لئے ایک جماعت کو اپنا طرفدار بنا رہا تھا۔ علی شاہ نے قلعہ زینہ پور میں اس کو محبوس کیا۔ تین ماہ کی صعوبتوں کے بعد حسن خاں نے اسی قلعہ میں وفات پائی۔

آج زینہ پور میں نہ وہ قلعہ ہے نہ شاہی عمارات ہیں۔ نہ ایسی اور علامتیں باقی ہیں جن سے یہ شبہ تک بھی ہو سکے کہ یہ مقام کبھی دارالخلافہ کی ہمسری کیا کرتا تھا[1]

کیا عجب مرقد بڈشاہ سے آئے جو ندا زین پور پیارے کا کیا حال ہوا میرے بعد

تاریخ حسن سے معلوم ہوتا ہے کہ زینہ پور کے باغہائے دلکشا اور عمارات عالیہ عجوبۂ روزگار تھیں یہ سب فراز کر وہ پڑھتیں نعلیہ و حکومت تک اس کے آثاروں میں کچھ کچھ ان موجود تھی۔

[1] تاریخ خواجہ اعظمی۔

زینہ ڈوب یا راجدہانی نوشہرہ

یہ مقام جو آج سرینگر کا ایک دور افتادہ محلہ ہے۔ دارالحکومت شیر گڑھی (سرینگر) سے ملہ شاہی باغ کو جاتے ہوئے قریباً پانچ میل کے فاصلہ پر راستہ میں آتا ہے۔ نوشہرہ نئے شہر کو کہتے ہیں۔ بڈشاہ نے بھی عالیشان عمارتوں کا ایک رفیع و وسیع سلسلہ قائم کر کے سرینگر کے شمالی گوشے میں ایک نیا شہر آباد کیا۔ چونکہ بادشاہ خود یہاں رہتا تھا۔ اور یہیں دفاتر وغیرہ تھے۔ اس لئے نوشہرہ کو کشمیری زبان میں راجدہانی بھی کہتے تھے۔ دب یا ڈیب کے معنی محل یا منزل ہے۔ اس لئے سرکاری کاغذات میں یہ محلات زینہ دب کے نام سے موسوم تھے۔

موجودہ زمانے میں بھی اس مقام کے کھنڈروں کو راجدہانی ہی کہتے ہیں اور لفظ راجدہانی کے مزید ثبوت میں بڈشاہی زمانے کے ایک شاعر کی یہ رباعی بھی بیاض (سرخوش) قلمی میں نظر آتی ہے۔ رباعی

سلطاں بہ سریر کامرانی بنشست　　بر مسند عیش جاودانی بنشست
ہر شوکت و شان کہ داشت کیواں فراز　　تا سنگ اساس راجدہانی بنشست

بادشاہ نے اس مقام کو جی کھول کر رونق دی نالہ منڈی بل کے پاس ایک وسیع و خوش نما باغ بنوایا۔ اسی باغ کے کھنڈروں پر شاہجہان کے زمانے میں نواب علی مردان خاں گورنر کشمیر نے "حویلی ہائے سنگین نوارہ و آبشار نشیں برائے بود و باش خود احداث" کرائے۔ نواب علی مردان خاں نے اس کا نام باغ حیدر آباد رکھا۔

بادشاہ نے نوشہرہ میں بارہ منزلہ عمارت کا جو دربار عام تعمیر کرایا صنعت

۱ سال تعمیر ۴۵۱۵ لوکک مطابق ۱۴۳۹ء ۲ مفصل حالات کے لئے دیکھو کتاب ہذا کا ضمیمہ ۲

حرفت نقش و نگار اور وسعت و سربلندی میں رشک زمانہ اور عجوبۂ روزگار تھا۔ ہر منزل میں پچاس حجرے تھے۔ اور ہر حجرے میں پانچسو آدمی سما سکتے تھے۔ گویا اس مکان میں پچیس ہزار آدمیوں کی گنجائش تھی۔ پھر لطف یہ کہ اس عمارت میں اینٹ پتھر چونہ کہیں نام کو نہ تھا۔ تمام عمارت لکڑی کی تھی۔ اور کشمیری صنعت کا بہترین نمونہ تھی۔ مرزا حیدر کاشغری تاریخ رشیدی میں اس عمارت کے متعلق لکھتے ہیں "۔ ہماں سلطان زین العابدین عمارتے در شہر برائے خود ساختہ کہ بہ کشمیریاں آں را راجدہانی مے گویند کہ دوازدہ آشیانہ است بعضے آشیانہ مشتمل بر پنجاہ خانہ و حجرہ و ایوان و غرفہ باشد و عمارتے بہ ایں رفعت و وسعت در عالم مثل کوشک ہشت بہشت سلطان یعقوب در تبریز و کوشک باغ زاغاں و باغ سفید و باغ شہر کہ در ہرات اند و کوک سرائے و عاق سرائے و باغ دلکشا و باغ بولائی کہ در سمرقند است، دیدہ شد۔ اما طرح سیاق و لطافت کہ آں ہا دارند ایں ندارد و غرابت ایں عمارت بیشتر ازاں است[1]"

مرزا حیدر یہ تسلیم کرتا ہے۔ کہ بلحاظ خوبصورتی و وضع کشمیر کا زینہ دب گو سمرقند و ہرات اور تبریز کی تعمیرات کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ تاہم وہ دنیا کی عجیب عمارتوں میں سے ہے۔

راجدہانی کا نام سب سے پہلے زونراج نے شری جینا نگری یعنی زینہ نگر لکھا ہے معلوم ہوتا ہے۔ بادشاہ نے اس علاقہ کا نام زینہ نگر رکھا۔ اور چونکہ دارالحکومت بھی بعد میں یہیں مقرر ہوا۔ اس لئے اس کو راجدہانی بھی کہتے تھے بعد میں اسی نام نے نوشہرہ کی شکل اختیار کر لی۔ اب محلہ نوشہرہ تو موجود ہے مگر راجدہانی جہاں شاہی محلات تھے کھنڈروں کا ایک عبرتناک ڈھیر ہے۔

[1] از تاریخ رشیدی ورق ۳۰۲ غیر مطبوعہ ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کشمیر۔

زونراج لکھتا ہے۔ بادشاہ نے اس نئی بستی میں بازار تعمیر کرائے۔ اور اجناس کی خرید وفروخت کے لئے تجارتی منڈیاں قائم کیں۔ اس بستی کی وسعت پردی من پہاڑی سے لیکر امریش پور تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں جو مکانات بڑے بڑے اور اونچے اونچے پتھروں کے بنے ہوئے تھے۔ ان کے عکس زین گنگا ندی میں سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی لہروں کے ذریعہ ہلتے اور لرزتے ہوئے ایک کیفیت پیدا کیا کرتے تھے۔ بڈشاہ نے یہاں کئی مٹھ تعمیر کرائے۔ اور برہمنوں کو جن پر وہ خاص طور پہ مہربان تھا۔ نہ صرف اراضیات مفت دیں۔ بلکہ ان کو مکانات بھی شاہی مصارف سے تعمیر کرا دیئے۔

زونراج کے بعد اس کے شاگرد شری ور نے راجدھانی کا ذکر کرتے ہوئے زینہ ڈب یعنی شاہی محلات کی کچھ کیفیت بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

سٹ[۱]۔ نوکک کے بلند ترین شاہی محل دیوگاہ (DAWAGAMA) کے علاوہ ۸۴۳ھ نوکک میں بادشاہ نے اس محل کے نزدیک ایک اور لاجواب محل شری جہنانگری تعمیر کرایا۔ جو اینٹوں اور لکڑیوں سے بنایا گیا تھا۔ محل کی چوٹی کے گول گنبد کا سنہری کلس سورج کی روشنی میں اپنی آب و تاب سے آنکھوں کو خیرہ کر دیتا تھا۔

زونراج لکھتا ہے۔ عمارت کے مستریوں کو بادشاہ خود ہدایات دیا کرتا تھا۔ جو اس کے فن تعمیر سے آگاہ ہونے کی روشن دلیل ہے۔

بادشاہ نے قدیم دارالحکومت کو ترک کر کے زینہ نگر ہی میں سکونت اختیار کر لی۔ اور مرنے دم تک وہ اسی جگہ رہا۔

---

[۱] مطابق ۱۴۶۴ء موافق ۸۶۸ھ

بادشاہ نے اس عالیشان سنہری کلس والے محل کے وسیع صحن میں ایک تالاب تعمیر کرایا۔ اور اس میں پالتو راج ہنس چھوڑے جن سے تالاب کی خوبصورتی دوبالا ہو گئی۔ اس محل میں دربار کے لئے ایک بہت بڑا ہال تعمیر کیا گیا جس میں بادشاہ کے لئے ایک مثلث نما تخت رکھا گیا۔ اور ہال کی دیواروں میں آئینہ بندی کی گئی۔ لیکن اب وہاں کیا ہے؟ ؎

دلِ برباد میں اڑتی ہے خاک　　یہ بستی غیرتِ جنت کبھی تھی

پاپنور میں مصنوعی جھیل زینہ تراگ

بادشاہ کو کونثر ناگ کی جھیل بہت پسند تھی۔ اس زمانے میں دشوار گزار سفر ہونے کے باوجود وہ وہاں جاتا اور گھنٹوں وہاں سیر کرتا۔ بادشاہ نے اس لمبے سفر اور لمبی چڑھائی سے بچنے کے لئے ایک ایسی ہی جھیل دارالحکومت کے نزدیک بنائے جانے کا حکم دیا چنانچہ یہ مصنوعی جھیل کوثر ناگ کے ہی نمونہ پر پدم پور (پان پور) میں بنائی گئی۔ اور اس کا نام زینہ تراگ رکھا گیا۔

شر یور لکھتا ہے۔ اس جھیل کی بنیاد ان ایام میں رکھی گئی جب زعفران کے پھول اپنی پوری بہار پر تھے۔

بقول شر یور بادشاہ نے اس جھیل کے کنارے ایک خوبصورت محل تعمیر کرایا جس کا نام اس نے کلودہران ناگ رکھا۔ لیکن اب نہ وہ جھیل ہے نہ وہ خوبصورت محل۔ البتہ ایک نشیبی مقام اب تک زینہ تراگ کے نام سے پاپنور میں مشہور چلا آتا ہے لہ

لہ تحصیل اونتی پورہ میں ایک موضع زینہ تراگ بھی بادشاہ کے نام پر ہے جس میں قریباً ایک سو نفوس کی آبادی ہے۔ ملاحظہ ہو فہرست دیہہ وار کشمیر بابت ۱۹۲۱ء

آسماں سے بھی تھا پایہ جن کی رفعت کا بلند
ہائے کیونکر کھا گئی ان آسمانوں کو زمیں

ہلال پور

شر یور لکھنتا ہے شہر جینا نگر میں ایک ہاتھی بدمست ہو کر خون خرابہ کرنے لگا۔ ہلال نامی ایک شاہی ملازم اسے مارنے کو نکلا۔ اور آخر اس نے کسی نہ کسی ترکیب سے اس بدمست ہاتھی کو جس کے خوف سے لوگوں کو باہر نکلنا بھی دشوار تھا مار ڈالا۔ بادشاہ اس کی جوانمردی سے بہت خوش ہوا۔ اور جس مقام پر وہ ہاتھی مارا گیا۔ اس مقام پر بادشاہ نے ہلال کی یادگار میں ایک گاؤں ہلال پور کے نام سے آباد کیا جس بادشاہ نے اپنے ایک ملازم کے نام پر گاؤں آباد کیا۔ اس نے یقیناً اسے انعامات کثیرہ سے بھی مالامال کیا ہوگا۔

زینہ تلک

شر یور لوکک کے سیلاب عظیم کے بعد بادشاہ نے کامراج کو سیلاب کے نقصانات سے محفوظ رکھنے کے لئے جیا پیڈ پور (موجودہ نام اندرکوٹ) کے نزدیک دتستہ کے کنارے زینہ تلک کے نام سے ایک شہر آباد کیا۔ چونکہ تمام مکانات پر بادشاہ نے سفیدی کرانے کا حکم دیا تھا۔ اس لئے یہ شہر دودھ کا ایک شہر یا کوہ سفید معلوم ہوتا تھا۔ اس شہر میں ایک نالہ کے ذریعہ پانی لایا گیا۔ وہ پانی شہر کے بڑے دروازے سے گزر کر باہر نکلا کرتا تھا۔ شر یور لکھتا ہے۔ بادشاہ نے اپنے لئے بھی یہاں شاہی محل تعمیر کرایا۔ اور عمارت سے فارغ ہونے کے بعد یہاں رقص و سرود کے جلسے منعقد کئے جہاں کشمیر اور کاشی (بنارس) کے ماہرین علم موسیقی نے اپنے اپنے

کمالات دکھلائے۔ بادشاہ نے نقد انعامات سے ان کے دامن مراد کو مالا مال کیا۔

سمدر کوٹ

بادشاہ نے جھیل ولر اور مانس بل کے کناروں پر کئی گاؤں آباد کئے جن میں سایہ دار درخت نصب کئے گئے۔ سمدر کوٹ[1] سے شری دوار کا تک بادشاہ نے ولر کے کنارے جتنے گاؤں آباد کئے۔ ان سب کا ابتدائی لفظ جینا آتا تھا۔ یعنی تمام گاؤں بادشاہ کے نام پر ہی آباد کئے گئے تھے۔ یہ نئے گاؤں بابا شکور الدین کی زیارت کے نیچے سے لے کر بنڈپورہ یعنی کھوئی ہامہ کے تمام علاقہ میں پھیلے ہوئے تھے۔

زونراج نے لکھا ہے۔ کہ بادشاہ نے جھیل مانس بل کے کنارے ایک نیا شہر آباد کیا۔ نالہ سندھ سے اس نے ایک نہر نکالی۔ جو ہر پھر کر مانس بل ہی میں داخل ہو جاتی تھی۔

بڈ کوٹ۔ بڈ سر۔ بڈ مقام

یہ تینوں مقام شمالی کشمیر میں واقع ہیں۔ بڈ کوٹ ایک گاؤں ہے جو بادشاہ کے نام پر آباد ہے۔ ہندواڑہ سے علاقہ راجوار کی طرف جائیں۔ تو بائیں طرف سڑک کے کنارے یہ گاؤں نظر آتا ہے۔ یہاں کے لوگ بادشاہ کو ولی تصور کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ اس کا مزار بھی اسی جگہ ہے۔ بڈ سر

---

[1] سمدر کوٹ کا موجودہ نام صدر کوٹ ہے جو حاجن کے متصل واقع ہے[2] موجودہ زودلکھ متصل زیر نز کھوئی ہامہ کے علاقہ میں اب بھی قریباً چالیس گاؤں ولر کے کنارے آباد ہیں۔ لیکن کسی گاؤں کے ساتھ زینہ یا جینا کا لفظ نہیں ہے۔ ممکن ہے انقلاب زمانہ سے یہ نام لوگوں نے فراموش کر دیا ہو۔ اور گاؤں کے ناموں میں بھی تبدیلی ہو گئی ہوا۔

اور بڈ مقام یہ دونوں مقام ہردو شیوہ کے اوپر رام پور۔ راجپور کا جو جنگل ہے۔ وہاں چیر نار گاؤں کے متصل واقع ہیں۔ بڈسر ایک وسیع خام تالاب ہے۔ جو جنگل کے عین درمیان ہے۔ بڈ مقام بھی اسی علاقہ کا نام ہے۔ راقم مؤلف یہاں ۱۹۱۱ء کی گرمیوں میں تین ہفتہ قیام کر چکا ہے۔ یہاں ریچھ اور بندر بکثرت ہیں۔ جن کا گزارہ جنگلی پھلوں پر ہے۔ بڈ مقام کافی بلندی پر ہے اور یہاں خاصی سردی رہتی ہے۔ یہاں سے شہر۔ وادی اور ولر کا نظارہ صاف نظر آتا ہے۔ ؎

میداں بھی بستیاں بھی دریا بھی اور ولر بھی
یہ بڈ مقام منظر کیا کیا دکھا رہا ہے

یہاں کسی قدیم عمارت کے نشان نظر نہیں آئے شاید کبھی بادشاہ یہاں آیا ہو۔ اور چند روز مقیم رہا ہو۔ اور یہ جگہ اس کے قیام چند روزہ کی وجہ سے بڈ مقام کے نام سے مشہور ہو گئی ہو۔ بڈسر کے خام تالاب کا پانی جنگل کے جانوروں کے پینے کے کام آتا ہے۔

چند اور گاؤں اور دو مندر

سوپور (سوپور) کے دوسری طرف بادشاہ نے ایک قصبہ سنال گیری کے نام سے آباد کیا۔ اس میں اچھے اچھے مکانات تعمیر کرلئے۔ ایک اور شہر تعمیر کیا جس کا نام سدی پوری (سدی پور) رکھا۔ یہ شہر اس نے سرشیوری میں سدا کھشتیر کے مقام پر آباد کیا یہیں اس نے شاہی محل سے ذرا زیادہ بلندی پر دو مندر بھی تعمیر کرلئے۔ ایک کا نام ماز نڈ رکھا۔ اور ایک کو امر ناتھ کے نام سے مشہور کیا۔

کرم راجیہ یعنی علاقہ کامراج میں اس نے ایک قصبہ سلطان پور کے نام

(نہ حاشیہ دیکھو صفحہ ۲۴۴ پر)

سے بسایا۔ زونراج نے اس کو سوترانِ پور لکھا ہے۔ یہاں بادشاہ نے عالیشان مکانات تعمیر کرائے۔

بادشاہ نے جس کا لقب جینا زین العابدین تھا جھیل ولر کے کنارے دو اور قصبے آباد کئے۔ ان میں ایک کا نام جینا کنڈل اور دوسرے کا جیناپٹن تھا۔ ان دونوں قصبوں میں کریپر (Creeper) نام کے درخت بادشاہ کے حکم سے لگائے گئے۔ جن کے پتوں اور جن کی شاخوں کی خوبصورتی نے ان قصبوں کی رونق کو دوبالا کر دیا تھا۔

ستارھواں باب

آبپاشی اجرائے انہار اور سڑکیں

بڈشاہ کی زرعی دلچسپیاں

سلطان کو تعمیر عمارات فلاح زراعت اور احداث انہار کا شوق نہیں بلکہ عشق تھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ چند اہلکاروں کے سوا میرے ملک کی آبادی اور خوشحالی کا حقیقی باعث وہی فرقہ ہے۔ جو امیر غریب سے لے کر بادشاہ تک کو اناج پیدا کر کے دیتا ہے۔ زمینداروں کی بہبود کا اس کو اس قدر خیال تھا۔ کہ ایک قانون کے ذریعہ اس نے مالیہ وصول کرنے والے افسروں کو زمینداروں سے کسی قسم کا نذرانہ قبول کرنے کی سخت ممانعت کر رکھی تھی

(۱) حاشیہ صفحہ ۲۴۲ ۔ اندراج کا نام اب وزارت شمال کشمیر (بارہ مولا) ہے۔

اور چونکہ بادشاہ خود ہر بات کی نگرانی کرتا۔ زمینداروں سے بھی بے محابا ملتا رہتا۔ اور ان سے ان کی شکایات سنا کرتا تھا۔ اس لئے دیہاتی اور کسان لوگ حکام مال کی تعدیوں سے نہایت محفوظ رہتے تھے۔

غرض رعایا بالخصوص زمینداروں کی فارغ البالی کو ترقی دینے میں جو دلچسپی اس نے لی کشمیر کے کسی بادشاہ کو اس کی توفیق نہ ہو سکی۔ چنانچہ صاحب طبقات اکبری بھی اس کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ "در تعمیر ولایت و تکثیر زراعت کندن جوہا توفیق کہ او یافت ہیچ کس از حکام کشمیر را دست نداده بود۔"

زہر کس نآید ایں کز ابر رحمت　　　نہال عہد را سرسبز دارد

بڈشاہ سے پہلے کشمیر کے مشہور انجنیئر سویہ بانی سوپور نے آبپاشی کے اہم کام میں دلچسپی لی ہے۔ لیکن بڈشاہ کا انتظام اس کے بادشاہ ہونے کی وجہ سے بہت اعلیٰ پیمانہ پر تھا۔ سٹین بھی زین العابدین کے طویل دراین عہد میں آبپاشی کے جو اہم کام سرانجام ہوئے ہیں۔ ان کی تعریف کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے۔ جونراج اور شری ور کی تاریخوں میں اس سلطان کے عہد کی تعمیر شدہ نہروں کی طول طویل فہرست مل سکتی ہے لیکن ان میں چند ایک خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ہم سب کا تھوڑا تھوڑا ذکر جو تاریخوں کی ورق گردانی سے معلوم ہو سکا ہے۔ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

لال کوہل

نالہ پہر[1] و لولاب کے خوشگوار اور سرسبز و شاداب پہاڑوں سے نکلتا ہے اور قریباً چالیس میل کی مسافت طے کر کے دو آب گاہ (متصل سوپور) کے پاس

---

[1] وادی لولاب میں جو کوپہ وارہ سے چندی گام تک دو میل لمبی ہے۔ اس نالہ کا نام گنڈ ماچھر ہے وادی کے اور بھی بہت سے نالے اس میں ملتے ہیں۔ آخر کا نالہ (بقیہ حاشیہ دیکھو صفحہ ۲۵۰ پر)

دریائے جہلم میں جاملتا ہے۔ بڈشاہ نے زینہ گیر کی آبادی کے لئے نبہ گام
پہرُو کے پاس اس نالہ پر پتھروں کا ایک مضبوط بند بندھوایا۔ اور ایک نہر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۹) جو درنگ کی طرف سے آتا ہے۔ بمقام گنگا باک کے نزدیک اس میں ملتا ہے۔ دوسرا نالہ کلاروچ ہے۔ جو کھمبرابل کے متصل آکر شامل ہو جاتا ہے۔ گنڈا چھر نالہ آلن اور نالہ کلاروچ کا پانی لیکر وادی کے اکثر مواضعات کو سیراب کرتا ہوا جب وادی سے باہر قدم رکھتا اور کوپہ وارہ کی حدود میں داخل ہوتا ہے۔ تو اس کا نام پہرُو ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر اس کے ساتھ ایک اور نالہ کیمل نام جو کاغان سے آتا ہے۔ نزیہ گام کو سیراب کرتا ہوا آملتا ہے۔ ؎۲ لولاب کشمیر کی مشہور اور زرخیز وادیوں میں سے ہے۔ اس کے اندر قدرت نے کئی اور چھوٹی چھوٹی وادیاں "دامن دل مے کشد" کے لئے بنا رکھی ہیں۔ میں سب سے پہلے یکم اگست ۱۹۲۶ء کو اس وادی میں داخل ہوا۔ اور اس کے آخری مقام تک پہنچا۔ یہ وادی ایک سو پچیس میل مربع ہے۔ ماس میں ۷۷ دیہات اور اٹھارہ ہزار تین سو پچیس ۱۸۳۲۵ نفوس آباد ہیں ۷۹۸۶۸ ایکڑ اس میں جنگل کا رقبہ ہے جس کی سالانہ آمدنی پانچ چھ لاکھ اور مالیہ چالیس ہزار کے قریب ہے۔ اس میں مشہور گاؤں لال پور۔ ورنو اور سوگام ہیں۔ لال پور میں مدرسہ ڈاک خانہ اور پولیس چوکی ہے۔ ورنو ہندوستان کے برگزیدہ عالم شیخ الحدیث مولانا محمد انور شاہ کاشمیری مرحوم سابق صدر مدرس دیو بند کا وطن ہونے کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ سوگام میں ڈسپنسری رینج کوارٹرز ہیں۔ اس وادی میں آبادی سب مسلمانوں ہی کی ہے۔ پنڈتوں کی تعداد ان ۷۷ دیہات میں شاید سو سے زیادہ نہیں ہے۔ ورنو سے اوپر ایک میل کے فاصلہ پر ہندو زمانہ قدیم کی بہت سی مورتیاں ملتی ہیں۔ لولاب کی تمام چھوٹی بڑی وادیوں میں محکمہ جنگلات والوں نے سڑکیں بنا کر جنگل میں منگل بنا رکھا ہے چنانچہ لولاب میں موٹریں گھومتی پھرتی ہیں۔ یہ جگہ سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ بلند ہے۔ یہاں کی زیادہ پیداوار شالی اور مکی ہے۔ شکاران جنگلوں میں (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۲ پر)

نکالی جس کی بڑی شاخ تودامن کرہ کے تمام مواضعات زولرہ۔ہرون۔لیٹ شارٹ۔نوپورہ۔ستجر۔زینہ پورہ ستے۔گوری پورہ اور سلیو کو سیراب کرتی تھی۔اور اس کی چھوٹی شاخ ڈوڈرا اور دریورہ وغیرہ کی طرف نکل جاتی تھی۔ اور جس کی دیگر شاخوں کا تمام زینہ گیر میں جو زین العابدین کا اپنا آباد کردہ علاقہ تھا جال پھیلا ہوا تھا۔

علاوہ دیگر مورخین کے کشمیر کے آخری نامور مؤرخ پیرزادہ حسن شاہ بھی اپنی تاریخ میں پہرو اور نالہ پہرو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "نالۂ پہرو کہ دریان درہ کامرج میگذرد۔منبع آں کوہستان وچشمہ سار لولاب است۔بڈشاہ در عہد خود نالۂ پہرو را من مقام پہرو[1] از مجرائی خود مسدود کردہ آب آں فیض بخش پرگنہ زینہ گیر ساختہ۔"

یہ نہر اپنی شاخوں کے علاوہ چودہ پندرہ میل لمبی تھی۔اس نے زینہ گیر کو جو دولت دی اس کا ذکر زینہ گیر کے حالات میں بیان کیا جاتا ہے۔

---

[1] پہرو اور ینہ گام بالکل پاس پاس ہیں اور سڑک مندواڑہ پر جاتے ہوئے جہاں ستھو باندھا گیا ہے وہاں نالہ سے پار اب بھی یہ دونوں مواضعات موجود اور آباد ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۰) بہت ملتا ہے مدارس کی تعداد وہ بھی ۱۸ ہزار سے زیادہ آدمیوں کی آبادی میں چھ سات سے زیادہ نہیں ہے۔لولاب کا سنسکرت نام لولا اور کشمیری نام لولو ہے اور عام طور پر لولاب بولا جاتا ہے اور کاغذات میں بھی لولاب لکھا جاتا ہے۔یہ علاقہ راجہ لولر ۲۰۴۲ ق م تا ۱۹۸۲ ق م کا آباد کردہ ہے جیسا کہ تاریخ حسن نے صفحہ ۱۳۰ پر لکھا ہے "لولاب درہ است سرحد شمالی کشمیر کہ از چارسو کوہستان دارد راجہ لو آباد کردہ است" لولاب کی دلفریبیاں شاید اس شعر سے کچھ ظاہر ہو سکیں از مولف۔ ؎ بارہا دیکھ چکا پھر بھی تمنا ہے یہی ؛ ایک بار اور دکھا دے کوئی لولاب مجھے

نہر کے تعمیر ہونے پر کئی شعرا نے بادشاہ کی خوشنودیٔ مزاج کے لئے نظمیں لکھیں۔ قصائد لکھے۔ قطعات تاریخ قلمبند کئے۔ بادشاہ علم وفضل کا قدردان تھا۔ اس کے دربار میں کئی شاعر موجود تھے۔ ظاہر ہے کہ اس نے کئی شعراء پر علی قدر مراتب نوازش شاہانہ کی بر کھا کی ہو گی لیکن تاریخوں میں جس قطعہ تاریخ کا ذکر آیا ہے۔ وہ صرف ایک ہی شعر ہے۔ اور تعجب بلکہ افسوس ہے۔ کہ تاریخ گو شاعر کا نام تک بھی کسی تاریخ میں نظر سے نہیں گزرا۔ شعر حسب ذیل ہے ؎

چوں شد تعمیر آں جوئے گرامی   خرد تاریخ گفتہ جوئے خورم[۱]

اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ نہر ۸۵۹ھ میں تیار کی گئی تھی تقریباً پانچسو سال گزر جانے کے باوجود بھی اس قدیم نہر کے آثار تحصیل زین پورہ یے سوپور اور ڈڈر کے متصل نظر آتے ہیں۔ جو سڑک سوپور سے ہندواڑہ کو جاتی ہے۔ وہ دسویں میل پر اسی قدیم چشمۂ فیض یا جوئے خورم کے سینۂ بے کینہ کو روندتی اور پامال کرتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

راقم الحروف نے بارہا "جوئے خورم" کے بانی کی روح پر فتوح پر دعائے خیر کے پھول نچھاور کئے۔ لیکن بند دستھو کے آثار سب سے پہلی مرتبہ ۱۹۲۴ء میں دیکھے۔ جو سوپور سے ہندواڑہ کو جاتے ہوئے دسویں میل پر سڑک سے نیچے بائیں ہاتھ کی طرف اور باغ وزیر سوبھارام کے عقب میں ہیں۔ ستھو کے بہت سے پتھر زمینداروں نے اپنے کھیتوں کے گرد باڑ کے طور پر لگا رکھے ہیں تاہم ستھو کا بہت سا حصہ اپنی گزشتہ شاندار تاریخ کے دریدہ و بوسیدہ اوراق کے ذریعہ دیدۂ عبرت کو اب بھی اپنی اصلی جگہ پر پہاڑ کی مضبوط چٹان کی طرح نظر

[۱] از کمل تاریخ حصہ دوم مصنفہ راقم الحروف۔

آرہا ہے۔ زیر کاشت زمین میں بھی کہیں کہیں اینٹ چونہ اور پتھروں کے نشان ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہاں اس زمانے میں کوئی طویل پختہ فرش نہر کے کنارے پر تھا۔ یا بادشاہ یا اس کے نمائندوں کے لیے یہاں کوئی عمارت تھی۔ ایک پیر مرد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بہ زمانہ بڈشاہ دامن کوہ میں ایک بہت بڑا شہر آباد تھا۔ اس برباد شہر کے لوگوں کو فرشتہ اجل نے اسی جگہ تھپک کر سلا رکھا ہے۔ اس نہر کو بڈشاہ کوہل اور نہر زند بھی کہتے ہیں۔

شاہ کوہل

مشہور ہے کہ کریوہ مارتنڈ کی بنجر اور غیر آباد سطح مرتفع کو سب سے پہلے بادشاہ نے شاہ کوہل کے اجراء سے آباد کیا۔ لیکن جب ہم تاریخوں کی ورق گردانی کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ بڈشاہ سے بہت عرصہ پیشتر کشمیر کے مشہور اور نامور راجہ للتا دتیہ (۷۱۵ء لغایت ۷۵۲ء) نے اس کریوہ پر اپنا شاندار مندر مارتنڈ تعمیر کرایا تھا۔ اور اس مندر کی آبادی اور رونق کے لئے اس نے دریائے لدر کے اس مقام سے جہاں موضع گنیش[1] پور آباد ہے۔ اور جو کریوہ مارتنڈ سے سولہ میل کے فاصلہ پر پہلگام کو جاتے ہوئے سر راہ واقع ہے۔ ایک نہر جاری کی تھی۔

اس نہر سے کئی گاؤں سیراب ہوتے تھے۔ پنڈت کلہن۔ پرجا بھٹ اور شک جو ہندو عہد قدیم کے نامور مورخ تھے۔ مارتنڈ کے میدان پر انگوروں کے باغ کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا

[1] گنیش پور سے کریوہ مارتنڈ تک قریباً تیس چالیس دیہات کے رقبہ کو یہ نہر سیراب کرتی تھی۔

راجہ مذکور کے جانشینوں کے زمانے میں ان کی عدم توجہی اور لاپروائی کی وجہ سے ایک وقت ایسا آیا۔ کہ نہر بند ہو گئی۔ پانی کی بجائے اس میں مٹی اور پتھر نظر آنے لگے۔ مندر بھی ویران اور اجاڑ ہو گیا کریوہ پر جو مکان آباد تھے۔ وہ خاک کا پیوند ہو گئے۔ مکین ادھر ادھر جا کر کسی اور جگہ کاشت کرنے لگے۔

راجہ للتادتیہ کے قریباً سات سو سال بعد جب بڈشاہ کا زمانہ آیا تو ملک کے سوئے ہوئے نصیب پھر جاگ اٹھے۔ خشک اور اجاڑ اضیاع پہاڑوں اور جنگلوں کو جیر کر آباد کی گئیں۔ زینہ گیر کے لئے اگر اس کا وجود بارش کرم بن کر آیا تو اس کریوہ کے لئے وہ ابر رحمت ثابت ہوا۔

ہزارہا مزدور نہر کی کھدائی کے لئے لگا دیئے گئے۔ بادشاہ کی طرف سے مزدوری بھی دی جاتی تھی۔ جو اس زمانہ میں شائد دو چار پیسے روزانہ سے زیادہ نہ تھی۔ تاہم سرکاری اہلکار جو نہر کی کھدائی پر مامور تھے۔ کبھی کبھی لوگوں کو بیگار میں بھی پکڑ لیا کرتے تھے۔

بابا زین الدین حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کے مرید تھے۔ اور اپنے خاص خدمت کی وجہ سے بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ ایک دن انہوں نے اپنے کسی خادم کو کسی کام کے لئے کہیں بھیجا۔ جب وہ اس مقام پر پہنچا۔ جہاں بڈشاہ کے اہلکار "شاہ جو" یعنی شاہی نہر کی کھدائی کر رہے تھے۔ تو انہوں نے خادم مذکور کو بزور و جبر بیگار میں پکڑ لیا۔ جب چند دنوں کے بعد اسے جبری خدمت سے نجات ملی۔ تو وہ حضرت بابا صاحب کی خدمت میں آیا اور تمام ماجرا بیان کیا۔ حضرت یہ واقعہ سنکر ملول خاطر ہوئے۔ غضبناک ہو کر اپنے عصا کو دریائے لدر میں جس کا پانی نہر شاہی میں جانے

والا تھا۔ زور سے گاڑ دیا۔ اور کلاہِ مبارک کو سر پر ٹیڑھا کر دیا۔ ادھر یہ ہوا اور اُدھر دریا کا پانی کم ہو کر خشک ہونا شروع ہوا۔ آخر یہ خبر بادشاہ کو بھی پہنچی۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ سرکاری آدمیوں نے حضرت بابا صاحب کے ایک خادم کو بیگار میں پکڑ کر اس سے زبردستی کام لیا تھا۔ بادشاہ ایک جمعیت بندگان کے ساتھ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا عذر تقصیر کیا۔ اور اپنے آدمیوں کو منع کر دیا۔ کہ وہ نہ صرف حضرت کے خدام کو بلکہ کسی آدمی کو بھی بیگار میں نہ پکڑیں۔ حضرت نے بادشاہ کی معذرت قبول فرمائی۔ عصا دریا سے باہر نکالا۔ اور کلاہ کو سر پر سیدھا کیا۔ چنانچہ دریا کا پانی پھر اسی طرح جاری ہو گیا۔ جس طرح پہلے تھا۔

بادشاہ ایک عجیب طبیعت لیکر آیا تھا۔ وہ جس طرح جوگیوں اور سادھوؤں کا عقیدتمند تھا۔ اسی طرح مسلمان درویشوں اور صوفی منش بزرگوں کی خاک پا کو بھی طوطیائے چشم تصور کرتا تھا۔ حضرت بابا صاحب ضرور خفا ہوئے ہوں گے۔ اور سلطان نے فرط عقیدتمندی سے ضرور معذرت کی ہو گی۔ بلکہ بیگار کے اس جبری واقعہ کے بعد ہی بیگار کی ممانعت کے احکام جاری کئے ہوں گے جس سے سینکڑوں اور ہزاروں لوگوں کو اس جبری اور بے مزد خدمت سے نجات مل گئی ہو گی۔ باقی رہا قصہ عصا کے دریا میں گاڑے جانے اور دریا کا پانی خشک ہو جانے کا۔ اس کو عقیدتمندوں کے حسن ارادت پر محمول کر دیا بزرگان دین کی روحانی طاقتوں سے اپنی لاعلمی تصور کرو۔ اس کے ماننے یا نہ ماننے سے بابا صاحب کی عظمت اور بزرگی میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔

لے تاریخ خوارق ال کلین غیر مطبوعہ سال تصنیف ۱۱۰۹ھ صفحہ ۹۳۔

شری ور نے اپنی راج ترنگنی میں بڈشاہ کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نہر کے اجرا اور اس کی خوش نظمی کی وجہ سے انگوروں کے باغات اس کریوہ پر بکثرت تھے۔ اور وہ اپنی شیرینی اور موٹائی کی وجہ سے دور دور تک مشہور تھے۔[1]

شاہ کوہل اور حکومت ڈوگرہ

کریوہ مارتنڈ پر یہ نہر رنبیر پورہ، رام پور، گوپال پورہ، کلاں وخورد، امر گڑھ، سنگھ پورہ اور دیوی پورہ کے دیہات کو سیراب کرتی ہے ۱۹۱۹ء ب میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اس کریوہ کو ازسرنو آباد کیا۔ یہاں پٹھان پنجابی اور ڈوگرے آباد ہیں۔ جن کا اکثر حصہ فوجوں سے آیا ہوا ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ان سب کو ½ مالیہ معاف کر دیا تھا۔

۱۹۳۹ء ب لغایت ۱۹۴۰ء ب میں وزیر پنول گورنر کشمیر کی معرفت مہاراجہ موصوف نے بڈشاہی نہر کی تعمیر شروع کی۔ لیکن پانی موضع سالیہ سے نیچے نہ اتر سکا۔

۱۔ جغرافیہ قدیم کشمیر صفحہ ۲۰، ضمیمہ راج ترنگنی ۵۱۔ اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں بھی مارتنڈ کا انگور بہت مشہور رہا ہے۔ اس زمانہ میں ایک درم یا دو بڑے پیسے کے ۸ سیر خام یا ۴ سیر پختہ انگور آتے تھے۔ کشمیر سے دہلی تک ایک ڈالی لے جانے کی مزدوری دو روپے تھی۔ اس زمانے میں بھی اس قسم کی اور اتنی ہی بڑی ڈالیاں ہوا کرتی تھیں جیسی آج نظر آرہی ہیں۔ کشمیر سے لاہور اور لاہور سے دہلی تک کی مسافت کا اندازہ کرو۔ اور پھر یہ بھی خیال کرو۔ اس زمانے میں راستے کس قدر ناہموار تھے۔ اور پھر دو روپے اجرت پر بھی نظر ڈالو۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اس زمانہ میں دو روپے کی قریباً ساٹھ من اکبری شالی آتی تھی۔ اس زمانہ کا من موجودہ من سے بہت کم ہوتا تھا۔ کشمیر سے دہلی تک کی مسافت باپیادہ ۲۴-۲۵ یوم بلکہ ایک ماہ سے کم میں طے نہ ہوتی تھی۔

بعدہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ ۱۹۵۵ء میں پھر اس کریوہ کی سرسبزی کے لئے کوشش کی گئی۔ اور ۱۹۶۰ء میں بہت سی لاگت اور بے حد جانفشانیوں کے بعد آخر پانی رنبیر پورہ تک آ گیا۔ پہلے اور دوسرے سال لوگوں کو آبیانہ معاف کر دیا گیا ۱۹۶۲-۶۳ء میں ½ حصہ اور ۱۹۶۴ء میں آبیانہ سالم لیا جانے لگا۔ تقسیم آب کے لئے اس نہر پر ڈویژنل انجنیر کے علاوہ ایک ضلعدار، ایک امین، تین پٹواری اور ایک چپراسی مقرر ہے۔

چند اور بادشاہی نہریں

شریور لکھتا ہے۔ زمین کا کوئی ٹکڑا ایسا نہ تھا۔ جہاں نہروں کی ضرورت ہو۔ اور بادشاہ نے نہریں نہ کھدوائی ہوں۔ بلکہ جہاں نشیبی زمین تھی۔ اور وہ جگہ ناقابل زراعت تھی۔ وہاں پانی کا ذخیرہ رکھنے کے لئے خام تالاب کھدوائے تھے۔

بادشاہ کو فرزندوں کی ناہنجاریوں کی وجہ سے جو سب سے بڑی تکلیف تھی وہ یہ تھی۔ کہ رعایا مصیبت میں گرفتار ہو جاتی تھی۔ ان کی باہمی خانہ جنگیوں اور باپ سے فتنہ و فساد کھڑا کرنے بلکہ جنگ آزما ہونے کی وجہ سے نہ صرف جانوں کا نقصان ہوتا تھا۔ بلکہ فصلیں تباہ ہو جاتی تھیں۔ مکانات جلا دیئے جاتے تھے۔ اور فسادی لوگ عوام سے نقد و جنس زبردستی چھین لیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب اس قسم کے دورح فرسا واقعات بادشاہ کو سنائے جاتے تھے۔ تو ان کے تدارک کے لئے اس کو اپنی توجہ رفاہ عامہ کی طرف سے عمداً ہٹانی پڑتی تھی۔ چنانچہ بقول شریور ادہم خاں کی جلا وطنی اور حاجی خاں کی دارالحکومت میں مراجعت کے بعد جب ملک میں امن و امان کی صورت پیدا ہوئی۔ تو بادشاہ پھر ملک کی سرسبزی اور شادابی کی طرف متوجہ ہوا۔ اور سب سے پہلے اس نے نہروں کے احداث کی طرف توجہ کی۔

نوتراج نے بھی جو شاعری و تاریخ نویسی میں شریور کا استاد تھا۔ بادشاہ

کے رفاہ عام کاموں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ بادشاہ نے ایک قدیم نہر کے آثار دیکھے۔ اس کو اس نے از سر نو کھدوایا۔ یہ نہر مختلف دیہات کی اراضیات کو سرسبز و شاداب کرتی ہوئی اتپل پور تک چلی گئی۔

بادشاہ نے ایک اور نہر نند شیل ناگ سے بڑھائی۔ اس نہر میں پانی اس کثرت سے رہتا تھا۔ کہ یہاں کے لوگ اپنے آپ کو سمندر کے کنارے آباد سمجھا کرتے تھے۔ دانتی پورہ میں ہمیشہ خشک سالی رہتی تھی۔ بادشاہ نے اس علاقہ کو آباد و سرسبز کرنے کے لئے ایک نئی نہر جاری کی جس سے شالی کی فصل میں بہت ترقی ہوئی۔

بادشاہ نے اسی طرح ایک نہر پرگنہ کرال میں زین پور کو آباد کرنے کے لئے جاری کی۔

زونراج لکھتا ہے۔ کہ اگلے وقتوں میں سویہ بانی سوپور سے لیکر اب تک کشمیر میں بہت سے فرمانروا گزرے ہیں۔ لیکن لوگوں کی بدقسمتی یا بادشاہوں کی کم توجہی کی وجہ سے ملک نے کوئی نمایاں ترقی نہ کی۔ لیکن شری زین العابدین کے عہد میں ملک کی گم شدہ ترقی پھر واپس آگئی۔ اس لئے کہ گذشتہ زمانے میں پیداوار کا انحصار صرف بارش پر ہوتا تھا۔ اور اب بارش کے علاوہ نہروں پر بھی ہے۔

نالہ مار عرف مہاسرت ندی

مہاسرت ایک ندی ہے۔ جو ڈل کے چشمہ سے سیراب ہوتی ہوئی سرینگر کے ساتھ آملتی ہے۔ اس کا ذکر کشمیر کی عام روایتوں کے ساتھ ساتھ چلا آتا ہے مہاسرت کا اتصال وتستہ (جہلم) کے ساتھ جس مقام پر ہوتا ہے۔ وہ شاہی محل

لہ مراد از بن مرگ کریوہ جو تحصیل کولگام میں ہے۔

شیرگڑھی کے عین مقابل ہے۔ یہ جگہ زمانہ قدیم ہی سے ایک مشہور تیرتھ چلی آتی ہے سکھوں کے زمانہ میں یہاں لسبنت باغ تھا۔ اب بھی ایک مندر وہاں موجود ہے۔

قدیم ہند دموَرخوں نے اس سنگم (انفصال) کا نام "مہاسرور" و "تشتہ سنگم" اور سر لوبر پنڈت نے اس کا خلاصہ کرکے "ماری سنگم" لکھا ہے۔ یہی لفظ شنک اور پرجا بھٹ نے بھی استعمال کیا ہے۔ مہاسرت سے ماری اور ماری سے مار مشہور ہو گیا۔ اور اب یہ نالہ اسی نام سے نامزد ہے۔

یہاں تک نوسٹین صاحب کی تحقیقات کا نتیجہ تھا۔ اب مسلمان مورخین نے جو کیفیت نالہ مار اور مار کی وجہ تسمیہ کے متعلق لکھی ہے۔ وہ بھی درج کی جاتی ہے۔ شیخ عبدالوہاب نوری گنائی اپنی کتاب فتحیات کبرویہ میں لکھتے ہیں۔ زمانہ سابق میں تالاب ڈل کا پانی براہ نبل[1] کی راہ سے محلہ علاؤالدین پور[2] سے ہو کر گزرتا تھا۔ بادشاہ نے غور کرنے کے بعد اس پانی سے فائدہ اٹھانے کی دو

---

[1] نبل کشمیری لفظ ہے۔ اور اس قطعہ زمین کا نام ہے۔ جو نمناک اور زرخیز یعنی دلدل کی قسم کی ہو۔ ایسا قطعہ زمین جس میں تقریباً دو حصہ پانی اور ایک حصہ مٹی ہو۔ کشمیر کے نبلوں میں سے بارہ نبل اس لحاظ سے کہ نفس شہر کے شمالی حصہ میں موجود ہے۔ نہایت آباد مزروع اور زرخیز ہے یہاں سفیدہ اور بید کے درخت بکثرت ہیں۔ [2] تعمیر کردہ سلطان علاءالدین والئے کشمیر (عہد حکومت ۱۳۴۳ء لغایت ۱۳۶۲ء) یہ ایک وسیع احاطہ کا نام ہے جس میں حسب ذیل محلہ جات ہیں۔ خانقاہ معلی۔ دوکان سنگین۔ قبرستان۔ ملک انگن۔ شاہی تعمیرات اب نابود ہیں۔ البتہ ملک انگن میں قبرستان کا ایک چھوٹا سا احاطہ ہے۔ مشہور ہے کہ وہاں علاءالدین کا مزار ہے۔ جو کہ آثار قدیمہ والوں نے حال ہی میں کھود کر نکالا ہے۔ ابھی وہ کس مپرسی کی حالت میں ہے۔

تجویزیں سوچیں۔ ایک تو یہ کہ اس سے پرگنہ اچھن[1] کو آباد و سرسبز کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ عیدگاہ تک کسی طرح یہ پانی پہنچایا جائے۔ تاکہ لوگوں کو وضو وغیرہ کے لئے تکلیف نہ ہو۔ لیکن یہ دونوں تجویزیں بظاہر خوش اسلوبی سے عملی صورت اختیار کرتی نظر نہ آتی تھیں۔

آخر بادشاہ نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ ایک سانپ نکلا ہے۔ اور وہ دوڑتا جاتا ہے۔ اور پانی کا رستہ دکھاتا جاتا ہے۔ چونکہ بادشاہ کو صفائے باطن کا درجہ بھی حاصل تھا۔ اس لئے یہی واقعہ بعد میں عالم بیداری میں مشاہدہ کیا۔ دیکھا کہ ایک سانپ نکلا ہے۔ لوگ اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ اور وہ بھاگا جا رہا ہے۔ اور کسی کے قابو میں نہیں آتا۔ یہاں تک کہ میدان عیدگاہ تک پہنچا۔ وہاں سے ہوتا ہوا اچھن میں جاکر غائب ہو گیا۔ یہ واقعہ نالہ کی تیاری کے لئے ایک اشارہ تھا۔ چنانچہ سلطان نے اسی لکیر پر کھدائی شروع کرائی اور چونکہ سانپ کو فارسی میں مار کہتے ہیں۔ اس لئے اس آبجو کا نام نالۂ مار مشہور ہو گیا۔ دیگر تمام مسلمان مؤرخین نے بھی نالۂ مار کی وجہ تسمیہ میں قریباً یہی الفاظ دُہرائے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہندو عہد قدیم کا اس نالہ سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن جیسا کہ سٹین صاحب کے حوالہ سے لکھا جا چکا ہے۔ عہد قدیم میں "مہا سرت" نالہ موجود تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ نالہ کریو دانزنند کی نہر کی طرح مٹ گیا ہو۔ یا بہت چھوٹا ہو۔ اور بعد میں سلطان زین العابدین نے از سر نو جاری کیا ہو۔ جیسا کہ ٹر لو رینڈ ت ڈل کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے۔ اسی طرح

[1] سری نگر کے غربی حصہ میں تقریباً تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اور عیدگاہ تک پھیلا ہوا ہے۔ رنبل سنگم کی زراعت جو شامل پرگنہ اچھن ہے۔ بلحاظ لائمت و لطافت بہت مشہور ہے۔

سے نالہ مار بہتا ہے جس کا پانی شہر باش لوگ نہانے اور پینے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بادشاہ نے اب اس نالہ کو نہر شالی کے ساتھ ہستی کرن کے مقام پر ملا دیا ہے۔ نہر شالی وتستہ اور سندھو (جہلم اور نالۂ سندھ) کے مقام اتصال تک جہاں اب شادی پور (سابق نام شہاب الدین پور) واقعہ ہے پھیلی ہوئی تھی۔ اس مقام اتصال کو ماری سنگم کہتے ہیں۔ اور یہاں ہندو اپنے مردوں کی رسومات ادا کرتے ہیں۔

جغرافیہ قدیم کشمیر (ضمیمہ اردو راج ترنگنی) میں بھی لکھا ہے۔ کہ مغرب کی طرف نالۂ مار کی جو توسیع ہے۔ وہ زمانہ مابعد کی ہے۔ سلطان زین العابدین نے اس کو کشتی رانی کے قابل بنا دیا تھا۔

یہ نالہ شہر کی اندرونی آمد و رفت کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے ڈل تک پہنچنے کے لئے ایک آسان گزار شاہراہ تیار کر دی ہے۔ اس کے ذریعہ ڈل کی تمام پیداوار دیگر مقام خصوصاً شہر سرینگر کے ہر گلی کوچہ تک بآسانی پہنچ رہی ہے۔

اس نالہ سے تین چار شاخیں بھی نکالی گئیں۔ مثلاً کاوہ ڈارہ بارہ مل ودلت کل اس نالہ کا دور ۳½ میل تک بنایا جاتا ہے۔ میدان عیدگاہ میں ایک[1] عالیشان مسجد[2] بنام عالی مسجد ہے۔ جو بڈشاہ کے بھائی علی شاہ بادشاہ کشمیر نے اپنے نام

---

[1] آج اس نالہ پر چودہ پل ہیں سات قدیم ہیں اور سات زمانہ مابعد کے (۱) پل نایدیار (۲) پل جوگی لنگر (۳) پل نادہ پورہ (۴) نائید کدل (۵) بوہری کدل (۶) صراف کدل (۷) کاوی کدل (۸) راوری کدل یا راجوری کدل (۹) پل کاوہ ڈارہ (۱۰) ڈونبہ کدل (۱۱) پل سکہ ڈاز (۱۲) پل رتہ پورہ (۱۳) گاؤ کدل (۱۴) پل گنڈرپورہ۔ سات سنگین پلوں کی تصدیق وجیز التواریخ غیر مطبوعہ مصنفہ ملا عبد الغنی ۱۲۲۶ھ سے بھی ہوتی ہے۔ [2] عیدگاہ کا میدان بہت وسیع ہے۔ اور قدرت (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۲ پر)

پر تعمیر کرائی تھی۔ عیدگاہ کے میدان اور اس مسجد میں پانی کی بڑی ضرورت تھی۔ بڈشاہ نے پرگنہ اچھن کی آبادی کے ساتھ ہی عیدگاہ کو بھی پانی پہنچانے کا انتظام کیا۔ چنانچہ نالہ مار کا پانی میدان عیدگاہ سے ہو کر پرگنہ اچھن کو جایا کرتا تھا۔

نالہ مار کے کنارے کئی بزرگ آسودہ خاک ہیں جن میں دو خاص طور پر مشہور ہیں (۱) حضرت سید محمد بیہقی جن کے مزار پر خواجہ محمد اعظم مؤلف تاریخ اعظمی ۱۱۴۵ھ کے زمانہ میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی۔ دوسرے میر سید حبیب سرخابی جو نہایت جلالی شان کے صوفی اور اغنیائے حکام کی صحبت سے سخت متنفر تھے۔

نہر زین گنگا

جنوبی کشمیر کا نام عہد قدیم میں مدوراجیہ تھا۔ اسی کا بگڑا ہوا نام آج تک مراز چلا آتا ہے۔ یہاں اڈون کے عظیم علاقہ کا جو کرال کے نام سے بھی مشہور ہے کچھ حصہ سطح مرتفع پر واقع ہے جو باوجود قرب دریا کے پانی سے محروم تھا۔ بقول شاعر ؎

اے سمندر دیکھ لی ہم نے تری دریا دلی　　ایک قطرے کے لئے ساحل ترستا رہ گیا

جب سلطان زین العابدین نے اس علاقہ میں سلسلہ انہار کو وسعت دی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۱) نے جو مخملی فرش (سبز گھاس) اس پر بچھا رکھا ہے۔ اس نے اس کی سادگی کو بہت دلفریب بنا دیا ہے مسجد بہت وسیع فراخ اور بلند و بالا ہے۔ لیکن بہت شکستہ حالت میں ہے سنگ فرش اکھڑا ہوا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہاں کبھی فرش تھا ہی نہیں۔ بارش میں پانی ٹپکتا رہتا ہے مسجد کے پاس ہی دائیں طرف سیاہ پتھر کی سیڑھیاں وضو کے لئے بنی ہوئی ہیں۔ جو مٹی سے ڈھکی ہوئی اور پانی میں چھپی ہوتی ہیں۔ پانی میں لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی ہے۔

تو اس کا شمالی حصہ ایک جداگانہ پرگنہ بن گیا۔ اس نے اس علاقہ کو آباد کرنے کے لئے اس سطح مرتفع پر اپنے نام سے زین پور ایک قصبہ آباد کیا جس کو سنسکرت زبان کے مورخین نے جین پور اور جین نگر دونوں ناموں سے موسوم کیا ہے۔ چنانچہ جونراج یا زونہ راج اپنی راج ترنگنی کے شلوک نمبر ۱۱۵۳ میں جین نگر یا جین پور کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ اس کو زین العابدین نے اپنے نام پر آباد کیا تھا۔ اور کشمیندر مورخ نے اپنے پرکاش ۲ میں اس کی تائید کی ہے[1]

زین پور کو آباد و شاداب رکھنے کے لئے زین العابدین نے ایک نہر جاری کی جس نے زین پور کو وہ رونق دی کہ زین پور جو ایک قصبہ تھا پرگنہ بن گیا۔ بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ اپنے نئے آباد کردہ مقامات پر کوئی نہ کوئی سرکاری مکان بھی تعمیر کرا دیتا تھا۔ اور اس کی دیکھا دیکھی امیر وزیر بھی چھوٹے موٹے مکان بطور ریسٹ ہاؤس (آرام گاہ) بنا لیا کرتے تھے۔ یہاں بھی بادشاہ نے یہی عمل کیا۔ بلکہ کئی لوگوں نے باغات اصلاحات کر کے اس کو نمونہ رشک ارم بنا دیا[2]

جونراج اپنی تاریخ کے شلوک ۸۶۲ میں لکھتا ہے کہ زین العابدین نے جین نگری کے لئے جو نہر تعمیر کرائی۔ اس کا نام جین (زین) گنگا رکھا تھا۔ اور اس کو اس قدر وسعت دی کہ "ان سوامن" کے مندر تک لے آیا جو راجہ رانا دتیا نے سرینگر میں تعمیر کرایا تھا۔

اس نہر کا منبع قصبہ شوپیاں بیان کیا جاتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ اس کا آخری مقام "رن سوامن" کا مندر واقع سرینگر تھا۔ تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ اس

---

[1] مترجمہ راج ترنگنی کا ضمیمہ کشمیر کا جغرافیہ قدیم صفحہ ۱۰۶۔
[2] مکمل تاریخ کشمیر حصہ دوم مصنفہ راقم الحروف۔

نہر کی لمبائی تیس میل سے کم نہ تھی۔ اور اس سے صرف زینہ پور ہی سیراب نہ ہوتا تھا۔ بلکہ اور کئی دیہات و مقامات کے تشنہ لب کھیت بھی اس سے اپنی پیاس بجھاتے تھے۔

رن سوامن کا مندر سرینگر میں کس مقام پر واقع تھا۔ اس کے متعلق سٹین صاحب جو سنسکرت راج ترنگنی مصنفہ کلہن کے انگریزی مترجم ہیں۔ لکھتے ہیں "کہا جاتا ہے۔ کچھی کوہل وہی نہر ہے۔ جو دریائے سندھ علاقہ لار سے نوشہرہ اور سنگین دروازے تک آتی ہے۔ اور جامع مسجد کے پاس سے گزر کر قاضی کدل کے قریب نالۂ مار میں جا ملتی ہے۔ اگر یہ بات ثابت ہو سکے۔ کہ کچھہ کوہل کا موجودہ انتہائی مقام آج بھی وہی ہے۔ جو بقول جونراج زین العابدین کے زمانہ میں تھا۔ تو میں اس قدیم شکستہ مندر "رن سوامن" کے کھنڈر دل کو جو نالۂ مار اور کچھہ کوہل کے مقام اتصال پر ایک کونہ میں موجود ہیں رن سوامن کا مندر سمجھنے کے لئے تیار ہوں"۔

بڈشاہی سڑکیں

جس بادشاہ کو ملک کی آبادی اور فارغ البالی کے لئے ہر وقت کوئی نہ کوئی مفید تجویز سوچنے سے سروکار رہتا ہو جس نے تپتے ہوئے میدانوں اور خشک قطعات زمین پر پانی کے دریا بہا دیئے ہوں۔ جس نے ویران، اجاڑ، اور خاموش مقامات کو جہاں ہر وقت سناٹا چھایا رہتا تھا۔ بارونق قصبہ اور شہر بنا دیا ہو جس نے ایسی زمینوں کو جہاں ایک دانہ تک پیدا نہ ہوتا تھا۔ ہزار ہا خروار اناج پیدا کرنے کے قابل کر دیا ہو۔ اس بادشاہ نے لوگوں کی آمد و رفت اور تجارتی فوائد کے لئے کیا سڑکوں کا کچھ انتظام نہ کیا ہوگا۔ قیاس کہتا ہے کہ ضرور کیا ہوگا۔ لیکن جب اس زمانہ کی راج ترنگنیوں

اور مابعد کی تاریخوں سے کوئی شہادت طلب کی جاتی ہے۔ تو کوئی شافی جواب نہیں ملتا
غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی۔ کہ اس زمانہ میں نہ بگھیاں تھیں۔ نہ موٹریں۔
نہ تانگہ اور لاریاں بلکہ صرف گھوڑے کی سواری ہوتی تھی۔ اور یہی جانور باربرداری
کے کام آتا تھا۔ اور تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ پرانے کشمیر میں موجودہ زمانہ
کی طرح فراخ اور چوڑی سڑکیں نہ تھیں اور نہ ان پر ایسے عظیم الشان پل تھے
جیسے آج نظر آرہے ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ بادشاہ نے
باربرداری کے لئے ضرور ایسے رستے بنا رکھے تھے۔ جن پر سے بیل خچر اور گھوڑے
اسباب سے لدے ہوئے بہ آسانی گزر سکتے تھے۔ ایک گاؤں دوسرے گاؤں
سے اور ایک قصبہ دوسرے قصبہ سے انہی رستوں یا پگڈنڈیوں کے ذریعے
ملتا تھا۔

زونراج نے ایک جگہ سری نگر کی دلدلی زمین کا ذکر کیا ہے اس پر بادشاہ
کے حکم سے جو ستھو (بند) بنایا گیا۔ وہ اتنا وسیع تھا کہ اس کو پل کا نام دیا گیا
ہے۔ یہ ستھو کاچ ڈامر نے جو بادشاہ کے عہد میں افسر شہر تھا مٹی کی بجائے
پتھروں سے بنایا۔ لمبائی میں ایک کروش (کوس) تھا۔ اس دلدل اور کیچڑ
نے سڑک کو ناقابل گزر بنا رکھا تھا۔ اور خصوصاً بارش کے دنوں میں اس طرف
آمد و رفت بالکل بند ہو جایا کرتی تھی۔

بڈشاہ کے زمانہ میں کشتیوں کے ذریعہ بھی کافی آمد و رفت ہوتی تھی اور
شائد فراخ اور پختہ سڑکوں کی عدم موجودگی کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ پانی کے
رستے ایک جگہ سے دوسری جگہ مال و اسباب لے جانا آسان تھا۔

اٹھارھواں باب

بڈشاہی زمانہ کے قحط اور سیلاب اور نرخ اجناس

عہد قدیم کا طریق مال گزاری

راجگان ہنود کے عہد میں مالیہ کس شکل اور کس صورت سے وصول کیا جاتا تھا اس کی تفصیلات کسی سابقہ مورخ نے نہیں بتائیں۔ لیکن خیال یہ ہے کہ چونکہ ان ایام میں سکہ کا رواج بہت کم تھا۔ اس لئے مالیہ جنس ہی کی صورت میں وصول ہوتا ہوگا اور سکہ کے رواج کے باوجود بھی چونکہ عہد قدیم میں جنس کا تبادلہ بالعموم جنس ہی سے کیا جاتا تھا۔ اس لئے مالیہ کا رواج بھی جنس ہی کی صورت میں تھا[1]

کشمیر میں جب مسلمانوں کا زمانہ آیا۔ تو بقول فرشتہ سلطان شمس الدین نے ۱۳۴۱ء میں پیداوار کا چھٹا حصہ سرکاری مالیہ مقرر کیا۔ اسی بادشاہ کے عہد میں بقول ابوالفضل مال درآمد پر چھٹا حصہ محصول مقرر ہوا۔ البتہ سلطان سکندر کے زمانے میں اس کے وزیر سیہہ بٹ نے مالیہ اور دیگر محصولات میں بہت کچھ اضافہ کر دیا۔

عہد بڈشاہی میں مالیہ کا طریق

سلطان شمس الدین سے زین العابدین بڈشاہ کے باپ سلطان سکندر بت شکن

---

[1] جنسی مالیہ مسلمانوں اور سکھوں کے عہد تک بھی کشمیر میں جاری رہا۔ البتہ ڈوگرہ حکومت کے زمانے میں بہ عہد مہاراجہ پرتاپ سنگھ لارنس صاحب کمشنر بندوبست نے بندوبست کے وقت جنسی مالیہ کی جگہ نقد مالیہ مقرر کیا۔ جو اب تک جاری ہے۔

کے زمانہ تک کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوتا رہتا تھا۔ بڈشاہ کے بھائی علی شاہ کے زمانہ میں بھی یہی کیفیت تھی۔ لیکن جب بڈشاہ کے ہاتھ میں عنان حکومت آئی۔ تو اس نے جہاں پیمانہ اور اوزان رعایا کے مفید مطلب ایجاد کئے۔ افسروں کو زمینداروں سے رشوت لینے اور ان کو تنگ کرنے کی ممانعت کی۔ وہاں اس نے مالیہ پیداوار کا ⅓ حصہ کر دیا۔ جو اس کے جد امجد سلطان شمس الدین کے زمانہ میں تھا۔ البتہ علاقہ زنگیر کے لئے یہ رعایت تھی کہ وہاں مالیہ پیداوار کا ¼ حصہ لیا جاتا تھا۔

بڈشاہ کے عہد میں چونکہ نہروں کی کثرت تھی اور رعایا امن و مسرت کے ساتھ رہتی تھی۔ اس لئے زمیندار اطمینان کے ساتھ کاشت کا کام کرتے تھے۔ مصنف تاریخ حسن صفحہ ۱۳۳ پر لکھتے ہیں "در عہد سلطان زین العابدین یک کروڑ سیزدہ لک خروار داخل خزینہ میشود" غور کرو جب مالیہ ہی میں ایک کروڑ سترہ لاکھ خروار مختلف اجناس سے آتی تھی۔ تو ملک کی پیداوار کس افراط سے ہوتی ہوگی[1]

شالی کا نرخ قدیم

شالی اس ملک کی خاص پیداوار ہے۔ بلکہ چاول (شالی) کو اگر اہل کشمیر کی قومی خوراک کہا جائے۔ تو بالکل مناسب ہے۔ شالی کی گرانی اور ارزانی ہی باشندگان کشمیر کو فارغ البال او تنگدست بنا سکتی ہے۔ کشمیر کی تاریخوں میں سب سے پہلے شالی کی قیمتوں کا ذکر راجہ اونتی ورمن کے عہد میں آیا ہے۔ جس نے آبپاشی کے طریقوں میں وسیع اصلاح کی تھی۔ اور ملک کی زراعتی ترقی کی وجہ سے شالی کا نرخ ارزاں ہو گیا تھا۔

[1] مورکرافٹ کے زمانہ حیات (سنہ ۱۸۲۵ء) میں جب کشمیر میں سکھوں کی حکومت تھی شالی کی پیداوار ۲۰ لاکھ خروار رہ گئی تھی

سوا تین پیسے کی خروار شالی

راجہ اونتی ورمن کے زمانے میں ایک خروار شالی کی قیمت بالا وسط دوسو دینار یا سوا تین پیسے تھی۔ جو قحط کے دنوں میں زیادہ سے زیادہ ۱۰۵۰ دینار یا چار آنہ تک ہو جاتی تھی۔ جب سوپور کے بانی سویہ نے اراضی کی کاشت کو اور وسعت دی۔ تو نرخ ۳۶ دینار تک کم ہو گیا یعنی ایک خروار شالی کی قیمت دوسو دینار کی بجائے ۱۶۴ دینار رہ گئی۔

قحط میں شالی کا نرخ ۲ خروا

راجہ ہرش کے زمانے میں شالی بہت سستی تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اس کی کچھ قیمت ہی نہ تھی۔ لیکن جب اس کے آخری عہد حکومت میں ایک دفعہ شدت کا قحط پڑا۔ تو ایک خروار شالی کی قیمت پانچ سو دینار یا دو آنہ ہو گئی۔

بڈشاہی زمانہ کا نرخ

شر تور لکھتا ہے سلطان زین العابدین کے زمانہ میں شالی کی قیمت فی خروار ۳۰۰ دینار یا ساڑھے چار پیسے تھی۔ چونکہ کشمیر میں مالیہ جنس ہی کی صورت میں لیا جاتا تھا۔ اس لئے شاہی ذخیرہ میں کافی جنس رہا کرتی۔ اور سرکاری نرخ پر فروخت ہوا کرتی تھی۔ چونکہ یہ قیمت عام مقررہ نرخ سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس لئے لوگ سرکاری ذخیرے سے بامر مجبوری غلہ خریدا کرتے تھے۔

انگور ڈیڑھ پیسے کا پانچ سیر

راجہ ہرش کے زمانہ قحط میں پشم (اون) کی قیمت فی خروار گیارہ ہزار دینار یا دو روپے بارہ آنے تھی۔ انگور ایک دینار کا چار تولہ آتا تھا۔

یا بیس دینار کا ایک سیر بیس دینار کا کوئی سکہ نہیں تھا بلکہ اس کی کوڑیاں گنی جاتی تھیں۔ زین العابدین کے زمانہ میں بھی قریباً یہی نرخ تھا۔ ابوالفضل کی تحریر کے مطابق ایک سو دینار کا ایک دام ہوتا تھا اور دام کی قیمت ۱½ پیسہ تھی۔ اس سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ ۱½ پیسے کا انگور بڈشاہ کے زمانہ میں پانچ سیر آتا تھا۔

نمک کا بڈشاہی نرخ

نمک کی قیمت کشمیر میں دیگر ممالک کی نسبت ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ کشمیر میں نہیں ہوتا۔ اس کی درآمد پنجاب اور لداخ سے کشمیر میں ہوتی ہے۔ شرلور اپنی راج ترنگنی کے ۶ شلوک ۱۸۲ میں سیاسی فسادات کے زمانہ کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ جنوبی راستے بند تھے اور دارالخلافہ سرینگر میں ½ پل یا ۶ تولہ نمک کی قیمت ۲۵ دینار یا ایک پونتسو یا ایک دام کا چوتھا حصہ تھی۔ اس حساب سے ایک سیر کی قیمت اس زمانہ میں پانچ پیسے تھی یا فی من تین روپے دو آنہ اکبر کے زمانہ میں بھی جو بڈشاہ سے ایک سو سال بعد گزرا ہے۔ قریباً یہی قیمت تھی۔

نرخ نویسی کی ابتدا

نرخ نویسی کا رواج بھی بڈشاہی زمانے سے ہوا۔ اس زمانے میں چھاپے کا رواج نہ تھا۔ اس نے ورق لکھائے جس پر تمام اجناس کے نرخ کندہ کرائے اور دارالخلافہ کے علاوہ پرگنوں اور قصبوں میں یہ ورق اطلاع عام کے لئے بھجوائے۔ ان اوراق کے اخیر میں یہ الفاظ بھی درج تھے "ہر کہ بعد از ما باشد دریں دستورالعمل عامل نہ باشد ادراد اند خدا۔[۱] لیکن" زمانہ ہر کہ آمد عمارت

[۱] طبقات اکبری۔

نوساختن" کا مصداق ہے۔ بڈشاہ کی باتیں بڈشاہ کے ساتھ ہی چلی گئیں ؎
گئیں وہ رونقیں سب داغ کیسا ۃ دہی دم تھا غنیمت وہ نہیں ہے

کشمیر کے قحط اور ان کے انسداد

لارنس[1] صاحب اپنی کتاب دیلی آف کشمیر میں لکھتے ہیں کشمیر کے مورخوں نے اپنے ملک کے انیس بڑے بڑے قحطوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کی وجوہ کے متعلق ان کے مختلف بیانات ہیں لیکن سب سے اہم امر جس پر سب مورخین نے اتفاق کیا ہے یہ ہے کہ عموماً بے وقت برفباری کثرت آب اور اس کے بعد آتش زدگی کے واقعات سے ہمیشہ یہ ملک تباہ ہوا ہے۔ چنانچہ ایک کشمیری شاعر کا ایک شعر بھی اس کی تائید و تصدیق کرتا ہے وہ کہتا ہے ؎

زآب و آتش است آباد کشمیر
ازیں ہر دو شود برباد کشمیر (خادم سوپوری مرحوم)

جب کبھی اس قسم کے افسوسناک واقعات پیش آتے تھے۔ حکومت کی طرف سے ان کا ضرور کچھ نہ کچھ انسداد و انتظام ہوتا تھا۔

اگرچہ قحط کا اثر کچھ کم ہولناک نہ تھا لیکن زین العابدین نے پوری کامیابی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ اور کئی مقامات پر محصول یعنی لگان کم کر دیا طبقات اکبری کے مصنف نے بھی اس قحط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ بادشاہ

[1] لارنس صاحب کشمیر کے کمشنر بندوبست تھے۔ سب سے پہلے آپ ہی نے جنسی مالیہ کو نقدی میں تبدیل کیا کشمیر کے لوگ آج تک ان کے دعائیہ گیت گاتے اور ان کی تعریف کرتے سنے گئے ہیں۔ لنڈن جا کر "دیلی آف کشمیر" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ جو چھپ چکی ہے۔ پہلے مسٹر لارنس تھے۔ پھر سر والٹر لارنس ہو گئے۔

نے علاوہ زربخشی کے کئی مقامات پر ان کی پیداوار کے لحاظ سے مالیہ کم کر دیا اور کئی دیہہ اور پرگنے مالیہ کی ادائیگی سے آزاد کر دیئے۔

مصنف تاریخ حسن نے بھی لکھا ہے کہ اس موقعہ پر بادشاہ نے غلے اور خزانے دونوں کے منہ رعایا کے لئے کھول دیئے۔ وہ لکھتا ہے "سلطان خزائن و دفائن فراواں وقف محتاجاں کردہ جاں بخشیِ قحط زدگان فرمود"

بڈشاہ کے زمانے میں ۳۶ لوکک کا قحط

شرلور زینہ راج ترنگنی کی دوسری فصل میں بڈشاہ کے زمانے کے ایک عظیم قحط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ قدرت کے اختیار میں ہے کہ فصل زیادہ کرے تو ملک خوشحال ہو جائے اور کم پیدا کرے یا نہ کرے۔ تو ملک قحط کے مصائب میں گرفتار ہو کر ملک الموت کے منہ کا نوالہ بن جائے۔ انہی بادلوں سے ہر وقت برکھا ہوتی ہے۔ تو گھاس اور چارہ پیدا ہوتا ہے جس سے مال مویشی پلتے ہیں اناج پیدا ہوتا ہے جس سے انسان زندگی پاتے ہیں۔ اور انہی بادلوں سے بے موقع بارش ہوتی یا برف گرتی ہے۔ یا بارش بالکل ہی نہیں ہوتی۔ تو ملک بھر میں قحط کی وبا نازل ہو جاتی ہے۔

۳۶ ۔ لوکک ہیں جبکہ عیسوی ۱۴۶۰ء اور ہجری سال ۸۶۴ھ تھا۔ ملک میں فصل تو اچھی پیدا ہوئی لیکن چیت کے آتے ہی آسمان سے اچانک گرد و غبار[۱]

[۱] زینہ راج ترنگنی کا مترجم جے سی دت لکھتا ہے کہ میں نے اس قسم کی بارش جموں میں ۱۸۸۵ء و ۱۸۸۶ء کے سرا میں دیکھی تھی لیکن راقم مؤلف نے ٹھیک اس قسم کے گرد و غبار کی بارش خاص کشمیر (سرینگر) میں جولائی ۱۹۳۶ء کے ابتدائی ایام میں کتاب ہذا کی تالیف کے دوران میں دیکھی ہے۔ لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف تھے آسمان پر بارش یا آندھی کے کوئی آثار نہ تھے۔ کہ ۵ یا ۶ بجے شام کے قریب گپکار اور دلبقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۷ پر)

کی ایک خوفناک بارش ہوئی۔ پتے اور پھول اس گرم گرد و غبار سے مرجھا کر جھڑ گئے بادشاہ نے اپنے ایک درباری منجم سے اس گرد و غبار کے متعلق دریافت کیا منجم نے عرض کیا۔ یہ گرد و غبار جو زمین و آسمان پر چھا گیا ہے۔ ایک ہولناک قحط کا پیش خیمہ ہے۔ گزشتہ نوکک سدی کے سنہ میں اسی طرح ایک قحط پڑا تھا۔ اور اس صدی کا چھنیسواں سال بھی مجھے ایسا ہی نظر آتا ہے۔

ملک شالی کی فصل سے بھرپور تھا۔ کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد شدید برفباری اور بارش نے ملک کا نقشہ بدل دیا۔ برف کی کثرت سے "زمین ہم سفید و فلک ہم سفید" کی کیفیت نہ صرف پہاڑوں پر سے بلکہ در و دیوار سے نظر آنے لگی۔ شالی کی پختہ فصل برف کے نیچے اس طرح دب گئی جس طرح قصاب بکرے کو ذبح کرنے کے وقت اپنے گھٹنوں کے نیچے دبا لیتا ہے۔

شریور اس قحط کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے۔ کہ چونکہ آئندہ فصل کی کوئی توقع نہ رہی۔ اس لئے غلہ دار غلہ کو دبا کر بیٹھ گئے۔ اور شالی اس قدر نایاب ہو گئی۔ کہ کسی قیمت پر بھی ہاتھ نہ آتی تھی۔ شالی کا جو خروار تین سو دینار یعنی پانچ پیسے سے بھی کم میں آتا تھا۔ اب وہ پندرہ سو دینار پر بھی آسانی سے دستیاب نہ ہو سکتا تھا۔ شریور کا بیان ہے کہ میں نے ایک امیر شخص کو دیکھا۔ جو ایک وقت کی خوراک کے لئے ترس رہا تھا۔ آخر جب اسے بمشکل خوراک دستیاب ہوئی۔ تو اس نے بے صبری سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۱) حشمہ شاہی کے پہاڑوں کو عبور کرتی ہوئی سیاہ گرد و غبار کی آندھی نے تاریکی کا عالم پیدا کر دیا۔ ڈل اور ڈل میں جو لوگ کشتیوں پر تھے ان میں سے کئی ایک ضائع ہو گئے۔ کئی درخت جڑوں سے اکھڑ گئے۔ رات کو تھوڑی سی بارش بھی ہوئی۔ مگر الحمد اللہ کہ فصلوں کو نقصان نہیں پہنچا۔ اور نہ قحط کے آثار ظاہر ہوئے۔

اور اس کثرت سے اس نے کھانا کھایا۔ کہ اسے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ رہا۔

غلہ واروں نے شالی کو چھپا رکھا تھا۔ اس لئے جب کسی کو یہ خبر ملتی تھی کہ فلاں مقام پر غلہ فروخت ہو رہا ہے۔ تو لوگوں کا انبوہ کثیر وہاں جمع ہو جاتا تھا۔ تمام ملک بھکاریوں کی طرح نظر آرہا تھا۔ کئی کئی دنوں کے پکے ہوئے چاول اور کئی کئی دنوں کی بوسیدہ روٹیاں (کلچہ وغیرہ) نعمت غیر مترقبہ تصور کی جاتی تھیں۔

بہت سے لوگ خوراک نہ مل سکنے کی وجہ سے مر گئے۔ کئی آدمی زیادہ کھا کر ہلاک ہو گئے۔ اور وہ زیادہ اس لئے کھا جاتے تھے۔ کہ ان کو دوسرے وقت کا کھانا دستیاب ہونے کی توقع نہ ہوتی تھی۔ لوگ پتوں۔ درختوں کی نرم نرم شاخوں اور گلے سڑے میووں پر گزارہ کرتے تھے۔ ان ایام میں گھی۔ تیل اور نمک کا کوئی نام بھی نہیں لیتا تھا۔ دیہاتی آبادی کا حال شہر باشوں سے بھی بدتر تھا۔ انتہا یہ ہے کہ شالی کو کوٹنے سے جو بھوسہ برادہ کی شکل میں نکلتا ہے جس کو کشمیری زبان میں کم (Kumm) کہتے ہیں۔ لوگ اس میں نمک ملا کر کھایا کرتے تھے۔ اور یہ بھی ہر ایک کو نصیب نہ ہوتا تھا۔

اس قسم کا ہولناک قحط ہو۔ اور بڈشاہ جیسا بادشاہ اس کے انسداد سے غافل اور رعایا کے حالات سے بے خبر رہے۔ یہ کبھی ممکن نہ تھا۔ چنانچہ جونہی بادشاہ کو قحط کی ان تباہ کاریوں کا علم ہوا۔ بادشاہ نے سرکاری شالی کے کوٹھار[1] غریبوں کے لئے وقف کر دیئے۔ اور جہاں کوٹھار نہیں تھے۔ وہاں سرکاری شالی جمع

[1] اس زمانے میں مالیہ کے ذریعہ جو شالی آتی تھی وہ سرکاری کوٹھار (دا) میں جمع رہتی تھی۔ اور وقت بے وقت کام آیا کرتی تھی۔ اس زمانے میں مالیہ کو نقد وصول (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۴ پر)

تاریخ ... ...

کر کے نئے کوٹھار بنوا دیئے۔

سرکاری کوٹھار کو وقف عام کرنے کے علاوہ بادشاہ مسلسل کئی ماہ تک ہزارہا لوگوں کو ہر روز کھانا کھلاتا رہا۔ قحط کے ایام میں جن لوگوں نے قحط کے مصائب سے بچنے کے لئے اپنی قیمتی اشیاء سستے داموں بیچدی تھیں۔ وہ غلہ داروں سے واپس دلائیں۔ یا مناسب قیمت پر فروخت کرنے کا حکم دیا اور آئندہ کے لئے اس قسم کی خرید وفروخت کے لئے سخت ممانعت کر دی۔ اور غلہ داروں کے لئے سخت سے سخت احکام نافذ کئے۔

ملک میں شدت قحط کی وجہ سے لوگوں نے اخروٹ بھی ختم کر ڈالے تھے۔ اس لئے تیل کا دستیاب ہونا بھی ناممکنات میں داخل تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ دیودار درختوں سے تیل نکالا جائے چنانچہ جب تک قحط کا دور دورہ رہا یہی تیل استعمال میں آتا رہا۔ شریور لکھتا ہے۔ اس قہر خداوندی یعنی قحط کی وجہ سے سب سے بڑا یہ نقصان ہوا۔ کہ علوم و فنون کی جو سنہری شاخیں اور صنعت و حرفت کی ترقی اور دیگر قسم کی دستکاریاں سب تباہ ہو گئیں۔

تاریخ فرشتہ میں بھی بڈشاہی عہد کے اس قحط اور انسداد قحط کا ذکر ہے۔ لکھا ہے کشمیر میں ایسا قحط پڑا۔ کہ نان کے عوض جان ایک معمولی بات سمجھی جاتی تھی۔ سونے اور چاندی کو چھوڑ کر لوگ غلہ و آذوقہ کی چوری کو زیادہ مفید سمجھتے تھے۔ میوہ ابھی خام ہی ہوتا تھا کہ لوگ اس کو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۸) ہوتا ہے لیکن سرینگر میں جو سرکاری کوٹھار ہیں اور جن کا نام شالی سٹور ہے وہاں مجوزہ کے ذریعہ شالی جمع رہتی ہے اور سرکاری نرخ پر شہر باشوں کو فروخت کی جاتی ہے بہرحال سرکاری کوٹھاروں میں شالی جمع رکھنے کا رواج کسی نہ کسی صورت میں زمانہ قدیم ہی سے چلا آتا ہے۔

کھا جاتے۔ اور مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ درختوں کے پتے اور کچی سبزیاں تک لوگ کھا گئے۔ بادشاہ اس واقعہ سے ہر لحظہ محزون و غمگین رہتا تھا۔ اور سرکاری کوٹھاروں کے علاوہ اِدھر اُدھر سے غلہ فراہم کر کے رعایا کو تقسیم کیا کرتا تھا جب قحط سے کسی قدر نجات ہوئی۔ تو بادشاہ نے بعض محالات میں ⅙ اور بعض میں ½ حصہ مالیہ مقرر کر دیا۔

۳۸ سنہ لوکک کا سیلاب

ابھی ۳۶ سنہ کے قحط کی ہولناک یاد لوگوں کو فراموش نہ ہوئی تھی کہ ۳۸ سنہ میں گرد و غبار کی پھر بارش ہوئی۔ لوگ پہلے ہی سہمے ہوئے تھے۔ وہ اور بھی خوفزدہ ہو گئے۔ اس گرد و غبار کے فوراً بعد بادل کی گرج، رعد کی کڑک اور آخر میں کئی دن کی موسلا دھار بارش نے ان کے اوسان خطا کر دیئے۔ اس لگاتار بارش سے سیلاب کا اندیشہ روز بروز بڑھ رہا تھا۔

وِتستہ[1]۔ لدری۔ سندھو اور کشتپ ٹکا میں پانی اس زور و شور سے بہتا تھا۔ اور اس کی روانی اس قدر تیز تھی۔ اور ان کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا جوش و خروش اس قسم کا تھا کہ چاروں دریا اور ان کے معاون ندی نالے دار الحکومت یعنی سرینگر کو محاذ جنگ قرار دے کر ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ ان دریاؤں کے کناروں پر جس قدر گاؤں آباد تھے۔ وہ سب غرق بلکہ دریا برد ہو چکے تھے۔

[1] وِتستہ دریائے جہلم کا قدیم سنسکرت نام ہے دریائے لمبودری جواہر ناتھ جی کی طرف سے پہلگام کے پاس سے گزرتا ہے ہے سندھو نالہ سندھ گاندربل والا ہے کشتپ ٹکا نالہ کٹھہ کوہل جو شیرگڑھی سرینگر کے پہلو سے نکلکر چھتہ بل کے پاس پھر جہلم میں شامل ہو جاتا ہے۔

دریائے وشو کا (وشو) نے مدوراجیہ (مراز یعنی جنوبی کشمیر) میں فصلوں، انسانوں، مکانوں اور مویشیوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اور جینپور کو بھی اس نے تباہ کر دیا۔

بادشاہ نے وتستہ کے کنارے ایک محل تیار کرا رکھا تھا۔ یہ محل پتھر اور لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ چار برج اس کے چاروں کونوں پر تھے۔ اس مکان پر شاہی جھنڈا ہمیشہ لہرایا کرتا تھا۔ اس محل کا ایک حصہ جس کا رخ شہر کی طرف تھا۔ سیلاب کے زور سے گر پڑا اور اس کے دو برج بھی مسمار ہو گئے۔ اس کے علاوہ شہر کی اور بہت سی عمارتیں جو نشیب میں تھیں۔ غرق آب ہو گئیں۔

یہ تو علاقہ مراز کا حال تھا۔ کمراز میں جھیل مہاپدم یعنی وُلر نے بہت سے دیہاتوں کو نقصان پہنچایا۔ دُدگ ایک گاؤں تھا۔ وہ تو پانی میں تیرتا ہوا نظر آتا تھا۔ پانی کی کثرت نے رستے ناقابل عبور کر دیئے تھے۔ کھیتوں میں کیچڑ کی تہ نشینی نے فصلوں کو برباد کر دیا۔

بادشاہ سیلاب کے نقصانات دیکھنے کے لئے شہر سے باہر نکلا۔ اور کشتی پر سوار ہو کر مراز اور کمراز میں پھرتا رہا۔ کھیتوں کی تباہی و بربادی نے اس کے دل پر بڑا اثر کیا۔ بادشاہ ایک ایسے مقام پر بھی کشتی لے گیا۔ جو بہت بلندی پر واقع تھا۔ اور جہاں شیر گجرول یعنی دودھ بیچنے والوں کی آبادی تھی۔ یہ بستی مرتفع سطح پر واقعہ ہونے کے باوجود غرق ہو گئی تھی۔

غرض سیلاب چند ہی دنوں میں جس تیزروی سے آیا تھا۔ اسی تیز قدمی سے ملک کو تباہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ اسی سیلاب کے بعد بادشاہ نے دارالحکومت اور بعض مقامات کو سیلاب کے حملے سے محفوظ رکھنے کے لئے جیا پیڈپور داندر کوٹ

کے نزدیک ایک شہر زینہ نگر کی بنیاد رکھی۔ اور تزپیپور
اور دار الکتیز کے مقام پر بے شمار مفلوک الحال لوگوں کے لئے شاہی لنگر کھول دیا۔

زونراج لکھتا ہے۔ بادشاہ نے صرف ایک دن کے اندر دس کروڑ دینار غریب اور محتاج لوگوں کو تقسیم کر دیئے تھے۔ ابوالفضل کی تحریر کے مطابق دس کروڑ دینار کی قیمت پچیس ہزار روپیہ تھی۔ اور ہرچند کہ شدت بارش نے سارے ملک کو عالم آب بنا رکھا تھا۔ مگر خروار شالی کی قیمت چھ آنہ سے زیادہ نہ ہوئی۔

اراضیات کی خرید و فروخت کا باقاعدہ اندراج

سلطان زین العابدین سے پہلے زمین کی خرید و فروخت اور بیع اور رہن کا دستور نہ تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کی خرید و فروخت کے باقاعدہ اندراج کا کوئی سرکاری انتظام نہ تھا یا تھا بھی تو اس پر عملدرآمد نہ ہوتا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے جو اراضیات خریدتے ہونگے یا رہن رکھتے ہونگے۔ ان کے لئے ایک دوسرے سے پرائیویٹ طور پر تحریریں لے لیتے ہوں گے اور باہمی اعتماد سے یہ کام چلتا ہوگا۔

لیکن دنیا میں تین قسم کے سب سے بڑے جھگڑے اور فساد جو مشہور ہیں۔ ان میں سے زمین کے جھگڑوں کو خاص اہمیت ہے۔ مرلہ اور کنال تو بڑی بات ہے۔ ایک ایک انچ اور ایک ایک فٹ کے لئے زمینداروں میں کشت و خون کی نوبت آجاتی ہے۔ اس لئے جب ان جھگڑوں کی نوبت فتنہ و فساد اور لڑائی دنگول تک پہنچنے لگی۔ اور اس کے مقدمات کثرت سے آنے لگے۔ تو بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ زمینوں کی خرید و فروخت کا

باقاعدہ اندراج ہوا کرے۔ اس زمانے میں بھوج پتر کے کاغذوں کا زیادہ رواج تھا۔ اس لئے زیادہ تر انہی کاغذوں پر اندراج ہوتا تھا۔ زونراج نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ بادشاہ نے اراضیات کی خرید و فروخت کے لئے باقاعدہ دفاتر جاری کئے۔ ان دفاتر اور ان کے افسران کے فرائض شائد وہی ہوں۔ جو اس زمانے میں محکمہ رجسٹریشن اور سب رجسٹرار یا رجسٹرار صاحبان کو حاصل ہیں۔ جو اراضیات کی خرید و فروخت کی باقاعدہ تصدیق کرتے ہیں۔ تاکہ بعد میں مشتری اور بائع میں کسی قسم کا قانونی جھگڑا نہ ہو سکے۔

انیسواں باب

کشمیر کے سکّے یا اوزان

کوڑیوں کا رواج

زمانہ قدیم سے ہندوستان کے دیگر حصوں کی طرح کشمیر میں بھی کوڑیوں کا رواج سکوں کے طور پر چلا آیا ہے۔ پنڈت کلہن اپنی راج ترنگنی میں اور کیشمندرا اور جونراج نے اپنی تاریخوں میں کوڑیوں کا ذکر کیا ہے آج تم کسی کی حیثیت پر حرف گیری کرنا چاہتے ہو۔ تو کہتے ہو کہ وہ دو کوڑی کا آدمی نہیں۔ لیکن غور کرو کہ جب انہی کوڑیوں میں بادشاہ وقت زمیندارون سے مالیہ اور رعایا سے مختلف قسم کے ٹیکس وصول کیا کرتے تھے۔ اور

یہی کوڑیاں وزرا، امرا اور فوج کے سپاہیوں اور دیگر اہلکاروں کو تنخواہوں میں ملا کرتی تھیں۔ یہ قدرتی سکہ جو سمندروں اور دریاؤں کے پیٹ سے نکلتا ہے۔ آج انقلاب زمانہ کے ہاتھوں نہ صرف کشمیر سے بلکہ ہندوستان سے بھی قطعاً نابود ہو رہا ہے۔

کشمیر میں سب سے پہلا سکہ

بیان کیا جاتا ہے کہ راجہ تورمان ۱؎ (راجہ ہرنیہ کے بھائی) نے سب سے پہلے کشمیر میں سکہ رائج کرنے کی ضرورت محسوس کی چنانچہ ایک ٹکسال بنایا گیا۔ جہاں سکے مسکوک کئے گئے۔ تورمان سکہ کس قیمت پر چلتا تھا۔ اس کے متعلق کوئی صحیح واقفیت نہیں مل سکی۔ البتہ اتنا معلوم ہوتا ہے کہ تورمان کے بعد بھی تورمان سکہ عرصہ دراز تک مختلف راجوں کے زمانے میں کشمیر میں رائج رہا۔ بلکہ سلطان زین العابدین بڈشاہ کے زمانہ اور اس کے بعد اس کے پوتے سلطان حسن شاہ کے زمانہ (سنہ ۱۴۷۲ء لغایت سنہ ۱۴۸۴ء) تک بھی اس سکے کے کچھ نہ کچھ نشانات ملتے رہے ۲؎

ہندو عہد قدیم کے سکے

اگر تورمان سکہ تانبے کا تھا۔ تو اس کو تانبہ کی کان کہاں سے ملی۔ اس

۳؎ آج سے دو سو سال پیشتر (سنہ ۱۱۲۰ھ) کے مورخ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری کاشمیری نے اپنی تاریخ اعظمی میں کوڑیوں کے سکے کے رواج کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ تو بہت دور کی بات ہے اب سے چند سال پیشتر راقم الحروف نے پنجاب اور کشمیر میں کوڑیوں کے سکہ کا رواج دیکھا ہے ایک پیسے کے سولہ گنڈے ہوتے تھے۔ اور ہر گنڈے میں چار کوڑیاں ہوتی تھیں ۱؎ راج ترنگنی حصہ اول صفحہ ۱۶۱ ۲؎ ضمیمہ نوٹ جلد دوم صفحہ ۱۳۰ راج ترنگنی۔

پر بھی پنڈت کلہن نے کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ البتہ راجہ جیا پیڈ[1] کے حالات میں لکھتا ہے۔ کہ جھیل مہاپدم (ولر) کے ناگ پر اس کو تانبہ کی جو کان ملی تھی۔ وہ کرم راجیہ کے پہاڑ میں تھی۔ اس سے جیا پیڈ کو اس قدر تانبہ ملا۔ جو ایک کروڑ دینار[2] مسکوک کرنے کے لئے کافی تھا۔

اس تانبہ کے سکے کی موجودگی میں کوڑیوں کا سکہ بھی جاری تھا کیشیمندر کی کتاب لوک پرکاش کی تصنیف نانویں صدی عیسوی کے وسطی زمانہ کی ہے۔ اس کتاب کے دوسرے پرکاش میں تجارتی ٹھیکوں۔ دستاویزوں اور سرکاری احکام وغیرہ کے متعدد کاغذات سنسکرت کے ان حروف میں ملتے ہیں جو قدیم راجگان ہنود کے آخری دنوں میں اہلکاروں کی خط وکتابت میں پائے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری وغیر سرکاری حساب کتاب اور لین دین میں کوڑیاں بھی مستعمل رہیں اور تانبہ کا سکہ بھی۔

سکوں کا وزن

البتہ سوائے تورمان سکہ کے جس کا وزن ایک سو دس گرین تھا باقی تمام راجگان کشمیر کے سکوں کا وزن قریباً ۱۶ گرین تھا۔ ایک مرتبہ جب کشمیر کی بے بسی حالت نہایت اضطراب افزا تھی۔ تو کلہن کی راج ترنگنی اور بعد کی تاریخوں سے پایا جاتا ہے۔ کہ راجہ ہرش[3] نے چاروں طرف سے مایوس ہو کر دیوتاؤں کی مورتیوں کو جو سب تانبہ کی تھیں اور جن کی کشمیر

---

[1] عہد حکومت سنہ ۷۶۴ء لغایت ۷۹۵ء [2] بقول ابو الفضل ایک ہزار دینار ایک اساس یا ½ روپے یا دس دلم کے برابر ہے۔ ایک کروڑ دینار کی قیمت ۲½ ہزار روپے دس کروڑ کی پچیس ہزار اور سو کروڑ دینار کی قیمت ۲½ لاکھ روپے کے برابر ہوتی ہے [3] عہد حکومت سنہ ۱۰۸۹ء لغایت سنہ ۱۱۰۱ء

میں بہتات تھی۔ تو ڈر واکر گلا ڈالا تھا اس زمانہ میں سکہ کا وزن مالی مجبوریوں کی وجہ سے ضرور نسبتہً کم رکھا گیا ہوگا۔

یہ تمام سکہ جات صرف دار الحکومت سری نگر میں ڈھالے جاتے تھے۔ اس کے سوا کسی اور مقام پر ٹکسال نہ تھی۔ ہندوؤں کے عہد میں بھی اور مسلمانوں کے زمانے میں بھی کشمیر میں سب سے چھوٹا سکہ ۲۵ دینار کا تھا۔ اور تانبہ کا تھا۔ اس سے کم وزن کا کوئی سکہ کشمیر میں (سوائے کوڑیوں کے) استعمال نہیں ہوا۔

سکوں کا تعلق لباس سے

پانچویں چھٹی صدی عیسوی کے کچھ قدیم کشمیری سکے دستیاب ہوئے ہیں جن سے اس زمانے کے قدیم لباس پر روشنی پڑتی ہے۔ سکوں کے ایک طرف راجہ کی تصویر ہے جس میں راجہ کھڑا ہے۔ اور اس نے چھوٹا سا پاجامہ پہنا ہوا ہے۔ جو تبدریج ایک بہت بڑے ڈھیلے کی صورت اختیار کر لیتا ہے سکے کے دوسری طرف ایک بیٹھی ہوئی دیوی کی مورت ہے۔ اور دونوں طرف سنسکرت یا سنسکرت نما زبان میں کچھ حروف بھی درج ہیں۔

کشمیر کے اسلامی سکوں کی عبارتیں

کننگھم کی تاریخ کے حوالہ سے مصنف "اسلامک کلچر ان کشمیر" لکھتے ہیں۔ کشمیر کے مروجہ سکوں کی قیمت مسلمانوں کے ابتدائی دور حکومت تک قریباً یکساں اور غیر مبدل رہی ہے۔ البتہ جوں جوں مسلمان بادشاہوں کے پاؤں مضبوط ہوتے گئے۔ اور ان کا دائرہ حکومت وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا

لہ شریور کی راج ترنگنی کے ترنگ ۳ شلوک ۲۱۲ میں ۲۵ دشتشکا یا ۲۵ کے سکہ کا ذکر ان لفظوں میں آیا ہے۔ وہ ایک تانبہ کا سکہ تھا جب (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۷ پر)

ان سکوں میں بھی بتدریج ترقی اور اصلاح ہوتی گئی۔چنانچہ اسلامی عہد حکومت میں ان سکوں کی کیفیت اس طرح تھی۔ (۱) بعض سکوں پر سنہ دو طرفیول یعنی حروف واعداد میں لکھا جاتا تھا۔بعض پر صرف حروف ہی تھے (۲) بعض سکوں پر سنہ عربی حروف میں تھے۔بعض پر فارسی میں (۳) سکہ جات ہر اسلامی عہد کے قریباً یکساں ہیں۔ان میں بہت کم فرق ہے ان کی شکل بالکل مربع ہے۔اور ان کی پشت پر "ضرب کشمیر" درج ہے۔ بعض سکہ جات پر نائب خلیفۃ الرحمٰن بعض پر نائب امیر المومنین بطور شاہی خطاب استعمال کیا گیا ہے بعض سکوں پر منیر الدین اور نصیر الدین کے اعزازی خطابات بھی مشاہدہ میں آئے۔بعض سکوں پر دار الضرب یعنی سرینگر کو خطہ اور بعض پر شہر لکھا ہوا دیکھا گیا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشمیر کا سب سے پہلا بادشاہ زین العابدین ہے۔ جس نے تانبہ کے علاوہ طلائی و نقرئی سکوں کا وزن ۹۱ سے ۹۶ گرین اور پیتل کے سکوں کا وزن اوسطاً ۴۰ گرین مقرر کیا کشمیر کے سرکاری عجائب خانے میں مغل شہنشاہوں سلاطین کشمیر اور افغان فرمانرواؤں کے عہد کے کشمیری سکہ جات کا ایک ذخیرہ ہے۔اکبر کے عہد میں طلائی و نقرئی سکوں نے خوشنما صورت اختیار کر لی تھی۔اور یہ سب سکے کشمیر (سرینگر) ہی میں تیار کئے جاتے تھے۔عہد جہانگیر کے سکہ جات مغلیہ عہد کے جملہ سکوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔اور ان میں بعض تو مصوری اور صنعت گری کے اعلےٰ نمونے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۱) حسن شاہ ۱۴۷۲ء تا ۱۴۸۴ء نے مالی مشکلات کے باعث کھوٹا سکہ رائج کیا۔ (از ضمیمہ لوٹ لمنے راج ترنگنی صفحہ ۱۱۰)۔

بڈشاہی سکوں کی قیمت عہد اکبری میں

ذیل میں ایک جدول درج کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہوگا کہ جو سکے زین العابدین سے پہلے، زین العابدین کے عہد میں اور اس کے بعد کے زمانہ میں جاری رہے۔ ان کی قیمت ابوالفضل کی تحریر کے مطابق اکبر کے عہد میں کیا تھی۔ یہ سکے راجگان قدیم کے سکوں کے نمونہ پر ہی تھے صرف فرق یہ تھا۔ کہ ہندو راجگان کے سکوں پر راجگان کی تصویریں یا دیوی دیوتاؤں کی تصاویر ہوتی تھیں۔ اور حروف سنسکرت یا سنسکرت نما ہوتے تھے۔ مسلمان بادشاہوں کے سکے عربی اور فارسی حروف میں ہوتے تھے۔ اور تصویروں کی بجائے "ضرب کشمیر" یا بادشاہ کا نام اور سن درج ہوتا تھا۔ جدول حسب ذیل ہے۔

جدول

نام کشمیری سکہ	دیناروں کی تعداد مالی قیمت کے اعتبار سے	عہد اکبری میں ان کی قیمت
دوادوش (بارہ گنی)	۱۲	۱/۸ دام یا ۱/۳۲۰ روپیہ
پنچ وتشتنک (پونشتو)	۲۵	۱/۴ دام یا ۱/۱۶۰ روپیہ
ہتھ	۱۰۰	ایک دام یا ۱/۴۰ روپیہ
سہسر (ساس)	۱۰۰۰	دس دام یا ۱/۴ روپیہ
لکش (لاکھ)	۱۰۰۰۰۰	۲۵ روپیہ
کوٹی (کروڑ)	۱۰۰۰۰۰۰۰	۲۵۰۰ روپیہ

ان کے علاوہ کوڑیوں کا سکہ حسب ذیل تھا

۸ کوڑی کی ایک باہ گنی یا ایک دوادوش — ۶ کوڑی یا دو باہ گنی یا دو دوادوش کا ایک پونتشو یا ۲۵ دینار۔ یا ایک پنج وتشنک۔
ابوالفضل نے بعض اور رقمیوں کا بھی ذکر کیا ہے مگر ان میں کشمیری سکوں کا نام نہیں لکھا۔ دیناروں کی تعداد کے ساتھ عہد اکبری کی قیمت لکھ دی ہے۔ مثلاً۔

عہد اکبری میں اس کی قیمت	دیناروں کی تعداد
۵ دام یا $\frac{1}{8}$ روپیہ	۵۰۰
۲۰ دام یا $\frac{1}{2}$ روپیہ	۲۰۰۰
۲۵ دام یا $\frac{25}{40}$ روپیہ	۲۵۰۰
دام یا $3\frac{1}{8}$ روپیہ	۱۲۵۰۰

سلطان زین العابدین کا جدید سکہ

سلطان سکندر اور علی شاہ کے زمانے میں جو چاندی اور سونا مندروں اور مورتیوں کو غارت کرکے جمع کیا جاتا تھا۔ اسے ٹکسالوں میں مضروب کیا جاتا تھا[1]۔ چونکہ یہ سکہ کم درجہ کا ہوتا تھا۔ اس لئے رائج الوقت سکوں کی کساد بازاری ہوگئی تھی۔

مورتیوں اور مندروں کا سونا ہلکی قسم کا تھا۔ یہ ایسا ہی سونا تھا۔ جیسا اس زمانہ میں شادی بیاہ میں صرف ہوتا تھا۔ لڑکے والا لڑکی کو ۵ تولہ سونا یا اتنے وزن کے طلائی زیورات دیتا تھا۔ اور لڑکی والا اپنی لڑکی کو صرف ایک تولہ سونا دیا کرتا تھا۔ یہ رواج بڈشاہ سے پہلے بھی چلا آتا تھا۔ اس قسم

[1] مورتیوں کو توڑ کر سکے مضروب کرنے کا رواج بعض ہندو راجاؤں کے عہد میں بھی ملتا ہے

کے سونے کو "کوری سن" کہتے تھے۔ اور اب بھی کہیں کہیں اس کا نام سنا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ سونا ہلکی قسم کا ہے۔ جو لڑکی کے جہیز میں دیا جاتا ہے

سلطان ان نقائص کو دور کرنے کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا۔ اسے ملک کی ترقی اور معدنیات کی تلاش کا بے حد شوق تھا۔ آخر اس نے اپنی ننگ وود اور کوہ نوردی سے مس کی ایک کان کی تلاش کی۔ پرانے سکے موقوف کر کے خالص دھات کا نیا سکہ جاری کیا۔ اور پرانی ضرب کو موقوف کر دیا۔

بڈشاہی عہد میں سونا اور دیگر معدنیات

راجہ جیا پیڈ کو تانبہ کی جو کان علاقہ کامراج کے پہاڑ سے ملی تھی اس کا ذکر بڈشاہی عہد کے مؤرخ جونراج نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ راجہ جیا پیڈ کو تو فقط "تانبہ کی کان ملی تھی لیکن اس بادشاہ کے عہد میں زمینیں خود بخود سونا اگلنے لگیں۔ مثلاً جواہرات اور عقیق وغیرہ جو دیگر مقامات پر بمشکل ملتے ہیں۔ اس بادشاہ کو دستیاب ہوا کرتے تھے۔ ان جواہرات کا نام بھی اسی کے نام پر جینا ماتی (زین ماتی) مشہور ہے۔

اسی بادشاہ کے عہد میں دریاؤں کی ریت سے سونا نکلنا شروع ہوا۔ اور چونکہ اکثر لوگوں نے یہی کاروبار شروع کر دیا۔ اس لئے بادشاہ نے تانبہ کی ایک سلیٹ پر اپنا یہ حکم کندہ کرایا۔ کہ جو سونا اس طریق سے دریا سے نکالا جائے گا۔ اس کا چھٹا حصہ سرکاری خزانے میں داخل ہوا کرے گا۔

لہ وجیز التواریخ غیر مطبوعہ مصنفہ ملا عبد الغنی کاشمیری سال تصنیف ۱۲۷۲ھ

کامراج کی پہاڑی سے جو باباشکوالدین کی زیارت سے لیکر نالۂ پہرو اور دریائے کیمل کے کنارے کنارے لولاب تک چلی گئی ہے۔ بادشاہ کو لوہے اور تانبہ کی کانیں بھی ملیں۔ ان کے علاوہ لداخ کے دریاؤں سے بھی اس کے عہد میں سونا نکلتا رہا ہے۔

طبقات اکبری سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کی جس قدر کانیں اس کو دستیاب ہوتی تھیں۔ وہ خزانہ شاہی کے لئے وقف کردی جاتی تھیں۔ لیکن ان کے علاوہ بادشاہ اپنی پرائیویٹ جاگیر بھی رکھتا تھا جس کی آمدنی اس کی ذات خاص کے لئے وقف ہوتی تھی چنانچہ مس خالص کی ایک کان اس کی ذاتی ملکیت میں تھی۔ لیکن جب ملک میں ایک دفعہ زر کی کساد بزاری ہوگئی۔ تو اس نے اپنی ذاتی کان کو بھی شاہی سکّہ کے لئے دارالضرب کے حوالہ کردیا۔ اور اس کے طویل عہد میں دیر تک اس پر عمل ہوتا رہا۔

علاقہ زنگیر میں ہردو شیوہ اور پتھر کے دیہات لوہے کی کان کے لئے بہت مشہور ہیں کسی زمانہ میں ان دیہات کی پتھریلی زمینوں سے لوہا نکلتا رہا ہے۔ بلکہ پتھر کے متعلق تو مشہور ہے۔ کہ بڈشاہ کے زمانہ میں وہاں سے سونا بھی دستیاب ہوا کرتا تھا۔ لیکن لوہے کے آثار تو اب بھی ان مقامات میں نظر آتے رہتے ہیں۔ اور بسا اوقات راقم مؤلف نے خود بھی دیکھے ہیں[1]

بڈشاہی دارالضرب

صراف کدل کے پاس جو بڈشاہ ہی کا تعمیر کردہ ہے ایک محلہ ہے۔ اس کو ٹنکی سرائے بھی کہتے ہیں۔ اور مہاراج گنج اسی محلے کے قرب وجوار

[1] ہردو شیوہ کے لوہے کے متعلق مفصل کیفیت کے لئے دیکھو تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم مصنفہ راقم

میں ہے۔اس ٹنکی سرائے میں بڈشاہ کی دارالضرب[1] تھی بلکہ دارالضرب ہی کی وجہ سے اس مقام کو ٹنکی سرائے کہتے ہیں۔یعنی ایسی سرائے جہاں ٹکے بنتے ہیں۔چونکہ صراف لوگ یہاں زر و نقرہ فروخت کرنے کے لئے بیٹھا کرتے تھے۔اسی وجہ سے اس پل کا نام بھی صراف کدل ہو گیا۔

بڈشاہی سکہ کی شکل وصورت

خالص چاندی کا بڈشاہی سکہ مربع شکل کا ہے۔اس کے ایک طرف بخط عربی "السلطان بن سلطان زین العابدین" درج ہے اور پشت پر "ضرب خطۂ کشمیر" کی عبارت مکتوب[1] ہے۔ایک تانبہ کا چھوٹا سا سکہ بھی نظر سے گزرا ہے جس کے ایک طرف "سلطان زین العابدین" اور دوسری طرف "امیر المومنین ۸۵۱ھ" درج ہے۔اس کے علاوہ سری نگر کشمیر کی ہینڈ بک آف آرکیولوجیکل میں بڈشاہ کے ایک چاندی اور ایک سونے کے سکے کی کچھ کیفیت درج ہے۔چنانچہ چاندی کے سکہ پر ایک طرف "السلطان الاعظم زین العابدین" اور دوسری طرف "ضرب کشمیر فی شہور سنہ اثنی واربعین ثمانمایہ" کے الفاظ درج ہیں۔یہ سکہ سنہ اثنی واربعین کے مطابق ۸۴۲ھ میں جاری کیا گیا تھا۔دوسرا سکہ تانبہ کا ہے۔اس کے ایک طرف "السلطان الاعظم زین العابدین" اور دوسری طرف "ضرب کشمیر فی شہور سنہ احد" درج ہے۔سنہ احد سے صرف اتنا معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ سکہ سنہ ایک یا ۱۱ یا ۲۱ یا ۳۱ یا ۴۱ وغیرہ میں رائج ہوا۔لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ ہجری یا کشمیری یا لوکک سنہ تھا یا کون سا تھا؟

---

[1] احسن التواریخ غیر مطبوعہ مصنفہ مولوی عزیز الدین قاضی کشمیر مرحوم
[1] " " " " " " " "

بڈشاہی اوزان اور پیمانے

سلطان نے دیکھا کہ اس کی مملکت میں گز، جریب اور پیمانے اور اوزان پوری مقدار کے نہیں ہوتے۔ گزوں اور پیمانوں کی کمی سے زمیندار خسارہ میں رہتے ہیں۔ اس نے زمینداروں کی پاس خاطر سے جن کی ہمدردی سے اس کا دل ہمیشہ لبریز رہتا تھا۔ اور جن کو وہ اصلی معنوں میں ملک کی ریڑھ کی ہڈی تصور کرتا تھا۔ جریب کو مروجہ جریب سے زیادہ بڑھا دیا۔ گز اور پیمانے اور اوزان پوری مقدار کے رائج کئے۔ آئین اکبری میں بڈشاہی عہد اور ما بعد کے پیمانوں اور اوزان کی مندرجہ ذیل کیفیت درج ہے

ایک تولہ ۱۶ ماشہ یا ۹۶ رتی (ایک ماشہ چھ رتی کے مساوی) اوزان حسب ذیل تھے:-

$7\frac{1}{2}$ پال = ایک سیر۔ ۲ سیر = $\frac{1}{2}$ من ۴ سیر = برابر ایک ترکھ اور ۱۶ ترکھ برابر ایک خروار۔

خروار اس کا نام اس لئے رکھا گیا ہے۔ کہ یہ وزن گدھے کے بوجھ کے برابر ہے۔ اور گھوڑے کا بوجھ ۲۲ ترکھ قرار دیا گیا ہے۔ تقریباً یہی اوزان اور پیمانے اکبر کے زمانے میں بھی رائج تھے۔ موجودہ زمانے میں ایک ترکھ پانچ سیر ۳ چھٹانک کے برابر اور ایک خروار دو من ۵ سیر ۳ چھٹانک کے مساوی ہے۔ اور من چالیس سیر کا ہے۔

بیسواں باب

بادشاہ اور ہندو

کشمیر کے قدیم مذاہب

کشمیر میں ہندوستان کی طرح زمانہ قدیم میں ہندو مذہب ہی تھا۔ اور اس کے چار فرقے تھے۔ برہمن۔ کھتری۔ ویش۔ شودر۔ لیکن مذہباً ان کے عقائد میں بہت اختلافات تھے کوئی ناگ پرست تھا۔ کوئی آفتاب پرست۔ کوئی آتش پرست۔ کوئی دیوتا پرست۔ بہت تھوڑے لوگ تھے۔ جو خداشناس اور خدا پرست تھے۔ جب کشمیر کے راجہ اشوک نے ۲۰۰ بکرمی بالکم بیش میں بدھ مذہب اختیار کر لیا۔ تو قدیم مذہب والوں نے اس کی بہت مخالفت کی۔ مگر راجہ کے مقابلہ میں کسی کی کوئی پیش نہ چلی۔ اشوک کے بعد کئی راجے اس مذہب کے پابند رہے۔ اور انہوں نے بہ جبر و اکراہ یا بہ صلح و صفائی بدھ مذہب کو تمام کشمیر میں رائج کر دیا۔

آخر ایک وقت آیا کہ ہندوستان کی طرح کشمیر میں بھی مذہب بدھ کو زوال شروع ہوا۔ راجہ جنید راج شیو مذہب کا پیرو تھا۔ بدھ مذہب کا سب سے بڑا مخالف تھا۔ اس نے بدھ مذہب کا استیصال کر کے اپنے مذہب کو بڑا فروغ دیا۔ جب شنکراچارج کشمیر میں آیا۔ تو اس نے شیو مذہب کو اور بھی زیادہ ترقی دی۔

ذوالجو کا المناک واقعہ

کشمیر مذہبی اختلافات بلکہ فسادات اور ملک کے اندرونی فتنوں میں مصروف تھا۔ کہ دفعتاً ایک وبائے عظیم نے اس میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔

یعنی ذالقدر خاں عرف ذوالجو بہتر ہزار سوار جرار لیکر بے خبر کشمیریوں پر جو خانہ جنگیوں کے انجام سے غافل ہوکر باہمی کشت وخون میں معروف تھے۔ حملہ آور ہوا۔ جو ملک اور جو قوم نفاق وفساد کا شکار ہو رہی ہو۔ باوجود کثرت جمعیت کے اس کی کیا طاقت ہے کہ کسی بیرونی دشمن کا خواہ وہ قلیل سے قلیل فوج بھی کیوں نہ رکھتا ہو مقابلہ کرسکے۔

اس موقعہ پر ابراہیم لودی اور بابر بادشاہ کی لڑائی پر غور کرو۔ ابراہیم کے پاس کئی سو مست اور جنگی ہاتھیوں کے علاوہ ایک لاکھ فوج تھی۔ لیکن امرا، چونکہ آپس میں پھٹے ہوئے تھے۔ اور بادشاہ کے اقربا وخویش اس سے ناراض تھے۔ اس لئے بابر نے صدہا میل دور ایک غیر ملک سے آکر بارہ ہزار فوج کے ساتھ سارے ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ غرض ذوالقدر خاں نے جس کو کشمیری ذوالجو[1] کہتے ہیں ملک

[1] ذوالجو کی اصلیت کے متعلق صاف طور پر کسی تاریخ سے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ کہ وہ کون تھا۔ اور کس خاندان سے تھا۔ وہ بادشاہ تھا یا کسی بادشاہ کی طرف سے کشمیر پر حملہ آور ہوا تھا۔ کشمیر کی تاریخیں اس کو تاتاری النسل بتاتی ہیں۔ اور اس لحاظ سے وہ کشمیر کے لئے اپنے اجداد کی طرح چنگیز خاں ثانی ثابت ہوا ہے لیکن بیرونی مورخ اس کے حسب نسب کے متعلق خاموش ہیں۔ صاحب تحقیقات اکبری صرف اس قدر لکھتے ہیں کہ ذوالجو میر بخشی قندہار بود" اس سے صرف اتنا ہی معلوم ہوسکتا ہے۔ کہ وہ قندہار کا حاکم تھا۔ یا فوج کا افسر اعلےٰ تھا۔ اس سے آگے صاحب طبقات لکھتے ہیں۔ "جمعیت عظیم کے ساتھ کشمیر آیا۔ اور اس ولایت کو زیروزبر کرگیا۔ چنانچہ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ "بہ جمعیت تمام بر سر کشمیر آمدہ تمام آں ولایت را زیروزبر ساخت" صاحب طبقات یہ بھی لکھتے ہیں کہ راجہ سہدیو نے اپنی رعایا پر تشدد کرکے بہت سا روپیہ اکٹھا کیا۔ اور اس ظالم کی خدمت میں بطور پیشکش بھیجا تاکہ یہ بلا دور ہی سے ٹل جائے۔ مگر خوب روپیہ لیکر بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تو راجہ خود ہی کشمیر سے باہر چلا گیا۔ چنانچہ صاحب طبقات کے اصل الفاظ اس طرح ہیں "وراجہ سہدیو زر بسیار بر رعایا توجیہہ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۱ پر)

۳ رکو ط ۲۱، ۱

میں قتل عام مچا دیا۔ انسان کیا مال مویشی ناپید ہو گئے ملک جو جنت نظیر کہلاتا تھا۔ دوزخ سے بدتر ہو گیا۔ ذوالچو چھ ماہ تک کشمیر میں رہا اور اس وقت کشمیر سے باہر نکلا جب سارے ملک کو بے چراغ کر گیا۔ کہتے ہیں کہ وہ گھوڑی (مظفر آباد) کے رستے واپس گیا اور مضافات و لواحات سے ہزار ہا کشمیری اور پہاڑی قید کر کے ہمراہ لے گیا۔ پھاگن اور پوہ کا مہینہ تھا جب بالائے کوہ پہنچا۔ تو اس قدر برف پڑی۔ کہ قیدیوں اور قید کرنے والوں میں سے ایک متنفس بھی نہ بچ سکا۔

حملہ ذوالچو کے نتائج

ذوالچو کے بعد کشمیر میں دیر تک بے اطمینانی کی حالت رہی لوگ ذوالچو کو خواب میں دیکھتے تھے۔ اور چونک اُٹھتے تھے جس طرح ہلاکو خاں نے بغداد کو تباہ کیا تھا۔ اور شیخ سعدی نے زوال خلافت بغداد پر ایک غمناک اور خون رلا دینے والا مرثیہ لکھا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔ ؎

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۰) کردہ بجہت پیشکش ذوالچو فرستادہ۔ خود بگوشہ بدر رفت" اس کے بعد مورخین کشمیر کا بیان ہے کہ راجہ کشتواڑ کی طرف بھاگ گیا اور ذوالچو ملک میں قتل عام کر کے اور ہزار ہا لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اور غلام بنا کر مراجعت کے دوران میں جب بالائے کوہ پہنچا۔ تو شدت برف باری سے نہ خود بچ سکا اور نہ اس کے ہمراہی اور نہ اسیر اور نہ غلام: صاحب طبقات نے اس کی یا اس کے ہمراہیوں کی ہلاکت کا تو کوئی ذکر نہیں کیا۔ البتہ وہ لکھتے ہیں کہ اس نے کشمیر کو تباہ و برباد کیا۔ اور شدت سرما کی وجہ سے وہ واپس چلا گیا چنانچہ ان کے اصل الفاظ ہیں: "ذوالچو بواسطہ کثرت سرما آں جا نتوانست بود و بہ قندھار بازگشت نمود" پنڈت آنند کول بامزئی اپنے جغرافیہ ریاست جموں و کشمیر میں لکھتے ہیں۔ کہ بمبہ قوم ذوالچو کے ہمراہ ہی کشمیر آئی تھی۔ مگر یہ درست نہیں۔ اس کی تفصیلات "تاریخ اقوام کشمیر جلد دوم" کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔

آسمان را حق بود گر خوں بہ بارد بر زمین
بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین

یہی حال ذوالچو نے کشمیر کا کیا لیکن افسوس اس بدنصیب ملک کی اس ذلت وخستہ حالی پر کسی نے خون کے آنسو تو کیا حسرت و افسوس . . . . . .

. . . .

کے دو قطرات اشک بھی نہ بہائے۔

کثرت حوادث اور انتظام حکومت کی خرابیوں اور انقلاب عظیم کی وجہ سے کشمیر کا اب کوئی خاص مذہب نہ تھا۔ یہاں رینچن شاہ نے کشمیر کے تخت و تاج پر قابض ہو کر ۱۳۲۵ء میں مذہب اسلام قبول کر لیا۔

بہت سے ہندو مشائخ کبار کے حسن خلق اور تعلیم اسلام کے تاثرات سے مسلمان ہو گئے۔ کئی ایسے تھے جن کو مصالح ملکی نے تبدیل مذہب پر مجبور کیا۔ ایک کافی تعداد ایسی تھی جو سلطان سکندر بت شکن کے وزیر ملک سیف الدین عرف سیہہ بٹ کے جوش مذہبی کی بدولت دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی بہت سے ایسے بھی تھے۔ جو تشدد سکندری کی تاب نہ لا سکے۔ اور ہجرت اور ترک وطن پر مجبور ہو کر کشمیر سے باہر چلے گئے۔

سلطان بت شکن کے بعد علی شاہ اس کا بڑا بیٹا تخت پر بیٹھا۔ اور چونکہ اس زمانہ میں بھی ملک سیف الدین مدارالمہام اور مختار کل تھا۔ اس لئے ہندوؤں کی بے اطمینانی و بیقراری کی جو صورت سلطان بت شکن کے زمانے میں تھی اس میں اس کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔

بڈشاہ کا سلوک ہندوؤں کے ساتھ

جب تخت کشمیر نے زین العابدین کے پاؤں چومے اور تاج شاہی نے اس

کے سر پر آکر فخر محسوس کیا۔ تو کشمیر کے ہندوؤں کی بے اطمینانی مضطرب الحالی اور شکستہ دلی کے احساس کے باوجود بادشاہ کچھ عرصہ تک سرکشوں اور سلطنت کے مخالفوں کے استیصال میں مصروف رہا۔ اسے ذرا اطمینان حاصل ہوا۔ تو اس نے صحیح تعلیم اسلام پر کاربند ہو کر ملک کے غیر مسلم گروہ کی جس کی تعداد کشمیر میں غالباً اس وقت چند ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ تالیف قلوب کرنا زندگی کا خاص مقصد قرار دیا۔

جسم پر حکومت کرنے کی بجائے وہ دلوں پر حکومت کرنے کو ترجیح دیتا تھا اور اس کے طرز عمل نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنے قول اور عہد اور اپنی زبان پر سختی سے پابند رہتا تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ جو سلوک بڈشاہ نے کیا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ کوئی ہندو راجہ کسی ہندو کے ساتھ نہیں کر سکا۔ انہی مراعات کی وجہ سے بڈشاہ بٹ شاہ کے نام سے بھی مشہور ہو گیا ؎

بڑھ گیا ہر کا اس سے کیا ہر دلعزیزی کا ثبوت
بن گیا بڈشاہ سے بٹ شاہ زین العابدین

بڈشاہ نے اپنے طویل عہد حکومت میں ہندوؤں کو جس طرح نوازا اور مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کی جو حوصلہ افزائی کی۔ اور ان کے مقدس مقامات اور قدیم عمارات کے ساتھ جس انصاف و مساوات کا سلوک کیا اور قابل ہندو علماء ادبا کی جو سرپرستی کی اس سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ بادشاہ اپنے باپ اور بھائی کے خلاف حکمت و تدبر سے بھرا ہوا ایک عجیب دل و دماغ لیکر آیا تھا۔ اس کی نظر میں مسلمان اس لئے قابل وقعت نہ تھا۔ کہ وہ مسلمان ہے۔ اور ہندو اس لئے قابل نفرت نہ تھا۔ کہ وہ ہندو ہے۔ بلکہ وہ ہر شخص سے کسی نہ کسی کمال کا متلاشی تھا۔ چنانچہ مسلمان مشائخ کی طرح

اے ان ہندو جوگیوں سے بھی جن کے پہلو میں حقائق و معارف سے لبریز دل ہوتا تھا۔ برابر عقیدت و ارادت تھی۔

جب ہم دربار بڈشاہی کے ارکان و شعرا پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں ہندوؤں کی ایک کافی تعداد نظر آتی ہے[1]

مختلف تاریخوں کے مطالعہ سے بڈشاہ کی ہندو نوازیوں کی جو کیفیت معلوم ہو سکی ہے۔ اس کو بیسویں صدی کے نفاق پرور و اتحاد شکن دور میں ذرا وضاحت سے قلمبند کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مہاجر کشمیری پنڈتوں کی واپسی

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ سلطان سکندر بت شکن کے نومسلم وزیر ملک سیف الدین بٹ کے تشدد کی وجہ سے ہنود کی ایک کثیر تعداد کشمیر سے باہر چلی گئی تھی۔ یہ لوگ دہلی، لکھنؤ، بنارس، دکن، الہ آباد اور ہندوستان کے دیگر مقامات میں جا کر آباد ہو گئے۔ جب بڈشاہ کا زمانہ آیا۔ اور اس نے سلطنت کے نوجی انتظامات اور دشمنان سلطنت کو محکوم و مغلوب کرنے کے بعد ملک کی آبادی کی طرف توجہ کی۔ تو اس نے مہاجر لوگوں کو واپس بلوانے کے لئے ایک اشتہار عام جاری کیا۔ ان کو بہت سی مراعات کی توقع دلائی۔ ان سے انصاف و عدل کا وعدہ کیا۔ ان کی زمینیں اور جایدادیں بعد ثبوت کامل ان کو واپس دلانے کی خوش خبری سنائی۔

چنانچہ کئی ہزار کشمیری ہندو جنہوں نے کئی سال سے ہندوستان کو اپنا وطن بنا رکھا تھا حب وطن اور جدید بادشاہ کے اعلان مراعات کی وجہ سے پھر کشمیر چلے آئے۔ بادشاہ نے بھی ان کے ساتھ مراحمت خسروانہ سے

[1] ان کی کچھ کیفیت دربار بڈشاہی کے ملکی و مالی و ادبی مصاحبوں کی فہرست میں دیکھیئے۔

کام لیا۔ جو جاگیردار تھے۔ ان کی جاگیریں واپس کیں۔ اور جو اپنی جایدادوں کا ثبوت دے سکے۔ ان کی جایدادیں ان کو واپس دلائیں۔ جن کا ثبوت نہ مل سکا۔ ان کو مکانات وغیرہ کے لئے زمینیں عطا کیں

پنڈتوں کی واپسی کے متعلق ایک ہندو مؤرخ لکھتا ہے "رسومات ظلم از ولایت کشمیر براند وخستہ وطبقہ برہناں راکہ بہ مساعیت سیہہ بٹ نامی کہ در عہد سلطان سکندر جدائی وطن اختیار کردہ بودند باز آوردہ در معابد و مقامات خود را قرار گرفتہ وظائف مستمراں مقرر گذاشت"[1]

معترضین کے نزدیک بڈشاہ کا گناہ

کشمیر کے بعض مسلمان مورخوں نے لکھا ہے کہ بڈشاہ میں سب خوبیاں تھیں لیکن بڑا عیب یہ تھا کہ اس نے اسلام کی اشاعت میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ جو ہندو اس کے باپ کے زمانہ میں ترک وطن کر کے ہندوستان کے دیگر مقامات میں چلے گئے تھے۔ ان کو بھی اس نے واپس بلا لیا۔ اور ان پر شاہانہ مراعات کی نوازشیں کیں۔ یہ اعتراض جن لوگوں کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ افسوس ہے وہ قوانین سلطنت اور فرائض الملوک سے قطعی بے بہرہ معلوم ہوتے ہیں۔ بادشاہ خدا کی مخلوق کا خدا کی طرف سے نگہبان ہوتا ہے رعایا کی جان و مال کی حفاظت، اس کی عزت و آبرو کی نگہداشت اور اس کے حقوق و مذہب کی نگہداری اور آئین عدل و انصاف کی عمل پیرائی اس کا فرض اولین ہوتا ہے۔

جو لوگ ہزاروں کی تعداد میں اس کے وطن سے باہر چلے گئے تھے۔ وہ باہر جا کر مصائب و تکالیف میں زندگی کے دن گزارنے کے علاوہ شاہان کشمیر

[1] پنڈت بیربر کاچرو مصنف مختصر التواریخ کشمیر غیر مطبوعہ

کی بدنامی کا باعث ہوتے تھے ۔ اور جہاں جاتے تھے ۔ بڈشاہ کے باپ سلطان سکندر کے مذہبی ظلم و تشدد کے افسانے بیان کر کے اس کو اور مسلمانوں کو بدنام کرتے تھے ۔

اس زمانہ میں ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت تھی ۔ اگر ہندوؤں کی حکومت ہوتی ۔ تو یہ جلا وطن کشمیری ان کو حملۂ کشمیر کی دعوت دیتے اور وہ ہندو راجے اپنے مذہب کی توہین اور اپنے ہم مذہبوں کی ذلت دیکھکر کشمیر کی اسلامی حکومت کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتے ۔ کیا جبار خاں اور عظیم خاں کے زمانہ میں جب کشمیر میں افغانوں کی حکومت تھی ۔ کشمیری پنڈتوں کے ایک جلیل القدر خاندان پر تباہی نہیں آئی ۔ اور کیا اس خاندان کے افراد نے پنجاب جا کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو حملۂ کشمیر کی دعوت نہیں دی ۔ اور کیا اس کشمیری پنڈت خاندان کی ذلت و رسوائی مہاراجہ کے لئے ایک بہانہ نہ بن گئی ۔ اور کیا اس نے طیش میں آکر ۱۸۱۹ء میں کشمیر کی آخری اسلامی حکومت کا خاتمہ نہیں کر دیا ۔ پھر اس سے اور پیچھے شہنشاہ اکبر کے زمانے تک چلے جاؤ ۔ جب کشمیر میں چک بادشاہوں کا طوطی بول رہا تھا ۔ اور سنیوں اور شیعوں کے فسادات نے ملک کو ایک عظیم مصیبت میں مبتلا کر کے بڑے بڑے جلیل القدر سنی خاندانوں کے قتل و غارت کے واقعات نے ایک جماعت کثیر کو لاہور میں اکبر بادشاہ کے پاس حملۂ کشمیر کے داعی بنا کر بھیجنے پر مجبور کر دیا تھا ۔ کیا اکبر کی فوجوں نے ۹۹۵ھ میں کشمیر پر آخری حملہ کر کے کشمیر کی آزاد حکومت کو بالکل نہیں مٹا دیا تھا ۔ اس قسم کے واقعات پر غور کرو اور پھر بتاؤ ۔ اگر بادشاہ کشمیر مسلمانوں کے علاوہ اپنے ملک کے غیر مسلم فرقہ کی دلداری و دلدہی کرتا ہے ۔ تو کیا برا کرتا ہے ۔ اور کیا یہ عین ملکداری

اس قسم کے عدل کی تعلیم نہیں دیتا۔ بادشاہ نے اگر مہاجر کشمیری پنڈتوں کو جو بیرون کشمیر مسلمان فرمانروایان کشمیر کی بدنامی اور وطن کی رسوائی کا باعث ہو رہے تھے۔ واپس بلوا لیا۔ اور علی قدر مراتب ان کی دلدہی کی تو نہ صرف حب وطن کا حقیقی ثبوت دیا۔ بلکہ اسلام کی رواداری کی ایک روشن مثال قائم کی ہے۔

رضا شاہ پہلوی شہنشاہ ایران۔ امیر امان اللہ خاں اور نادر شاہ شاہان افغانستان نے بھی اپنے اپنے عہد میں اپنے ہم وطن بلکہ جلا وطن لوگوں کو جو ہندوستان میں مقیم تھے۔ اپنے اپنے ملکوں میں واپس آنے کی اجازت دی حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں کے باوجود وہ اپنے مذہب کا سختی سے

ے یاد رکھنا چاہیے کہ سلطان شمس الدین التمش سے لیکر بلکہ اس سے بھی قبل کے زمانہ سے محمد تغلق کے زمانے تک جو بڈشاہ اور اس کے باپ سلطان سکندر کا معصر ہے۔ حکومت اسلامیہ کے بنیادی اصولوں میں جزیہ بھی شامل تھا۔ جو صرف ہندوؤں ہی سے لیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے سلطان محمد تغلق نے ہندوؤں کی دلجوئی کو محسوس کیا۔ اس نے رسم ستی کی سخت مخالفت کی اور اگر کوئی عورت ستی ہونا بھی چاہتی تو اس پر سخت پابندیاں عاید کیں۔ ہندوؤں کو اچھے اچھے عہدوں پر ممتاز کیا۔ اور مسلمان رعایا کی طرح ہندو رعایا کی بہتری وبہبودی کا ہمیشہ خیال رکھا۔ علمائے عصر او رمفتیان وقت کا حکومت پر بڑا اثر تھا۔ جب سلطان محمد تغلق نے ہندوؤں کے ساتھ مراعات روا رکھیں اور مفتیوں اور قاضیوں کے فیصلوں پر نظر ثانی شروع کی اور ان کے کئی فیصلے جن میں جانبداری یا تعصب کی جھلک پائی جاتی تھی مسترد کر دیئے۔ یہ سلطان کے خوف سے مفتیوں نے خود ہی مقدمات میں اپنی رائے بدلنی شروع کر دی تو علماء اور مفتیوں نے سلطان کو برا کہنا شروع کیا یہ وہی چیز تھی جس کو بڈشاہ نے محسوس کیا اور عملاً کر دکھایا اور پھر بہت مدت کے بعد جس کو اکبر اعظم نے سیاست وقتی کے تقاضہ سے بہت بڑی اہمیت دی

پابند تھا۔ وہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے پکا مسلمان تھا۔ لیکن جس طرح ساری دنیا کا خالق رب المسلمین نہیں، بلکہ رب العالمین ہے۔ اسی طرح بڈشاہ بادشاہ ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں ہی کا بادشاہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ اپنی تمام رعایا کا بادشاہ تھا جس میں مسلمان بھی تھے۔ پنڈت بھی تھے۔ اور بدھ مت کے لوگ بھی تھے۔

نو مسلم کشمیری پنڈتوں کی شدھی

سلطان سکندر بت شکن کے عہد میں ایک جماعت ایسی بھی تھی۔ جس نے خوف یا طمع کی وجہ سے مذہب اسلام قبول کر لیا تھا۔ بڈشاہ نے جب مذہبی آزادی کا اعلان کیا اور مشتہر کیا۔ کہ اسلام لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کی تعلیم دیتا۔ اور مذہب کے معاملے میں جبر و تشدد سے منع کرتا ہے۔ تو کئی پنڈت جو سالقہ سلاطین کے عہد میں ملک سیف الدین کے جبر سے بہ اکراہ مسلمان ہو گئے تھے، پھر اپنے سالقہ دین میں آ گئے۔ ان کی برادری نے بھی ان کو شامل کرنے سے انکار نہ کیا۔ اور کسی قاضی اور مفتی کو بھی جرات نہ ہو سکی۔ کہ ان سے ارتداد کا مواخذہ کرتا[1]۔ اور ایک ہندو مورخ لکھتا ہے "علماء و فضلا را مجال آں نہ بود بر برہمنانے کہ در حکمرانی سلطان سکندر از درجہ خود افتادہ بودند۔ زبان تعرض کشائند" صاحب طبقات اکبری بھی بڈشاہ کے حالات میں لکھتے ہیں" در برہمنانے کہ در عہد سلطان سکندر مسلمان شدہ بودند بر تد گشتند و علماء را مجال منع و گرفت بر ایشاں نبود۔ القصہ ہر کس بہ ہر وضع و ہر مذہب کہ مے خواست مے بود۔"

---

[1] مکمل تاریخ کشمیر حصہ دوم مصنفہ راقم الحروف [2] پنڈت بیربر کاچرو

کرنل سر ولزلی ہیگ نے بھی بڈشاہ کے زمانہ میں نومسلم کشمیری پنڈتوں کی شدہی کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ عہد سکندری میں کشمیر کے جو ہندو خطۂ کشمیر سے باہر چلے گئے تھے۔ بادشاہ نے ان کو بھی واپس بلوایا۔ اور بہت سے ہندو جو بحالت مجبوری جان بچانے کے لئے اسلام قبول کر چکے تھے۔ پھر اپنے مذہب میں بادشاہ کے حکم سے واپس آ گئے۔[1]

جزیہ کی موقوفی

جونراج اپنی راج ترنگنی میں اس جزیہ کا ذکر کرتا ہے۔ جو کشمیر کے مسلمان بادشاہ کشمیر کے ہندوؤں سے وصول کیا کرتے تھے۔ کشمیر کے ابتدائی مسلمان سلاطین کے زمانہ میں اس ٹیکس کی مقدار دو پل چاندی سالانہ تھی سیلین صاحب لکھتے ہیں۔ چونکہ یہ وزن آٹھ تولہ کے برابر ہے۔ اس لئے یہ امر تعجب خیز نہیں۔ کہ اس زمانہ کے لوگ اس سختی کو بجا طور پر محسوس کرتے تھے۔ پل چار کرش کا ہوتا ہے۔ اور ایک کرش ۱۶ ماشہ کا ہوتا ہے۔ اس لئے ایک پل ۵ تولک (تولہ) کے برابر سمجھنا چاہیئے۔ اب تک کشمیر میں سیر کے ۱/۴ حصہ کے لئے پل ہی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس ترنگنی میں جونراج نے لکھا ہے۔ کہ بڈشاہ نے گھٹا کر اسے ایک ماشہ سالانہ کر دیا تھا۔ اور اس رعایت اور نوازش کے لئے جونراج نے بادشاہ کی بہت تعریف کی ہے۔ بہر حال جزیہ کم تھا یا زیادہ اور اسلامی نکتہ نگاہ سے جائز تھا۔ یا ہندوؤں کے خیال میں ناجائز! اس کی سختی ہندو عام طور پر محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ بادشاہ نے ہندوؤں کے خیالات اور ان کی عرضداشتوں سے متاثر ہو کر جزیہ کو اتنا کم کر دیا۔ کہ وہ بہت تھوڑا بلکہ برائے نام رہ گیا۔[2] اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد جو تھوڑا بہت بھی تھا سو وہ بھی موقوف کر دیا۔[3]

[1] تاریخ ہند جلد سوم صفحہ ۲۸۱ زبان انگریزی مصنفہ سر ولزلی ہیگ [2] ۲۰۲ [3] فتحیات کبرویہ غیر مطبوعہ

ایک محب وطن کشمیری پنڈت

جزیہ کی موقوفی کے متعلق ذیل کا واقعہ دلچسپی سے مطالعہ کیا جائے گا۔ جس کا ذکر جونراج نے زینہ ترنگنی میں کیا ہے۔ ایک دفعہ بادشاہ کی کہنی پر ایک سخت زہریلا پھوڑا نکلا۔ شریور لکھتا ہے "بھٹیوں کے ظلم سے شرفاء اور اہل شہر لوگ ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ اور جو موجود تھے۔ وہ سابقہ ظلم کے خوف سے چھپ چھپا کے زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ آخر بڑی تلاش کے بعد ایک حکیم کا پتہ چلا۔ جو عمل جراحی میں صاحب کمال تھا۔ اس کا نام شیوبٹ تھا۔ جب اس کو بادشاہی آدمی بلانے کے لئے گئے۔ تو وہ خوف دہراس کی وجہ سے آنے میں پس وپیش کرتا رہا۔ اور جب آیا تو بادشاہ نے - - - -
- - - - اس کے زخمی دل پر تشفی کا مرہم رکھا۔ شیوبٹ کے علاج سے اس پھوڑے میں سے کافی زہریلا مادہ نکلا۔ آخر جب بادشاہ کو صحت کامل ہوگئی۔ اور شیوبٹ کی شہرت بھی دور دور پھیل گئی۔ اور بادشاہ کے غسل صحت کے بعد عوام نے بھی مختلف ذرائع سے اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ تو بادشاہ نے حکیم موصوف کو نقد انعام دینا چاہا۔ لیکن اس نے زر نقد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اپنے جذبات پر قابو یافتہ کوئی شخص کسی خوبصورت اور من موہنی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ البتہ یہ کہا کہ میری ذات کے لئے خداوند نعمت کی شاہانہ توجہ سے بہت کچھ ہے۔ اگر سرکار مجھے عنایت خسروانہ سے ممنون ہی فرمانا چاہتے ہیں تو میری قوم کو زر جزیہ سے بالکل ہی معاف فرما دیا جائے۔ تاکہ ایک شیوبٹ کی جگہ اس کی ساری قوم حضور کے ازدیاد اقبال و دولت کی دعا کرتی رہے شیوبٹ کے یہ الفاظ ایثار وقربانی کی زندہ نظیر تھے۔ بادشاہ کے

دل پر اثر کر گئے۔ اور کیوں نہ کرتے ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

چنانچہ بادشاہ نے شیوبٹ کی یہ درخواست منظور کی۔ اور کشمیر کے ہندو جزیہ کے ٹیکس سے نجات حاصل کر گئے۔ آج ہر کشمیری پنڈت شیوبٹ کی حب الوطنی اور اس کے جذبۂ ایثار پر فخر کرتا ہے۔ اور تاریخ اس کے نام کو سنہری حروف میں پیش کر رہی ہے۔

ہندو جوگیوں کے لئے جوگی لنگر

بادشاہ کی فیاضیوں اور اس کی ہندو نوازیوں کی داستانیں گو کشور ہندوستان کی فصیل یعنی ہمالیہ سے باہر سمندر پار نہ جا سکی ہوں۔ تاہم اس قسم کا ایک واقعہ شاہجہان شہنشاہ ہند کے زمانہ میں بھی گزرا ہے۔ لکھتے ہیں کہ شاہجہان کی عزیز بیٹی شہزادی جہاں آرا بیگم ایک مرتبہ بیمار ہو گئی۔ یہ ۱۶۳۶ء کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر باٹن ایک انگریز اس زمانہ میں دارالسلطنت میں موجود تھا۔ اس کے علاج سے شہزادی کو شفائے کامل حاصل ہو گئی۔ شہنشاہ نے اس کو انعام دینا چاہا۔ لیکن اس نے انعام لینے کی بجائے یہ عرض کیا کہ میری قوم کے تاجروں کو ایک تو بلا محصول تجارت کرنے کی اجازت دی جائے۔ دوسرے بنگال میں کارخانے قائم کرنے کا کمپنی کو حکم صادر فرمایا جائے۔ شہنشاہ نے اس کی دونوں باتیں مان لیں۔ ان دونوں باتوں نے ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کی جڑیں مضبوط کر دیں۔ شیوبٹ کے ایثار کا واقعہ اس واقعہ سے دو سو سال قبل کا ہے لیکن کشمیر کی تاریخ ہمیشہ تاریکی میں رہی۔ اور چونکہ اس واقعہ کا تعلق انگریزی قوم کے کسی فرد یا ہندوستان کے شہنشاہ سے نہیں تھا۔ بلکہ کشمیر کے ایک بادشاہ سے تھا۔ اس لئے بھی اس کو شہرت نصیب نہ ہو سکی ورنہ یہ ایثار بھی اپنی جگہ کوئی کم اہمیت نہیں رکھتا۔

کلام نہیں۔ کہ کشمیری پنڈتوں کے علاوہ جو کشمیر سے ہجرت کر گئے تھے۔ اور بڈشاہ کے زمانے میں جن کی کثیر تعداد واپس آگئی تھی۔ انہی ایام میں اکثر دوسرے برہمن بھی بادشاہ کی شہرت سنکر کشمیر آگئے۔ ان میں جگن ناتھ اور کورو کشیتر کے عالموں کے علم وفضل اور ان کی صحبتوں سے بادشاہ نے بہت استفادہ کیا اور ان کے معقول مشاہرے مقرر کر کے اپنی علم نوازی اور بے تعصبی کا ثبوت دیا۔ بلکہ لکھا ہے۔ کہ وہ ان لائق وفائق ویدانتوں اور عالم فاضل برہمنوں کی قدر مسلمان درباریوں سے بھی زیادہ کرتا تھا[1] لیکن ہندو جوگیوں کی جن میں کشمیری سادھو بھی تھے۔ ایک عظیم تعداد ایسی تھی۔ جو توکّل کے غلط معنی سمجھکر اور ہاتھ پاؤں توڑ کر ملک اور قوم کے لئے ناقابل برداشت بوجھ ثابت ہو رہی تھی۔ بادشاہ نے ان کے لئے رینہ واری میں مطبخ عظیم مقرر کیا۔ جہاں سے دو وقت کھانا ہر ایک جوگی کو سرکار کی طرف سے مفت ملتا تھا۔ اور ان کے روزینے بیت المال سے مقرر کرا دیئے[2]۔ جس مقام پر یہ مطبخ یعنی لنگر تھا۔ اب وہ جگہ جوگی لنگر کے نام سے موسوم ہے۔ یہ جوگی لنگر عہد بڈشاہی کا پور ہوس یعنی غریب گھر تھا۔

مندر شنکر اچارج کی مرمّت

کمراز کے علاقہ میں راجہ پرتاب پیڈ کا مندر موضع تاپور میں نرندلیشور کے نام سے تھا۔ راجہ جیا پیڈ کے تین مندر (۱) چترا تھا کیشو (۲) شیئنہ سنائی کیشو اور (۳) امرتہ کیشو اندر کوٹ میں تھے۔ یہ سب مندر ایسی تباہ حالت میں تھے کہ از سر نو ان کا اصلی شان وشوکت میں آنا بہت محال تھا۔

---

[1] تاریخ کشمیر اردو قلمی مصنفہ خواجہ حسن ملک۔ مکمل تاریخ کشمیر حصہ دوم مصنفہ راقم الحروف
[2] فتحیات کبرویہ قلمی صفحہ ۳۲۲ وگلزار کشمیر مصنفہ دیوان کرپا رام۔

بادشاہ نے ان مندروں کی بوسیدہ و کہنہ ہڈیوں یعنی ان کے پتھروں سے جو ادھر ادھر بیکار پڑے ہوئے تھے۔ ایک نہایت مفید کام لیا۔ ان سے کسی مسجد کی تعمیر نہیں کی۔ یا ان کو کسی محل میں استعمال نہیں کیا۔ بلکہ ان پتھروں سے ایک ستقو (بند) ناندکھائی سے سوپور تک بنوایا اور ایک سفاپور سے سوپور تک جو رفاہ عام کے لئے دقت تھے۔ تاریخوں میں لکھا ہے۔ کہ اس نے بعض مناور جو منہدم ہو گئے تھے۔ از سر نو تعمیر کرلئے۔ ان میں مندر "ازشٹی شور" جو کوہ سلیمان یا شنکر اچارج پر واقع ہے۔ خاص طور پر مشہور ہے۔ یہ مندر راجہ سندیمان نے ۲۶۳۸ ق م میں تعمیر کرایا تھا۔ راجہ گوپادت اور راجہ للتادتیہ نے اپنے اپنے زمانہ میں اس کی مرمت کرائی۔ لیکن بعد کے راجاؤں نے چنداں توجہ نہ کی۔ مندر کی حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ سلطان سکندر کے زمانے میں زلزلہ کی ایک ہی ضرب نے اس کی چھت کے پتھروں کو شکستہ و منہدم کر دیا۔

بڈشاہ نے اپنی طویل عمر کے آخری ایام میں اس مندر کی طرف توجہ کی۔ اس کے انہدام کو پائیداری سے اور اس کی شکستگی کو پختگی سے تبدیل کیا اور چھت کو نئے سرے سے تعمیر کر کے اس کے نیچے چار سنگین ستون استوار کئے۔ چنانچہ اس کے ایک ستون پر مندرجہ ذیل دو سطریں منقوش ہیں۔ سطر اول: "ایں ستون برداشت خواجہ رکم بن مرجان و سال پنجاہ و چہار[۱] کشمیری"۔ سطر دوم "معمار ایں ستون واجی ہشتی زرگر و سال پنجاہ و چہار کشمیری نیز بر دیوار شمالی لزوبان سنگین آں منقوش بود"۔

[۱] تاریخ حسن حصہ اول سنہ پنجاہ و چہار رحسن ۵۴ سے مراد ہے ۵۴ سال کشمیری ہے مفصل حالات کے لئے دیکھو ضمیمہ نمبر ۱ سنہ لوکک دسنہ کشمیری۔

اس سال کشمیری سال ۱۵۴۲ء تھا۔ مگر اہل کشمیر ہو ماً احاد لکھتے تھے۔ اور ہات ساقط کر دیتے تھے۔ جس طرح جزاج اور رشتر پور ۳۶ء۔ لوکک باٹ ۳۶ء۔ لوکک لکھتے آئے ہیں۔ حالانکہ ان سے مراد ۴۴۳۶ء لوکاک د ۴۴۳ء لوکک ہوتی تھی۔ اور اس سنہ کی ابتدا آبادی کشمیر یا زمانہ کلجگ سے شمار کی گئی ہے اور آجکل بھی نہ صرف کشمیر میں بلکہ ہر جگہ یہی رواج ہے۔ مثلاً آج ۱۹۴۲ء ہے لیکن تحریروں میں بالعموم ۴۲ء ہی لکھا جاتا ہے۔

مندروں کے ساتھ پاٹ شالائیں

بادشاہ نے بُت خانوں اور مندروں کی مرمت ونگرانی کے علاوہ ان کے ساتھ پاٹ شالے بھی بنوائے۔ جہاں ہندو ودیارتھی مذہبی علوم نہایت آزادی سے حاصل کرتے تھے۔ ان کی مذہبی کتابیں جو ان کی ہجرت کے ساتھ کشمیر سے نابود ہو گئی تھیں۔ ہندوستان سے واپس منگوائیں۔ بقول ملا بہار الدین "دفاتر کفر وشرک کہ ازیں دیار بدر کشیدہ بودند باز طلبیدند" بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ ہندو جو کچھ ان کتابوں میں درج ہے۔ اس پر عمل کیا کریں۔ مندروں کی مرمت اور پاٹ شالاؤں کے اخراجات کے لئے بادشاہ نے جاگیریں عطا کیں۔ استاد تنخواہوں سے بے فکر تھے۔ اور طالبعلم فیسوں سے آزاد تھے۔ افسوس یہ باتیں بادشاہ کے ساتھ ہی مٹ گئیں ؎

آہ! اے سلطان زین العابدین بڈشاہ ما
نوحہ کشمیر پڑھ بیٹھے تیری میت کے ساتھ

سنسکرت اور فارسی کا میل جول

بادشاہ نے ہندوؤں کا مذہبی لٹریچر صرف پاٹ شالاؤں ہی میں تقسیم نہیں کیا بلکہ ویدوں۔ شاستروں۔ پرانوں اور ان کی کئی مذہبی کتابوں کا ترجمہ فارسی

میں اور فارسی کتابوں کا سنسکرت زبان میں کر کے ہندوؤں کے مذہبی خیالات سے مسلمانوں کو اور مسلمانوں کی مذہبی تعلیم سے ہندوؤں کو آگاہ اور باخبر کیا۔

بادشاہ کی عقلمندی بے تعصبی اور دور اندیشی کا ملک کی سیاسی حالت پر بہت اچھا اثر پڑا۔ چنانچہ جب مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک دوسرے کی مذہبی تعلیم سے واقف ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ ع مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا۔

تو ذاتی بغض و عناد کی جڑیں جو تھوڑی بہت ابھی باقی تھیں۔ وہ بھی وقت غلط کی طرح کٹ گئیں۔ اب دونوں قومیں اکثریت و اقلیت کی تمیز کئے بغیر آپس میں شیر و شکر ہو گئیں۔

جزیہ کی موقوفی نے بھی اس بادشاہ کے عہد میں کفر و اسلام کی تفریق مٹا دی تھی۔ لیکن دونوں قوموں کو دونوں کے علوم سے آگاہ کر کے بادشاہ نے نہ صرف اپنے مصالح ملکی یعنی قومی اتحاد کی وجہ سے ملک میں امن و امان کو مضبوط کیا۔ بلکہ ملک کو بھی آئے دن کے فتنہ و فساد سے نجات دلا دی۔

کیا کوئی اندازہ کر سکتا ہے کہ بڈشاہ کیسا بے تعصب اور محب وطن بادشاہ تھا۔ اور اس کی رعایا کیسی صلح جو اور امن پسند اور مختلف مذاہب کے بزرگوں کا احترام کرنے والی تھی۔ آہ اب یہ صورتیں تو اب و خیال ہو گئی ہیں

ہو گئیں وہ صورتیں کو صورت موج سراب   خلق کو احسان ان کے اب بھی ہیں خاطر نشیں

کشمیری پنڈت اور فارسی

انگریزی راج کے ابتدائی دور میں مسلمان علما اور پیر صاحبان نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کے حصول سے جو کہ راج بزم کی زبان تھی۔ اور ملک کے ہر حصہ میں سرعت کے ساتھ پھیل رہی تھی محروم رکھا تھا۔ اور زبان کی اسی محرومی

کی وجہ سے مسلمان برطانوی عہد حکومت میں اب تک دفتری ملازمتیں نہ حسب خواہش اور نہ تناسب آبادی کے لحاظ سے حاصل کر سکے ہیں۔

بڈشاہ نے جزیہ کی موقوفی اسنسکرت لٹریچر کی سرپرستی اور اپنے ذاتی حسن سلوک سے ہندوؤں میں بہت کچھ ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات بھی بڑے خوشگوار تھے۔ لیکن ابھی تک ایسے ہندو علماء موجود تھے۔ جو ہندوؤں کو فارسی کی تعلیم سے جو اس وقت کشمیر کی دفتری زبان تھی۔ اور جس کے حصول کے بغیر کسی ہندو کا کسی سرکاری دفتر میں ملازم ہونا نہایت مشکل تھا۔ روکتے اور منع کرتے تھے۔ اور اس کو ملیچھوں کی زبان کہتے تھے۔ اور اس کے پڑھنے والے پر برادری سے خارج کرنے کے فتوے صادر کیا کرتے تھے۔

بڈشاہ نے ہندوؤں کو سمجھایا کہ فارسی دفتری زبان ہے۔ اگر تم اس سے الگ رہے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملکی حکومت میں تم کو کوئی حصہ نہ ملیگا۔ ملک کی کثیر تعداد مسلمان ہے۔ جو کئی لاکھ تک ہے۔ تمہاری تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے فارسی زبان جس کو مسلمانوں نے اپنی مذہبی زبان عربی کے بعد دوسرا درجہ دیا ہے۔ اور جو کشمیر میں سوا سو سال سے زیادہ عرصہ سے اور ہندوستان میں کئی سو سال سے دفتری زبان کی حیثیت سے جاری ہے۔ بدلی نہیں جا سکتی اس کے حصول کے لئے تم کو کوئی دقت نہیں تعلیم مفت ہے۔ اور اس کے تمام اخراجات حکومت کے ذمہ ہیں۔ تم بھی مسلمانوں کی طرح فارسی پڑھو۔ اور ملک کے عہدوں میں حصہ لو اور مل جل کر اپنے ملک کی

لہ کرنل سر ینگ سنبا نے تاریخ ہند جلد سوم کے صفحہ ۲۸۲ پر لکھا ہے بڈشاہ ہی نے فارسی زبان کو دفتری زبان بنایا لیکن حقیقت یہ ہے کہ بڈشاہ سے پہلے ہی کشمیر میں یہ زبان دفتری ہو چکی تھی۔

ترقی وفلاح کی تدابیر سوچو۔

چنانچہ اسی زمانہ میں پنڈتوں نے فارسی پڑھنی شروع کی اور تھوڑے عرصہ میں اس قوم میں فارسی زبان کے ایسے نامور شاعر اور عالم فاضل پیدا ہوئے کہ بادشاہ نے ان کی قابلیت کی وجہ سے ان کو سر آنکھوں پر جگہ دی اور وہ اعلےٰ مراتب ان کو عطا کئے کہ ان کے خواب وخیال میں بھی نہ تھے فارسی پڑھنے والے ہنود طلبا کو خاص وظائف ملا کرتے تھے۔ اور ان میں سے بعض نادار طلبا کو خوراک بھی حکومت کی طرف سے عطا ہوتی تھی۔

مختصر التواریخ کا مصنف بڈشاہ کی بے شمار خوبیاں بلکہ اس کے احسانات کو جو اس نے ہندو قوم کے ساتھ کئے تھے تسلیم کرنے اور یہ تحریر کرنے کے باوجود کہ در رعایت فقرا وضعفا وپرداخت حال رعایا وبرایا دقیقہ از شفقت ومہربانی دریغ نے داشت "بڈشاہ جیسے نیک دل اور نیک نیت بادشاہ پر یہ حملہ کرتا ہے۔ کہ اس نے پنڈتوں کو فارسی تعلیم کی تحریک محض اس لئے کی کہ ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ کر دیا جائے اور ان کو بام عروج سے قعر مذلت میں گرا دیا جائے چنانچہ اس کے اصل الفاظ یہ ہیں "سلطان زین العابدین در نظر کار افتاد کہ این رکھیشران در ریاضت کیشال بہ ہیچ عنوان ازین درجہ بر آیندا ہم بمرور ایام چند نفر برہمن را بدولت دنیا خام طمع ساختہ بہ خواندن علم فارسی مشغول ساخت و بہ خوردن نان شبانہ عادی کرد تا اینکہ اندک اندک ہمگی خواص وعام بہ طمع دولت ناپایدار کہ بیجا قرار ندارد داغب ومائل گردیدند وطریقہ دیگر پیش کار آمدہ وقا نون ... پذیرفت وہر کس از درجہ ریاضت افتادہ بدام حرص وہوا

لہ ... ہر گز بود ... گاہے نگہبانی حکومت ... ۔

در افتاد"
مختصر التواریخ کے مصنف نے بڈشاہ کی رواداری پر جو زبریلی نظر ڈالی ہے۔ وہ دیکھ چکے ہو۔ اب گلزار کشمیر کے ہندو مصنف کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیے جس نے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ کشمیر کے علاوہ ہندوستان کے اکثر لوگ کشمیر کے برہمنوں کی ان کے کمالات علم کی وجہ سے عزت و تکریم کرتے۔ اور نقد و جنس سے ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ جب دولت اسلامیہ کشمیر پر قابض ہوگئی۔ تو امرا لوگ انقلاب سلطنت کی وجہ سے برہمنوں کی خاطر اچھی طرح نہ کر سکے۔ یہی باعث تھا کہ اہل علم رفتہ رفتہ علم سے بھی اور دولت سے بھی بے بہرہ ہو گئے۔ اور چونکہ محنت اور جفاکشی کی ان کو عادت نہ تھی۔ اس لئے ان کی گزر اوقات مشکل سے ہوتی تھی۔ بڈشاہ کے حسن سلوک کی تعریف سن کر مہاجر کشمیری پنڈتوں کی ایک کثیر جماعت کشمیر میں واپس آگئی تھی۔ اور ہر چند ان کو بادشاہ نے سر آنکھوں پر جگہ دی تھی۔ تاہم بہت سے لوگ مالی حیثیت سے امداد کے قابل تھے۔ بادشاہ نے جوگی لنگر میں نادار و محتاج برہمنوں کا انتظام کیا۔ اور حکم دیا۔ کہ برہمن لوگ بھی علم مروجہ (فارسی) حاصل کریں۔ سرکار ان کو ان کی قابلیتوں کے موافق کوئی نہ کوئی خدمت سپرد کر دیگی۔ چنانچہ صاحب گلزار کشمیر کے چند اصل الفاظ ذیل میں درج ہیں "سلطان تعسر گذران این جماعت نہ پسندیدہ از ناقابلیت محنت کشی و بار برداری کہ در تعیش عادات سہی بازو نہ داشتند بہ نظر چارہ گری در تعلیم علم فارسی بہ محاسبہ طوعاً و کرہاً مائل کنانیدہ ہر یکے را از خور حوصلہ و خرد واجبی بہ کارے منسوب نمودہ تقسیم رزق کردہ داد۔"
شارٹ ہسٹری آف کشمیر ایک تازہ تصنیف ہے جو اس عہد میں لکھی گئی

ہے۔ جبکہ ملک میں فرقہ دارانہ اختلافات ترقی پر ہیں۔ اور کوئی قوم دوسری قوم کے کسی مذہبی بزرگ یا دنیاوی بادشاہ کی نیکی اور اس کے احسانات کو تسلیم کرنا اپنی ملکہ اپنے مذہب کی کمزوری محسوس کرتی ہے۔ اس کتاب میں جو ایک کشمیری پنڈت[1] کی تصنیف ہے لکھا ہے۔ زین العابدین کی متبرک یادگار ہمارے دلوں میں ہے۔ جو کچھ اس نے کیا۔ دانائی اور تاّل اندیشی سے کیا۔ اس کے تاج کے نیچے قابلیت ہی قابلیت چھپی ہوئی تھی۔ اس کے عہد میں ہر کسی کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ہندوؤں نے اس کے مبارک دور میں (فارسی تعلیم حاصل کرنے کے بعد) اعلیٰ سے اعلیٰ سرکاری ملازمتیں حاصل کیں۔

پنڈتوں کے دو فرقے

پنڈتوں میں جن لوگوں نے دفتری زبان (فارسی) سیکھکر نوکریاں حاصل کیں ان کا نام کارکن مشہور ہوا۔ جو مذہبی کام کرتے تھے۔ ان کو باچھ بٹ کہتے تھے۔ اگرچہ بڈشاہ ہی کے عہد میں کارکن پنڈتوں نے سرکاری دفاتر پر اچھا خاصا اقتدار حاصل کر لیا تھا لیکن تاریخ اس امر کی شہادتیں بھی پیش کر رہی ہے۔ کہ بڈشاہ کے کئی سو سال بعد افغانوں کے عہد میں جو بے آئینی اور مظالم کا دور تھا۔ کشمیری پنڈت حکومت کے تمام شعبوں پر حاوی تھے۔ یہانتک کہ خود افغانستان میں کارکن پنڈتوں کا طوطی بول رہا تھا چنانچہ نند رام ٹکو ایک معزز کشمیری پنڈت نے کابل میں جاکر وہ عروج حاصل کیا۔ کہ آج تک "سکہ زد در کابلستان نند رام" مشہور چلا آتا ہے۔

پنڈتوں کے یہ دونوں فرقے آج تک موجود ہیں۔ اور تعجب یہ ہے۔ کہ

[1] شارٹ ہسٹری آف کشمیر صفحہ ۲۶، ۲۷ مطبوعہ ۱۹۲۴ء مصنفہ گوپی ناتھ لال کول بی اے

ان کا باہمی اختلاف بھی آج تک نابود نہیں ہوا۔ یہانتک کہ ایک دوسرے کے ساتھ شادیاں بھی نہیں کرتے۔

بڈشاہی دربار کے پنڈت کارکن

پنڈتوں نے بڈشاہی دور ہی میں فارسی زبان کی طرف توجہ کی۔ اور اپنی ذہنی قابلیتوں کی وجہ سے اسی زمانے میں اعلیٰ اعلیٰ عہدے حاصل کر لئے۔ جن عہدیداروں کے نام کشمیر کی مختلف تواریخوں سے ہم تک پہنچ سکے ہیں۔ ان کی فہرست ذیل میں درج ہے۔

(۱) پنڈت شیوبٹ حکیم شاہی۔
(۲) پنڈت زونہ راج مترجم و مؤرخ۔
(۳) پنڈت یودھ بٹ مترجم
(۴) پنڈت سداشیو بابو جوتشی و منجم
(۵) پنڈت گوپال کول صدر قانون گو کشمیر
(۶) پنڈت مادھو کول قانون گوئے کامراج
(۷) پنڈت گنیش کول قانون گوئے کامراج
(۸) سوم پنڈت مصاحب و شاعر و مترجم
(۹) تلک چاریہ بدھ مذہب مصاحب
(۱۰) روپے بٹ منجم و ریاضی دان
(۱۱) تارپور بٹ درباری حکیم۔
(۱۲) سیما منجم۔ سعلہ (۱۳) پنڈت شری بٹ وزیر انصاف
(۱۴) پنڈت شریور مؤرخ و مصاحب

زونہ راج لکھتا ہے۔ یہی وہ لوگ تھے۔ جن کی وساطت اور برکت

سے بادشاہ کے عہد میں برہمنوں نے بڑے بڑے عہدے حاصل کئے۔ ان میں سے چند ایک کے حالات بڈشاہی درباریوں کی ذیل میں لکھے جائینگے۔

گاؤکشی بند اور رسم ستی کا مشروط اجراء

گائے کا گوشت مسلمانوں میں حلال وجائز ہے۔ چنانچہ مسلمان سلاطین کے عہد حکومت کے ساتھ ہی کشمیر میں گاؤکشی بھی شروع ہوگئی تھی۔ بڈشاہ نے اپنی محکوم رعایا کے ایک فرقہ کے تالیف قلوب کی خاطر اور زراعتی کاروبار کو ترقی دینے کے لئے ممالک محروسہ میں گاؤکشی کی ممانعت کے احکام جاری کر دیئے۔ اور نہ صرف یہی کام کیا۔ بلکہ رسم ستی کو بھی جو ہندوؤں میں زمانہ قدیم سے چلی آتی تھی اور سابقہ سلاطین اسلام نے اس کو ایک ظلم سمجھکر بند کر دیا تھا۔ اور خود زین العابدین بھی اس کے دوبارہ اجرا پر راضی نہ تھا۔ صرف ہندوان کشمیر کی خاطر اس نے اس رسم کو جو فی الواقع صریح ظلم تھی۔ بعض شرائط کے ساتھ دوبارہ جاری کر دیا۔

چنانچہ شریور لکھتا ہے۔ اس ملک میں بھی ہندوستان کی طرح ہندو عورتیں اپنے خاوندوں کی لاشوں کے ساتھ ستی ہو جایا کرتی تھیں۔ اور چونکہ ہندو رسم ستی کو اپنا مذہبی قانون سمجھتے ہیں۔ اس لئے بادشاہ اس کو بند نہ کرسکا۔ اور اس نے ان کے مذہبی معاملہ میں دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔

ممکن ہے گاؤکشی کو بند کرنے کے متعلق اس زمانہ کے علماء نے بادشاہ کے اس فرمان کو مذہب اسلام میں دخل دینے کا مترادف سمجھا ہو۔ اور اس پر ناراضگی کا اظہار کیا ہو۔ لیکن بادشاہ جو صلح کل تھا اور سمجھتا تھا۔ کہ ذبیحہ گاؤ کے حلال ہونے کے باوجود اسلام نے یہ حکم کہیں نہیں دیا کہ مسلمان اگر گائے کا گوشت نہیں کھائے گا۔ یا اس کی قربانی نہیں دیگا

تو وہ مسلمان نہیں رہے گا۔ اس لیے اس نے علمائے وقت کو اپنی ہمسایہ اور ماتحت قوم کے مذہبی جذبات کے احترام کی طرف توجہ ضرور دلائی ہو گی۔ اور علماء اسلام نے بھی ہمسایہ قوم کی دلداری کی وجہ سے بادشاہ کی ملکی مصلحتوں کو سمجھ لیا ہوگا۔ خصوصاً جبکہ ذبیح گاؤ کے بغیر بھی ایک مسلمان مسلمان رہ سکتا ہے۔

ہندو مُردوں کے ٹیکس کی منسوخی

سکندر بت شکن اور علی شاہ کے زمانے میں یہ دستور چلا آتا تھا۔ کہ ہندو اپنے مُردوں کو جلانے کے لئے جب شمشان بھومی میں لے جایا کرتے تھے۔ تو ان سے مُردہ جلانے کا ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ بڈشاہ کے عہد میں بھی کچھ عرصہ تک اس کا رواج رہا۔ شری ور لکھتا ہے کہ جب میرے باپ کا انتقال ہوا۔ تو اس کو جلانے اور اس کی ماتمی رسومات ادا کرنے کے لئے مجھ سے بھی محصول طلب کیا گیا۔ میں نے بادشاہ کو اس ٹیکس کی اطلاع دی۔ اور اس کی منسوخی کی طرف توجہ دلائی۔ بادشاہ نے فوراً میری عرضداشت پر شاہانہ توجہ فرمائی۔ اور بیک جنبش قلم اس ناجائز اور ظالمانہ ٹیکس کو معاف فرما دیا۔ چنانچہ اس وقت سے کشمیر میں یہ ٹیکس معاف ہے۔ ہر ہندو اپنے مُردوں کی رسومات اطمینان سے ادا کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں پر چوٹ کرتا ہے اور لکھتا ہے۔ لیکن عام ملیچھ ٹیکس کی اس منسوخی سے خوش نہیں ہیں۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ جب بادشاہ نے ذبیحہ گاؤ کی ممانعت کے احکام جاری کئے ہوں گے۔ تو ضرور علماء اہل شریعت نے کسی نہ کسی رنگ میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا ہو گا۔ لیکن یہ نیک دل بادشاہ حکومت کے استحکام اور اپنے فرائض کو ان سے بہتر سمجھتا تھا۔ مسلمان بادشاہ کے

ان احسانات کے باوجود مسلمانوں کے لئے شری ور کا یا کسی اور مورخ کا بار بار ملیچھ کا لفظ لکھنا اس کے اپنے ملیچھ بن یا اس کے دل کی اندرونی کثافت کا ثبوت ہے۔

بڈشاہ اور امرناتھ کی یاترا

اس کا قدیم سنسکرت نام امریشور اور کشمیری نام امرناتھ ہے۔ یہ ایک ایسا تیرتھ ہے۔ جہاں نہ صرف کشمیری بلکہ پنجابی مدراسی بنگالی اور ہندوستان کے دوسرے حصص کے لوگ بھی یاترا کے لئے آتے ہیں۔ امرناتھ ایک مرتفع غار (گفا) کا نام ہے۔ جو اسلام آباد سے پانچ منزل یا پانچ دن کے راستہ پر واقع ہے۔ یہ مقام ۱۳۰۰۰ فٹ کی بلندی پر ایک برفانی چوٹی کے جنوبی پہلو میں ہے۔ اس غار کے اندر سفید برف کا ایک بہت بڑا تکڑا اس پانی کے انجماد سے بنا ہوا موجود رہتا ہے۔ جو چٹان سے رستا رہتا ہے۔ ہندو اسے سوامی امریشور کا مجسمہ خیال کرتے ہیں۔ اور شولنگ تصور کر کے پوجتے ہیں۔ اور اس کے درشن کو باعث خیر و برکت سمجھتے ہیں۔ باوجود اس شہرت کے راج ترنگنی (پنڈت کلہن) اور نیل مت پران میں اس مقدس تیرتھ کا بہت کم ذکر آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانے میں اس کی اس قدر شہرت نہ تھی اور نہ کبوتروں کا جوڑہ کہیں سے نکلتا تھا جیسا کہ آجکل کے زائرین (یاتری) ان کی شہادت دیا کرتے ہیں۔

مسلمان بادشاہوں میں سب سے پہلا بادشاہ بڈشاہ ہے۔ جو ہندوؤں کے اس متبرک تیرتھ پر پہنچا۔ چنانچہ زونراج نے اپنی راج ترنگنی میں[1] لکھا ہے کہ سلطان زین العابدین اس تیرتھ کے لئے تمام مشکلات کو عبور کر کے وہاں گیا۔

[1] بمبئی ایڈیشن شلوک م ۱۳۲۳ بحوالہ راج ترنگنی اردو ترجمہ

بادشاہ ہندوؤں کے میلوں اور تیرتھوں پر جایا کرتا۔ اور اپنی شمولیت سے ان تیرتھوں کی رونق کو دوبالا کیا کرتا تھا۔ افسوس ہے امرناتھ کی شاہی یاترا کے مفصل حالات نہیں مل سکے۔ ورنہ معلوم ہوسکتا کہ کس جاہ وجلال سے اور کس ساز وسامان کے ساتھ وہاں جاتا ہوگا۔ بادشاہ کے یاترا جانے سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ کہ کلہن پنڈت بار اجہ جے سنگھ کے زمانہ میں امرناتھ کی بہت زیادہ شہرت نہ تھی۔ تاہم بڈشاہ کے زمانہ میں یہ اس قدر مشہور تھا کہ خود بادشاہ وہاں یاترا کے لئے گیا تھا۔

شاردا تیرتھ اور بڈشاہ

ہندوؤں کا یہ مشہور تیرتھ کمراز کی طرف دریائے کشن گنگا کے دائیں کنارے ضلع مظفرآباد کی تحصیل کرناہ میں واقعہ ہے۔ اور بہت قدیم زمانہ سے مشہور ہے۔ چنانچہ البیرونی (بزمانہ محمود غزنوی) نے اپنی کتاب الہند میں ہیم چندر کے مصنف ویاکرن اور کلہن نے راج ترنگنی میں اسی طرح جونراج اور اس کے بعد کے مصنفوں اور فارسی مورخوں میں ابوالفضل (بزمانہ اکبر) وغیرہ سب نے اس کا ذکر کیا ہے۔

زونہ راج کی ایک تحریر کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ سلطان زین العابدین بھی اس تیرتھ کی یاترا کے لئے گیا تھا۔ سٹین صاحب نے راج ترنگنی کے انگریزی ترجمہ میں لکھا ہے۔ کہ بادشاہ غالباً ۱۴۲۲ء میں اس مندر کی زیارت کے لئے گیا اس زمانہ کے مشکل ترین راستوں پر غور کرو۔ پہاڑوں کی عظیم رفعت کو جہاں ہر موسم میں برف کے تودے لگے رہتے ہیں۔ دیکھو دریاؤں ندی نالوں کی طغیانیوں پر نظر ڈالو اور بادشاہ کی عقیدہ تندی اور دلوں پر حکومت کرنے کی پالیسی پر دھیان کرو اور پھر بتاؤ کیا ایسی مثالیں آج بھی مل سکتی ہیں۔

مسجدیں اور پنڈت اور قشقہ

سلطان بُت شکن اور علی شاہ کے زمانہ میں ہندوؤں کو مسجدوں میں داخل ہونے بلکہ ان سے چھو جانے تک کی سخت ممانعت تھی۔ بڈشاہ نے یہ سختی ہٹادی۔ اور حکم دیا کہ ہندوؤں کو بشرط طہارت مسجدوں میں داخل ہونے اور ان کے صحنوں میں پھرنے اور ان کے دیکھنے کی عام اجازت ہے۔ کوئی پنڈت سلطان بت شکن اور سلطان علی شاہ کے زمانہ میں نہ اپنے آپ کو علانیہ ہندو کہہ سکتا تھا۔ اور نہ اپنی پیشانی پر قشقہ لگا سکتا تھا۔ جو ان کا قدیم دستور تھا بادشاہ نے پنڈتوں سے اس مصیبت کو بھی دور کیا۔ اور کھلے بندوں ان کو ہندو کہلانے اور قشقہ لگانے کی اجازت عطا کی۔ علاوہ ان مراعات کے جرمانہ پیشکش۔ نذرانہ جو سلطان بُت شکن کے زمانہ سے جاری تھا۔ معاف کر دیا[1]۔

ہندوؤں کیلئے ہندو عدالتیں

ہندوؤں اور مسلمان مصنفوں اور مورخوں نے بڈشاہ بادشاہ کی اس انصاف پروری کی سنہری الفاظ میں داد دی ہے کہ اس نے ہندوؤں کے مذہبی مقدمات کے تصفیہ کے لئے ہندو جج اور مسلمانوں کے مذہبی مقدمات کے لئے قاضی مقرر کر رکھے تھے۔ چنانچہ خواجہ محمد اعظم اپنی تاریخ واقعات کشمیر میں لکھتے ہیں:۔ "از ہر ملتے بہ جہت فیصل قضا با شخصے را از ہماں آئین تعین مے کرد" اور جب مدعی اور مدعا علیہ ہندو اور مسلمان ہوتے تھے۔ تو ان کے مقدمات کا تصفیہ دو جج مل کر کرتے تھے جن میں ایک ہندو ہوتا تھا۔ ایک مسلمان' یہ وہ انصاف اور وہ عدل ہے۔ کہ آج بھی ہندوستان کو کامل طور پر نصیب نہیں ہو سکا۔

شکار سے نفرت اور گوشت سے پرہیز

بڈشاہ کو باوجود ایک عظیم الشان فاتح و کامران بادشاہ ہونے کے شکار

[1] طبقات اکبری

سے کوئی رغبت نہ تھی۔ شکار سے جو خرابیاں انسانوں اور حیوانوں پر آتی ہیں۔ وہ سب اس کے پیش نظر تھیں۔ صدہا انسان شکار کو گھیرنے اور شور مچانے کے لئے ہمراہ ہوتے۔ ان میں سے کئی ایک رستہ کی خرابیوں اور پہاڑوں کے نشیب و فراز کی نذر ہو جاتے۔ پھر ان غریبوں کا جو ہرج اور نقصان ہوتا وہ اس کے علاوہ تھا۔ مبداء فیاض نے اس کے پہلو میں ایک درد مند دل رکھا تھا۔ اس نے اپنے ابتدائی دور کے بعد شکار کو نہ صرف خود ترک کیا۔ بلکہ اس خیال سے کہ اس کی رعایا کا ایک گروہ (طبقہ ہنود) شکار سے نفرت رکھتا ہے۔ اس نے کشمیر میں شکار کی قطعی ممانعت کر دی۔ بعض بعض ہندو تقریبوں اور تہواروں پر گوشت بھی ترک کر دیا کرتا تھا۔ اور اپنے مذہب کے مبارک مہینہ یعنی رمضان میں گوشت کا مطلقاً استعمال نہ کرتا تھا۔

رفاہ عام دان اور دھرم نتبل

بادشاہ نے شور پور حال ہیر پور واقعہ درّہ ہیرپنجال میں جو شوپیاں سے تھنہ وراجوری کے رستہ میں ایک پڑاؤ ہے۔ اور اپنے تاریخی واقعات کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ کچھ مواضع اس کام کے لئے وقف کر رکھے تھے۔ کہ ان کی آمدنی سے مسافروں کو جو پنجاب یا گرد و نواح سے کشمیر میں آیا کرتے تھے۔ بلا امتیاز مذہب و ملت مفت کھانا ملا کرے۔ ہیرپور میں بادشاہی لنگر موجود رہتا تھا۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے علیحدہ علیحدہ انتظام ہوتا تھا۔ اس دان یا فیاضی کا نام شری ور نے اپنی راج ترنگنی میں ان ستر ادچھن لکھا ہے۔

ڈل میں فصل سنگھاڑا بافراط ہوتی ہے۔ اس کے چاروں ساحل اس فصل کی پیداوار سے سبز رہتے ہیں۔ بادشاہ نے تمام فصل کو غریب غربا

کے لئے وقف کر دیا۔ اور نام اس کا دھرم ممبل رکھا۔ چنانچہ تاریخ حسن میں لکھا ہے: "از ابتدائے عہد بڈشاہ تا حال وقف عام است آں را دھرم منبل مے گویند"۔ لیکن اس کا جنوبی و غربی حصہ اب مدت سے ضبط سرکار رہے۔ چنانچہ مصنف تاریخ حسن لکھتا ہے: "آنکہ در نواحی غرب وجنوب مے رسید از قدیم ضبط سرکار"

بڈشاہ ہندوؤں پر کیوں مہربان تھا؟

ہندو مورخوں اور ہندوؤں کی تقلید میں مسلمان مورخوں نے ہندوؤں پر شاہی عنایات کے متعلق عجیب وغریب حکایتیں لکھی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے۔ کہ سلطان ابتدائے عہد میں ہندوؤں کی طرف چنداں ملتفت نہ تھا۔ لیکن ایک دفعہ جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہو گیا۔ تو شیوبٹ اور دیگر اطبائے نامدار کی تمام تدابیر کے باوجود بھی اسے آرام نہ آیا۔

آخر شیوبٹ اور پودی بٹ ایک باکمال جوگی کے پاس گئے۔ جو علم سیمیا میں یگانۂ روزگار تھا۔ اور کشمیر کے ایک گوشہ میں رہتا تھا۔ بادشاہ کی بیماری کا حال اس سے عرض کیا۔ جوگی نے کہا۔ سلطان کی موت سے تو کوئی چارہ نہیں۔ تقدیر کو کون ٹال سکتا ہے۔ البتہ ایک صورت ہے کہ قدرت بھی اپنا کام کرے اور بادشاہ بھی زندہ رہ سکے۔ اس کی تدبیر یہ ہے۔ کہ جب بادشاہ کا دم نکل جائے۔ تو میں اپنے خاص عمل کے ذریعے روح اپنے قالب سے نکال کر اس کے قالب میں ڈال دوں گا۔ جب میری روح سلطان کے بدن میں منتقل ہو جائے۔ تو میرے قالب کو حفاظت واحتیاط سے تھام کر میرے اصلی آسن پر لے آؤ۔ تاکہ سلطان کو صحیح

تندرست بلکہ زندہ کرکے ہیں پھر اپنی اصلی حالت پر آجاؤں چنانچہ جوگی کو اس کے شاگردوں سمیت بادشاہ کے دونوں مصاحب بادشاہ کے پاس لے آئے۔ جب بادشاہ کا مرغ روح اس کے قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ تو جوگی نے اپنا عمل شروع کیا۔ اپنی روح اس کے قالب میں ڈالدی۔ اس کے شاگردوں نے امراء سے کہا کہ اپنے بادشاہ کو جا کر دیکھ لو۔ وہ اب صحیح وسالم موجود ہے۔ اور میں اب اپنے استاد کو معالجہ کے لئے اپنے استھان میں لئے جاتا ہوں۔

وجیز التواریخ کے مصنف نے استھان میں لیجانے سے اختلاف کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے مصاحبوں نے جوگی کے قالب کو ہندو رسوم کے مطابق جلا دیا۔ اس واقعہ کے بعد بادشاہ ۲۳ سال تک عدل وانصاف کے ساتھ حکمرانی کرتا رہا۔ اور ہندوؤں کی اس بے غرضانہ محبت وخدمت کا اس کے دل پر محکم اور پائدار اثر پڑا۔

ہندو مورخین کا خیال ہے۔ کہ چونکہ نئے زین العابدین میں ایک ہندو کی روح موجود تھی۔ اس لئے قدرتاً اسے ہندوؤں سے محبت تھی۔ شارٹ ہسٹری آف کشمیر کا ہندو مصنف بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے۔ لوگوں کا عام خیال ہے۔ کہ اس بڑی شخصیت میں ہندو روح حلول کر گئی تھی۔ جو اس کو ہندوؤں کی طرف راغب کرتی رہتی تھی۔

لیکن ارباب دانش سے مخفی نہیں ہے۔ کہ روح ایک بدن سے دوسرے بدن میں منتقل نہیں ہوسکتی۔ البتہ مرض کا منتقل ہونا قرین قیاس ہے۔ جیسا کہ بابر کی موت اور ہمایوں کی بیماری کا حال سب لوگ جانتے ہیں کہ باپ بیٹا دونوں سخت بیمار تھے۔ بابر نے خلوص دل سے خضوع خشوع

کے ساتھ دعا مانگی۔ کہ بارالہا ہمایوں کی بیماری میری بیماری میں شامل کر کے اس کو صحت و تندرستی عطا فرما' دعا دل سے نکلی تھی اثر کر گئی۔ بابر زیادہ بیمار ہو گیا۔ اور ہمایوں تندرست ہونے لگا۔ یہاں تک کہ تیسرے ہی دن بابر کا انتقال ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جوگی اور بڈشاہ کا معاملہ بھی اسی قسم کا ہو گا۔

بہر حال ہندو اس کے احسانات عظیمہ کے قائل و معترف ہیں۔ اور اس کی انصاف پروری اور رعایا پروری اور علم دوستی کا شکر گزاری اور احسان مندی کے ساتھ ذکر کرتے رہتے ہیں۔

راجہ راجوری کی بیٹی اور بڈشاہ

صاحب اسلامک کلچر ان کشمیر لکھتے ہیں۔ راجوری کے راجہ سندر سین نے جس کی تخت نشینی کا سال ۱۴۵۰ء بتایا جاتا ہے۔ اپنی بڑی لڑکی راجیہ دیوی بڈشاہ کی خدمت میں بطور تحفہ بھیجی۔ بادشاہ اس وقت جھیل ولر کی سیر کر رہا تھا۔ ڈولی اور ڈولی کا جلوس معہ کنیزگان وہیں پہنچا۔ بادشاہ نے دیکھکر فرمایا کہ یہ کس مائی کی ڈولی ہے۔ جو واقف کار تھے۔ انہوں نے واقعہ عرض کیا۔ بادشاہ نے فرمایا۔ کہ جس کو ماں کہدیا ہے۔ اس کو بیوی کیونکر قبول کر سکتا ہوں۔ بادشاہ نے اس خیال سے کہ ڈولا واپس بھیجنے میں راجہ کی ہتک ہو گی راجیہ دیوی کو شاہی حرم میں بھجوا دیا۔ جہاں ہمیشہ اس کی خدمت میں وہ ایک بیٹے کی حیثیت سے حاضر ہوتا رہا۔ اسی کتاب میں لکھا ہے۔ کہ رانی بادشاہ کا یہ حسن سلوک دیکھکر تھوڑے عرصہ کے بعد مسلمان ہو گئی۔ اور اس نے بادشاہ کی اجازت سے اپنی یادگار کے طور پر نالہ مار پر راجویر کدل یا راجوری کدل کے نام سے ایک پل تعمیر کرایا[۱]

[۱] یہ پل آج بھی کسی نہ کسی حالت میں موجود ہے

صاحب اسلامک کلچران کشمیر نے یہ واقعہ جرنل آف دی پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی سے لیا ہے۔ لیکن اس واقعہ کا ذکر نہ زونراج کی زینہ ترنگنی اور نہ شری ور کی زینہ راج ترنگنی میں ہے۔

البتہ اس واقعہ کے تسلیم کرنے سے بہ ظاہر اس لئے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ اس کے اپنے محلات میں یکے بعد دیگرے پہلے بھی راجہ مدر دیش کی دو راجکماریاں رہ چکی تھیں۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں۔ اگر راجہ راجوری نے اپنی راجکماری بطور پیشکش بادشاہ کے پاس بھیجدی ہو۔ جبکہ اس ملک میں پہلے بھی اس قسم کی نظیریں موجود تھیں۔ اور خصوصاً جبکہ راجہ راجوری اس کے ماتحت بھی تھا۔ اور اس کا احسان مند بھی تھا۔ کیونکہ راناسوہا (Rana Soha) نے اس پر یک لخت حملہ کر دیا تھا۔ اور بڈشاہ کی بروقت اعانت نے راناسوہا کو شکست فاش دے کر اسے وہاں سلامت لے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

ایک نوعمر اور پربچہرہ راجکماری کے پاس جو بیوی بنائے جانے کے لئے بادشاہ کے حضور میں بھیجی گئی تھی۔ ہمیشہ ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح جانا۔ بادشاہ کے اخلاق حسنہ، اس کی مقدس زندگی اور اس کے صفائے قلب کی ایک نادر مثال ہے۔ اور اس کا یقیناً ہندوؤں اور عام لوگوں پر بڑا اثر ہوا ہوگا۔

بادشاہ کی عنایات برہمنوں پر

زونراج لکھتا ہے۔ بارہ کھشیتر وجیاکھشیتر اور اشاتک کے مقامات پر بادشاہ نے خیرات خانے کھول رکھے ہیں جن سے برہمن بھی مستفیض ہوتے تھے۔

لہ یہ واقعہ زونراج نے لکھا ہے لیکن یہ نہیں بتایا۔ کہ راناسوہا کس ملک کا راجہ تھا۔

رہتے ہیں۔ پرگنہ کرال میں زین پور بادشاہ کی نئی بستی ہے۔ وہاں برہمنوں کو خاص مراعات ملی ہوئی ہیں۔ اس نے اکثر برہمنوں کو زمینیں لاگان دے رکھی ہیں۔

شری ور نے بھی شکر گزاری کے الفاظ کے ساتھ بادشاہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے: اندر کوٹ میں بادشاہ کی فیاضیوں سے اس قدر برہمن اور تپسوی جمع رہتے کہ ان کے سنکھوں اور ناقوں کی گونج مانس بل تک جایا کرتی۔ ناگ یاترا اور گھن چکر کے تہواروں پر بادشاہ کی طرف سے برہمنوں کو پھول میوے اور کھانا مفت ملا کرتا۔ ان میں جو سب سے بڑا تھا۔ جس کو وہ میرا (Mera) کہتے تھے۔ بادشاہ نے اس کو خلعت عطا کیا۔ تحفہ تحائف دیئے اور اعزازی نشان عطا کر کے اس کا مرتبہ بلند کیا۔

بادشاہ وتستہ اور سندھو کی جائے اتصال شادی پور کے مقام پر ہمیشہ مچھلیوں کو چاول کھلایا کرتا تھا۔ بادشاہ نے اپنے درباریوں میں برہمنوں کو بڑے بڑے جلیل القدر عہدے دے رکھے تھے۔ جن کا کچھ ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

وتستہ کی یادگار میں دربار چراغاں

بادشاہ اندر کوٹ کے برہمنوں کو انعامات اور تحفہ تحائف دیکر چاند کی ۱۲ تاریخ کو رخصت کر دیا کرتا اور تیرھویں تاریخ کو جشن دیکھنے کے لئے شہر میں واپس آجایا کرتا۔ جو وتستہ (دریا) کی پیدائش اور اس کے فیوضات کی یادگار کے طور پر کشمیر کے برہمن ہر سال منایا کرتے ہیں۔ اس موقعہ پر چراغاں کی اس قدر کثرت ہوتی کہ شہر بقعۂ نور بن جاتا۔ اور چونکہ بادشاہ اس میں خود دلچسپی لیتا تھا۔ اس لئے مسلمان بھی جشن چراغاں میں

شامل ہوا کرتے تھے۔ بادشاہ کشتی پر سوار ہو کر چراغاں کا نظارہ دیکھا کرتا۔ دریا کے دونوں کناروں پر چراغوں اور موم بتیوں اور فانوسوں کی قطاریں جب دریا کے لہراتے ہوئے پانی میں اپنا عکس ڈالتی تھیں۔ تو یہ منظر دیکھنے والوں کے دلوں میں عجب کیفیت پیدا کرتا۔ بادشاہ اس نورانی منظر کے دیکھنے کے لیئے جب کشتی پر سوار ہوتا۔ اور دار الحکومت کے پاس آکر کشتی سے اترتا۔ تو رعایا کی دعاؤں کے شور سے آسمان گونج اٹھتا۔

بادشاہ چراغاں دیکھ چکنے کے بعد دربار ہال میں آتا۔ جہاں درباری اس کے آنے سے پیشتر ہی اپنی اپنی نشستگاہیں سنبھال لیتے۔ پہلے رقص و سرود کی محفل گرم کرتا۔ اس سے فارغ ہو کر دربار منعقد کرتا۔ اور بقول شریوَر ساری رات اسی طرح بسر کر دیتا[1]۔

---

[1] کشمیر کی طرح اس قسم کی رسم مصر میں بھی دریائے نیل کی پیدائش اور طغیانی اور اس کی برکات کے متعلق زمانہ قدیم سے منائی جاتی ہے۔ چنانچہ ۲۴۔ اگست ۱۹۳۸ء کو بھی قاہرہ دار الحکومت مصر میں یہ رسم عید کی شکل میں منائی گئی۔ حکومت مصر کے کل دفاتر اور ادارے اس دن بند تھے۔ ملک میں عام تعطیل تھی۔ لاکھوں آدمی دریائے نیل کے کنارے ایک وسیع ساحل پر جمع تھے۔ جن میں ہر فرقہ کے لوگ شامل تھے۔ گورنر قاہرہ بادشاہ مصر کے قائم مقام کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ ایک جہاز جھنڈیوں اور بجلی کے قمقموں سے سجایا گیا۔ اور اس کا نام عروس نیل رکھا گیا۔ ساڑھے دس بجے رات تک جلسہ رہا۔ فوج جو اس موقعہ پر آئی۔ دس ہزار تھی۔ نیل زندہ باد، بادشاہ فاروق زندہ باد، اور مصری فوج زندہ باد کے فلک شگاف نعرے دلوں میں جذبات وطنیت پیدا کر رہے تھے۔ گورنر کے آنے پر فوج نے سلامی دی۔ توپیں داغی گئیں۔ آتشبازی چھوڑی گئی رقص و سرود کی محفل گرم ہوئی۔ اور گورنر کی صدارت میں خطبات پڑھے گئے۔ روشنی کی کثرت نے رات کو بقعۂ نور بنا رکھا تھا۔

نظامِ ملک خوش اسلوب تھا اس عہدِ زریں میں
وطن اک جنتِ مرغوب تھا اس عہدِ زریں میں
ہر اک لمحہ بہت ہی خوب تھا اس عہدِ زریں میں
زمانہ کس قدر محبوب تھا اس عہدِ زریں میں
کھلے تھے ہر طرف خلد بریں کے باب اے جہلم (زینت عمری) (?)

جہانگیر نے بھی توزک میں کشمیر کے اس جشن چراغاں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ یہ ایک قدیم رسم ہے۔ جو ہر سال ادا کی جاتی ہیں۔ ہر غریب ہر امیر جس کا گھر لب دریا واقع ہے۔ شب برات کی طرح چراغاں روشن کرتا ہے۔ جہانگیر لکھتا ہے۔ میں نے برہمنوں سے اس جشن کی وجہ دریافت کی۔ تو انہوں نے کہا کہ اس تاریخ کو دریائے وتستہ (بہت) کا سرچشمہ ظاہر ہوا تھا۔ اور یہ رسم زمانہ قدیم سے اسی طرح منائی جارہی ہے۔ اس جشن کا نام دتہ تر واہ ہے۔ جو چاند کی تیرھویں تاریخ کو ہوتا ہے۔ کشمیر میں تر واہ تیرہ کو کہتے ہیں۔ اور وَت یا وہت بہت کا مترادف ہے۔ جو دریائے جہلم کا قدیم نام ہے۔

مفتوح و ماتحت ہند وراجگان سے بادشاہ کا سلوک

بادشاہ کو ملک گیری اور خود بخود پیش قدمی کا چنداں شوق نہ تھا۔ لیکن جب کبھی ان باتوں کے لئے واقعات وحالات اس کو مجبور کر دیتے۔ تو وہ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح حملہ کرتا تھا اور جب کسی ملک کو فتح کر لیتا۔ تو مفتوح والئے ملک ہی کو فتح کیا ہوا ملک بعض شرائط کے ساتھ واپس کر دیتا تھا۔ اور اس کو ملک کی آسائش کی طرف توجہ دلایا کرتا تھا۔

اس مملکت سے ملحق یا ماتحت جس قدر والیان ملک تھے۔ ان سب سے

اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ راجگان گندہار۔ راجگان سندھو راجگان راجور۔ راجہ مدر۔ راجہ اودبانڈپور۔ بلتستان وغیرہ اس کے حسن سلوک کے مداح تھے۔

راجہ مالدیو والئے مدر دیش کے ساتھ اس کے جو تعلقات تھے اس کا قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے۔

اودبانڈپور کا راجہ بھی اس کا رشتہ دار تھا۔ وہ راجہ سندھو سے مدد لیکر بار بار سرکشی کرتا تھا۔ اور بڈشاہ بار بار اس کی خطائیں معاف کرتا تھا۔ اور فتح پانے کے باوجود اس کو پھر تخت پر بیٹھاتا تھا۔

ھٹہ قوم کی سرزمین پر گوگا قوم کی حکومت تھی۔ بادشاہ نے اس کو بھی فتح کر لیا تسے زبیہ (الداخ) کے مقام پر مہاتما بدھ کی ایک سنہری مورتی تھی۔ لوگوں نے اس مندر کو جس میں وہ مورتی تھی لوٹنا چاہا۔ بادشاہ نے بڑی حکمت کے ساتھ ان کو اس ارادے سے باز رکھا۔

کلوٹہ کا علاقہ جب بادشاہ نے فتح کر لیا۔ تو ھٹہ قوم پر بادشاہ کی سخت ہیبت چھاگئی۔ اور ہنوں نے آیندہ چھیڑ خانی اور سرکشی بند کر دی۔

راجہ راجوری کو نلک راج

بادشاہ نے جب ۴۳۴۶ لوکک کے سیلاب عظیم کے بعد ایک نیا شہر زینہ نلک کے نام سے جیاپیڈپور (اندرکوٹ) کے قریب آباد کیا۔ تو اس نے اپنی سالگرہ (جنم دن) کا جشن جس کو وہ ہر سال منایا کرتا تھا۔ اس نے شہر میں منانے کا ارادہ کیا اس دربار میں جو ماتحت راجے۔ رئیس اور جاگیردار اور اہل دربار دار الحکومت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ان سب کو اس نے شہر کی رونق بڑھانے کے لئے یہاں آنا پڑا۔ انہی ماتحت راجوں میں

(۱ے حاشیہ صفحہ ۲۳ پر دیکھیں)

راجوری کا نیا راجہ جے سما (جے سنگھ) بھی تھا جس کو ابھی تک باقاعدہ مسند نشینی اور راجگی کے اختیارات نہیں ملے تھے۔ بادشاہ نے اس تقریب پر راجہ جے سنگھ کو اپنے ہاتھ سے راج تلک لگایا۔ بادشاہ اس کی خدمات سے بڑا خوش تھا اس نے مسرت کے ساتھ راجوری کی خوش حال اور شاداب سلطنت کا جے سنگھ کو حقدار تسلیم کیا۔

۳۸ لوکک میں سیلاب آیا تھا۔ ۳۹ لوکک میں یعنی دوسرے سال بادشاہ نے زینہ تلک کو آباد کیا ہوگا۔ ۳۹ لوکک ۱۴۶۳ء اور ۸۶۷ھ کے مطابق تھا اس حساب سے راجہ جے سنگھ کو ۱۴۶۳ء میں راجوری کی باقاعدہ حکومت ملی تھی۔

تاریخ راجور کا مصنف لکھتا ہے۔ کہ راجگان راجور شہاب الدین غوری کے زمانہ میں مسلمان ہو چکے تھے۔ اور جہانگیر تزوک میں لکھتا ہے۔ کہ فیروز شاہ خلجی کے عہد میں والیان راجور نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

راجگان راجور کا قبول اسلام

صاحب اسلامک کلچر ان کشمیر لکھتے ہیں۔ کہ وہ بڈشاہ کے زمانہ میں ہندو ہی تھے چنانچہ راجوری کے راجہ چندر سین نے اپنی راجکماری بڈشاہ کی خدمت میں پیش کی تھی لیکن زونراج جو بڈشاہ کے عہد کا مصنف درباری شاعر اور مصاحب ہے اپنی تاریخ زینہ راج ترنگنی میں راجوری کے نئے راجہ کا نام جے سما جس کو ہم

(۱) حاشیہ صفحہ ۳۲۴) کلوت علاقہ کلو کا قدیم نام ہے۔ جو آجکل کانگڑہ میں واقع ہے۔ کلو اور لاہول اور اس کے ملحقہ علاقہ جات کشمیر کے راجگان ہنود کے زمانہ میں کشمیر کے ماتحت ہوا کرتے تھے۔ بڈشاہ نے بھی ان کو فتح کیا۔ اور چونکہ یہ مقامات بھوٹوں کی سرحد پر واقع تھے۔ بلکہ یہیں سے بھوٹہ آبادی شروع ہو جاتی تھی۔ اس لئے بھوٹہ قوم کے سرداروں نے اس کی اطاعت اختیار کر لی۔

جے سنگھ یا جے سین کہہ سکتے ہیں۔ لکھتا ہے۔ اس لئے راجگان راجور اور تزک جہانگیری دونوں کی تحریریں بڈشاہ کے ہمعصر مصنف کی تحریر کے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بڈشاہ کے زمانہ میں راجگان راجور ہندو ہی تھے۔ یہ مسلمان کب ہوئے۔ یقیناً بڈشاہی عہد کے بعد کسی زمانے میں ہوئے ہوں گے۔ جیسا کہ مصنف تاریخ راجگان جموں و کشمیر صفحہ ۱۲ جلد اول میں لکھتا ہے ۔" خاندان راجگان راجور بعہد شاہان مغلیہ مسلمان ہو گئے۔ ان کی برادری کچھ ہندو بھی ہے۔" لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاہان مغلیہ کا تعین بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ لوگ بابر یا ہمایوں یا سوری خاندان یا اکبر کے زمانہ ہی میں مسلمان ہوئے ہوتے۔ تو جہانگیر فیروز شاہ خلجی کا ذکر نہ کرتا۔ جو مغل خاندان سے کئی سو سال قبل ہندوستان کا بادشاہ رہا ہے۔ راجگان راجور کے قبول اسلام کا زمانہ بہر حال بڈشاہ اور بابر کے درمیان گزرا ہے۔

صاحب اسلامک کلچر نے راجوری کے راجہ کا نام سندر سین لکھا ہے۔ اور اس کی تخت نشینی کا سال ۱۴۵۰ء بتایا ہے۔ چونکہ راجہ جے سما کو ۱۴۶۳ء میں بادشاہ اپنے ہاتھ سے راجوری کا راج تلک دیتا ہے۔ اس لئے جے سما سندر سین کا فرزند یا اس کے قریبی عزیزوں میں سے تھا۔ کیونکہ ۱۴۵۰ء اور ۱۴۶۳ء یہ دونوں سال بالکل قریب العہد ہیں۔

بڈشاہی عہد میں حقوق ہنود گان

کرنل سرہیگ لکھتے ہیں۔ بڈشاہ کے عہد میں ہر فرقہ اور ہر شخص کو مذہبی آزادی

۱؎ راقم نے بھی تاریخ اقوام کشمیر اور تاریخ اقوام پونچھ میں راجگان راجور اور تزک جہانگیری کی سند پر راجگان راجور کے قبول اسلام کا زمانہ بڈشاہ سے بہت پہلے بتایا ہے۔ زونراج کی تاریخ ان کتابوں کی تصنیف کے بعد دستیاب ہوئی ہے۔

کی نعمت جو اس سے قبل کشمیر میں مفقود تھی۔ حاصل تھی۔ بادشاہ نے اسی سلسلہ میں بیوگان کو بھی دوسرا نکاح کرنے کی اجازت دیدی۔ کرنل سرمیگ نے ان الفاظ کی سند کے لئے گو کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن جس بادشاہ نے زچہ و بچہ کی آسائش کے لئے ممالک غیر سے قابلہ (دائیاں) منگوائی ہوں۔ جس نے ستی کی رسم کو کبھی دل سے پسند نہ کیا ہو۔ اور پھر اس کو بھی بہ جبر نہیں۔ بلکہ عورت کی مرضی اور منشار کے ماتحت رکھا ہو۔ جس نے ہندو قوم کے لئے جزیہ تک معاف کر دیا ہو۔ جس نے بہ جبر مسلمان ہونے والے ہندوؤں کو پھر ہندو دھرم میں آجانے کی اجازت دیدی ہو۔ کوئی تعجب نہیں اگر اس نے ہندو بیوگان کے مصائب کو دور کرنے کی طرف بھی توجہ کی ہو۔

ممکن ہے اس زمانے میں مسلمان بیوگان کی بھی دوبارہ شادی نہ ہوتی ہو۔ یا اس کا بہت کم رواج ہو۔ اس لئے کہ کشمیر میں اسلامی سلطنت کے قیام کو ابھی سو سوا سو سال ہی کا عرصہ گذرا تھا۔ لیکن ہندو بیوگان میں دوبارہ شادی کا ان ایام میں بالطلق کوئی رواج نہیں تھا۔ ہندو بیوہ عورت ہو یا مسلمان بیوہ عورت۔ اس کو خاوند کے مرنے کے بعد اپنی بقیہ تمام زندگی جس مصیبت کے ساتھ کاٹنی پڑتی ہے اس زمانے میں جبکہ مسلمانوں میں نکاح بیوگان کا عام رواج ہے اور ہندوؤں کا ایک طبقہ بھی ان کے نکاح ثانی کو جائز سمجھکر قدیم رسم و رواج کو توڑ رہا ہے۔ شاید اس کا احساس بہت کم ہو سکے۔ لیکن نہ صرف زمانہ قدیم میں بلکہ موجودہ زمانہ سے صرف نصف صدی پیشتر بیوہ عورت خصوصاً ہندو بیوہ عورت کو میکے اور سسرال دونوں جگہ نحوست کا باعث سمجھا جاتا تھا۔

سلہ بڈشاہ ۸۲۳ھ میں تخت کشمیر پر بیٹھا۔ اس سے صرف ۴۲ سال پیشتر ۷۸۱ھ میں جبکہ حضرت سید علی ہمدانی کشمیر میں تشریف لائے۔ تو سلطان قطب الدین کشمیر کا بادشاہ تھا (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۸ پر)

اکیسواں باب ۲۱

پھولوں کا تیوہار

اکبر شاہ ثانی خلف شاہ عالم ثانی کے بیٹے مرزا جہانگیر کو جب ۱۸۰۹ء میں رزیڈنٹ دہلی مسٹر سٹین پر گولی چلانے کی وجہ سے الہ آباد میں انگریزوں نے نظربند کر دیا۔ تو شاہزادہ کی ماں نواب ممتاز محل نے یہ منت مانی۔ کہ جب شاہزادہ رہا ہو کر آئے گا۔ تو وہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر پھولوں کا چھپر کھٹ اور غلاف چڑھائے گی۔ چنانچہ جب شاہزادہ رہا ہو کر آیا تو بادشاہ بیگم نے اپنی منت پوری کی۔ اس موقع پر اتنی خلقت جمع ہو گئی۔ کہ بڑا بھاری میلہ لگ گیا۔ اس کے بعد اکبر شاہ بحال ہر برس ساون کے مہینہ میں آتا رہا۔ اس کی جیب خاص سے دو سو روپیہ پھول والوں کو پنکھے وغیرہ کی تیاری کے لئے ملا کرتا تھا۔ اس کے فرزند ابوظفر بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ میں بھی یہ میلہ برابر قائم رہا۔ بلکہ اس زمانہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۲) اور اس زمانہ میں کشمیر میں اسلام کا یہ حال تھا۔ کہ بادشاہ قطب الدین کے عقد میں دو حقیقی بہنیں تھیں حالانکہ اسلام دو سگی بہنوں کو بیک وقت کسی مسلمان کے عقد میں رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ جب حضرت سید علی ہمدانی کو اس بات کا علم ہوا۔ تو انہوں نے بادشاہ کو شریعت اسلامیہ کی رُو سے ایک کو طلاق دینے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ بادشاہ نے ان کے مشورہ پر عمل کر کے اپنی دونوں بیگموں میں سے جو سگی بہنیں تھیں ایک کو طلاق دیدیا۔

سے اب تک یہ میلہ ہر برس قطب صاحب میں دھوم دھام سے ہوتا ہے ۔ اور اسے "پھول والوں کی سیر" کا میلہ کہتے ہیں۔ دہلی میں اس میلہ کو اچھی خاصی شہرت حاصل ہے۔ اس موقعہ پر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا اور دوسرے بزرگوں کے مزاروں پر خوش الحان قوال بھی آجاتے ہیں جس سے رونق دوبالا ہو جاتی ہے ۔

اس[1] سے صدیوں پیشتر اس قسم کا ایک میلہ کشمیر میں بھی ہوتا تھا۔ جسے "پھولوں کا تہوار" کہتے تھے۔ اس تیوہار پر شگوفہ پھوٹنے کا نظارہ کیا جاتا تھا۔ یہ موسم بہار کے آغاز میں ہوتا تھا۔ اسے "جشن نوروز" اور "جشن شگوفہ" کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ ان دنوں کی یادگار ہے جب کشمیری تہذیب و تمدن پورے اوج پر تھے۔ اس گئے گزرے زمانہ میں بھی یہ جشن کشمیریوں کے دلوں کو برماتا اور ان میں زندگی اور جوش کی لہر پیدا کرتا ہے۔ ہر پیشانی مسرور نظر آتی ہے۔ اور ہر غنچۂ دل نسیم بہجت سے شگفتہ دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ تقریب عیش و طرب ہے جس کے طغیان ابتہاج اور طوفانِ لذات میں باشندگان کشمیر ڈوب جاتے ہیں ۔

مارچ کا مہینہ شروع ہوتے ہی جاڑے کی استبدادی حکومت میں اضمحلال ہونے لگتا ہے۔ اس وقت نیچر گہری نیند سے بیدار ہو کر انگڑائیاں لیتی تلک یوس پہاڑوں سے برف ڈھلنی شروع ہوتی۔ دریاؤں کے منجمد پانی حرکت میں آتے۔ مردہ زمین میں از سر نو زندگی کے آثار نمایاں ہوتے۔ اور چھوٹے چھوٹے پودے اپنی برفانی قبروں سے سر باہر نکالتے ہیں ۔

سورج گرمجوشی کا اظہار کرتا ہے۔ چاند اپنی چاندنی سے انج میں ٹھاس

[1] ماخوذ از مضمون مولانا محمد عبداللہ قریشی بی اے بعنوان "کشمیر میں دعوت پھولوں کی"۔

ڈالتا اور پھولوں میں رنگ بھرتا ہے۔ تمام کوہ و دشت سبزے سے ڈھک جاتے۔ درخت غنچہ بار ہوتے۔ ان کی نازک نازک شاخیں دھانی کونپلوں کے زیور اور رنگ رنگ کے پھولوں اور شگوفوں کے بوجھ سے لچکنے لگتی ہیں پھر جوں جوں دن گزرتے ہیں۔ چاروں کھونٹ خوشحالی چھا جاتی ہے۔ جدھر نظر اٹھاؤ۔ پھول ہی پھول دکھائی دیتے ہیں۔ مکانوں کی چھتیں۔ سڑک کی روشیں۔ باغوں کے جنگلے۔ غرضیکہ ہر مقام عروس بہار بن جاتا ہے موج گل کی شدت سبزے کو مغلوب رنگ کر لیتی ہے۔ اور تا بہ حد نگاہ پھولوں کی رنگینی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

ندی نالوں اور جھیلوں کا پانی بھی خنک لذت پیش کرتا اور آبحیات کا کام دیتا ہے۔ ان کے کنارے پانی سے لبریز چادلوں کی چھوٹی چھوٹی کیاریاں ایسی معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے کسی باکمال مصور نے اپنی تصویر میں لاتعداد خطوط کھینچ کر مہارت فن کا مظاہرہ کیا ہو۔ سطح آب پر مست تعطر غنچے اس طرح پڑے بستے ہیں۔ گویا کسی پری کا ہار ٹوٹ کر بکھر گیا ہے۔ شگوفے ٹہنیوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر پھولوں کا مینہ برساتے اور زمین کو گل پوش کرتے ہیں۔ شمشاد کے بلند و بالا درختوں کے سفید سفید پھول روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں ادھر ادھر اڑتے اور باغوں میں سبزے کا فرش مخملی آنکھوں کو طراوت بخشتا ہے۔ نیلے پیلے۔ لال۔ گلابی۔ کاسنی۔ بنفشئی۔ سفید اور نارنجی رنگ کے پھولوں کی کیاریاں ہر طرف لذت و انبساط بکھیرتی۔ نکہت پھولوں کے اندر سے انگڑائیاں لیتی ہوئی نکلتی۔ ٹھنڈی نسیم رندانہ وضع کے ساتھ بید مجنوں کی شاخوں سے کھیلتی۔ اور اسے سر تا پا لرزش بنا دیتی ہے ؎

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

فضا مہک جاتی ہے۔ چلتے پھرتے خوشبو کی لپٹیں آتی ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ع اڑتی ہے شراب پھول بن کر۔

اس کے ساتھ ہی خوبصورت قوس و قزح کی سی رنگین تتلیاں ایک مستقل اضطراب کے ساتھ ہوا میں رقص کرتی دکھائی دیتی ہیں خوش نما چڑیاں اور خوش آواز پرندے اپنے وطن میں واپس آکر بہار کے گیت گاتے اور بھونرا پھولوں کے گرد پروانہ وار جھومتا ہے۔

جب فطرت کے یہ نئے نئے روپ اور البیلے سنگھار انسانی جذبات میں طلاطم برپا کرتے۔ اور افقی مناظر لطف کے لئے بالکل ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں۔ تو سیر و تفریح کے شوقین باہر نکل آتے ہیں۔ اور باغات کے قریب جھیل کا تمام ساحل شکاروں سے بھر جاتا ہے۔ لوگ ملکۂ بہار کی آمد کے انتظار میں سارا سارا دن باغوں میں گزارتے۔ پھولوں سے کھیلتے۔ اور ان کی خوش آبی سے دماغوں کو تر و تازہ کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا قدرت خدا تمام "سرما" رتی" اور "کاما" کی سیر و تفریح کے لئے باغات کو شاداب کرنے میں مشغول رہی ہے۔ کیسے باغات؛ جہاں کے زہریلے کیڑے بھی غیر تکلیف دہ اور جہاں کے موسیقی نواز پرند سیاحوں کو گا کر خوش آمدید کہتے ہیں۔

اگرچہ کشمیر میں پھولوں کے عظیم الشان تہوار کی سابقہ شان و شوکت تو اب نظر نہیں آتی۔ تاہم کشمیر کے زندہ دل لوگ شگوفہ کے موسم میں "پھول نہیں تو پنکھڑی ہی سہی" کے مصداق اب بھی اپنا دل خوش کر لیتے ہیں۔

بادشاہ کی روانگی بج بہارہ کو

بڈشاہ کے عہد میں اس تہوار کی رونق کا کچھ اور ہی عالم تھا۔ ہم یہاں

شرلوبر کی زینہ راج ترنگنی سے کشمیر میں پھولوں کے تہوار کی کچھ کیفیت بیان کرتے ہیں۔

موسم بہار بادشاہ نے اپنے فرزند ادہم خاں کے ساتھ لڑائی ہی میں گزار دیا۔ اب گرمی کے دن آرہے تھے چیت کے مہینے میں پھولوں کا تہوار بھی منایا جانے والا تھا۔ بادشاہ اس تہوار کی رونق بڑھانے کے لئے ولیعہد کو ہمراہ لے کر شاہی کشتی پر سوار ہوا۔ شرلوبر لکھتا ہے۔ بادشاہ کی کشتی کے آگے پیچھے وزرا امرا کی کشتیوں کی قطاریں وتستہ کے صاف وہموار سینہ پر اس طرح دوڑ رہی تھیں۔ جیسے دودھ کی سڑک پر راجہ اندر کی رتھیں جا رہی ہوں۔

بادشاہی کشتی پر جھنڈا لہرا رہا تھا۔ رات کو بادشاہ نے وانتی پورہ میں قیام کیا۔ صبح پھر ترتیب و نظام کے ساتھ کشتیاں مدوراج (مراز) کی طرف روانہ ہوئیں۔ وجیشور یعنی بج بہارہ اور دیگر مقامات پر بادشاہ کو ناچ رنگ اور رقص و سرود کے تماشے جو اس تہوار کے موقعہ پر لوگوں کی فرحت کا باعث تھے نظر آئے۔

بادشاہ کی آخری منزل بج بہارہ ہی تھی۔ اس لئے وہ یہیں اتر پڑا جس مکان میں بادشاہ نے قیام کیا۔ وہ اتنا وسیع تھا۔ کہ چند وزرا اور اس کا ولیعہد بھی وہیں قیام پذیر ہوگئے۔ باقی وزرا اور درباری لوگوں کے لئے خیمے لگائے گئے۔ اور چند ہی گھنٹوں میں بج بہارہ ایک سجی سجائی دلہن کی طرح آراستہ ہوگیا۔

بلہ؎ یہ ان ایام کا ذکر ہے جب ۸۶۳ھ کی لڑائی کے بعد بادشاہ نے ادہم خاں کو جلا وطن کرکے حاجی خاں کو خلعت ولیعہدی دیدیا تھا۔

" بادشاہ کی قیام گاہ یاسمین اور دیگر کئی قسم کے پھولوں سے سجائی گئی تھی۔ دوسرے وزرا، اور درباریوں کے خیمے اور ہر کانات بھی گلہائے رنگا رنگ سے زینتِ چمن کیا رشک چمن نظر آرہے تھے۔

کمالاتِ موسیقی کا شاہی دربار

بادشاہ نے اس تہوار کے لئے جس کا تعلق صرف کشمیری پنڈتوں کے ساتھ ہی تھا۔ ایک دربار منعقد کیا۔ دربار کے چاروں طرف پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ چونکہ اس دربار کا سیاسیات یا ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ یہ ایک تہوار کا جشن تھا۔ اس لئے بادشاہ نے اپنے درباری گویوں اور فن موسیقی کے ماہرین کو اپنے کمالات دکھانے کا حکم دیا۔ پہلے چھوٹی لڑکیاں آئیں۔ جو خوبصورتی کے ساتھ خوش الحانی کے جوہر بھی رکھتی تھیں۔ ان کے کشمیری گیت اہل دربار کو مسحور کر رہے تھے شریور لکھتا ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جنت کی حوریں دنیا کی اس جنت پر آکر گا رہی ہیں۔

تارا نام ایک ماہر موسیقی نے ناراج (Naracha) قسم کا گانا بادشاہ کو سنایا۔ اُت سوا (utsawa) نام ایک عورت نے جو کشمیر کی مشہور گانے والیوں میں تھی۔ اپنے لحن داؤدی سے کشمیری زبان میں وہ گیت گائے جو اپنے مضامین کے لحاظ سے بھی بڑے موثر تھے۔ اور جس انداز سے وہ ادا کئے گئے تھے۔ وہ بھی دلوں کو موہ لینے والی تھی۔

سجایا (Sajaya) نے اپنے دلفریب نغموں سے اپنے استاد عبدالقادر کا نام روشن کر دیا۔ ملا جادق خراسانی نے مگرمچھ کے چمڑے کے طنبور پر بادشاہ کو اپنا گانا سنایا۔ ملا جمال نے جو ملیچھ زبان میں اعلیٰ قسم کا

۱۔ حاشیہ صفحہ ۳۳۲ کے نیچے)

گا نا جانتا تھا۔ بادشاہ کو اس موقعہ پر بہت خوش کیا۔ اپنے متعلق شرلوبہ لکھتا ہے۔ کہ میں تمام راگ اور راگنیوں سے پورے طور پر آگاہ ہوں میں نے بھی بادشاہ کو کدو کے بنائے ہوئے طنبورے پر گا کر دل شاد کیا۔ حافز اتن اور دوسرے درباری گوئیے میرے ساتھ مل کر نہایت اشکل طرزوں میں جو شرشک (ترکی) کہلاتی تھیں۔ گاتے رہے ہم نے بارہ مختلف قسم کی طرزوں میں بادشاہ کو گانے سنائے۔ اور جب تاروں کے ذریعہ صدائیں گونجتی تھیں۔ تو لوگ بن پئے مست نظر آتے تھے۔

آتشبازی کی کیفیت

دن کو عام تفریحات کے علاوہ رات کو مختلف قسم کی آتشبازی چلائی گئی جو کوئلہ۔ گندھک۔ شورہ وغیرہ سے بنائی جاتی تھی۔ بادشاہ کو اس فن سے بھی پوری آگاہی تھی جبیب آتشباز نے اس کی ہدایات کے مطابق اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی آتشبازی تیار کی تھی۔ شرلوبہ لکھتا ہے۔ شورہ خالی نالیوں کے اندر بھر دیا جاتا تھا۔ پھر اس کو آگ لگا دی جاتی تھی۔ اور اس آگ سے جو چنگارے نکلتے تھے۔ وہ ایک ایسا درخت معلوم ہوتے تھے جس کے پتے سنہری شعاعوں کی شکل میں نظر آتے تھے۔ وہ لکھتا ہے۔ ایک نل میں شورہ بھر دیا گیا۔ اور اس نل کو رسی کے ساتھ باندھکر شورہ کو آگ لگا دی گئی۔ آگ لگنے کی دیر تھی کہ نل خود بخود اس شورہ کے زور سے اتنی دور تک جہاں تک وہ رسی لمبی تھی۔ کشش مقناطیس کی طرح روانہ ہونے لگا اور جب اس رسی کو واپس کھینچا گیا تو وہ نل جو شورہ سے بھرا ہوا تھا اسی طرح شرر باریاں کرتا شعلے چھوڑتا اور چنگاریاں نکالتا واپس آگیا۔

حاشیہ صفحہ ۳۲۸) شرلوبہ ہر غیر کشمیری اور غیر سنسکرت زبان کو ملیچھ زبان اور ہر غیر ہندو کو ملیچھ تصور کرتا ہے لے شاید جعفر نام ہو۔

دربار شبینہ میں آتشیں ناچ

آتش بازی کے بعد رات کو بھی دربار منعقد ہوا۔ اس میں رقص وسرود کی محفل گرم ہوئی۔ اور آتشین ناچ نے تو قیامت پیدا کر دی۔ شریویر اس ناچ کی تعریف میں لکھتا ہے۔ شورہ سے بھرے ہوئے نل ناچنے اور گانے والی نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کے ہاتھوں میں دیئے جاتے تھے۔ اور جب شورہ کو آگ لگا دی جاتی تھی۔ تو وہ ناچنا اور گانا شروع کر دیتی تھیں۔ اس ترکیب سے ان کے ہاتھوں سے چنگارے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ بادشاہ اور اس کے وزرا اور دیگر لوگ اس نظارہ سے بہت خوش ہوتے تھے۔ یہ اس قسم کا آتشین ناچ تھا۔ کہ بادشاہ سے قبل اور بادشاہ کے بعد کشمیر کیا کسی اور ملک میں بھی نہیں سنا گیا۔

بادشاہ نے گانے والوں اور گانے والیوں سب کو ان کی حیثیت کے کے موافق انعام واکرام سے مالامال کیا۔ اسی تقریب پر اس نے حکم دیا۔ کہ طنبور اور ربا ؤ (رُباب) اور موسیقی کے دیگر آلات سونے۔ چاندی اور جواہرات سے مزین کئے جائیں۔

اس موقعہ پر شریویر لکھتا ہے۔ ہمیں ایسا بادشاہ کہاں ملیگا۔ جو ایجادات میں بھی ماہر ہے۔ موسیقی کا بھی قدردان ہے اور فصاحت وبلاغت جس کے گھر کی ادنی کنیز ہے۔ کتابیں تصنیف کرتا ہے۔ اور مقدس کتابوں کے مضامین شوق سے سننے کا عادی ہے۔ اور ہمہ صفت موصوف ہے۔

ولیعہد حاجی خاں کو شاہی انعام

شریویر لکھتا ہے جس وسیع مکان میں بادشاہ اور ولیعہد ٹھہرے ہوئے تھے۔ اسی مکان میں بادشاہ نے ولیعہد سے کچھ ایسی فلسفیانہ باتیں کیں جن

کے جواب سے اس کو مسرت حاصل ہوئی۔ بادشاہ نے یہیں اپنے فرزند دوم یعنی دلیبد کو ایک خنجر جو سونے سے مرصع تھا۔ بطور انعام عطا کیا۔

چونکہ دربار میں کچھ لوگ بادشاہ کے بڑے مگر شکست خوردہ فرزند ادہم خاں کے حامی تھے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے ان لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اب تخت کشمیر حاجی خاں کے سوا اس کے کسی اور فرزند کا حق نہیں ہے۔ اس کو خنجر مرصع بطور اظہار محبت عطا فرمایا۔

اہل دربار اور عوام پر حاجی خاں کا اثر و اقتدار قائم کرنے کے لئے بڑے فرزند کی جلا وطنی کے بعد بادشاہ اس کو اپنے تمام کاموں میں شریک رکھتا تھا۔ کوئی دربار سیاسی یا تفریحی یا مذہبی ایسا نہ ہوتا تھا۔ جس میں حاجی خاں شریک نہ ہو۔ بلکہ ہر سفر اور ہر سیر و سیاحت میں بادشاہ حاجی خاں کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

۲۲
بائیسواں باب

علم موسیقی اور بڈشاہ

بڈشاہ کی موسیقی سے دلدادگی

بڈشاہ کے دربار میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کے صاحب کمال موجود تھے اس کی فیاضی و سخاوت اور اس کی قدر دانیوں اور ہنر پروریوں کی شہرت سُنکر ہندوستان کے علاوہ خراسان و بغداد تک سے ارباب کمال کھنچے چلے آتے تھے۔

مشائخ کبار اور علمائے کرام بھی اس کے دربار میں موجود تھے۔جوگیان باصفا اور صوفیان بے ریا بھی اس کے دربار کی زینت تھے۔شاعران جادو بیان بھی بزم شاہی کی رونق تھے۔ اور صانع و کاریگر اور دیگر اہل حرفت نے بھی اس کی سرپرستیوں کے دامن میں پرورش پاکر اپنے کمالات سے اس کی شہرت کو چار چاند لگا رکھے تھے۔انہی میں علم موسیقی کے ماہر بھی تھے۔ اور بڈشاہ چونکہ علم موسیقی کا شائق بلکہ کئی سازوں کا موجد تھا۔ اس لئے دیگر اہل علوم و فنون کے ساتھ علم موسیقی کے جاننے والوں کی بھی بڑی قدر ہوتی تھی۔چنانچہ صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں۔ کہ سلطان زین العابدین ہر قسم کے علوم و فنون کا سرپرست تھا۔علم موسیقی میں وہ بڑا ماہر تھا۔ اس کی سخاوتوں کے قصے سن سن کر اطراف و اکناف سے کئی قسم کے باکمال کشمیر میں جمع ہو گئے تھے[۱]۔غرض سے

ہر طرف سے آئے تھے کچھ کچھ کے کیا کیا اہل ذوق

اہل علم اہل ہنر اور اہل تقوی اہل دیں

بادشاہ موسیقی کا اس قدر دلدادہ اور اس سے اس قدر مسحور ہو چکا تھا۔ کہ جب کبھی وہ مطربوں سے خوش ہوتا۔ تو ان کو بیش قیمت انعام و اکرام دیتا۔ اور ان میں جو زیادہ ماہر ہوتے۔ان کو درباری گویئے مقرر کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرتا۔ لکھا ہے کہ مطربوں سے خوش ہو کر اس نے کئی مرتبہ ان کے آلات موسیقی مثلاً بین و رباب وغیرہ سونے سے آراستہ کرا دیئے۔ اور ان کو زر سے لبریز کرا دیا۔ جیسا کہ پھولوں کے تہوار کے سلسلہ میں گزشتہ باب میں ذکر ہو چکا ہے۔

صاحب وجیز التواریخ نے بھی بادشاہ کی سرود افزائی کا ذیل کے

[۱] ترجمہ از اسلامک کلچران کشمیر (انگریزی) صفحہ ۲۲۴

الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ سلطان کو ساز و سرود سے بھی بہت رغبت تھی۔ وہ اس فن کو خوب جانتا اور راگ کی ماہیت کو خوب سمجھتا تھا۔ ملا عود اور ملا جمیل کہ علم موسیقی میں صاحب تصانیف اور کئی راگ راگنیوں کے بانی تھے اس نے خراسان سے بلوائے۔ اور ان کو انعامات سے سرفراز کیا۔[1]

بڈشاہ کے علم موسیقی میں ماہر ہونے کا قریباً تمام مصنفین و مورخین نے ذکر کیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے۔ کہ اس نے کئی آلات خود بھی ایجاد کئے تھے۔ لیکن ایک آلہ یا ساز کا ذکر صاحب طبقات نے ذیل کے الفاظ میں کیا ہے۔ بادشاہ نے گانے کا ایک ایسا آلہ تجویز کیا تھا کہ "یک نقش را بہ دوازدہ مقام ادا مے نمود" یہ ساز آج عنقا ہے۔ بادشاہ کی قدردانیوں کا ذکر کرتے ہوئے صاحب طبقات لکھتے ہیں۔ سلطان کے حکم سے رباب۔ بین اور دیگر آلات سرود مرصع بہ زر کئے جاتے تھے۔

کشمیر میں موسیقی کے مدارس

ابوالفضل کے قول کے مطابق ایرانی و تورانی راگی بھی اس کے دربار میں موجود تھے۔ ان میں سے بعض نے کشمیر میں موسیقی کے مدارس جاری کئے۔ اور جب انہوں نے بادشاہ کے حضور میں ان مدارس کی سرپرستی کی درخواستیں کیں۔ تو بادشاہ نے جو فقہ و حدیث اور تفسیر کے مدارس کا بھی سرپرست اور سنسکرت زبان کے پاٹ شالاؤں کا بھی مربی تھا۔ اور فارسی زبان کی درسگاہوں کا بھی معاون تھا۔ فنون لطیفہ کی اشاعت کا خیال رکھتے ہوئے موسیقی کے مدارس کی بھی سرپرستی و امداد قبول فرمائی

---

[1] اصل فارسی میں ہے۔ یہ ترجمہ ہے۔

ان مدارس میں سے چند ایک سرینگر ہی میں تھے۔ اور گو ابوالفضل اور صاحب تاریخ فرشتہ نے ان کا محل وقوع نہیں بتایا۔ تاہم قیاس یہ کہتا ہے۔ کہ یہ مدارس نوشہرہ کے قرب وجوار میں ہونگے۔ جو بڈشاہ کا دار الحکومت تھا۔ اور جس کو بادشاہ نے عالیشان ایوانوں اور نہروں اور باغوں کے اجراسے نمونہ بہشت بنا رکھا تھا۔

ایرانی راگنیاں جو کشمیر کے سازندوں اور مطربوں نے اختیار کر لیں۔ حسب ذیل بتائی جاتی ہیں۔ ساگا راست۔ کشمیری راست۔ چراغ۔ عراق۔ نوا۔ ریحانی شاہ نواز۔ نوروز۔ نے ریز۔ اور زنگولہ۔[1]

کشمیری آلات موسیقی

کشمیری سازندے طوطی شہنائی بجانے میں بڑے ماہر تھے۔ لیکن ان کے بڑے بڑے آلات موسیقی جو بڈشاہ کے زمانے سے اب تک چلے آتے ہیں حسب ذیل ہیں۔ گیجگت۔ جو ہندی سارنگی سے مشابہت رکھتا ہے۔ لیکن اس سے ذرا بڑا ہے۔ اسے ایک کمان سے بجاتے ہیں۔ ستار جو ہندی ستار سے چھوٹی ہوتی ہے۔ یہ نہایت نفیس ساز ہے۔ اور جب بجایا جاتا ہے۔ تو چنگ کی سی آواز دیتا ہے۔

دربار بڈشاہی کے نامور مغنّی

پنجاب کشمیر اور ہندوستان کے اکثر موسیقی دان نہ صرف اپنے ادنے کیریکٹر سے موسیقی کو بدنام کر رہے ہیں۔ بلکہ اہل علم نہ ہونے کی وجہ سے معزز

[1] مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم نے عرصہ ہوا۔ بڑودہ کی مجلس موسیقی کی تحریک سے ایک دلچسپ مضمون ہندی راگ پر ایرانی موسیقی کا اثر کے عنوان سے لکھا تھا۔ اور اسی میں کشمیر کی موسیقی کا بھی ذکر کیا تھا۔ یہ اقتباس اسی مضمون سے لیا گیا ہے۔

طبقوں میں وہ قابل وقعت نظروں سے بھی نہیں دیکھے جاتے۔ گزشتہ زمانے کے لوگ اس فن کو ایک علم اور فن کے طور پر حاصل کیا کرتے۔ اور اس کی تکمیل کے بعد اس پر اعلیٰ کتابیں لکھا کرتے۔ جن سے نہ صرف ان کی قابلیتوں کا اظہار ہوتا تھا۔ بلکہ فنون لطیفہ کے شوقین ان کتابوں سے مستفیض ہوتے تھے۔

بڈشاہ خود اس علم میں صاحب کمال تھا۔ اس نے بازاری گویوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ بلکہ اس فن کے ایسے ایسے صاحب کمال بلوائے جو اپنے زمانہ میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔ ان کو دربار میں دوسرے صاحبان علوم و فنون کے برابر جگہ دی۔ چند نامور موسیقی دان جو اس کے دربار کی زینت تھے حسب ذیل ہیں۔

یودی بٹ

کشمیری پنڈت تھا۔ خدا نے اسے عجیب دماغ دیا تھا۔ ذہن اس قیامت کا رسا اور حافظہ اس بلا کا تیز تھا۔ کہ شاہنامہ فارسی جس کو فردوسی نے تیس سال میں لکھا تھا۔ اسے ازبر یاد تھا۔ سلطان کو شاہنامے سے عشق تھا جب یودی بٹ اپنی مستانہ لے میں اسے پڑھتا تھا۔ تو بادشاہ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اس کی ایک کتاب علم موسیقی میں زینؔ نام ہے۔ جو نہایت معتبر سمجھی جاتی ہے۔ بادشاہ یودی بٹ کی بڑی قدر کرتا تھا۔

ملا عود

خراسانی النسل تھا۔ اور اس فن کے صاحب کمال خواجہ عبدالقادر کا عزیز اور مشہور شاگرد تھا۔ عود (بربط) بجانے میں بے مثل تھا۔ اور اسی رعایت سے اس کا نام ملا عود مشہور ہو گیا تھا۔ بادشاہ کی قدردانیوں کی شہرت سنکر خراسان سے کشمیر آیا۔ لکھا ہے کہ جب یہ عود بجاتا تھا۔ تو سامعین نقش بر دیوار ہو جاتے تھے۔

جب یہ بادشاہ کے دربار میں پہنچا۔ تو بادشاہ نے جو ہر فن اور ہر علم کا قدردان تھا اس کو اپنے دامن دولت میں جگہ دے کر فکر روزگار سے بے نیاز کر دیا۔ صاحب طبقات اکبری نے بھی ملا عود کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ عود اس غضب کا بجاتا تھا کہ محفل مدہوش ہو جاتی تھی۔ بادشاہ نے بارہا اس کو اپنی نوازشوں سے نوازا۔

ملا جمیل

بڈشاہ کے چرچے ہندوستان سے نکل کر ایران تک جا پہنچے تھے۔ جب خراسان میں یہ خبر پہنچی۔ کہ کشمیر کا بادشاہ اکثر سازوں عود۔ رباب۔ طنبور وغیرہ کو طلائے خالص سے مڑھکر جواہرات سے مرصع کرتا ہے۔ اور سازندوں کی ایسی قدر کرتا ہے۔ کہ ان کو شام غربت کی خزاں میں صبح وطن کی بہاریں فراموش ہو جاتی ہیں۔ تو بہت سے صاحبانِ کمال نے اپنی آشفتہ حالی کو دور کرنے کے لئے کشمیر کا رُخ کیا۔ ملا جمیل بھی جو علم موسیقی کا ماہر ہونے کے علاوہ بزلہ سنج اور شاعر بے بدل تھا۔ انہی میں سے ایک تھا۔ اس کی خوش الحانی و خوش خوانی اور اس کے خوش رنگ کلام سے تمام دربار خوش رہتا تھا۔ سلطان اس پر بڑا مہربان تھا۔ اور دل کھول کر اسے انعام دیا کرتا تھا۔

چنانچہ صاحب سیر المتاخرین جلد اول میں لکھتے ہیں۔ "ملا جمیل سلطان ابوسعید مرزا بادشاہ خراسان کے دربار کی زینت تھے۔ جب اس نے سنا کہ بادشاہ کشمیر کو بھی علم موسیقی میں دسترس ہے۔ تو اس نے بطور تحفہ ملا جمیل کو معہ اور تحائف کے بڈشاہی دربار میں بھجوا دیا۔"

مصنف تاریخ حسن بھی ملا جمیل کے متعلق لکھتا ہے۔ "در سخندانی و خوش خوانی لاثانی بود و خواندگی ہائے خوب در مجلس سلطان مے کرد و سلطان را

رفتے تمام دست داد و در صلۂ آں چنداں زر بہ ملا جمیل مے بخشید کہ شرح آں مقدور نیست ولقش ہائے ملا جمیل در کشمیر مشہور است"

سوم پنڈت

بڈشاہ کے اس نامور درباری کا ذکر اس کے درباریوں کے ذیل میں آئیگا یہاں اس کا صرف اس قدر ذکر کیا جاتا ہے۔ جو علم موسیقی سے تعلق رکھتا ہے۔ صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں۔ اس نے بادشاہ کے لئے ایک نئی کتاب مانک۔ علم موسیقی پر لکھی جسے بادشاہ نے اپنے نام پر معنون کرنا منظور فرماکر اس کی عزت افزائی فرمائی۔ صاحب اسلامک کلچران کشمیر لکھتے ہیں۔ سوم علم موسیقی کے ماہر ہونے کی وجہ سے بھی بادشاہ کا نہایت منظور نظر تھا۔

کشمیری مطرب دربار اکبری میں

اکبر اعظم جو بڈشاہ ہی کا ایک نمونہ تھا۔ دیگر اہل کمال کی طرح مغنیوں کا بھی بڑا مربی تھا۔ یہ بڈشاہ سے قریباً سو سال بعد ہوا ہے۔ اس زمانہ میں بھی کشمیری مغنی اپنے کمال کی وجہ سے اتنی شہرت رکھتے تھے۔ کہ اکبر جیسے عظیم الشان بادشاہ کے دربار میں بھی۔ . . . .

. . . .

ہندی ایرانی اور تورانی اور تان سین جیسے صاحب کمال جس نے علم موسیقی میں حیات تازہ پیدا کردی تھی مغنیوں کے پہلو بہ پہلو قدردانی کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

اکبر کے زمانہ میں چونکہ ہندی مغنیوں کی کثرت تھی۔ ان کے فیض صحبت سے کشمیری مغنی بھی متاثر ہوئے۔ اور جب یہ وطن میں واپس آئے۔ تو ان کے ساتھ ہی ہندوستانی راگنیوں نے وادی کشمیر میں قدم رکھنا شروع کیا۔

جس طرح کشمیری زبان حکومتوں کی تبدیلیوں کے ساتھ جدید سانچہ میں ڈھل رہی اور نئے الفاظ قبول کر رہی تھی۔ اسی طرح اکبر کے زمانہ میں کشمیری موسیقی ایرانی و ہندی موسیقی کے اشتراک سے ایک جدید قالب اختیار کر چکی تھی۔

موجودہ کشمیری موسیقی

آج کشمیری راگ سارے ہندوستان میں موسیقی کے لئے باعث تزمین سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ ہندوستان میں مثل مشہور ہے۔ کہ راگ ہندوستان میں پیدا ہوا۔ پنجاب میں یہ پروان چڑھا اور کشمیر میں جاکر دفن ہوگیا۔ اور یہ اعتراض اور نکتہ چینی وہ لوگ کرتے ہیں۔ جن کے اہل وطن بادشاہ کشمیر کے دربار میں خالی داماں لے کر آتے تھے۔ اور جب واپس جاتے تھے۔ تو کامیابیوں کا ایک خزانہ ان کے ہمراہ ہوتا تھا۔ بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہوتے تھے۔ جو بادشاہ کشمیر کے دامن دولت سے لپٹ کر یہیں کے ہو رہتے تھے۔ اور کہتے تھے ؎

کس طرح جائے ترا در چھوڑ کر جائے کہاں
ذوق وابستہ ہے تیرے دامن دولت کے ساتھ

جس ملک کی اپنی دولت چھن جائے۔ اس کا اخلاق اور تمدن سب بدل جاتا ہے۔ بلکہ بگڑ جاتا ہے۔ اس کی خوبیاں برائیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اور فاتح جو غیر ملکی ہوتا ہے۔ ہر طرح سے ان کو پست ہمت اور پست خیال بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ محکوم قوم کے کمالوں پر زوال آجاتا ہے اس کی آزادی پر غلامانہ عادات غالب آجاتی ہیں۔ اور غلامی کی وجہ سے ان میں خوشامد۔ خوف۔ جھوٹ وغیرہ عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو قوم اور

ملک یہاں تک زوال پذیر ہو جائے۔ اس میں موسیقی کہاں تک ترقی کر سکتی ہے۔ ترقی تو کجا اس کا اصل حال پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے اور پھر موسیقی اور شاعری تو فارغ البالی۔ آزادی۔ بے فکری اور قومی حکومت کی عیش و عشرت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

خوشہ چینوں کے لگے رہتے تھے کیا کیا جمگھٹے
جب تک آتا تھا نظر پھولا پھلا یہ گلستاں
ایک ہی گردش میں تیری سب نے آنکھیں پھیر لیں
ایک ہی چشمک میں تو نے کیا کیا اے آسماں
اب نہ وہ گلچیں نہ وہ گلبن نہ وہ باغ و بہار
اب نہ وہ ساقی نہ وہ محفل نہ وہ پیر مغاں
ہے یہ افسانہ نصیحت اہل عالم کے لئے
ہے زمانے کے لئے عبرت ہماری داستاں

۲۳ تیئسواں باب

کشمیری صنعت و حرفت بڈشاہی عہد میں

کشمیری صنعت کی ترقی کا دور

مرزا حیدر جو بڈشاہ سے پون صدی بعد کشمیر میں ایک بادشاہ کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ اپنی تاریخ رشیدی میں لکھتا ہے کہ کشمیر ایسی عجیب و

غریب صنعتوں کا مرکز نظر آتا ہے۔ جو سمرقند۔ بخارا۔ ماوراالنہر میں بھی کہیں نظر نہیں آتیں۔ ان صنعتوں میں پتھر کو جلا دینا۔ پتھر کو کاٹنا۔ بوتلیں بنانا تاب دان تراشنا اور طلائی ورق بنانا خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔
کشمیر میں صنعت و حرفت کی اس ترقی کا سہرا سلطان زین العابدین کے سر ہے اس کے زمانے میں کشمیر علوم و فنون اور صنعتی و حرفتی کاروبار کا گہوارا اور امن و امان کا ملجا و ماویٰ تھا۔
مرزا حیدر نے اس بارہ میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس کی کیفیت الفاظ ذیل سے معلوم ہو سکتی ہے:" وصاحبان حرفہ کہ در اکثر شہرہا کم مے باشند مثل حکاک سنگتراش و شیشہ گر۔ تابدان تراش و زرکوب وغیرہ ہنرمندان کہ در تمام ماوراالنہر و سمرقند۔ بخارا در ہیچ جا ایں جماعہ نے باشد ساختہ و پرداختہ آں سلطان است"!
مرزا حیدر کے ان الفاظ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر کی تاریخوں میں بڈشاہی عہد کے صناعوں کے متعلق جو یہ لکھا ہے۔ کہ بڈشاہ ان کو سمرقند اور ماوراالنہر سے اس وقت اپنے ہمراہ لایا تھا۔ جب تیمور کی وفات کے بعد اس کو قید سے نجات ملی تھی وہ سراسر غلط ہے۔ مرزا حیدر اس کا قریب العہد مصنف ہے۔ اور اس کے زمانے میں کئی اشخاص ایسے زندہ اور موجود ہوں گے۔ جن سے وہ حالات کی تحقیق و تفتیش کر سکتا تھا۔ اور یقیناً اس نے بڑے بوڑھوں کو بلا کے ان سے حالات کی تصدیق بھی کی ہوگی۔ ورنہ سمرقند اور بخارا وغیرہ ممالک اس کے بزرگوں کا وطن تھا۔ اگر تمام بڈشاہی صنائع انہی ممالک سے آئے ہوتے تو وہ فخر و مباہات کے ساتھ اپنے وطن کے کاریگروں اور صناعوں کا ذکر کرتا۔

لہ تاریخ رشیدی قلمی ورق ۲۲۷ ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کشمیر۔

البتہ یہ ممکن ہے کہ قالین باف اور غالیچہ ساز سمرقند اور بخارا یا خراسان وغیرہ ممالک سے آئے ہوں۔ اور سنگتراش اور مصور کشمیر ہی کے ہوں کیونکہ ہندوستان کی طرح کشمیر میں بھی سنگتراشی اور مصوری کی صنعت ہندو زمانہ قدیم ہی سے چلی آتی ہے۔

بڈشاہی خشت اور ٹائیل

محلہ مدین صاحب سے تھوڑی دور آگے منڈی بل کے عبرت انگیز کھنڈروں میں بڈشاہی عہد کی کچھ ٹوٹی پھوٹی اینٹیں بھی نظر آتی ہیں۔ راقم الحروف کو وہاں کے لوگوں نے ایک اینٹ کے دو ٹکڑے لاکر دکھائے۔ جب ان کو جوڑا گیا۔ تو یہ اینٹ ۸½ انچہ موٹی اور ۱۵۔۱ انچہ لمبی اور ۱۲½ انچہ چوڑی نکلی۔ اینٹ کا ایک پہلو بالکل صاف اور دوسرا کھُردرا تھا۔ بڈشاہی عہد کی ٹائیلوں کا نمونہ مزار سید مدنی اور مقبرہ سلاطین کے ڈمٹ میں بھی جہاں بڈشاہ کی والدہ مدفون ہیں نظر آیا۔ یہ ٹائیلیں سبز رنگ کی ہیں۔ اور ان کی خوشنمائی اور خوبصورتی اب تک قائم ہے۔ مزار مدنی صاحب کے دروازہ کی ٹائیلیں بڑے سائز کی ہیں۔ اور جو ٹائیلیں مزار السلاطین ڈمُٹ کی بیرونی سطح پر نظر آتی ہیں۔ وہ بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔ اور ڈمٹ (گنبد) کے چاروں طرف تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر اسی طرح معلوم ہوتی ہے۔ جیسے انگشتری پر کسی نے سبز ہیرا جڑ دیا ہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی خوبصورت ٹائیلیں یا تو مرورِ ایام سے خودبخود ہی گنبد کے سوراخوں سے گر پڑی ہیں یا طوائف الملوکی کے زمانے میں بے رحم لوگوں کے ستم پرور ہاتھوں نے اکھاڑ لی ہیں۔ اب تو صرف چند ایک باقی ہیں۔ جو بنانے والوں کی خوش ذوقی کا پتہ دیتی ہیں۔

ریشم کا کارخانہ

ریشم کا کام کشمیر میں قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے۔ لیکن بڈشاہ کے عہد میں کشمیر کی اس صنعت کو غیر معمولی ترقی نصیب ہوئی۔ اس وقت دمشق بخارا اور ختن تک کی منڈیوں میں کشمیر کا ریشم جاتا تھا۔ اور بہت پسند کیا جاتا تھا۔ بخارا سے کشمیر کے ریشم کو بہت تعلق رہا ہے۔ اگرچہ اس کے بیج وہیں سے آتے تھے۔ لیکن اہل کشمیر کے صنعتی دماغوں کا یہ حال تھا۔ کہ تیار کئے ہوئے ریشم کی کھپت بھی بخارا ہی میں ہوتی تھی۔[1]

ختن کے تاجر یورپ۔ اور وسط ایشیا تک کشمیر کا ریشم پہنچایا کرتے تھے مرزا حیدر تاریخ رشیدی میں لکھتا ہے کہ کشمیر کا ریشم دور دور تک پسند کیا جاتا ہے۔ اور اس کا استعمال فیشن میں داخل ہے یہاں تک کہ غریب طبقہ کی عورت بھی اسے ضروریات زندگی میں شمار کرتی ہے۔ اور جس کو یہ میسر نہ ہو سکے۔ اس کو بدقسمت تصور کیا جاتا ہے۔ کشمیر کے عجائبات میں توت کے درخت بھی ہیں۔ جو بہت بڑی تعداد میں ریشم کے کیڑوں کی خوراک کے لئے لگائے جاتے ہیں۔

شری ور بھی راج ترنگنی میں بڈشاہ کے زمانہ میں ریشم کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ بادشاہ نے ریشم کی پیداوار میں اس دلچسپی سے کام لیا۔ اور اس کو ایسی ترقی دی کہ ہر شخص ریشمی لباس ہی میں ملبوس نظر آتا تھا۔

سر والٹر لارنس کی رائے میں ریشم کے کیڑے پالنے کے لئے کشمیر کی سرزمین نہایت موزون ہے چنانچہ توت کے بہت سے قدیم درخت جو بے برگ و بار بڑے تناور اور جسیم ہیں۔ اب تک کشمیر کے دیہات میں کثرت سے نظر آرہے ہیں۔ موجودہ حکومت بھی اکثر دیہات میں جہاں کاہچرائی اور خالصہ زمین کی

---

[1] رپورٹ مردم شماری سنہ ۱۹۲۱ء جموں و کشمیر۔

کثرت ہے۔ توتوں کے درخت نصب کرا رہی ہے۔ اور قریباً ہر گاؤں میں ریشم کے کیڑوں کے تخم زمینداروں کو ڈبیوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ جو چالیس دن کے بعد غنچہ ابریشم تیار کرکے ریشم کے کارخانہ میں لے آتے ہیں موجودہ حکومت جموں وکشمیر کو بھی اس صنعت سے خاص آمدنی ہو رہی ہے۔

زنگیری پٹو

عام طور پر اس کو دیہاتی پہنتے ہیں۔ بھیڑوں کی اون سے بنایا جاتا ہے۔ سب سے اچھا پٹو علاقہ زنگیر میں ہوتا ہے۔ جو زین العابدین نے اپنے نام پر آباد کیا تھا۔ یہ سادہ بھی ہوتا ہے۔ اور دھاری دار بھی۔ صالحہ حاجی بیگم سلطان محمد شاہ والئے کشمیر نے خانقاہ معلےٰ کی تعمیر کے سلسلہ میں جو پانچ ہزار کرتے مزدوروں کو تقسیم کئے تھے۔ وہ زنگیری پٹو ہی کے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں زنگیری پٹو سوپوری پٹو کے نام سے مشہور ہے۔

پیپر ماشی

بوسیدہ کاغذوں کو کوٹ کر مختلف چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ اور ان پر منقش کام کیا جاتا ہے۔ اس کو پیپر ماشی کہتے ہیں۔ اس کا رواج بھی بڈشاہی زمانہ ہی سے ہوا ہے۔ اس کو کار قلمدانی بھی کہتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے منقش قلمدان اور چھوٹی چھوٹی خوبصورت صندوقچیاں نقش ونگار کے ساتھ تیار کی جاتی ہیں۔

پیپر ماشی کا کام عموماً شیعہ اہل ہنر بناتے ہیں۔ ایک وقت تھا۔ کہ کابل میں دس ہزار اور فرانس اور دیگر یورپین ممالک میں بیس ہزار روپے کی قیمت کا یہ کام فروخت ہو جاتا تھا۔ مگر آجکل اس کی فروخت پر زوال آرہا ہے۔ قلمدان دو قسم کے ہوتے تھے۔ ایک چھوٹے جو

مسندی کہلاتے تھے۔ اور جن کو اہلکار اور منشی لوگ اپنے ساتھ لایا اور لیجایا کرتے تھے۔ دوسری قسم فرشی کہلاتی تھی۔ اس قسم کے قلمدان ایک ہی جگہ رہا کرتے تھے۔

فرانس میں جو شال دوشالہ وغیرہ تاجر لوگ بھیجا کرتے تھے۔ وہ پے پر ماشی کے بکسوں میں بند کئے جاتے تھے۔ اور پھر وہ بکس بھی فرانس میں معقول قیمت پر فروخت ہو جایا کرتے تھے۔ چھتوں کی نقاشی اور ہاتھیوں کے ہودے بھی پے پر ماشی ہی سے تیار کئے جاتے تھے۔ چھتوں کی نقاشی تو اب بھی شیرگڑھی کے شاہی محلات اور بعض امراء کے مکانوں میں نظر آرہی ہیں۔ بلکہ لاہور کے حضوری باغ میں جو بارہ دری مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بنوائی تھی۔ اس کی چھت میں بھی اب تک اس کشمیری صنعت کے دلفریب جوہر نظر آرہے ہیں۔

بڈشاہ کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی پے پر ماشی سے دیگر چیزوں کے علاوہ ڈھالیں تیر کمان اور ترکش اور اس قسم کی دیگر اشیاء تیار ہوا کرتی تھیں۔ لیکن اب پے پر ماشی کا وہ رواج نہیں رہا۔ اس صنعت کو زوال آرہا ہے۔ اب کاغذوں کی بجائے لکڑی کا برادہ زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اگلے زمانہ میں پے پر ماشی کا کام پچاس سال تک خراب نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ پائیداری نہیں اور ارزاں فروشی کی وجہ سے یہ صنعت بھی خراب ہو رہی ہے۔

آجکل پے پر ماشی سے تصویروں کے فریم اور پردے بنائے جاتے ہیں چارپائیوں کے پلنگ۔ میزیں۔ پٹاریاں۔ بڑے پیالے۔ رومالوں اور کارڈوں اور ٹکٹوں اور سگرٹ سگار کے بکس۔ مرہم پٹی دان بجلی کے لیمپ اور سٹینڈ وغیرہ تیار ہوتے ہیں۔

بیرونی ارباب صنائع کشمیر میں

بادشاہ نے اہل صنائع کی بڑی حوصلہ افزائی کی۔ ان صناعوں میں مندرجہ ذیل تمام کے نام مختلف تاریخوں میں درج ہیں۔

کاغذ ساز صحاف۔ قالین باف۔ زین ساز۔ دایہ (قابلہ) حکاک سنگتراش شیشہ گر۔ تابدان تراش۔ زرکوب۔ اسلحہ ساز۔ غالیچہ ساز ماہران علم موسیقی جلدگر آتشباز۔

بادشاہ نے بہت سے ان میں سے سرکاری کاموں میں لگا دیئے۔ جن کو سرکاری ملازمت یا کام نہ مل سکا ان کو اپنا علیحدہ کاروبار کرنے کے لیے مالی امداد دی اور ہرچند کہ یہ لوگ دور دراز مقامات سے آئے تھے۔ لیکن بادشاہ کی قدردانیوں نے ان کو یہیں آباد ہونے کے لئے مجبور کر دیا۔

غالیچہ سازی

کشمیر میں یہ بھی بڈشاہی یادگار ہے۔ بادشاہ کے بعد بھی کئی سال تک غالیچہ کی تجارت کو فروغ رہا۔ لیکن جب ملک خانہ جنگیوں میں مصروف ہو گیا۔ اور بادشاہوں کو اپنی سلطنت بلکہ جانیں بچانے کی فکر پڑ گئی۔ تو یہ تجارت اور صنعت بھی قریباً معدوم ہو گئی۔

کاغذسازی اور جلدسازی

کاغذ ملک چین کی ایجاد ہے حضرت عیسےٰ کی وفات کے ۷۰ سال بعد ایک شخص سیچ لن نام پیدا ہوا۔ جس نے دنیا بھر میں سب سے پہلے کاغذ تیار کیا۔ پہلے وہ بانس وغیرہ سے کام لیتا رہا۔ لیکن وہ زیادہ مفید ثابت نہ ہوا۔ تیس سال کے بعد اس نے شہتوت کے درخت کے ریشے تیار کئے۔ اور ان سے کاغذوں کا پہلا دستہ تیار کیا۔

لیکن کشمیر میں کاغذ کا بانی زین العابدین ہی ہے جس نے صحافوں اور کاغذگروں کی حوصلہ افزائی کی۔ اور جس نے اپنے ملک کے نوجوانوں کو اس قسم کی صنعتوں کے سیکھنے کے لئے بہت سی آسائشیں بہم پہنچائیں۔

ان لوگوں کو اس نے دارالخلافہ نوشہرہ میں آباد کیا۔ جہاں آج تک نہ صرف ان کاغذسازوں کی ذریات موجود ہیں۔ بلکہ کاغذسازی کا کارخانہ بھی جاری ہے۔ کشمیری کاغذ تمام ہندوستان میں باوجود اپنی بے انتہا گرانی کے اپنی صفائی اور پائیداری کی وجہ سے نہایت پسند کیا جاتا ہے۔ یہ کاغذ اس قدر پائیدار ہے کہ اس کاغذ پر لکھی ہوئی کتابیں تین تین سو سال سے زیادہ عرصہ تک محفوظ و بے ضرر پائی گئی ہیں۔ پائیداری میں دنیا کا اور کوئی کاغذ کشمیری کاغذ کا مقابلہ نہیں کرسکتا ہے

عہد اسلاف کا ہے ایک مرقع دلکش　　دور حاضر کا ہے آئینۂ روشن کاغذ

چونکہ حکومت کی طرف سے اس کاغذ کی کوئی خاص سرپرستی نہیں کی جاتی اور عام بازاری کاغذ اس سے سستا ملتا ہے۔ اس لئے یہ صنعت بھی آج کشمیر میں زوال پر ہے۔ اس زمانہ میں نہ چھاپہ خانوں کا رواج تھا۔ نہ کتابوں کی بہتات تھی۔ اس لئے جلدسازی کا بھی رواج بہت کم تھا۔ اور کہیں تھا بھی۔ تو بالکل معمولی اور ادنیٰ درجہ کا۔ بڈشاہ نے ہنرمند صحافوں کے ذریعہ اس فن کو بھی ترقی دی۔ اور نہ صرف اعلےٰ جلدیں تیار کرائیں۔ بلکہ نقرئی جلدسازی کا کام بھی سب سے پہلے کشمیر بلکہ ہندوستان میں اسی نے شروع کرایا۔

کاغذسازی پر شاعروں کی طبع آزمائیاں

ایک شاعر اسی زمانہ میں محلہ کاغذگراں (نوشہرہ) سے گزرا۔ دیکھا کہ ایک کاغذساز پرانے اور بوسیدہ کپڑوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے جمع کرتا۔ اور ان کو دھوتا۔ اور کاغذ بنانے کے لئے ان کو کوٹتا ہے۔

اس قسم کا کاغذ آبی کاغذ کہلاتا تھا۔ شاعر نے کاغذ اور کاغذساز کی یہ کیفیت دیکھکر فی البدیہہ کہا ہے

تا اجل آرام بخشِ رسمِ بے تابی شود | زندگانی مدِ آہ عہدِ بے خوابی شود
پرزہ پرزہ جامۂ عاشق سرِ راہ گذشت دوش | گوشہ داماں عاشق کاغذ آبی شود

بادشاہ کو خبر ہوئی۔ اس نے شاعر کو بلوایا۔ اشعار سنے اور بطور اظہار خوشنودی انعام عطا فرمایا۔

کشمیر کے ایک مشہور خوشنویس اور شاعر سرخوش کی ایک بیاض میری نظر سے گزری ہے۔ جس میں بڈشاہ کے چند اشعار اور اس کے ذوق سخن کے واقعات درج ہیں۔ انہی میں کاغذ سازی کے متعلق بھی یہ سطور درج ہیں۔

کاغذ سازی در عہد سلطان ظہور یافت کہ سلطان از ملک قزدین کاغذ سازاں را آوردہ در کشمیر رواج کاغذ سازی داد تا آں زماں کہ کتاب و دفاتر بر اوراق توز دبھوج پتر لے شد۔ ملائے ندیمی ایں واقعہ بہ نظم نوشتہ کردو بیت بہم آمد"۔ وہ اشعار حسب ذیل ہیں ؎

کاغذ بہ دفتر آمد و شیرازہ در گرفت | پیچیدہ روزگار زدیواں چو فرش توز
زیں تختہ ہائے کاغذ زیبائے رنگ رنگ | بشکست دو گردش پرکار عرش توز

کشمیری تلوار اور بندوق

جن لوگوں کو تاریخ پر عبور حاصل ہے اور جو جانتے ہیں۔ کہ ہر قوم اور ہر ملک میں کبھی نہ کبھی شجاعت و بسالت اور حکومت و سطوت کا دور دورہ رہا ہے۔ ان سے مخفی نہیں کہ کشمیری بھی کسی زمانہ میں صاحب السیف والقلم تھے۔ اس موضوع

ے از بیاض بوسیدہ و کہنہ ملوکہ خواجہ محمد اسمٰعیل صاحب نامی بقال تبت سری نگر کشمیر۔
ے یہ بیاض میں نے پیر شمس الدین حیرت یاندانی کاشمیری کے پاس دیکھی تھی۔ زین تختہ ہائے کے آگے جو چند الفاظ تھے وہ کرم خوردہ تھے۔ مولانا نے مصرعہ کو پورا کرنے کے لئے فرمایا۔ لکھدو " زین تختہ ہائے کاغذ زیبائے رنگ رنگ "

پر اہل کشمیر کی جنگی سپرٹ اور بڈشاہ کے فوجی کارناموں کے باب میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

غرض جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ وہ کشمیر میں عین شباب و عروج کا زمانہ تھا۔ ہر کشمیری تلوار کا دھنی تھا۔ اور تلواریں اور بندوقیں یہاں بنا کرتی تھیں ایجرٹن صاحب لکھتے ہیں۔ کشمیر کی ساختہ تلواروں پر نہایت نفاست و خوبصورتی سے باریک باریک انسانی و حیوانی تصاویر کندہ ہوتی ہیں۔ تلواروں کا حاشیہ سونے سے چمکدار بنا دیا جاتا ہے۔ نیاموں پر نہایت خوبصورت شکلیں اور بیل بوٹے ہوتے ہیں۔ جو شال کے سلمہ ستارہ سے مقابلہ کرتے ہیں۔ تلواروں پر کشمیری ارباب صنائع جو تصویریں بناتے ہیں۔ ان میں عموماً پیدل یا ہاتھی سوار شکاریوں کو کسی شیر یا دوسرے کسی خونخوار جانور کا تعاقب کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ بندوق کی نالیاں بنانے میں بھی ان کو خاص شہرت ہے۔ لنڈن کے ہندوستانی عجائب خانے میں پرانے کشمیری پیش قبض اور شیر بچہ اب بھی دیکھے جاتے ہیں۔

لنڈن تو بہت دور ہے سری نگر کے عجائب گھر میں بھی کشمیری اسلحہ جات موجود ہیں۔ جو زبان حال سے ؎

اشک ریزاں در عجائب خانہ بر حال وطن
خود و تیر و زرہ و تیغ و سناں کاشمیر

کشمیری توپ کی ابتدا

شریور لکھتا ہے۔ بادشاہ کو اسلحہ سازوں نے مختلف قسم کے گرجنے اور رہوائی آوازیں پیدا کرنے والے ہتھیار دکھائے۔ جو لوگوں کو اپنی ہیبت انگیز گونج سے دہشت زدہ کر دیتے تھے۔ انہی نمونوں پر بادشاہ نے اس قسم کے ہتھیار مختلف دھاتوں سے اپنے ملک ہی میں تیار کرلئے۔ شریور نے سنسکرت زبان میں

توپ اور دیگر ہتھیاروں کے لئے بادشاہ کے حکم سے اشعار لکھے۔ جو ان پر کندہ کرائے گئے۔ ان اشعار یا شلوکوں کا ترجمہ جگے بسی دت نے کنگس آف کشمیر کے صفحہ ۱۰۵ پر انگریزی میں کیا ہے۔ اردو میں ان کا ملخص درج کیا جاتا ہے۔

شری زین العابدین فاتح اعظم نے جو اندر کی طرح دنیا میں مشہور ہے اور کشمیر کا بادشاہ ہے۔ سنہ ۱۴۸۱ء لوک میں اس توپ کو جس کا عام چرچا ہے بنوایا۔ یہ توپ قلعوں کو تباہ کرتی ہے۔ لوگوں کے دلوں کو خوفزدہ کرتی ہے اور پہاڑوں میں زلزلہ سا پیدا کر دیتی ہے۔ اور جنگی گھوڑوں میں ہلچل ڈال کر ان کو بھاگنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ توپ پتھروں کے گولے دور دور تک پھینکتی ہے۔ جو بالمقابل فوجوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ یہ توپ بہت مضبوط ہے۔ کار آمد ہے۔ اور اس کی پرشکوہ آواز دور تک اور دیر تک پہاڑوں میں گونجتی رہتی ہے۔

تفنگ اور آتشبازی کا رواج

بادشاہ کو فن آتشبازی سے پوری واقفیت تھی حبیب آتشباز جو آتشبازی کے کھیل تماشوں سے بادشاہ کو محو حیرت کر دیا کرتا تھا۔ اکثر چیزیں بادشاہ کی ہدایت کے مطابق تیار کیا کرتا تھا۔ سٹرلور لکھتا ہے کشمیر میں شورہ پیدا کرنا بہت مشکل تھا۔ بادشاہ خود اس کا موجد بنا اور پھر یہ ملک میں عام طور پر بنایا جانے لگا۔ بادشاہ ہر عجیب اور نئی چیز کا رواج اپنے ملک میں چاہتا تھا۔ اس نے حبیب کو حکم دیا کہ خاص خاص لوگوں کو اس فن میں اُستاد کامل بناؤ۔

حبیب ہی نے کشمیر میں سب سے پہلے تفنگ ایجاد کی۔ اور آخر بادشاہ

ـــــــــــ

لـہ اسلامک کلچران کشمیر صفحہ ۲۵۲ ـ مطابق سنہ ۱۴۶۵ء موافق سنہ ۸۶۹ھ

کی عنایات سے وہ مقربان شاہی میں داخل ہوگیا۔

کرنل سرہنگ نے بھی اس آتشباز کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک کامل آتشباز نے نہ صرف آتشبازی ہی تیار کی۔ بلکہ بادشاہ کے حکم سے اس نے آتشین آلات بھی تیار کئے۔[1]

چوبیسواں باب ۲۴

بادشاہ کی علمی سرگرمیاں

بڈشاہ کئی زبانیں جانتا تھا

بادشاہ اپنے زمانے کے علم و ادب ہی میں مہارت تامہ نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ اس زمانہ کی متعدد زبانوں سے بھی اسے بہت اچھی واقفیت تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس نے علم و علماء دونوں کی قدردانیوں سے اپنے ادبی کارناموں کو ناپائیدار شہرت دی۔ آج ہندوستان و کشمیر کے مصنفوں اور مورخوں کے علاوہ یورپ کے محقق و مؤرخ بھی اس کے برمحل علمی عطیات اور اس کے ماہر علوم ہونے کی تعریف کر رہے ہیں۔[1]

کشمیری زبان تو بادشاہ کی ملکی و مادری زبان تھی۔ اس کے علاوہ تبتی۔ فارسی سنسکرت اور ہندی زبانیں بھی جانتا تھا۔ بلکہ ان زبانوں کا عالم و فاضل[2] تھا۔ فارسی میں اس کے اشعار بھی موجود ہیں وہ علوم ریمیا و سیمیا میں بھی ماہر تھا۔

---

[1] اسلامک کلچران کشمیر ہر الننٹ نیول بٹ۔ اے ایم صفحہ ۱۶۱ [2] وجیز التواریخ فارسی

کرنل سرولزلی ہیگ تاریخ ہندوستان کی تیسری جلد میں لکھتے ہیں :۔
زین العابدین کو فارسی ہندی تبتی اور اپنی مادری (کشمیری) زبان پر پورا عبور تھا۔ اور وہ شاعری مصوری اور موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اس نے سنسکرت سے مہابھارت اور راج ترنگنی کا جو راجگان کشمیر کی مشہور منظوم تاریخ ہے۔ فارسی میں ترجمہ کرایا۔ اور کئی فارسی اور عربی زبان کی کتابوں کو ترجمے کے ذریعے ہندی لباس پہنایا۔

بادشاہ ایک مصنّف کی حیثیت سے

شری ور کی راج ترنگنی سے بادشاہ کی دو تصنیفوں کا پتہ ملتا ہے۔ ایک کتاب کا نام سوال وجواب ہے۔ جو آتشبازی بنانے اور شورہ وغیرہ پیدا کرنے سے متعلق ہے۔ شری ور لکھتا ہے۔ کہ بادشاہ نے حبیب میر آتش کو فارسی زبان میں آتشبازی کے متعلق جو ہدایات بطور سوال وجواب لکھائیں۔ ان کی ایک مختصر سی کتاب بن گئی۔ یہ پہلی کتاب تھی جو بادشاہ کے نام سے لکھی گئی۔ پھر بادشاہ کی تقلید میں کئی اور مصنفوں نے اسی طریق پر اپنی کتابیں تصنیف کیں۔ طبقات اکبری کا مصنف بھی اس آتشباز کا ذکر کرتا ہوا کتاب سوال وجواب کے متعلق لکھتا ہے۔ کہ "متضمن فوائد بسیار است سلطان به اتفاق او تصنیف کرده" لیکن آج یہ کتاب بالکل نابود و معدوم ہے۔

بادشاہ کی دوسری تصنیف کا نام شکایت ہے۔ اس کتاب میں اس نے ضعیف العمری کی تکالیف اور دنیاوی ندامات کا ذکر کیا ہے۔ بقول شری ور یہ بھی فارسی زبان میں تھی۔ اس میں دنیا کی بے ثباتی و ناپائیداری کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور نالائق و ناخلف اولاد کے ہاتھوں تنگ رہنے اور رنج اٹھانے پر لاولد رہنے کو ترجیح دی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی آج عنقا کا حکم رکھتی ہے۔

دارالترجمہ اور دارالتصانیف کا اجرار

بادشاہ نے اس زمانے میں جبکہ ہندوستان کے علاوہ دیگر تمام ایسے ممالک بھی جنہوں نے علوم جدیدہ کی شعاعوں سے آج تمام عالم کو منور کر رکھا ہے۔ اشاعت علوم و فنون کے طریقوں سے بالعموم بے خبر تھے علمی وظائف کے علاوہ دارالترجمہ اور دارالتصانیف کے شعبے قائم کئے۔ جن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی مذہبی تاریخی اور عام اخلاقی وطبی کتابوں کے تراجم ہوتے۔ اور نئی تصانیف بھی قابل مصنفوں سے معقول مشاہرے دیکر لکھوائی جاتی تھیں ملا احمد زونا آج پنڈت یودی بٹ اور ملا نادری ان شعبہ جات کے معزز ارکان تھے سب سے پہلے ملا احمد ہی نے مہابھارت کو فارسی کا جامہ پہنایا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں ایک کتاب ہندی زبان کی جس کا اصل نام معلوم نہیں ہوسکا بادشاہ نے فارسی میں ترجمہ کرائی۔ اور نام اس کا افسانہ ہندی رکھا۔ بڑی ضخیم کتاب ہے اب کہیں نہیں ملتی۔ اکبر نے ملا عبدالقادر بدایونی سے فرمایا۔ اس کی فارسی غیر متعارف ہے۔ اسے مانوس عبارت میں لکھدو۔ ملا نے دو تین مہینے کے اندر کتاب تیار کردی۔ اکبر نے دس ہزار تنگہ مرادی اور ایک گھوڑا انعام دیا۔ اور نام اس کتاب کا بحرالاسمار رکھا[۱]

معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ ہندی کی صرف ایک جلد ہی بڈشاہ کے حکم سے ترجمہ ہوسکی تھی جیسا کہ دربار اکبری کی سطور ذیل ظاہر کرتی ہیں۔ بادشاہ نے ابوالفضل سے فرمایا۔ افسانہ ہندی کی صرف ایک جلد ہی سلطان زین العابدین کے حکم سے ترجمہ ہوئی ہے۔ بہت سی جلدیں اس کی باقی ہیں۔ انہیں ترجمہ کر کے پورا کر دو۔ چنانچہ اس کتاب کی اخیر جلد جو ساٹھ جزو کی ہے۔

[۱] دربار اکبری اردو مصنفہ شمس العلما مولانا آزاد دہلوی صفحہ ۱۱۷

ابوالفضل نے پانچ مہینے میں تیار کر دی۔

شرور زینہ راج ترنگنی میں لکھتا ہے۔ بادشاہ نے وشن اوتار اور راج ترنگنی کا جو سنسکرت زبان میں کشمیر کی تاریخیں تھیں، فارسی زبان میں ترجمہ کرایا۔ ان کے علاوہ وریہات کتھا سار۔ مہابھارت۔ ایک نگرہ سے تا اور پران جیسی ہندو مذہب کی کتابیں اب ملیچھ بھی اپنی زبان میں پڑھ سکتے ہیں۔

شرور بادشاہ کی علم پرستیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ بادشاہ نے ایک دفعہ مجھ سے رشسٹ برہمہ ورش کی کتھا سنی۔ یہ کتاب بالمیک جی کی تصنیف تھی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے روح کو ایک قسم کی شانتی حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ اس کتاب کے سننے سے بہت محظوظ ہوا۔ بادشاہ نے اس کتاب کا اور دوسری کئی کتابوں کا فارسی اور کشمیری زبانوں میں ترجمہ کرایا۔ یہانتک کہ اب علم نباتات اور علم کیمیا کا مطالعہ ہر شخص اپنی مادری زبان میں کرسکتا ہے۔

علم و علماء کی سرپرستی

بادشاہ نے اپنے ممالک کے اکثر لوگوں کو جو علم کی اہلیت اور اس کا شوق رکھتے تھے وظائف دیکر بیرونی ملکوں میں بھیجا۔ ان میں جو لوگ شادی شدہ تھے۔ ان کے اہل وعیال کے اخراجات کا بوجھ بھی خزانہ شاہی پر

[1] شرلیور مسلمان سلاطین کشمیر کے عہد میں جہاں کہیں مسلمانوں کا ذکر کرتا ہے۔ ان کو ملیچھ ہی لکھتا ہے۔ اس سے سمجھ لینا چاہئیے۔ کہ ہندوؤں کو ان ایام میں کس قدر آزادی حاصل تھی۔ وہ مسلمان بادشاہوں کے عہد میں بھی اس قسم کے الفاظ لکھنے سے مسلمانوں کی دل آزاری کا خیال بھی نہ رکھتے تھے۔

ڈالا۔ علاوہ ازیں بیرونی ممالک سندھ۔ ہرات۔ ہندوستان۔ بخارا۔ خراسان۔ عرب۔ وغیرہ سے فارسی۔ عربی اور سنسکرت کے عالم بلوائے ان کو معقول تنخواہیں دیں۔ اور ان تنخواہوں کے لئے خاص خاص دیہات وقف کر دیئے۔ جو اہل علم زیادہ قابل تھے۔ ان کو جاگیریں بھی عطا کیں۔ بعض علماء فضلا ملک روم سے بھی کشمیر میں آئے۔ جیسا کہ بہاؤالدین متو اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں :" وعہداز او دیگر امصار علماء فضلاء دریں شہر آمدند مثلاً ملا محمد باقر رومی و مولانا احمد رومی کہ برادر یکدگر بودند از سلطان مورد انعامات شدہ دریں شہر سکونت ورزیدند"۔

خواجہ محمد اعظم واقعات کشمیر میں بادشاہ کے استاد مولانا کبیر کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ کہ اس نے ان کو نوشہرہ دارالحکومت کے دارالعلوم کا صدر اعلیٰ مقرر کیا۔ اور طالبان علوم کے اخراجات کے لئے چند مواضعات وقف کر دیئے۔ تاکہ ناداری کی وجہ سے علم کے اس چشمہ سے کوئی پیاسا نہ رہنے پائے۔

ہندوؤں کے علوم کی اشاعت

بادشاہ نے ہندو علوم کی کتابیں جن کو مہاجر کشمیری پنڈت اس کے باپ اور بھائی کے زمانہ میں اپنی جلاوطنی کے ساتھ ہی پنجاب وغیرہ ممالک میں لے گئے تھے۔ ہندوستان سے منگوا کر ملک میں تقسیم کیں۔

شریور لکھتا ہے۔ سکندر بادشاہ کشمیر کے زمانے میں یاونوں[1] کے اثر و اقتدار سے ہندو علوم کی تمام کتابیں یا جلائی جا چکی تھیں یا کسی نہ کسی طرح ضائع ہو گئی تھیں۔ جو ہندو ان ایام میں کشمیر سے ہجرت کر گئے۔ ان میں

[1] یاونوں سے مراد مسلمان ہیں۔

جو اہل علم وفضل لوگ تھے۔ وہ بھی اکثر کتابیں اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ اور ملک اچھی کتابوں سے بالکل خالی ہو گیا تھا۔ بادشاہ نے ان کتابوں کو ممالک غیر سے مختلف ذرائع سے حاصل کر کے پھر اپنے ملک میں علم وفن کو رونق دی۔ باہر سے پُران لائے گئے۔ اور فلسفہ وغیرہ علوم کی کتابیں اپنے ملک کے علماء میں باہر سے منگوا کر نقل کیں۔

کسی نے یجروید کا ایک نسخہ ہدیہ دیا۔ بادشاہ نے اس کی تصدیق وترتیب کے لئے چند آدمی دکن میں بھیجے۔ تاکہ وہ اس کا مقابلہ کر کے صحیح نسخہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کریں۔

تاریخ ملا بہاؤالدین متو میں بھی ان کتابوں کے کشمیر میں منگوائے جانے کا ذکر ہے۔ جو کشمیری مہاجرین اپنے ساتھ ہندوستان میں لے گئے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے "دفاتر کفر وصحائف شرک کہ ازیں دیار او کشیدہ بودند باز طلبید"۔

عالی حوصلگی۔ وسیع القلبی بے تعصبی اور سرپرستی علوم کی یہ ایک ایسی مثال ہے۔ کہ اس کی نظیر نہ پہلے کی تاریخوں میں مل سکتی ہے۔ اور نہ آج کوئی ملک اور کوئی بادشاہ اس قسم کی بلا تفریق مذہب وملت دلجوئی رعایا کا ثبوت پیش کر سکتا ہے۔

مختلف علوم وفنون کی کتابوں کیلئے بادشاہ کے تحائف۔

بادشاہ کو علمی ذخائر جمع کرنے اور ان سے اپنے ملک کو مستفیض کرنے کا اس قدر شوق تھا۔ کہ وہ غیر ممالک کے بادشاہوں کو کشمیر کے بیش قیمت تحائف ایک معزز جماعت کے ہاتھ بھیجا کرتا۔ اور بادشاہ اس جماعت کے اخراجات کا کفیل ہوا کرتا۔ بہاؤالدین متو اپنی تاریخ میں لکھتا ہے "ودریں دیار کتب ہا رسے فرستاد۔ از ایشاں کتاب ہا در مختلف علوم

وتصانیف کثیر آوراںید۔"

بادشاہ نے اس طریق سے ایک ایسا کتب خانہ بنالیا۔ جو اس کے عہد میں اس کے کسی معاصر بادشاہ کے پاس نہ تھا۔ یہ کتب خانہ بادشاہ[1] کے بعد ایک سو سال یعنی سلطان فتح شاہ کے عہد تک دستبرد زمانہ کے ہاتھوں محفوظ رہا۔ اس کے بعد دیگر تمام فانی اشیاء کی طرح یہ خزانۂ علوم وفنون بھی جس میں خدا جانے کیسے کیسے بیش قرار علمی جواہرات تھے۔ فنا و نابود ہو گیا۔

عہد بڈشاہی میں فراوانی علوم وفنون

شر تو ر لکھتا ہے میں کیا لکھوں اور کہاں تک لکھوں کہ اس بادشاہ کے عہد میں کشمیر نے کس قدر ترقی کی۔ انتہا یہ ہے کہ مزدوروں اور باورچیوں تک شاعر اور مصنف بن گئے۔ اور عورتوں تک نے حصول علوم میں نام پیدا کر لیا۔ اور ان لوگوں کی تصنیفات اس وقت تک بھی ہر گھر میں موجود ہیں۔ وہ لوگ جن کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ علم ہمارے نصیبوں میں ہو گا۔ وہ بھی علوم مختلفہ حاصل کر کے اور قابل و لائق ہو کر بادشاہ کے درباریوں میں شامل ہو گئے۔

جو طلبا بیرونجات سے پڑھنے کے لئے آتے تھے۔ بادشاہ نے ان کیلئے دار الاقامے قائم کئے۔ جہاں ہر طالب علم کی کتاب و خوراک وغیرہ کے مصارف خزانہ شاہی سے ادا کئے جاتے تھے۔ شر تو ر لکھتا ہے۔ تاریخ طب۔ نباتات۔ کیمیا۔ کوئی علم ایسا نہ تھا۔ جو مدارس میں پڑھایا نہ جاتا تھا۔

سیاسی حیثیت کے علاوہ علمی حیثیت سے بھی سرینگر یعنی دار الحکومت کو

---

[1] یعنی تا عہد سلطان فتح شاہ۔ بادشاہ کشمیر ۸۷۲ تا ۸۹۲ ء موافق سنہ ۱۴۸۶ء مطابق ۸۹۱ ھ

خاص اہمیت حاصل تھی۔ اور ماتحت راجگان و روٗسا اپنے فرزندوں اور عزیزوں کے علاوہ اپنے علاقہ جات کے دیگر طلبا کو بھی اسی جگہ حصول تعلیم کے لئے بھیجا کرتے تھے۔

ایک کتاب کے لئے مکہ معظمہ کو ایک کاتب کی روانگی

علامہ جار اللہ کی تصنیف تفسیر کشاف کا اصل نسخہ بہت کمیاب تھا۔ اس کے حصول کے لئے بادشاہ نے ہندوستان کے علاوہ ترکستان اور ماوراالنہر کے اطراف میں بھی آدمی دوڑائے۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ایک مرتبہ جب کشمیری حجاج کا قافلہ اپنے وطن میں واپس آیا۔ تو ان میں جو حاجی علم دین کے ماہر تھے۔ انہوں نے بادشاہ سے عرض کیا۔ کہ علامہ جار اللہ کی اصل تصنیف کا نسخہ مکہ معظمہ میں موجود ہے۔ بادشاہ نے یہ سنکر "یک مرد کاتبے را خرچ راہ داہل وعیال دادہ بہمیں غرض بہ مکہ فرستاد"

چنانچہ وہ کاتب عرصہ دراز تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہا۔ اس نے کتاب کے اصل نسخہ سے اس کی نقل کی۔ پھر نقل کو بعد مقابلہ صحیح کرایا اور اس کی تصدیق کے سلسلہ میں اکابر علمائے مکہ کے خطوط حاصل کئے۔ جب یہ تفسیر کشمیر پہنچی۔ تو شعرا نے نظمیں لکھیں۔ چنانچہ ایک نظم کے چند شعر ذیل میں درج ہیں۔ ؎

شہ راز مدینہ نور برہاں آمد	رنجورے اہل دیں بہ درماں آمد
آمد زخدا دفتر اخلاص ادب	(یہاں کاغذ کرم خوردہ ہے)
(یہاں کاغذ کرم خوردہ ہے)	باسلطاں بارسول قرآں آمد

اصل نسخہ تفسیر کشاف کی یہ مصدقہ نقل مرزا حیدر کے زمانہ تک کشمیر

---

[1] از بیاض بوسیدہ مملوکہ خواجہ محمد اسمٰعیل نامی تبت بقال سرینگر۔

میں موجود تھی جب کشمیریوں اور مغلوں میں جنگ ہوئی۔ تو بیشتر مغل جان سے مارے گئے۔ اور مرزا حیدر بھی قتل ہو گیا۔ اس وقت یہ کتاب ایک قاضی صاحب کے قبضہ میں آئی۔ جو مرزا کے ہمراہیوں میں تھا۔ وہ اپنی جان بچا کر اور کتاب کو بغل میں دبا کر اپنے وطن چلا گیا۔[۱]

بادشاہ کے حکم سے جامع مسجد (سرینگر) کے شمال کی طرف ایک مدرسہ کی بنا ڈالی گئی جس میں عربی فارسی کے علاوہ سنسکرت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ بادشاہ نے اس کے اخراجات و مصارف کے لئے چند دیہات وقف کر دیئے۔ قاضی میر علی بخاری جو چنگیز خاں کی اولاد سے تھے۔ اس دار العلوم کے صدر بنائے گئے۔[۲]

نوشہرہ میں بادشاہی دار العلوم

مرزا حیدر تاریخ رشیدی میں لکھتے ہیں۔ نوشہرہ میں شفاخانہ اور لنگرخانہ ہی نہ تھا بلکہ دولت خانہ شاہی کے بالکل متصل راجدھانی (نوشہرہ) میں اعلےٰ پیمانہ پر ایک شاہی بیت العلوم بھی جاری کیا گیا۔ کئی گاؤں طالبعلموں کے وظیفے ان کے اخراجات اور ان کے استادوں کو فکر معاش سے آزاد رکھنے کے لئے وقف کئے گئے۔ اس بیت العلوم میں دار الاقامہ بھی تھا۔ جہاں طالب علم رہا کرتے تھے۔ مولانا کبیر جو بادشاہ کے استاد بھی تھے۔ اس دار العلوم کے صدر مدرس یا پرنسپل تھے۔

اس مدرسہ میں مندرجہ ذیل مسلمان استادوں کا نام تاریخوں میں نظر سے گزرا ہے۔ ملا پارسا۔ ملا محمد۔ ملا احمد۔ ملا نادری۔ ملا یحییٰ۔ ملا ضیائی۔ جو بڈشاہی عہد کے نامور شاعر اور ادیب تھے۔ اور قاضی حمید الدین جنہوں نے بڈشاہ کے زمانے میں کشمیر کی تاریخ لکھی ہے۔ لیکن وہ آجکل عرصہ دراز سے نایاب ہے۔[۳]

غرض سے

---

[۱] تاریخ بہاء الدین متو [۲] ازبیان واقعہ حالات مسجد جامع اردو مصنفہ مولوی محمد شاہ سعادت کاشمیری [۳] از تاریخ حسن قلمی صفحہ ۱۵۰

اس کے زرّیں عہد میں جاری تھے وہ دارالعلوم
جن کی شہرت کے ہیں شاہد آج بھی شمس و نجوم
جن کے علم و فن پہ نازاں ہند و سندھ و شام و روم
جن سے بچ بچ کر کبھی چلتی رہی بادِ سموم
گردشِ ایام نے شکلیں وہ ایسی میٹ دیں
آج ان تعلیم گاہوں کا نشاں تک بھی نہیں

عہد بڈشاہی کی بعض تصانیف سنسکرت فارسی اور کشمیری میں

بڈشاہ خود صاحب علم تھا۔ اس لئے اس نے اہل علم کی قدر کی۔ اور اس کے عہد میں علماء و فضلاء نے بھی علم و فضل میں کشمیر کا نام روشن کیا۔ وہ خود شاعر تھا۔ اس نے شعرا کی حوصلہ افزائی کی۔ فارسی اور کشمیری زبان کے صاحب کمال پنڈت اور مسلمان شعراء اس کے سلک ملازمت میں منسلک تھے۔ وہ خود مصنف تھا۔ اس نے اپنے زمانہ کے مصنفوں۔ مترجموں اور مورخوں کو دربار میں ممتاز جگہ پر سرافراز کیا۔ ان کو قرب حضوری میں رکھا۔ اور بلا تمیز مذہب و ملت ان کے دامن سوال کو گوہر مراد سے پُر کیا۔

ان کتابوں کے علاوہ جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے مختلف کتابوں اور تاریخوں کی چھان بین کے بعد عہد بڈشاہی کی جن تصانیف کا پتہ مل سکا ہے۔ ان کی ایک فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

(سنسکرت زبان میں عہد بڈشاہی کی تصنیفات)

زینہ ترنگنی یا راجا ولی۔ از تصنیف پنڈت زونراج
زینہ راج ترنگنی ۔ از تصنیف پنڈت شری ور
} یہ دونوں کتابیں بان سنسکرت چھپ چکی ہیں۔ اور ان کا ترجمہ بھی انگریزی زبان میں ہو چکا ہے۔

زینہ پرکاش - از تصنیف اوتار بٹ - یہ وہی اوتار بٹ ہے جس کو شاہنامہ فردوسی از بر تھا۔ اس کتاب میں بادشاہ کے فرامین - ارشادات اور بعض احکام زبان سنسکرت درج تھے۔

الشور شاتک منظوم - از اوتار بٹ - نایاب ہے۔

شرح مہابھاشئے - از پنڈت پتن جلی - یہ کتاب در اصل بعہد مہاراجہ کنشک تقریباً سنہ ۰ء میں پتن جلی کاشمیری نے علم صرف و نحو کے متعلق لکھی تھی۔ بڈشاہ کے زمانے میں رام آنند نام ایک نحوی پنڈت نے اس کی آسان شرح لکھی۔ شرح اور اصل دونوں نایاب ہیں۔

مانک - از سوم پنڈت در علم موسیقی۔

پرتھوی راج وجے - ٹیکا مصنف نامعلوم - پنڈت جونراج نے سنسکرت میں اس کی شرح لکھی اس کا صرف ایک نسخہ بوہلر کو ملا تھا۔

کرت ارجنیا - (ٹیکا) " " " " " " "

رگ پرکاش - سنسکرت زبان میں لغت کی ایک کتاب ہے جس کو مشہور کشمیری مصنف کھیمندر - نے گیارہویں صدی عیسوی میں سنہ ۱۰۲۵ء سے سنہ ۱۱۰۰ء کے درمیان تصنیف کیا اور جونراج - نے بڈشاہ کے زمانہ میں اس کی شرح لکھی۔ یہ کتاب عام طور پر مل جاتی ہے۔

تری کنٹھہ چرت ٹیکا (منظوم) اس کا اصل مصنف کشمیری شاعر منکا ہے۔ جو کلہن مصنف راج ترنگنی کا ہمعصر تھا۔ شرح اس کی جونراج نے لکھی۔

کتھا کوتک - مترجم پنڈت شری ور - اصل کتاب فارسی زبان میں مختلف حکایات پر مشتمل تھی جس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ شری ور نے اس کا ترجمہ سنسکرت میں کیا۔ اس ترجمہ کا ایک نسخہ بوہلر محقق کو ملا تھا۔

زین - از یودھا بٹ در علم موسیقی۔

سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی زبان میں

وقائع کشمیر - ترجمہ راج ترنگنی مصنفہ نپڈت کلہن مترجم ملا احمد ملک الشعرا فاضل زبان سنسکرت ۔ کتاب نایاب ہے۔

ترجمہ مہابھارت مترجم ملا احمد وسوم نپڈت ۔ کتاب نایاب ہے ۔

شرح کلام شیخ نورالدین مترجم ملا احمد ۔ شیخ نورالدین ولی کا کلام سنسکرت نما کشمیری میں تھا ۔ ۱۸۲۳ء میں مشہور سیاح مشرہوچل کو اس کا ایک نسخہ ملا تھا۔

ترجمہ دش اونار جیرت مصنف ومترجم نامعلوم ۔ مسٹر یور نے بادشاہ کی علمی سرگرمیوں کے سلسلہ میں اس کا ذکر کیا ہے ۔

شرح وریہ ہت کنتھاسرا " " " بحوالہ مسٹر یور دیکھو کنگس آف کشمیر جے سی دت صفحہ ۱۲۶

شرح ہاٹ کیشور سم منتھا " " " " " " " "

کشمیری زبان میں عہد بڈشاہی کی تصنیفات

زینہ چرت (نثر) جس میں سوم نپڈت نے بادشاہ کے حالات زندگی شرح وبسط کے ساتھ لکھے ہیں ۔ مسٹر یور نے اس کا ذکر کیا ہے ۔ یہ کتاب آج تک کسی کو نہ مل سکی ۔

زینہ ولاس ۔ منظوم ناٹک مصنف یودھا بٹ ۔ اس میں بادشاہ کی زندگی کے ایک واقعہ کو ڈرامہ کی صورت میں لکھا گیا ہے ۔

بان آسرور ۔ مصنف ومضمون نامعلوم ۔ یوہلر نے لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ مجھکو ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہد بڈشاہی کی تصنیف ہے ۔

اشلوکس شیخ نورالدین ولی کا منظوم کلام نہایت ادق کشمیری زبان میں ہے جس میں سنسکرت کا زیادہ حصہ ہے ۔ اس منظوم کلام کو سب سے پہلے بڈشاہ کے عہد میں مرتب کیا گیا ۔

فارسی زبان میں عہد بڈشاہی کی تصنیفات

تاریخ کشمیر۔ مصنفہ ملا نادری۔ کتاب ناپید ہے۔
تاریخ کشمیر۔ مصنفہ قاضی حمید۔ ” ” ”
مقامات۔ مصنفہ حاجی بابا ادہم۔ درحالات اولیاؤ صوفیائے کرام۔
دیوان اویسی۔ حضرت سید محمد امین اویسی کا صوفیانہ منظوم کلام۔
کفایہ منصوری۔ اس کا دوسرا نام کفایہ مجاہدہ ہے۔ یہ علم طب کی ایک لاجواب کتاب ہے۔ اور اچھی خاصی ضخیم ہے۔ اس میں کئی مقدمے ہیں۔ ہر مقدمے میں کئی مقالے۔ ہر مقالے میں کئی باب اور ہر باب میں کئی فصلیں ہیں۔ اگرچہ کتاب نولکشور پریس میں چھپ چکی ہے۔ مگر راقم الحروف کو اس کا ایک قلمی نسخہ بھی ریسرچ ڈیپارٹمنٹ کشمیر میں دیکھنے کا موقعہ ملا ہے جو ۱۲۴۳ھ کا نقل کیا ہوا ہے۔ نقل کنندہ کا نام محمد اکرم ہے۔ جو نعل بند پورہ سرینگر کا رہنے والا ہے۔ مصنف کا نام منصور بن محمد بن احمد بن یوسف بن قیصر الیاس ہے۔

۲۵
پچیسواں باب

بڈشاہ کے عام اخلاق وعادات

بڈشاہ اپنی فتوحات عظیمہ اور لشکر جرار اور اپنی مشہور بے تعصبی اور رواداری کی وجہ ہی سے عظیم الشان اور قابل احترام بادشاہ نہ تھا۔ بلکہ

اپنے پاکیزہ اخلاق اور نیک عادات اور اپنے نیک چال چلن کے باعث بھی اپنی رعایا کی آنکھوں کا تارا تھا۔ مسلمان اور ہندو اس کے نام کی بجائے ہمیشہ اسے بڈشاہ اور بڈہ شاہ کہتے رہے۔ اور یہ مقبولیت اسے اپنی زندگی ہی میں نصیب ہوگئی۔ آج بھی کم لوگ ہیں۔ جو اس کے اصلی نام سے آگاہ ہیں۔

مال غیر اور زن بیگانہ سے نفرت

مال غیر اور زن بیگانہ دونوں کو وہ اپنے لئے حرام سمجھتا تھا۔ چنانچہ صاحب مختصر التواریخ لکھتے ہیں " بر روئے زن بیگانہ و مال مردم نظر بہ خیانت در نمے کرد " ایک شہزادہ نے ایک برہمنی کے ساتھ جو نازیبا حرکت کی اس کے لئے یہ جلیل القدر بادشاہ برہمن کے گھر ننگے پاؤں گیا۔ اور اس سے معذرت طلب کی۔ راجہ راجو اپنی بیٹی اس کے حضور میں بطور تحفہ بھیجتا ہے۔ اور یہ اسے ماں کہکر پکارتا ہے۔ اور جب تک وہ زندہ رہتی ہے۔ بطور ماں کے اس کا ادب و احترام کرتا ہے۔

اس موقعہ پر زونراج ایک لطیف فقرہ بادشاہ کے متعلق چسپاں کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ بیشک بادشاہ نے اس بات کے لئے قسم کھائی ہوئی تھی۔ کہ میں کبھی کسی غیر عورت کی طرف نظر بھر کے نہ دیکھوں گا۔ اور نہ اس کو اپنی شہوانی خواہشوں کا شکار بناؤں گا۔ لیکن اس کا یہ حلف بے اختیار ٹوٹ گیا جب قسمت اور شہرت کی دیوی اس کے ساتھ آکر ہمکنار ہوگئی۔ یہ دیوی جو مقبولیت اور عظمت کا پیش خیمہ تھی۔ اس بادشاہ سے پہلے کسی اور کے قبضہ میں تھی۔ لیکن اب ہمارے بادشاہ نے اس کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔

تاریخ کشمیر کوئی ایسی شہادت پیش نہیں کرتی۔ کہ اس بادشاہ نے دوسروں کے زر و مال پر دست برد کی ہو۔ اس نے اپنے باپ اور بھائی کے زمانے کے

ٹیکس بھی رعایا کو معاف کر دیئے۔ زونراج لکھتا ہے کہ رعایا پر جو ٹیکس عاید تھے اور جن کی وجہ سے رعایا دبی جا رہی تھی۔ وہ سب بادشاہ نے موقوف کر دیئے

عتاب میں الطاف

یہ بادشاہ ایسا نیک دل اور نیک نیت تھا۔ اور اس کے اخلاق ایسے اعلیٰ تھے۔ کہ جس کسی پہ اس کا عتاب بھی نازل ہوتا تھا۔ اس کو اس وقت درگزر کر کے کسی اور موقع پر ایسی آسانی اور خوبی کے ساتھ اپنے ملک سے باہر کر دیتا تھا۔ کہ وہ بادشاہ کی ناراضگی سے قطعی لاعلم و بے خبر رہتا تھا۔ اور اپنی جلاوطنی کو بھی بادشاہ کی عنایت ہی سمجھتا تھا۔ اس کی پالیسی ایسی گہری ہوتی۔ کہ عقلمند سے عقلمند بھی اس کی دوستی و دشمنی میں تمیز نہ کر سکتا تھا۔

ملک گیری و پیشقدمی کا حامی نہ تھا

بڈشاہ پر اس کی رعایا کا ایک ایک فرد جان دیتا تھا۔ اس کی باقاعدہ پیدل اور سوار فوج بھی کافی تعداد میں تھی۔ اور ملک کی لاج قائم رکھنے کے لئے مرمٹنا معمولی بات سمجھتی تھی۔ کشمیر سے باہر ہندوستان خراسان عراق و عرب تک اس کی فیاضی و دریا دلی اور اس کے اعلےٰ اوصاف کی شہرت تھی۔ اگر وہ ملک گیری و پیشقدمی کا حامی ہوتا۔ تو اندرونی و بیرونی ہر دلعزیزیوں کی وجہ سے یقیناً ہر جگہ کامیاب ہوتا۔ اور جہاں تک چاہتا اپنی مملکت کو وسعت دے سکتا تھا۔

لیکن ناحق خلق خدا کا خون بہانا اس نے کبھی پسند نہیں کیا۔ وہ ایسا رحمدل تھا کہ اس نے شکار تک کی ممانعت کر دی تھی۔ پھر وہ انسانوں کا خون کس طرح جائز رکھ سکتا تھا۔ تاریخ جس قدر اس کے حملوں کا پتہ دیتی ہے۔ وہ مدافعتی تھے۔

زونراج بادشاہ کی فوجی پالیسی کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ بادشاہ نے خود بخود کبھی کسی ملک پر چڑھائی نہیں کی۔ بلکہ ہمیشہ مدافعانہ حملے کرتا رہا۔ اس کو کشت وخون کرنے سے طبعاً نفرت تھی۔ اس کو ملک گیری اور دولت جمع کرنے کا کوئی شوق نہ تھا۔ پہاڑی علاقوں میں جو رئیس تھے۔ وہ خود بخود بادشاہ کے ماتحت ہوتے چلے گئے۔ تاریخ بہاؤالدین متو کی سطور ذیل سے بھی اس کی فوجی پالیسی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "اگر کسے از سلاطین اجانب و اطراف تغلب و استیلا برایں نواحے مے نمود۔ سلطان زین العابدین سپہ داران و امرائے لشکر خود کشیدہ بہ ایشان جنگ ہائے کرد۔ حدود ولایت خود را از استیلائے ایشان نگاہ مے داشت"۔

دشمنوں سے سلوک

جو متمرد اور سرکش ہوتے تھے۔ ان کی گوشمالی بھی کرتا تھا جیسا کہ پانڈو چک کو اس نے اس کی بدکرداریوں کی سزا دی۔ اور جو ان میں اصلاح کر لیتے تھے۔ ان کی عزت افزائی بھی کر لیتا تھا۔ اس موقعہ پر پانڈو چک کے بیٹے حسین چک کو یاد رکھنا چاہیئے۔ جو باپ کی وفات کے بعد پیدا ہوا تھا اور ترقی کرتے کرتے دربار شاہی میں پہنچ گیا تھا۔ جہاں اس نے خدمات شاہی کے باعث بادشاہ کے دل میں گھر کر لیا تھا۔

سادگی اور انکساری

باوجود اس قدر شان و شوکت اور جاہ و جلال کے یہ بادشاہ ہمیشہ سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ البتہ تاج کے اندر وہ کلاہ مبارک ضرور رکھتا تھا۔ جو امیر کبیر سید علی ہمدانی نے اس کے دادا سلطان قطب الدین کو عطا فرمایا تھا۔ اور جو

ل طبقات اکبری

اس کے خاندان میں سلطان ابوالفتح یعنی فتح شاہ تک (جو بڈشاہ کا پوتا تھا) برابر سر پر پہنا جاتا رہا۔ ابوالفتح کے مرنے کے بعد جب وہ کلاہ اس کے کفن کے ساتھ دفن کر دیا گیا تھا۔ تو اسی زمانہ سے ان کی دولت و سلطنت کو زوال آنا شروع ہو گیا تھا۔

اس کی انکساری کا یہ عالم تھا کہ علما و فضلا کو زاد راہ بھیجکر مختلف ممالک سے بلواتا اور مناصب جلیلہ عطا کرتا تھا۔ اور پھر ان کے مکانوں پر جا کر ان کی عزت افزائی کرتا اور ان کی صحبتوں سے مستفیض ہوتا تھا۔ اور بعض علما و فضلا و صوفیا رجب حریت صادقہ سے کام لے کر اس کی باتوں سے اختلاف یا ناراضگی کا اظہار کرتے تھے۔ تو برا نہیں مانتا تھا۔ اور اگر کبھی ناراض بھی ہوتا تھا تو بہت جلد اپنی پشیمانیوں کا اظہار کرتا تھا۔

خزانہ شاہی پبلک امانت ہے

اس نے سرکاری خزانہ کو ہمیشہ رعایا کی امانت تصور کیا۔ اور جب کبھی اسے خرچ کیا فلاح عامہ اور آسائش رعایا کے خیال کو سب سے مقدم رکھا۔ اس نے شاہی خزانہ کو علوم و فنون کی سرپرستی زراعتی ترقی اور نہروں کے احداث کے لئے وقف کیا۔ اور بقول صاحب اسلامک کلچران کشمیر بڈشاہ ایسا بادشاہ تھا۔ جو صنعت و حرفت کا معاون مزارعین کا دوست' علوم و فنون کا مربی' ہندوؤں کا محسن اور اپنی رعایا کا بہی خواہ تھا۔

بادشاہ کے ذاتی اخراجات

سرکاری خزانہ اور شاہی دفائن جب رعایا کے سود و بہبود کے کام آتے تھے۔ تو بادشاہ اپنے ذاتی اخراجات کہاں سے پورے کرتا تھا؟ اس کے جواب میں صاحب طبقات لکھتے ہیں۔ سلطانؒ کے اپنے روزمرہ کے اخراجات

کی کفیل سلطنت نہیں ہوتی تھی۔ نہ اس نے خزانے سے کوئی اپنی تنخواہ مقرر کر رکھی تھی۔ بلکہ کان مس سے جو اس نے خود دریافت کی تھی۔ اور جہاں صدہا مزدور بیگار پر نہیں بلکہ کام پر لگے رہتے تھے۔ وہ اپنے اخراجات ادا کیا کرتا تھا۔ اسی مس کی کان سے سرکاری سکہ جات تیار ہوتے تھے۔

چونکہ بادشاہ علم کیمیا وسیمیا میں بڑی بخوبی ماہر تھا۔ کان مس کے علاوہ کان جواہر بھی اس نے دریافت کی تھی۔ چنانچہ جواہرات زینہ رتن اسی کے نام پر اور اسی کے عہد سے مشہور چلے آتے ہیں۔ ان دونوں کانوں کی آمدنیوں سے وہ سیر و تفریح کرتا اور مطربوں اور مغنیوں کی سرپرستی کیا کرتا تھا۔ البتہ علماء و فضلا کی قدر دانیاں، درس گاہوں کے اخراجات اعلیٰ و صنعتی وظائف غربا و ضعفاء کی پرورش اور دیگر امور جن کا تعلق ملک کی خدمت و فلاح سے تھا وہ خزانہ شاہی سے ادا کرتا تھا۔

بادشاہ کی بے تعصبی

بڈشاہ کی بے تعصبی بلکہ مندروں اور بت خانوں کی تعمیر و مرمت کی وجہ سے اکثر مورخوں نے اس پر بت پرستی کا الزام بھی لگایا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ خالص اسلامی اخلاق و تعلیم کا پابند تھا جس میں لکھا ہے کہ تم غیر اقوام کی عبادت گاہوں کو مسمار نہ کرو۔ اور ان کے بتوں کو گالیاں نہ دو تاکہ وہ تمہارے سچے خدا کو گالیاں نہ دیں۔ بڈشاہ اپنی عمر کے آخری لمحے تک اس پر قائم رہا بلکہ مرنے سے پیشتر اس نے مندر تسکر اچارج کی نہ صرف حفاظت کی۔ بلکہ اس کی مرمت و تعمیر کرا کے اس کو از سر نو زندہ کر دیا

تبدیل لباس اور حالات رعایا

بڈشاہ اپنے اوقات عزیز کا بڑا حصہ سیر و سیاحت اور دار الخلافہ کے علاوہ دیگر

مقامات کی تعمیرات پر بھی صرف کرتا تھا۔ دیہات و پرگنہ جات میں بھی اس کی آمد و رفت رہتی تھی۔ اور ہر چند اس کے فرمان کا بھی عمال پر بڑا اثر تھا۔ کہ کوئی اہلکار کسی شخص سے نذرانہ قبول نہ کرے۔ لیکن اس کے اپنے دورے اور آمد و رفت کی وجہ سے بھی افسران مالی و ملکی خوفزدہ رہتے تھے۔ اور اس طرح غریب دیہاتی اور عوام ماتحت حکام کی استبداد کا تختہ مشق بننے سے محفوظ رہتے تھے۔

لیکن اس کی رعایا پروری یہیں ختم نہ ہو جاتی تھی۔ وہ راتوں کو لباس تبدیل کر کے اِدھر اُدھر نکل جاتا اور عام لوگوں میں شامل ہو کر ان کے حقیقی خیالات و جذبات ان کے مطالبات اور ان کی شکایات سے آگاہی حاصل کرتا۔ اور اپنی ذات کے متعلق لوگوں کے خیالات سنتا۔ لوگ اس کی تعریف کرتے۔ تو یہ خدا کا شکر ادا کرتا۔ اور زیادہ خدمات کی توفیق رفیق ہونے کے لئے دست بہ دعا ہوتا اگر اپنی کوئی برائی سنتا۔ تو اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا۔ اگر کسی حاکم کی زیادتی سے اس کے کان آشنا ہو جاتے۔ تو اس کی سرزنش کرتا۔

بادشاہ کی اس نیک عادت کو تاریخ خواجہ اعظمیؒ اور تاریخ حسنؒ کے مصنفوں نے نہایت مختصر مگر جامع طور پر مندرجہ ذیل الفاظ میں ادا کیا ہے "بادشاہ رعیت پروری بسیار مے نمود و تغییر لباس کردہ شب ہائے برے آید۔ تا حسن و قبح عمال و عمل خود بشنود۔

بادشاہ کا زہد و اتقاء

جس بادشاہ کی نظر میں زن بیگانہ اور مال غیر حرام ہو جو بادشاہ ہونے اور ہر قسم کی استطاعت رکھنے کے باوجود بیگمات اور کنیزوں کی کثرت سے بے نیاز ہو۔ اس کے زہد و اتقا میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

لہ ایڈیشن اول صفحہ ۵۰ طبع ۱۳۰۲ھ مطبع محمدی لاہور ۲ے صفحہ ۵ قلمی نقل ۱۳۰۱ھ

مشائخ عظام اور علمائے کرام کی خاکپا کو وہ طوطیائے چشم تصور کرتا تھا۔ مساجد و مزارات کی تعمیر میں اس نے فراخدلی سے کام لیا۔ زینہ لنک میں جو عالیشان محل اس نے تعمیر کرایا۔ اس میں بھی عبادت خانہ بنائے بغیر نہ رہا۔ جہانگیر اپنی توزک میں لکھتا ہے:" دریک طرف آں از صفحہ عمارتے بہ اتمام رسانیدہ عبادت کدہ بہ جہت پرستش پروردگار خود ترتیب دادہ کہ ازاں نقش برجائے نمے باشد"

جہانگیر لکھتا ہے۔ کہ لوگوں کے دلوں میں اس کا اس قدر احترام ہے۔ کہ وہ اس کو ولی سمجھکر اس کے خوارق عادات بیان کرتے ہیں۔

چھبیسواں باب ۲۶

دربار بڈشاہی کے ارکان

بادشاہ کے دربار میں ہندو اور مسلمان دونوں مذہبوں کے نمائندے موجود رہتے تھے جس طرح اکبری دربار کے ارکان" نورتن اکبری" کہلاتے ہیں۔ اسی طرح زین العابدین کے ارکان سلطنت" زینہ رتن" کے نام سے موسوم کئے جا سکتے ہیں۔ جن کی ایک مختصر سی فہرست ذیل میں درج ہے۔

(فہرست سامنے صفحہ پر درج ہے)

نمبر شمار	نام	عہدہ یا خطاب	نمبر شمار	نام	عہدہ یا خطاب
۱	شہزادہ محمد خاں	نائب السلطنت	۱۳	خواجہ بدیع الدین باندرے	رئیس الملک
۲	شری بٹ	چیف جسٹس	۱۴	احمد رینہ	امیر الجیش
۳	شیوبٹ	افسر الاطبا	۱۵	سید نصیر الدین خان بخاری	سفیر
۴	ہلمت رینہ	سپہ سالار	۱۶	ملک مسعود ٹھاکور	وزیر
۵	ملک جلال الدین ٹھاکور	مشیر السلطنت	۱۷	گوپال کول	صدر قانونگو قلمرو
۶	مادہو کول	قانون گو کا راج	۱۸	گنیش کول	قانون گو کا راج
۷	ملک ون ٹھاکور	معتمد درباری	۱۹	حسین چک	امیر الملک
۸	میر علی بخاری	قاضی شہر و صدر مدرس	۲۰	ملا جمال الدین	قاضی القضاۃ
۹	ملا کبیر	شیخ الاسلام	۲۱	میر علی گنائی	مصاحب
۱۰	نتو گنائی	امیر الامرا	۲۲	سدا شیو بابو	جوتشی و منجم
۱۱	سید حسین قمی	-	۲۳	ملا پارسا	مصاحب و مدرس
۱۲	سید محمد بیہقی	مصاحب	۲۴	سید ناصر الدین	مصاحب اعلیٰ

متذکرہ صدر درباریوں میں سے چند ایک کے حالات طبقۂ علما میں درج ہونگے بعض کا ذکر بادشاہ کی ملکی مہمات میں آچکا ہے۔ چند ایک کا ذکر ذیل میں درج کیا جاتا ہے

افسر الاطبا حکیم شیوبٹ

سلطان کے نامی طبیبوں ندیموں اور مقربوں میں شیوبٹ کا بہت بڑا درجہ تھا۔ وہ طبابت میں منتخب روزگار تھا۔ اور سلطان اس پر انواع و اقسام کی نوازشیں کیا کرتا تھا۔ یہ حکیم شیوبٹ ہی تھا جس کی تحریک و سفارش

سے بادشاہ نے حکم دیدیا۔ کہ سلطان سکندر کے زمانے سے جو لوگ جلاوطن ہو کر ممالک غیر میں چلے گئے ہیں۔ وہ وطن میں واپس آسکتے ہیں۔ اور جہاں جہاں ان کی جائیداد ہے۔ وہ اس پر قابض ہوسکتے ہیں۔ اور جہاں جہاں ان کے معابد ہیں وہ ان میں عبادت کرسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی رعائتیں دیں جن کا ذکر اپنے موقعہ پر ہوچکا ہے۔

یہی شیو بٹ تھا۔ جس نے اس زمانہ میں جبکہ لوگ حب وطن اور قوم پرستی کے جذبات سے محروم اور ایثار و قربانی کے احساسات سے بے بہرہ تھے۔ وہ کام کر دکھایا۔ جس کی مثال اس کے قریباً دو سو سال بعد شاہجہان کے زمانہ میں جاکر ملی۔ جبکہ بادشاہ کی بیٹی جہاں آرا بیگم کا کامیاب علاج کرنے کے بعد ایک انگریز انعام و اکرام کے بدلے اپنی قوم کی تجارت پر سرکاری محصول کی معافی کا خواستگار ہوا۔

شیو بٹ کو بھی بادشاہ کے علاج میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اور جب بادشاہ نے اس کو انعام دینا چاہا۔ تو اس نے ذاتی انعام کی بجائے اپنی تمام قوم کے لئے انعام کی درخواست کی۔ اور جزیہ کی معافی طلب کی۔ چنانچہ بادشاہ نے تمام ہندوؤں پر سے جزیہ معاف کر دیا۔

شیو بٹ کے مکانات بھی نوشہرہ راجدہانی ہی میں تھے۔ چنانچہ نوشہرہ سے راجدہانی کے کھنڈروں کو جاتے ہوئے سر راہ محلہ مدن صاحب آتا ہے۔ اس سے ذرا آگے بائیں طرف ایک مقام "شری بٹ کی دوکان" کے نام سے موسوم ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ یہاں "شری بٹ" کا دواخانہ تھا۔ شری بٹ تو بادشاہ کا چیف جسٹس تھا۔ اس کو دواخانے سے کیا تعلق؟ معلوم ہوتا ہے۔ شیو بٹ شاہی طبیب اور شری بٹ کے ملتے

جلنے ناموں کی وجہ سے یہ مغالطہ عوام میں اب تک چلا آتا ہے۔ اور اگر یہ مقام دواخانہ ہی تھا۔ تو شیوبٹ کا ہوگا۔ نہ کہ شری بٹ کا۔

زونراج شیوبٹ کے متعلق لکھتا ہے۔ وہ بادشاہ کا درباری طبیب اور سرکاری سرجن تھا۔ بادشاہ کی عنایتوں نے اسے امیر کبیر بنا رکھا تھا۔ اور رفاہ عام کے کاموں میں اپنے محبوب بادشاہ کی طرح پوری دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے بھی شہر میں بڑے بڑے مٹھ تعمیر کرائے۔ جہاں طلبا تعلیم پایا کرتے تھے۔ بادشاہ کی تقلید میں اور بھی کئی وزرا، اور اہل دربار رفاہ عام تعمیرات میں عوام کی دعائیں لیا کرتے۔ اور اپنی نیکیوں میں اضافہ کیا کرتے تھے۔

شیوبٹ ایسا کامل طبیب ہو۔ جس کو اکبری عہد کا نامور مؤرخ صاحب طبقات اکبری اس فن میں منتخب روزگار لکھتا ہے۔ اور پھر علم طب میں اس کی کوئی تصنیف کشمیر میں نہ مل سکے۔ تعجب ہے ہمارے خیال میں اس نے ضرور اس فن پر کوئی کتاب بلکہ کئی کتابیں لکھی ہونگی۔ جو آج ہماری بدقسمتی سے ناپید و معدوم ہیں۔

شری بٹ وزیر انصاف

شری بٹ کو زینہ ترنگنی میں زونراج ادب و احترام کے ساتھ "شری شریہ بٹ" لکھتا ہے۔ بعض مورخوں نے اس کو بادشاہ کا شاہی طبیب لکھا ہے۔ یہ غلط ہے۔ شاہی طبیب اعلےٰ کا نام شیوبٹ تھا۔ شری بٹ وزیر انصاف تھا۔ اور ملک کی تمام عدالتیں اس کے ماتحت تھیں۔ گویا وہ عہد بڈشاہی

---

[1] مکمل تاریخ کشمیر جلد دوم میں راقم بھی شری بٹ کو طبیب شاہی لکھ چکا ہے۔ جو بعد کے مطالعہ و تحقیقات سے غلط ثابت ہوا ہے۔

کا چیف جسٹس تھا۔ زونراج اپنی زینہ ترنگنی میں لکھتا ہے۔ کہ بادشاہ نے مجھے زینہ ترنگنی کی تصنیف کا جو حکم دیا۔ وہ مجھے شری بٹ کی معرفت ہی ملا۔ جو تمام عدالتوں کا افسر اعلیٰ تھا۔

زونراج دوسری جگہ شہزادہ محمد خان نائب السلطنت کی موت کے بعد شری بٹ کی وفات کا ذکر بھی کرتا ہے اور لکھتا ہے۔ انہی ایام میں شری بٹ جو ہماری عدالتوں کا چیف جسٹس تھا۔ انتقال کر گیا۔ بادشاہ کو اس کی وفات اور اپنے دیگر مقربین کی وفات سے بہت ملال ہوا۔ یہ واقعہ ۱۴۵۹ء سے پیشتر کا ہے۔

طبقات اکبری میں اس کی وفات کے موقعہ پر مصنف لکھتا ہے۔ بادشاہ نے اس کے اہل وعیال کے لئے ایک کروڑ زر کشمیر جو اکبری سکہ کے مطابق چار سو اشرفیوں کے برابر ہے مقرر کیا۔ طبقات کے اصل الفاظ یہ ہیں "شری بٹ کہ وزیر سلطان بود چوں از عالم رفت سلطان یک کروڑ زر کشمیر کہ چار صد اشرفی باشد بہ جہت او بہ اطفال تصدیق نمود۔"

سید ناصر الدین بیہقی

سید ناصر سلطان زین العابدین کے مقربان خاص میں تھے۔ سلطان اپنی مجلس میں ان کو (ان کے علم و فضل اور ان کے مشیر با تدبیر ہونے کی وجہ سے) ہمیشہ اپنے آپ پر سبقت و فوقیت دیتا تھا۔ ان کی پوتی یعنی سید حسن کی بیٹی حیات خاتون سے زین العابدین کے پوتے سلطان حسن شاہ نے شادی کی تھی۔ جس سے دو بیٹے محمد اور حسین پیدا ہوئے۔ محمد۔ محمد شاہ کے نام سے تخت کشمیر کا مالک بنا۔

سلطان حسن شاہ کے زمانہ تک سید ناصر زندہ تھے۔ اور وہ چونکہ

بڈشاہ جیسے جلیل القدر بادشاہ کی آنکھیں دیکھے ہوئے اور سلطنتوں کے بگڑنے اور بننے کے وجوہ واسباب سے کما حقہ آگاہی رکھتے تھے۔ انہوں نے حسن شاہ کو اس کی بعض بے اعتدالیوں سے منع کیا۔ لیکن اس نے راہ راست اختیار کرنے کی بجائے آپ کی حریت و حق گوئی سے ناراض ہو کر آپ کو کشمیر سے نکلوا دیا۔ آپ سیدھے دہلی چلے گئے اور وہیں رہ پڑے۔ جب ان کے بعد باہمی خانہ جنگیوں سے کشمیر میں ابتری پھیلنی شروع ہوئی تو حسن شاہ نے آپ کو یاد کیا۔ آپ اس وقت ضعیف العمر تھے۔ اور سفر کے ناقابل لیکن ملک کی تباہی کی خبریں سُنکر آلنسو نکل آئے۔ چنانچہ آپ کشمیر کو روانہ ہوگئے۔ اور جب تمام مراحل طے کرکے درہ پیر پنچال کی سر بفلک بلندی پر پہنچے۔ تو طبیعت زیادہ کمزور ہوگئی اور وہیں ٹھہر گئے۔ ؎

حسرت پہ اس غریب مسافر کی رو دیئے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

خیال یہ تھا کہ ع آگے چلیں گے دم لیکر۔

لیکن قدرت اس وقفہ قیام ہی کو دم واپسیں بنا رہی تھی۔ چنانچہ آپ نے اس عالم مہجوری میں جان جان آفریں کو سونپ دی ؎ المولف

ہائے اے ولولۂ خواہش اصلاح وطن
تجھ سا پُر حسرت ارماں نہ دیکھا نہ سُنا

ملک مسعود ٹھاکر

تاریخ کشمیر میں ٹھاکور خاندان کا بڑا مرتبہ ہے ملک مسعود ملک جلال

ے ٹھاکور یا ٹھکور کی صحیح وجہ تسمیہ معلوم نہیں ہوسکی (بقیہ حاشیہ دیکھو صفحہ ۳۸۰ پر)

اسی خاندان کے نونہال تھے۔ بابا داؤد مشکواتی مصنف اسرار الابرار جو خود بھی اسی خاندان سے ہیں۔ شیخ اوتر ٹھکور کے حالات میں اپنا خاندانی تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ہم ضحاک بادشاہ کی نسل سے ہیں۔ جب فریدوں ضحاک پر غالب آیا۔ تو ضحاک کی اولاد کوہ غور میں چلی آئی۔ اس خاندان میں سب سے پہلے شبیب نے مذہب اسلام قبول کیا۔ جب غوریوں پر غزنی و دہلی میں زوال آیا۔ تو حوادث روزگار کے باعث ان کا ایک نامور فرد حسن غوری ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۹) بابا داؤد مشکواتی جو اسی خاندان سے شاہجہان کے زمانہ میں ایک عارف کامل بزرگ ہوئے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ٹھکور ہم غوریوں کا نام ہندوستان میں ہی رکھا گیا تھا جس کے معنی پیشوا کے ہیں۔ مولوی سعادت مفتی گلشن کشمیر میں لکھتے ہیں۔ ٹھکور کے معنی پہلوان اور شہ زور کے ہیں۔ لیکن یہ کوئی نہیں لکھتا کہ ٹھکور ہے کس زبان کا لفظ اور اس خاندان کے ساتھ اس کا کیا تعلق تھا لیکن اس معمہ کا کچھ حل زدزاج کی زینہ ترنگنی کے مطالعہ سے بھی ہو سکتا ہے۔ وہاں زدزاج بادشاہ کے بھائی شہزادہ محمد خاں کے متعلق لکھتا ہے کہ شہزادہ بہت اچھا ٹھکور تھا۔ معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہندو عہد قدیم کا لفظ ہے۔ جو وزرا امراء کو بطور خطاب ملا کرتا تھا۔ بادشاہ نے بھی اسی لفظ کو برقرار رکھا ہوگا۔ چنانچہ اس کے حقیقی بھائی نائب السلطنت کے نام کے ساتھ ہی ہم ٹھاکور کا لفظ دیکھتے ہیں۔ چونکہ ملک مسعود بادشاہ کا مقرب اور رئیس تھا۔ اس کو بھی یہی خطاب ملا ہوگا۔ زدزاج نے اس کے نام کے ساتھ ٹھاکور کا لفظ لکھا ہے۔ اس قول کے مطابق کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ جموں و کشمیر کے موجودہ فرمانروا مہاراجہ سر ہری سنگھ بہادر نے بھی دو مسلمان رؤسا کو جاگیرداروں کے علاوہ (بقیہ حاشیہ دیکھو صفحہ ۳۸۱ پر)

کشمیر چلا آیا بادشاہان کشمیر نے ان کی نجابت و شجاعت سے آگاہ ہو کر حسن غوری کو عمدۃ الملک کا خطاب دیا۔ لیکن عوام میں وہ صرف ملک کے نام سے مشہور رہے چنانچہ ملک حسن۔ ملک قاضی ٹھکور۔ ملک فیروز ٹھکور۔ ملک مسعود اور اس کا بیٹا ملک جلال سب اسی نام سے شہرت پذیر ہوئے۔ ملک مسعود بڈشاہ کے عہد حکومت میں سپہ سالاری اور وزارت تک کے عہدوں پر رہا ہے۔ اس کے تدبر و انتظام کی بڑی تعریف کی جاتی ہے۔ بادشاہ ہمیشہ اس مدبر جرنیل کا مداح رہا ہے۔ باوجود اس عہدہ اور ان سرکاری مصروفیتوں کے اس کو بابا اسمٰعیل زاہد کبروی سے بیعت بھی تھی۔ اخیر عمر میں مجاہدہ و گوشۂ عزلت سے زیادہ سروکار رہا۔

مسلمان مورخوں نے لکھا ہے کہ ملک مسعود بادشاہ کی وفات کے ۱۳ سال بعد ۸۹۱ھ میں انتقال کر گیا۔ اور اپنے باغ فتح کدل کے قرب و جوار میں دفن ہوا لیکن عہد بڈشاہی کا نامور مورخ جونراج زینہ ترنگنی میں لکھتا ہے۔ کہ ملک مسعود ٹھاکور کو بادشاہ کی زندگی ہی میں بادشاہ کے رضاعی بھائیوں نے حسد و عداوت کی وجہ سے قتل کر دیا تھا۔ اور اس واقعہ کا ذکر اسی کتاب میں کہیں پہلے بھی آ چکا ہے۔

ملک وِن ٹھاکور

اپنے بھائی ملک مسعود ٹھاکور کی طرح وِن ٹھاکور بھی بادشاہ کے مقربوں اور معتمدوں میں تھا۔ اس نے اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لئے بادشاہ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۵) ٹھاکور کا لفظ غلط کیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے ایک لسید ہے اور ایک افغان ہے۔ ٹھاکور اور ٹھاکر ایک ہی لفظ ہے۔ اور اس زمانہ میں اس کو عموماً راجپوت ہی استعمال کیا کرتے ہیں۔

اجازت طلب کی۔ قاتل ہر چند بادشاہ کے رضاعی بھائی تھے۔ تاہم اس نے ازراہِ انصاف وعدل وِن ٹھاکور کو بدلہ لینے کی اجازت دیدی۔ چنانچہ وِن نے بادشاہ کے ایک رضاعی بھائی شور۔ نامی کو اس کے ساتھیوں سمیت قتل کر دیا۔

وِن ٹھاکور کے متعلق زونراج لکھتا ہے۔ اس نے بہت سے متبرک استھانوں کی زیارت کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ شاید وہ کشمیر سے باہر بھی بزرگان دین کے آستانوں کی زیارت کے لئے گیا ہو۔ آخر جب وہ اس مقام پر آیا جہاں سیندھیا نمک کا محصول لیا جاتا تھا۔ تو وہاں وہ بیمار ہوگیا۔ اور چند دنوں کے بعد وہیں انتقال کر گیا۔

ملک جلال ٹھاکور

یہ ملک مسعود ٹھاکور کا فرزند وِن ٹھاکور کا بھتیجا ملک سیف الدین وزیر سلطان سکندر بت شکن کا داماد اور لچھمی خاتون کا خاوند تھا۔ لچھمی خاتون اپنے علم وفضل اور اپنے نیک کاموں کی وجہ سے بہت مشہور تھی۔ اس کا نام نہر لچھمی کوہل کی وجہ سے جو جامع مسجد تک پانی پہنچانے کے لئے اس نے جاری کی تھی۔ اب تک کشمیر میں زندہ ہے۔ یہ نہر نوشہرہ کے محلات شاہی کی نہر سے نکالی گئی تھی۔ اس نے اس پر ایک مضبوط بند تعمیر کرایا تھا۔ نہر کی رسم افتتاح کے موقعہ پر جب پانی چھوڑا گیا۔ اور جامع مسجد تک پہنچگیا۔ تو لچھمی خاتون کی طرف سے اسی ہزار آدمیوں کو دعوت طعام دی گئی۔

ملک جلال کے اور بھی کئی بھائی تھے۔ بادشاہ نے ان کی ذاتی خدمات اور ان کے خاندانی لحاظ سے پرگنہ شاورا میں ان کو چند دیہات عطا کئے تھے۔

بادشاہ کی وفات کے بعد سب بھائیوں نے سرکاری ملازمتیں ترک کر کے زہد و خلوت کی زندگی اختیار کر لی۔ ملک جلال نے محلہ گوجوارہ میں خانقاہ تعمیر کی۔ اور آخر وہیں دفن ہوئے۔ شیخ سلطان کاشمیری شیخ بہاؤالدین گنج بخش اور شیخ نورالدین ولی کے صحبت یافتوں میں تھے۔

ستائیسواں باب ۲۷

عہد بڈشاہی کے مؤرخ و شاعر

بادشاہ کی شاعری

شریور نے اپنی تاریخ میں اکثر جگہ بادشاہ کی شاعری اور شعرنوازی کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے جب مانڈو کے فرمانروا کھلجا کو اس کے تحائف و ہدایا کے جواب میں بادشاہ نے اپنے ملک کی بعض قیمتی اشیا ارسال کیں۔ تو اپنی ایک نظم بھی اپنے ایلچیوں کے ہاتھ اسے بھیجی۔ جو کشمیری زبان میں تھی

بادشاہ کے چند اشعار کشمیر کی قدیم بیاضوں سے فارسی زبان میں بھی ملتے ہیں لیکن جن دو نظموں کا ذکر کشمیر کے اسلامی مورخوں نے اپنی تاریخوں میں کیا ہے ان کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ مثلاً کشمیر میں ایک مناجات بزبان عربی بطور وظیفہ پڑھی جاتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ بڈشاہ کی تصنیف سے ہے۔ لیکن کسی تاریخ دان و تاریخ نویس کو اس پر وثوق و اعتبار نہیں ہے۔ پھر سب سے پہلے حیدر ملک چاڈوڈرہ کی تاریخ میں بادشاہ کی فارسی شاعری کے متعلق ایں یہ

چند سطور نظر آتی ہیں۔

"خود ہم سلطان سخنور بود و قطبی تخلص داشت چنانچہ این دو بیت رنگین از نتیجہ طبع وقار سلطان است کہ ابراد مے یابد" ؎

اے نگہ و شمع رویت عالمے پروانۂ — وز لب شیرین تو شور یست در ہر خانۂ
من بہ چندیں آشنائی مے خورم خون جگر — آشنا را حال این است وائے بر بیگانۂ

ان کے علاوہ ایک قدیم بیاض میں جو پیر شمس الدین صاحب حیرت پاندانی سرینگر (کشمیر) کے پاس محفوظ ہے۔ چند دیگر شعرا کی غزلوں کے ساتھ جو اسی زمین اور اسی قافیہ میں ہیں۔ پہلے اشعار کے بعد یہ دو شعر بھی بڈشاہ کے نام درج ہیں ؎

منزل غمہائے تو شد سینۂ نالان من — لاجرم شد ہمنشیں گنجے وہم ویرانۂ
ماہ من گر ستیزانی رحم کن بر بیدلاں — کر تو ماند ایں حکایت در جہاں افسانۂ

مگر محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں خواجہ محمد اعظم نے جو تاریخ "واقعات کشمیر" کے نام سے لکھی ہے اس میں انہوں نے پہلے دو شعروں کو سلطان قطب الدین یعنی بڈشاہ کے دادا کے نام سے موسوم کیا ہے۔ بلکہ ان دو کے علاوہ ایک اور شعر لکھا ہے جس میں قطب تخلص بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے ؎

قطب مسکیں گر گناہے میکند عیبش مکن
شیخ نہ بود گر گناہے میکند دیوانۂ

مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد کا مصنف و مورخ پنڈت بیربل کاچرو بھی مذکورہ صدر شعر نقل کر کے لکھتا ہے "اکثرے میل خاطر بہ شعر و سخن مے نمود و قطب تخلص خود مے خواند و دیوان قطبی از زادہ طبع او مشہور است" لیکن تعجب ہے وہ دیوان مشہور بھی ہے لیکن اس مشہور دیوان میں سے جو مورخ اس کے اشعار کا

حوالہ دیتا ہے صرف یہی دو تین شعر لکھتا ہے۔ اس لئے یہ اشعار بڈشاہ کے نہیں۔ بلکہ سلطان قطب الدین ہی کے معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ شاعر بھی تھا۔ اور صاحب دیوان بھی۔ مورخ اس کے دیوان کا نام بھی دیوان قطبی بتلاتے ہیں۔ اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

البتہ فارسی میں بڈشاہ کا ایک مصدقہ شعر ملک الشعراء ملا احمد کے حالات میں لکھا جا چکا ہے۔ چند شعر بیاض نامی (غیر مطبوعہ) میں نظر سے گزرے ہیں۔ جن کو بڈشاہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک حسب ذیل ہے

جہاں نتواں ستردن نقش عشق سرشکن ہرگز
حکایت ہا زبان تیشۂ فرہاد مے گردد

سو سال کے بعد حضرت یعقوب صرفی کاشمیری (اکبر کے زمانہ میں) اس کی تضمین اس طرح کرتے ہیں ؎

نگردد کم نوائے بلبل از شور زغن ہرگز
نہ سازد محو ہنگامہ خزاں حرف چمن ہرگز
غم دنیا نہ سازد تلخ فکر عیش من ہرگز
جہاں نتواں ستردن نقش عشق سرشکن ہرگز
حکایت ہا زبان تیشۂ فرہاد مے گردد

بیاض سرخوش میں جس کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے۔ ایک رباعی درج ہے اور اس کے متعلق لکھا ہے۔ یہ رباعی سلطان کی ہے۔ اور وہ رباعی حسب ذیل ہے۔

تا شام حساب ملک گیری کردم — برتخت بلند قدر میری کردم
چوں نسبت جہاں بہ خواب غفلت عہدے — من رفتم و شکر عہد پیری کردم

کشمیر میں اکثر شعرا کے تذکرے بھی ہیں اور بیاضیں بھی۔ راقم نے بھی

کئی ایک بیاضیں دیکھیں۔ مگر افسوس ہے کہ دورِ بڈشاہی کے شعرار کے اشعار و حالات حسب خواہش نہ مل سکے۔

قاضی حمید

حمید الدین نام تھا۔ ان کے بزرگ قضا کے عہدوں پر ممتاز تھے۔ اس لئے قاضی کہلاتے تھے۔ ان کا ذکر کسی دوسری جگہ تفصیل سے نظر نہیں آیا۔ تاریخ حسن (غیر مطبوعہ) میں صرف ایک سطر درج ہے ؛ "قاضی حمید در زمان بڈشاہ تاریخ تصنیف کردہ است نقل آں نایاب"۔ قاضی حمید دنیا میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کی کتاب بھی نایاب ہے۔ لیکن صاحب کتاب یعنی مورخ ہونے کی حیثیت سے تاریخوں میں اس کا نام آج بھی زندہ ہے۔ سچ ہے ؎

رہتا ہے ذوق نام سخن سے ابد تلک | اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

نظر بند کاشغری شہزادہ

بیاض سرخوش میں ایک واقعہ قدر دانی شعرا کا درج ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ جنگ بنت دکاشغر کے بعد بادشاہ جب واپس آیا۔ تو بطور یرغمال ایک شہزادہ بھی ساتھ لایا۔ وہ شہزادہ شاعر تھا۔ ایک دن بادشاہ کی مجلس آراستہ تھی اور شہزادہ بھی اس میں موجود تھا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا۔ اپنی حکومت کے زمانہ سے لیکر اس وقت تک تم نے کیا دیکھا اور کیا تجربہ حاصل کیا ہے۔ شہزادے نے اس کے جواب میں فی البدیہہ یہ اشعار پڑھے۔ ؎

کجکول گدا و تاج شاہی دیدم | مسکینی و نیز کج کلاہی دیدم
از عزل ندانست کہ دنیا فانی است | زیں جملہ بدست روسیاہی دیدم

بادشاہ شہزادہ کے فی البدیہہ اور مناسب جواب سے بہت خوش ہوا۔ اور اسے رہا کر دیا
بیاض سرخوش کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ سلطان یکے را از سر آوردگان سرحد چین

بہ قال آوردہ بود مدتے در شہر کشمیر بند ماند طبیعت موزون داشت۔ روزے
درخدمت سلطان نشستہ بود سلطان فرمود۔ از زمان حکومت خود تا بہ ایں
زماں چہ یافتی آں فی البدیہہ بعرض رسانید (اس کے آگے وہ رباعی درج
ہے۔ جواوپر درج ہو چکی ہے)
" زمان حکومت خود" کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے۔ کہ وہ شہزادہ کسی علاقہ
کا خود مختار حاکم بھی تھا۔ بہر حال وہ کشمیر میں اتنی دیر تک رہ چکا اور اس ملک
سے اتنا مانوس ہو چکا تھا۔ اور بادشاہ کی قدر افزائیوں اور علم نوازیوں نے
اس کے دل میں اس قدر اثر کر لیا تھا۔ کہ آزاد ہونے کے بعد مرتے دم تک
وہ کشمیر میں ہی رہا۔

جینا واب چمن سے کیا کیجئے کنارا جینا اسی چمن میں مرنا اسی چمن میں

علاقہ پھاگ میں جوہارون سے اوپر گاندربل کے متصل ہے۔ ایک
قبر ارگن صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ وہ اسی ارغون شہزادے کی قبر
ہے۔ اس کا سنگ مزار بڈشاہی عہد کے مزارات سے ملتا ہے۔

پنڈت زونراج

دارالترجمہ میں تاریخ نویسی کے عہدے پر ممتاز اور بادشاہ کے معزز
درباریوں میں تھا۔ تاریخ نویسی میں اس کو ملک احمد علامہ کا ہم پلہ بتایا
گیا ہے۔ زونراج نے کلہن کے مابعد زمانے سے لیکر سلطان زین العابدین
کے وقت تک کے حالات بزبان سنسکرت نظم میں قلمبند کئے ہیں۔ جس
پر سلطان نے بذریعہ انعام واکرام اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ زونراج کی تاریخ
کا نام اس کے لئے اور بادشاہ زین العابدین کے نام پر زینہ ترنگنی مشہور ہے

لہ از خنظر اکبر آبادی ایڈیٹر رسالہ کنول آگرہ خلف اکبر علامہ سیماب وارثی اکبر آبادی۔

سٹین صاحب نے اپنے ترجمہ اور نوٹوں میں زینہ ترنگنی کے اکثر حوالہ جات دیئے ہیں۔ اور زودراج کا بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ زودراج نے اپنی زینہ ترنگنی میں ہندوؤں کے آخری عہد سے لیکر سلطان زین العابدین کے زمانہ تک کے حالات پر خامہ فرسائی کی ہے۔

زودراج بڑا عالم و فاضل تھا۔ اور کشمیر کے تاریخی حالات پر اسے کامل عبور تھا بادشاہ کی وفات سے پندرہ سال پیشتر ۱۴۵۹ء میں کہ ابھی زینہ ترنگنی اختتام تک بھی نہیں پہنچی تھی۔ زودراج ع کار دنیا کسے تمام نہ کرد۔ کے مطابق اپنا کام ادھورا چھوڑ کر اس عالم فانی سے رخصت ہو گیا۔

بادشاہ کی زندگی میں صرف زودراج ہی نے سفر آخرت اختیار نہیں کیا۔ بلکہ اس کی طویل حکومت میں اس کے کئی مصاحب اور وزیر و مشیر بھی ایک ایک کر کے چل بسے۔ اور بالآخر اس کے حال پر استاد داغ کا یہ شعر صادق آنے لگا

ہوش و حواس و عقل و خرد جا چکے ہیں سب
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

زودراج کی زینہ ترنگنی کا ترجمہ کلکتہ میں جے۔ سی دت نے ۱۸۹۸ء میں کیا ہے۔ اس تاریخ میں ۱۱۴۹ء سے ۱۴۵۹ء تک یعنی تین سو دس سال کے حالات درج ہیں۔ اسی سال زودراج کی موت کے باعث یہ سلسلہ رک گیا۔ زودراج نے بھی بادشاہ کے حکم سے کلہن کی راج ترنگنی کا سلسلہ قائم رکھنے کے لئے یہ تاریخ شروع کی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی تاریخ کے دیباچہ میں اس کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔

ابتدائے کشمیر سے لیکر جے سنگھ کے زمانہ تک کے حالات کلہن نے

ترجمہ و نوٹ راج ترنگنی سٹین صاحب

لکھے ہیں۔ لیکن یہ ملک کی بدقسمتی ہے۔ کہ اس کے بعد کسی مصنف نے حالات کا سلسلہ قائم رکھنے کے لئے اس طرف توجہ نہ کی۔ اور نہ کسی شاعر اور نہ کسی فرمانروا کو اپنے ملک کی تاریخ مکمل کرنے کا خیال آیا۔ اب جبکہ شری زین العابدین کشمیر کا بادشاہ ہے۔ جو زمانہ ہو اس زمانہ کا مصنف ہے۔ تاریخ نامہ بندر کشے کی طرف متوجہ ہوا ہے۔ جے سنگھ سے لیکر شری زین العابدین اور مصنف کے زمانے تک جس قدر راجے اور بادشاہ اس ملک میں گزرے ہیں۔ وہ فراموشی کے سمندر میں غرق ہو چکے تھے۔ اگر شری زین العابدین غواصی سے کام نہ لیتا۔ تو ان غرق شدہ فرمانرواؤں کو فراموشی اور گمنامی کے سمندر سے باہر نکالنے کی کس کو جرأت ہوتی۔ چنانچہ بادشاہ نے اس غرض کے لئے ملک کے شریف الطبع نامور شخص سری شریہ بٹ کی وساطت سے جو تمام عدالتوں کا حاکم اعلیٰ ہے مجھے تاریخ لکھنے اور گزشتہ سلسلہ قائم کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

سوم پنڈت

دارالترجمہ کے معزز دسرا آوردہ ارکان میں تھا کشمیر کی تاریخوں کے علاوہ اس کا ذکر صاحب طبقات نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ سوم پنڈت سلطان کے دانشمند درباریوں میں تھا۔ وہ کشمیری زبان میں اعلیٰ شعر کہتا تھا۔ اور ہندی علوم (سنسکرت) کے علاوہ فارسی عربی اور تبتی زبانوں میں بھی اسے بڑی مہارت تھی۔ اس نے زین چرت نام ایک کتاب بادشاہ کے نام پر لکھی جس میں اس کے عہد کے تمام واقعات بالتفصیل درج کئے۔

شریور اس کے متعلق لکھتا ہے۔ زینہ چرت جس میں بادشاہ کی زندگی کے واقعات تھے کشمیری زبان میں تھی۔ اور مصنف نے اپنے عہد تک کے

حالات لکھکر اس کتاب کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ شریور سوم پنڈت کا نام اپنی تاریخ میں ات سوم لکھتا ہے۔

اسے علم موسیقی میں بھی دخل تھا۔ اور اس علم میں مانک نام ایک کتاب اس نے لکھی تھی۔ اس لئے وہ ہمیشہ مورد الطاف شاہی رہا۔ عربی فارسی کی کئی کتابوں کا اس نے بادشاہ کے حکم سے ہندی زبانوں میں ترجمہ کیا۔

سوم پنڈت کی زینہ حیرت بھی آج صفحۂ دنیا سے محو و معدوم ہے۔ کشمیر کے یہ علمی دتاریخی جواہرات خدا جانے کسی کتب خانے کی زینت ہیں۔ یا کسی سلطنت کے انقلاب کی نذر ہو چکے ہیں۔ یا کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بن گئے ہیں۔ اگر یہ روشنی میں آجائیں۔ تو دنیا کو معلوم ہو جائے۔ کہ کشمیر کا یہ چھوٹا سا مگر خوبصورت ملک جو آج اپنی علمی واخلاقی اور سیاسی و مالی کم مایگی کی وجہ سے دنیا کی نظروں میں حقیر سمجھا جارہا ہے ہمیشہ سے اسی طرح نہ تھا۔ اس میں علم کے دریا بہتے تھے۔ اخلاق کے چشمے اُبلتے تھے۔ اس کی سیاسیات کشمیر کی حدود سے باہر جاکر کہیں چین وتبت اور کاشغر کے ساتھ ٹکراتی تھیں۔ اور کہیں پنجاب و سندھ کو عبور کرکے شاہان دہلی سے دوچار ہوتی تھیں۔ اس کی اقتصادیات کا یہ عالم تھا۔ کہ دُور دراز ملکوں سے لوگ اس ملک کی قدردانیاں اور فیاضیاں سنکر آتے تھے۔ اور مالامال ہوتے تھے۔ لیکن آہ آج یہ سب باتیں ایک افسانہ سی معلوم ہوتی ہیں ؎

ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

پنڈت شریور

یہ شاعر بھی تھا اور مؤرخ بھی۔ اور بادشاہ کے مقربان خاص میں درجۂ امتیاز بھی رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کے آخری ایام میں اس

کی تسکین خاطر کے لئے بعض روحانی کتب کی کتھائیں بھی اس کو سنایا کرتا تھا۔ اور رات دن اسی کے پاس رہتا تھا۔ اس نے صرف بڈشاہ کا زمانہ ہی نہیں دیکھا۔ بلکہ اس کے بیٹوں اور پوتوں سے چار[1] بادشاہوں کا زمانہ بھی دیکھا ہے۔ اور ان سب بادشاہوں کے درباروں میں اس کا بڈشاہی اعزاز برابر قائم رہا ہے۔ اس نے اپنی تاریخ کا نام زینہ راج ترنگنی رکھا۔ جس میں زونراج کی وفات ۱۴۵۹ء سے لیکر ۱۴۸۶ء یعنی سلطان فتح شاہ بادشاہ کشمیر کی تخت نشینی تک کے چشم دید حالات لکھے ہیں

شرلیور کی نظم و نثر سب سنسکرت زبان میں تھی جیسا کہ سابقہ سطور میں ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے طبع زاد اشعار بڈشاہی توپ پر بھی ہینیل کے الفاظ میں کندہ کرائے گئے تھے۔ اس کی تاریخ کا انگریزی ترجمہ بھی جے۔ سی دت (جگدیش چندر دت) نے کلکتہ میں کر دیا ہے۔ شرلیور اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھتا ہے۔ "میں زونراج کا شاگرد ہوں۔ میرا نام شرلیور پنڈت ہے۔ زونراج کی وفات کے بعد بادشاہ کے جو قابل ذکر حالات ہیں۔ ان کے علاوہ اس کے بعد اسی کی ذریات سے جن دوسرے بادشاہوں نے کشمیر پر حکومت کی ہے۔ ان کے حالات اپنی تاریخ میں لکھتا ہوں"۔ لکھتا ہے۔ بڈشاہ نے اپنے فرزندوں کی طرح میری پرورش کی ہے۔ اس نے مجھے جاگیر بھی عطا کی۔ اور مجھ پر ایسی شاہانہ نوازشیں کیں کہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہو سکیں۔ ایسے قدردان بادشاہ کے حالات میں نہ لکھوں تو اور کون لکھے۔ میری تاریخ ان بادشاہوں اور ان لوگوں کی شہرت وعظمت کی یاد اہل ملک کے دلوں میں تازہ کرے گی۔ جو آج اس دنیائے

[1] حیدر شاہ۔ حسن شاہ۔ محمد شاہ۔ فتح شاہ۔

فانی میں موجود نہیں ہیں۔ میرا بادشاہ اپنے ملک میں ہی نہیں۔ بلکہ بنگال مالوہ، انبیر[1] گوڑ (مغربی بنگال) اور کرناٹ[2] تک نہ ملنے والی شہرت کا مالک ہے۔

شر نور اپنی تاریخ میں جگہ جگہ بڈشاہ کی تعریف کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے جو لوگ اہل ہنر تھے۔ اور مختلف فنون سے آگاہ تھے۔ اور دستکاری اور صنعت جانتے تھے۔ بادشاہ ان کا دلدادہ تھا اور ان کی سرپرستی کرتا تھا اس نے اپنی ذات شاعروں کی قدر افزائی اور اپنے ملک کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر رکھی تھی۔

سترنور بادشاہ کے حالات پر تبصرہ اور اس سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہوا لکھتا ہے۔ بادشاہ کے سر سے بچپن ہی میں اس کے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ کئی دفعہ وزراء کے ساتھ اس کو مقابلہ کرنا پڑا۔ پھر بھائی کے ساتھ اس کو جنگ آزمائی کرنی پڑی۔ اور چند ایام اس نے اپنے ملک سے باہر بھی گزارے رضاعی بھائیوں نے اس کو تکلیفیں دیں اور آخر میں اس کے فرزندوں نے اس کی نافرمانیاں کیں۔ جو اس کے مرتے دم تک جاری رہیں۔

مطلب یہ کہ اگر یہ واقعات اس کو پیش نہ آتے۔ تو وہ عدل پروری اور رعایا نوازی اور سرپرستی علوم و فنون کے لحاظ سے دنیا کے اعظم ترین بادشاہوں میں ہوتا۔

ملک الشعراء ملا احمد بڈشاہی

ملا احمد کاشمیری بڈشاہ کے دارالترجمہ و دارالتصانیف کی روح رواں تھا۔ ملا احمد نے بادشاہ کے حکم سے رتنہ پوران اور راج ترنگنی جیسی قدیم سنسکرت تاریخوں کو فارسی کا لباس پہنایا۔ اور نام اپنی تاریخ کا "وقائع کشمیر" رکھا

[1] انبیر جے پور کا قدیم نام ہے [2] کرناٹ سے مراد کرناٹک ہے۔

ملا احمد کی قوت استدلال، لطافت طبع اور قادر الکلامی کا تمام مورخین نے اعتراف کیا ہے۔ دربار شاہی کے علمی مباحثوں میں جو نامور ادبا، و شعرا حصہ لیتے تھے۔ ملک الشعرا ملا احمد ان سب کا سرتاج تھا۔

ایک دن بزم آراستہ تھی۔ بادشاہ سلامت تخت پر جلوہ افروز تھے۔ ملا احمد دستار کا شملہ پیشانی پر شاخ دار لٹکا کر جھومتے جھامتے ہانپتے کانپتے دربار میں آئے۔ بادشاہ نے مسکرا کر فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔ ؎

شاخِ پیشانیِ ملا احمد کشمری بیں
گرنہ دیدستی تو در آفاق انساں شاخ دار

بادشاہ مذاق صحیح اور طبع سلیم رکھتا تھا۔ اس کے درباری مصاحب اور شعرا بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اور ملا احمد تو ملک الشعرا ہی تھا۔ فوراً بول اٹھا۔ ؎

شاخ پیشانی خدا یا گر ندارے داشتم
تا نبایم در میانِ مادہ گاواں در شمار

جواب کی برجستگی ملک الشعرا ملا احمد کے ذہن رسا کا پتہ دے رہی ہے۔

تاریخی اوراق میں ملا احمد کے استاد کا نام ملا محمد افضل بخاری ثم الکشمیری بتایا جاتا ہے۔ شاگرد نے اپنے استاد کی زندگی ہی میں ملک الشعرا کا خطاب اور بادشاہ کی مصاحبت و قربت کا اعزاز حاصل کر لیا تھا۔ لیکن اس منتہائے کمال پر بھی ملا احمد اپنے استاد کی خدمت گزاری اپنا فخر سمجھتا تھا۔

احسان یہی ہے فخر میرا   شاگرد جلال لکھنوی ہوں

مناظرہ و مباحثہ و بدیہہ گوئی میں فرد کامل تھا۔ وقائع کشمیرؔ کے علاوہ مہابھارت کا فارسی ترجمہ بھی اسی کی یادگار ہے۔ مرنے کے بعد ملک لچہ رہ یعنی مزار السلاطین میں جگہ پائی۔ حسد اور حاسدوں سے زمانہ کبھی خالی نہیں رہا۔ مولانا احمد بھی

اس سے نہ بچ سکے۔ جب دربار سے ملک الشعراء کا خطاب ملا، حاسد اور بھی جل گئے۔ آخر کہہ سنکر بادشاہ کو ملا احمد سے برافروختہ کرادیا۔ یہاں تنگ کر ملا بیچارہ پکھلی (ہزارہ) چلا گیا۔ اور ایک مدت تک وہاں سرگرداں رہا۔ آخر یہ رباعی لکھکر بادشاہ کی خدمت میں بھجوائی سے

نے بہ نجوم ز مبتدا خبرے　　　نے بہ منطق ز جزو و کل اثرے
بر من ایں کسر و جر چرا دانند　　　احمد از غیر منصرف خوانند

سلطان اس رباعی کے ملاحظہ و مطالعہ سے بہت خوش ہوا۔ مولنا کو واپس بلایا اور بیش از بیش انعام عطا فرمائے

ایک دن ملا احمد نوشہرہ میں سلطان کی خدمت میں حاضر تھا۔ ایک فقیر ہاتھ میں کاسۂ گدائی یعنی کچکول لئے آیا۔ اور نہایت بے باکی کے ساتھ اسے بادشاہ کے سامنے رکھدیا۔ بادشاہ کو اس کی یہ حرکت ناگوار گزری طیش میں آکر فرمایا۔ یہ کچکول تم کو کس نے دیا ہے؟ وہ تو خاموش ہو رہا۔ ملا احمد اٹھا اور فی البدیہہ بولا۔

اے آنکہ ترا تاجوری داد سری داد　　　در دست گدا کوزۂ دریوزہ گری داد

اس شعر کا سننا تھا کہ بادشاہ کا غصہ فرو ہو گیا۔

ملا احمد کے متفرق اشعار جو مختلف تاریخوں اور بیاضوں سے مل سکے ہیں۔ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

تا خبردار شدم بے خبر خویشتنم　　　غیستم نیستم ار در نظر خویشتنم
شکوۂ واقعہ ہائے کہ ازل بر ما تافت　　　موئے افتاد ملال و گہر خویشتنم

از کوئے کہ شد موج خیالم کہ کز انجا　　　ہر کاوش دل گل بہ کنار است دریں باغ

ل ازمکمل تاریخ کشمیر حصہ دوم مصنفہ راقم الحروف ت ۃ از بیاض خواجہ محمد اسمٰعیل صاحب نامی سرینگر

مرہون رگ گل شدہ ہر نالۂ بلبل　　زاں سال کہ صد او پئے خارا ست دریں باغ

معلوم ہوتا ہے۔ اصل وطن کشمیر نہیں تھا البتہ بادشاہ کی عنایات نے کشمیر کو وطن بنانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور کمالات علمی بھی کشمیر سے باہر ہی حاصل کئے تھے چنانچہ علامہ ہدایت اللہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ "بعد تحصیل کمالات علمی در عنفوان جوانی بہ کشمیر رسید"

ملک الشعراء ملا نادری

ملا نادری کی تاریخ کشمیر اور اس کی شاعری کا ذکر اکثر تاریخوں اور بیاضوں میں درج ہے۔ لیکن نہ اس کا دیوان کہیں ملتا ہے۔ اور نہ اس کی تاریخ کا کوئی پتہ چلتا ہے۔

عہد جہانگیری کا مصنف حیدر ملک چاڈورہ اپنی تاریخ میں ملا نادری کا سرکاری خطاب ملک الشعرا لکھتا ہے۔ اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔ "مولانا نادری کہ بعد از ملا احمد کاشمیری بہ منصب ملک الشعرائی مفوض بود۔ در بعض مصنفات خود آوردہ ...... ان الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نادری نے تاریخ اور دیوان کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی لکھی ہیں۔

ملا ہدایت اللہ جو ۱۱۷۵ھ سے ۱۲۰۶ھ تک عہدہ شیخ الاسلامی پر رہے ہیں مصاحبین بدشاہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ملا نادری کے حالات میں لکھتے ہیں۔ "طبع موزون داشت اشعار آبدار مے گفت تاریخ کشمیر از وے یادگار است" لیکن وہ تاریخ ہے کہاں؟ کے متعلق لکھتے ہیں۔ "مگر بہ نظر دقائق نگار نہ رسید"

---

[۱] بہ عہد نورالدین خاں ولد عبد خان اکوزئی ناظمان کشمیر کشمیر میں نہایت عالم گزرے ہیں

[۲] قلمی (غیر مطبوعہ) صفحہ ۲۲ مملوکہ پرتاپ پبلک لائبریری سرینگر کشمیر

صاحب تاریخ حسن بھی ملانادری کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "آمش معلوم وجہش معدوم" صرف آپ کا ایک ہی شعر ملا ہے۔ وہی درج ہے ؎

برقع نوراست بر رخسار آتش ناک تو
یا ز تاب عارضت آتش فتادہ در نقاب[1]

برقعہ کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ زمانہ بڈشاہی میں بھی اس کا رواج تھا۔ خواہ وہ کسی صورت میں تھا۔

سلطان محمد شاعر

صاحب طبقات اکبری بڈشاہ کے حالات میں ایک شاعر سلطان محمد کا ذکر کرتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں۔ وہ اہل علم ہونے کے علاوہ نہایت زیرک و دانا تھا۔ ہر قسم کے بحر اور قافیہ میں بدیہہ اشعار کہتا تھا۔ اور جب کبھی مشکل سے مشکل سوال اس سے کیا جاتا۔ وہ اسی وقت اور بے تامل اس کا حل کر دیتا۔ افسوس ہے۔ صاحب طبقات نے اس کا کوئی شعر اور اس کی بدیہہ گوئی کا کوئی اور واقعہ درج نہیں کیا۔

یودہ بٹ[1]

اس کا ذکر بادشاہ کے درباری موسیقی دانوں میں ہو چکا ہے۔ یہ کشمیری زبان کا زبردست شاعر تھا۔ اس نے بڈشاہ کے ایک واقعہ کا ڈراما کشمیری زبان میں ہی زین پرکاش (جین پرکاش) کے نام سے لکھا ہے۔ جو بعض دیگر کتابوں کی طرح کشمیر میں معدوم ہے۔

بٹ اوتار یا اوتار بٹ

اس نے زینہ ولاس (جینہ ولاس) کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ جس

[1] از بیاض محی الدین کاشیری نوشتہ ۱۲۲۳ھ قلمی مملوکہ پیر شمس الدین حیرت۔ باندانی سرینگر

میں بادشاہ کے فرامین وارشادات جو ملکی افسران اور ماتحت والیان ملک کے نام تھے۔ اور وہ احکام جو کبھی کبھی اپنی عزیز رعایا کے نام جاری کیا کرتا تھا درج تھے۔ ملک کی بدقسمتی سے یہ کتاب بھی اب اسمش معلوم وجسمش معدوم کی طرح نابود ہے۔

منصور بن محمد حکیم وشاعر

کفایہ مجاہدہ جو فارسی میں علم طب کی ایک نادر کتاب ہے۔ اسی کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب کفایہ منصوری کے نام سے مطبع نولکشور کانپور ولکھنؤ میں چھپ چکی ہے۔ اور اسی مطبع نے اس کا اردو ترجمہ بھی چھاپ دیا ہے۔ مصنف نے اپنا پورا نام کتاب کے دیباچہ میں اس طرح لکھا ہے "منصور بن محمد بن احمد بن یوسف بن قیصر الیاس" یہ کتاب بڑی ضخیم اور طب کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے۔ کہ اہل کشمیر اس کتاب سے بالکل لاعلم ہیں۔ مصنف اعضائے مفردہ کے بیان میں بدن کی ایک ایک ہڈی کا ذکر کرتا ہے۔ دماغ۔ جبڑے۔ گردن پشت۔ سینہ۔ انگلیاں۔ پاؤں۔ پنڈلی۔ ٹخنہ۔ ایڑی۔ کلائی۔ ناک۔ غرض تمام اعضا کی اس نے ۲۴۸ ہڈیاں بتائی ہیں۔ اور معمہ کے طور پر یہ دلچسپ شعر لکھا ہے

عدد عظم چو خواہی کہ بدانی بہ یقیں ۔ ۔ ۔ ہے بروں آید ازاں جا کہ بروں مے آئی

یعنی اگر تو بدن کی ہڈیوں کو شمار کرنا چاہے۔ تو یقین جان کہ وہ اس لفظ کے عدد سے نکلتی ہیں جس سے کہ تو باہر آیا ہے۔ مطلب یہ کہ آدمی رحم کے اندر سے نکلتا ہے۔ رحم کے عدد ۲۴۸ ہوتے ہیں۔ پس اسی کے موافق بدن کی تمام ہڈیاں سر سے پاؤں تک ۲۴۸ شمار کرنی چاہئیں۔

منصور بن محمد نے حکمت وطب کی یہ کتاب بادشاہ کی خدمت میں پیش کی چنانچہ وہ خود لکھتا ہے۔ ترجمہ "بندہ نے بھی فتراک سعادت پر ہاتھ مار کر اس متاع

تلیل کو ترقی کا وسیلہ جان کر بارگاہ کیوان میں نذر کیا۔ یہاں تک کہ صراف بازار حیرت اور نقادان ارباب سلطنت یعنی حضرت سلطنت پناہ کی نظر کیمیا خاصیت سے یہ کتاب مشرف ہوئی۔"

بادشاہ سے جو اس کو عقیدت تھی۔ وہ اس کے الفاظ ذیل سے جو اس کی کتاب کے دیباچہ میں مرقوم ہیں معلوم ہو سکتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:"میں نے اپنی کتاب کا نام کفایہ مجاہدہ رکھا۔ اور دیباچہ کو ہمایوں حضرت کے القاب سے مزین کیا۔ جو سکندر ثانی ہے۔ اور واضع احساس جہانبانی ہے اور حامی ہے قوانین ملک و ملت کا۔ اور مٹانے والا ہے قواعد ظلم و بدعت کا۔ السلطان الاعظم الاعدل الاکرام۔ افتخار سلاطین العرب والعجم۔ المبعوث فی عالم الملکوت۔ غیوث الامم المویدمن السمار المنصور علی الاعدا۔ راعی بلاد مشرق والمغرب۔ والئے ممالک العزل والنصب۔ ظل اللہ تعالیٰ فی الارض۔ مالک ازمۃ السبط وقبض۔ مجاہد سلطنت والدین سلطان زین العابدین۔"

پھر لکھا ہے:"اطراف عالم میں اس کی بخشش کا آوازہ اور انصاف کا شہرہ اڑ رہا ہے۔ اور اس کی بارگاہ سلطنت پناہ اصحاب علم و فضل اور اہل عقل کی تقویت کے لئے وقف ہے۔ اس لئے ہر ادنیٰ و اعلےٰ اور مطیع و سرکش کی زبان اس بارگاہ کی دعا کے لئے کھلی ہوئی ہے۔ اور فتح و نصرت کی مدد اور عزت و دولت کی ترقی کا فیضان لحظہ بہ لحظہ خدائے پاک کی درگاہ سے اس کو پہنچ رہا ہے۔

افسوس ہے ایسے نامور طبیب اور ایسے جید عالم و شاعر کے کلام کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ صرف چند شعر۔ وہ بھی بادشاہ ہی کی تعریف میں اور اسی کتاب کفایہ مجاہدہ سے ملے ہیں۔ جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

آنکہ از دور فلک اکثر ل غرض و دوران اوست (۱) آیت اقبال نصرت دائما در شان اوست

کشف اسرار قضا موقوف بر فرمان اوست — عقل کل فضل دبیرستان ابجد خوان اوست
جام جم رشحہ زعکس خاطر رخشان اوست — گوئے دولت دائما اندر خم چوگان اوست
(۲) ستارہ جیش بہ ہیبت زحل سہیل مکاں — شہاب رمح و سہا ناوک و ہلال کماں
بزرگ ہمت و قدر بلند افسر و تخت — مجستہ رایت و رائے گزندہ نام و نشاں

(۱) وہ ایسا بادشاہ ہے کہ دور فلک اس کے اشاروں پر چلتا ہے۔ اقبال اور فتحمندی کے الفاظ اس کی شان کے شایاں ہیں۔ قضا کے بھیدوں کا اظہار اس کے تابع فرمان ہے۔ عقل کل اس کی درسگاہ کا ایک ابجد خوان طفل ہے جمشید کا پیالہ اس کے روشن ضمیر کے عکس کی ایک شعاع ہے۔ دولت کی گیند ہمیشہ اس کی چوگان کے دائرہ کے اندر ہی رہتی ہے۔

(۲) اس کی سپاہ ستاروں کی طرح بے شمار ہے۔ اور اس کی ہیبت وسطوت زحل سے ملتی ہے۔ اور اس کا مقام سہیل ستارہ کی طرح ارفع و اعلےٰ ہے۔ اس کا تیر سہا کی طرح ہے۔ اور اس کی کمان ہلال کی مانند ہے۔ وہ بادشاہ عالی ہمت ہے۔ اور اس کے تاج و تخت کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس کی رائے اور اس کا جھنڈا مبارک ہے۔ اس کا نام برگزیدہ اور ممتاز ہے۔ (ان شعروں میں۔ زحل۔ سہیل۔ شہاب۔ سہا۔ ستاروں کے نام ہیں)

اٹھائیسواں باب ۲۸

عہد بڈشاہی کے علماء و مشائخ

عہد بڈشاہی میں علماء و مشائخ کی کثرت

یہ صحیح ہے کہ بڈشاہ نے ترویج اسلام و تائید سنت نبوی کے لئے وہ لائحہ عمل اختیار نہیں کیا۔ جو اس کے پیشرو کے مدنظر رہا۔ اور بعض مورخین نے دبے الفاظ میں اس کی شکایت بھی کی ہے۔ جیسا کہ صاحب تاریخ حسن (غیر مطبوعہ صفحہ ۵۰) پر لکھتے ہیں۔ "در ترویج اسلام و سنت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام بہ مرتبہ پدر توفیق نیافت" لیکن باوجود "بہ مرتبہ پدر توفیق نہ یافت" کے بڈشاہ کے عہد میں کشمیر شریعت اسلامیہ کی پابندی کے لئے خاص طور پر مشہور رہا ہے۔ علماء و مشائخ اور فضلاء و فصحا کی اس کے عہد میں وہ قدردانی ہوئی ہے کہ اس نے کشمیر کو علمستان اور اسلامستان بنا رکھا تھا۔ جس قدر علماء و مشائخ کے نام اس عہد کی تاریخوں میں نظر آتے ہیں۔ اس سے قبل اور اس کے بعد کسی بادشاہ کشمیر کے عہد میں دکھائی نہیں دیتے۔ بلکہ کئی ایسے علماء بھی ہوں گے۔ جن کا نام بھی تاریخوں میں نہ آسکا ہوگا ؎

نہ دانم ز آغاز و انجام شاں مرا بر زباں لیس بود نام شاں

بڈشاہی عہد کے تمام علماء و مشائخ کے حالات کے لئے ایک علیحدہ دفتر کی ضرورت ہے۔ اس لئے چند نام یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

(۱) ملا باقر رومی (۲) سید برخوردار (۳) ملا احمد رومی (۴) سید محمد شیبانی

(۵) سید محمد رشید (۶) سید محمد لورستانی (ایران) (۷) حافظ فتح اللہ خوشخوان (۸) مولا احمد ہروی (ایرانی) (۹) مولانا نورالدین (۱۰) سید حسن رومی (۱۱) شیخ سلطان کبروی بکھلی (۱۲) شیخ شمس الدین زبنہ پوری (۱۳) حضرت سید حبیب کاسانی (۱۴) سید ہلال (۱۵) میر سید حبیب اللہ (سرخابی) (۱۶) سید شہاب الدین (۱۷) سید حضور اللہ (۱۸) حضرت بابا بام الدین (۱۹) بابا نصر الدین (۲۰) بابا لطیف الدین (۲۱) بابا قیام الدین (۲۲) سید حسن وزد (۲۳) شیخ الاسلام مولانا کبیر (۲۴) ملا جمال الدین (۲۵) حافظ بغدادی (۲۶) علامہ سید شمس الدین اندرابی (۲۷) سید حسین قمی رضوی (۲۸) بابا حاجی ادہم۔ (۲۹) سید محمد مدنی (۳۰) سید محمد عالی مدنی (۳۱) میر سید حسن منطقی (۳۲) میر سید حسین منطقی (۳۳) سید جان بازولی (۳۴) بابا زین الدین (۳۵) بابا عثمان گنائی (۳۶) شیخ بہاؤالدین گنج بخش (۳۷) شیخ نورالدین ولی رشی (۳۸) میر سید محمد امین اویسی (۳۹) قاضی میر علی بخاری (۴۰) ملا پارسا (۴۱) میر سید محمد منطقی (۴۲) حضرت سید حاجی مراد (۴۳) سید بدرالدین (۴۴) سید جعفر (۴۵) بابا پم رشی (۴۶) بابا شمس الدین رومی (۴۷) شیخ پرباز (۴۸) بابا حیدر ربٹ (۴۹) بابا شکر الدین (۵۰) ریگی ریشی (۵۱) بابا لولی حاجی (۵۲) شیخ لالی (۵۳) لیچھم ریشی (۵۴) بابا حنیف الدین (۵۵) حضرت شیخ اسماعیل۔

یہ سب بزرگ آسمان تصوف وعلم کے درخشندہ ستارے تھے۔ ان میں سے کئی ایک کی خدمت میں بادشاہ خود حاضر ہوتا تھا۔ کئی ایسے تھے جن کے لئے بادشاہ نے خانقاہیں اور درسگاہیں تعمیر کرائیں اور وظائف اور جاگیریں تو قریباً سب کے لئے مقرر تھیں۔ یہی وہ عالی پایہ

صالحین تھے۔جن کے وجود مبارک کو بادشاہ ہمیشہ نزول رحمت وبرکت کا باعث تصور کرتا رہا۔یہی وہ صاحبان ولایت تھے ؎

ذات سے جن کی زمیں پر آسماں کو ناز تھا
جن کے سنگ آستاں پر لوگ گھستے تھے جبیں

ان میں چند ایک کے مختصر سے حالات قلمبند کئے جاتے ہیں جو بڈشاہ کی اس عقیدت وارادت پر بھی بالوضاحت روشنی ڈالتے ہیں۔جو اس کو اس متبرک گروہ کے ساتھ تھی۔

شیخ الاسلام مولانا کبیر

کشمیری الاصل تھے۔عنفوان جوانی ہی میں کہ سلطان سکندر کا زمانہ تھا ہرات چلے گئے۔فقہ وحدیث وتفسیر کے حصول میں وہ سعی کی کہ ان کا نام شہرت وعزت کے پر لگا کر اڑتا تھا۔اور تمام عالم اسلام سے ان کو روشناس کراتا تھا۔

بڈشاہ جب بادشاہ ہوئے تو بڑی منتوں اور آرزوؤں سے ان کو بلایا محلہ نوشہرہ میں شاہی محلات کے قریب ان کو جگہ دی۔منصب شیخ الاسلام کہ اس سے پہلے اس ملک میں اس عہدہ کا دستور ورواج نہ تھا۔عطا کیا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد ان کی مزید دلبستگی ودلدہی کے لئے اعلیٰ پیمانے پر ایک بادشاہی مدرسہ راجدھانی میں قائم کیا جس کا افسر اعلیٰ مولانا کبیر ہی کو مقرر کیا۔مولانا کا مقبرہ محلہ نوشہرہ ہی میں ہے۔جس طرح اور طلبار وشائقین علوم کے لئے وظائف مقرر ہوتے تھے۔بادشاہ نے ان کے مدرسہ کے طلبار کے لئے بھی وظائف کی خاطر چند مواضعات وقف کر دیئے صاحب تواریخ واقعات کشمیر لکھتے ہیں"وتعین مواضع برائے وظائف طالبعلماں نمودہ"

قاضی القضاۃ ملا جمال الدین

تمام مورخوں نے لکھا ہے۔ ان کا وطن ہندوستان تھا جب کشمیر آئے تو خانقاہ امیریہ (شاہ ہمدان) میں رہائش اختیار کی۔ درود و وظائف کے بڑے پابند اور بڑے عالم و فاضل اور رجید اہل قلم تھے۔ مگر عوام سے ہمیشہ اپنے علم کو پوشیدہ رکھا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے کسب حلال کے لئے عرائض نویسی کا کام شروع کیا۔ آپ اہل مقدمات کی طرف سے بادشاہ کے دربار میں عرضیاں لکھتے تھے۔ اور جو لوگ کسی حاکم کے خلاف کوئی شکایت کرتے تو اس کے تدارک یا اس کی اصلاح کے لئے بھی آپ اہل شکایات کو عرضیاں لکھ کے دیا کرتے۔ بادشاہ ان عرضداشتوں کے مضامین پڑھکر بڑا متاثر ہوتا۔ اور عرائض نویس کے تبحر علمی کا قائل ہو جاتا۔

بادشاہ نے کئی دفعہ چاہا۔ کہ عرائض نویس کو اپنے دربار میں بلائے۔ اور اس کے کمال فصاحت سے اور بھی زیادہ بہرہ اندوز ہو۔ لیکن کوئی نہ کوئی امر مانع ہوتا رہا۔ آخر جب آپ نے ایک منظوم درخواست بادشاہ کی خدمت میں بھجوائی جس میں سلطان سکندر کی وفات پر بھی قطرات اشک بہائے گئے تھے۔ اور جس کا ایک شعر یہ ہے۔ ؎

شہ کہ بود مرادش بجائے مسکیناں
بجان و دل طلبد دعائے مسکیناں

تو بادشاہ کو زیادہ انتظار کی تاب نہ رہی۔ اپنا ایک درباری آپ کو بلانے کے لئے بھیجا۔ جب آپ بادشاہ کے حضور میں گئے تو وہ قدردانی و مردم شناسی کا پتلا ایک گوشہ نشین درویش کے ساتھ جو ایک خانقاہ میں تجرد کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ادب و احترام کے ساتھ پیش آیا۔ اٹھکر تعظیم کی اور اپنے

ؔ مکمل تاریخ کشمیر حصہ دوم مصنفہ راقم الحروف۔

پہلو میں بٹھایا۔ آپ نے بادشاہ کی خدمت میں ایک تصنیف ہدیۃً پیش کی بادشاہ اس کے مطالعہ سے بے حد مسرور ہوا۔ اور آپ کی اعلیٰ قابلیت نے اس کو مسحور کر لیا۔

فرائض نویسی میں جو دلائل و براہین آپ لکھا کرتے تھے۔ بادشاہ ان کو نہایت پسند کرتا تھا۔ اور خیال کرتا تھا۔ کہ اگر ایسا شخص جو انشا پردازی کے ساتھ دماغ بھی متقن رکھتا ہے۔ میرے قلمرو کی عدالت اعلیٰ کا جج ہو جائے۔ تو انصاف اس سے بڑا نیکنام ہو سکتا ہے۔

چنانچہ بادشاہ نے عہدہ قاضی القضاۃ ان کے سپرد کیا۔ جو اس زمانہ کی چیف ججی کے برابر ہے۔ قاضی جمال علوم دنیویہ و دینیہ سے آراستہ تھے اور احکام کے فیصلے بلا کسی لحاظ مروت کے بلا رو رعایت دیانت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ بادشاہ ان کے فیصلوں سے خوش ہو کر ہمیشہ ان پر نوازشوں اور شاہی عنایتوں کا اظہار کرتا تھا۔

قاضی میر علی بخاری

صاحب گلزار خلیل[۲] لکھتے ہیں: "چوں ۸۰۰ھ رسید شاہی خاں المعروف بسلطان زین العابدین ابن سلطان سکندر بت شکن بہ رفاقت صاحب قرآن امیر تیمور گورگاں بہ سمرقند رسید۔ بہ تقریبے با قاضی میر بخاری آشنا شدہ چوں خدمت میر در ہمہ علوم و فنون نادرہ روزگار و عجوبہ امصار بود۔ بادشاہزادہ آں قدر صحبتش بر آر آمد کہ بے یکدیگر ساعتے صبرے تواں نشنند" پھر لکھا ہے کہ جب تیمور کا انتقال ہو گیا۔ تو شہزادہ کی تحریک سے قاضی معہ اہل و عیال

---

[۱] تاریخ خواجہ اعظمی [۲] مولانا ابو محمد حسن شعری قادری صاحب دیوان فارسی گلزار خلیل مطبوعہ مطبع مطبع نور لاہور ۱۲۶۱ھ

ان کے ہمراہ کشمیر چلا آیا۔ سلطان نے محلہ گوجوارہ میں ان کو ایک عالیشان مکان رہنے کو دیا۔ اور ان کو منصب اور جاگیر سے سرفراز فرمایا۔

زین العابدین کے سمرقند جانے کی تصدیق جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے نہ اس کے کسی ہمعصر مورخ نے اور نہ طبقات اکبری کے مصنف اور نہ تیمور نے اور نہ صاحب ظفر نامہ تیموری نے کی ہے۔ اس لئے شاہی خاں اور قاضی میر علی بخاری کی ملاقات سمرقند کا ذکر صرف تاریخ خواجہ اعظمی کی بنیاد پر ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ قاضی میر علی بخاری بڈشاہ کے عہد میں بخارا سے کشمیر میں آئے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ میں ممتاز اور بحث و مناظرہ میں سرافراز تھے۔ اور علوم تصوف و توحید میں بہرہ وافی رکھتے تھے بادشاہ نے منصب و جاگیر کے علاوہ فضائل و کمالات دیکھکر ان کو کشمیر کا قاضی القضاۃ نامزد کیا۔

قاضی میر علی بخاری ارغون خاں کی نسل سے تھے۔ جو چنگیز کی پانچویں اور ہلاکو کی تیسری پشت میں تھا۔ ارغون کو شاہ خوارزم (سلطان محمود غازدن) نے پہلے مسلمان کیا۔ اور پھر اپنی لڑکی قتلق نگار خانم کے ساتھ اس کا عقد کر دیا۔ ارغون کی تیسری پشت میں حسین آقا اپنے بھائیوں کے ساتھ موروثی ملک حاصل کرنے کے لئے لڑائی میں قتل ہو گیا۔ اس وقت اس کا بیٹا علی شاہ صرف دو سال کا تھا۔ اس کی ماں دشمنوں کے خوف سے اس کو جگہ جگہ لئے پھری۔ آخر اس کو ایک مدرسہ میں دینی و دنیوی تعلیم و تربیت کے لئے داخل کر دیا۔ کہ نہ کسی کو اس کے شہزادہ ہونے کا شبہ ہوگا۔ اور نہ اس کی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

علی شاہ نے علم و ادب اور تزکیہ قلب میں اپنے مرشد حضرت شیخ علی سزدقانی

کے فیض صحبت سے بڑی شہرت حاصل کی۔ جب اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ تو وہ بخارا چلے آئے۔ یہاں قاضی میر محمد خلف صدر جہاں نے ان کے علم سے آگاہ ہو کر ان کو اپنا داماد بنالیا۔ علی شاہ کا ایک ہی فرزند تھا۔ محمود نام۔ اس نے اپنے نانا سے جو اولاد نرینہ سے محروم تھا۔ تحصیل علم کی برکت حاصل کی۔ اور اس کی وفات کے بعد وہی قاضی میر محمود کے نام سے اس کا جانشین ہوا۔ میر محمود کا شغل ساری عمر تدریس و فتویٰ ہی رہا۔ اس کے دو فرزند تھے۔ قاضی میر علی بخاری اور دوسرے میر حیدر۔ یہ ۸۰۲ھ کا زمانہ تھا۔

قاضی میر علی بخاری جن کے آباؤ اجداد مغل شاہزادے اور مغل بادشاہ تھے۔ اب کشمیر میں بادشاہ کی عنایت سے محکمہ قضا کے حاکم اعلیٰ تھے۔ علم و فضل کے علاوہ طبع موزون رکھتے تھے۔ چنانچہ ذکر ہے کہ ایک دفعہ مولانا اسمٰعیل ماژندرانی نے تحریضاً ایک شعر آپ کے لئے لکھا ؎

تبر دار نکرم بہ بیں چوں تبر زد
کہ باغ بخاری بہ خارسے نیرزد

قاضی میر علی نے اس کے جواب میں حسب ذیل شعر لکھا۔ ؎

تہمتن چو گرز گراں را بگیرد دل دیو و ماژندرانی بہ لرزد

صاحب گلزار خلیل لکھتے ہیں:۔ "بعد وفات در محلہ گوجوارہ در مقبرہ سنگین و مکلف کہ برائے ہمیں کار احداث یافتہ بود۔ مدفون شد۔ ہنوز آں۔ مقبرہ باقی ست"

ان کے دو فرزند تھے میر سکندر و میر محمد یونس ان میں میر سکندر کی اولاد سے قاضی میر ابراہیم۔ مرزا حیدر کاشغری اور سلطان نازک شاہ کے

عہد میں خدمت قضا پر مامور تھے۔ انہی کے فتوے سے میر شمس عراقی کا فرزند میر دانیال قتل کیا گیا تھا۔ انہی میر ابراہیم سے مغلوں کی شاخ بچھ نکلی۔ جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان کے منہ سے رطوبت وبلغم کثرت سے خارج ہوا کرتی تھی۔ اور آبِ دہن کی روک تھام اور اصلاح ذائقہ کے لئے اور بچ بچ (ایک قسم کی گھاس) کو اکثر منہ میں رکھا کرتے تھے۔ اس سے ان کا نام میر ابراہیم بچ مشہور ہو گیا۔

قاضی موسےٰ شہید اور عالمگیری عہد کے نواب ابوالبرکات خاں، نواب بلند خاں حافظ مریم بیگم استاد زیب النسا بیگم۔ نواب مشرف خاں۔ نواب میر عنایت اللہ خاں اور شاہجہانی عہد کے محمد مراد زریں رقم اور محمد محسن شیریں رقم سب قاضی میر علی بخاری کی ذریات سے تھے۔ کشمیر اور بیرون کشمیر کے کشمیری مسلمانوں کی قوم میر قاضی میر علی بخاری کو اپنا جد اعلےٰ تصور کرتی ہے۔

ملا پارسا

بڈشاہ کے زمانے میں بخارا سے آئے۔ بادشاہ ان کا حد سے زیادہ احترام کرتا تھا۔ مدرسہ سلطانیہ واقعہ نوشہرہ میں ان کو مدرس مقرر فرمایا۔ اپنے مدرسہ کے متصل ہی ایک مسجد بھی تعمیر کی۔ جو اب تک مسجد پارسا کے نام سے موجود ہے۔ بادشاہ نے آپ کو جاگیر بھی عطا کر رکھی تھی۔ مدفن محلہ نوشہرہ میں ہے۔

حافظ بغدادی

اصل وطن جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ بغداد تھا۔ سلطان کی شہرت سنکر ترک وطن کیا۔ اور ہزارہا کوس کا فاصلہ طے کر کے کشمیر میں پہنچے بادشاہ

نے جو نہایت جوہر شناس اور مسافر نواز تھا، مصاحبوں میں داخل کر کے اس کی قدر افزائی فرمائی۔ حافظ بغدادی سے بہت سے لوگوں کو علم و عمل کا فیض حاصل ہوا۔ آپ کبھی کبھی جامع مسجد میں وعظ بھی فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے عمر عزیز کا بہت سا حصہ سلطان کی مصاحبت و مجالست میں بسر کیا۔ آپ ملا کبیر کے مقبرہ میں مدفون ہیں۔

ملا سید شمس الدین اندرابی

کشمیر میں خاندان سادات اندرابیہ[۱] کا وجود امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کے زمانے ہی سے چلا آتا ہے۔ چنانچہ حضرت امیر کی مراجعت کے بعد سید احمد اندرابی نے جو حضرت امیر کے ہمشیرزادہ بھی بیان کئے جاتے ہیں اپنے اہل و عیال کے ہمراہ کشمیر ہی میں اقامت اختیار کر لی۔

سلطان سکندر نے محلات شاہی کے قریب آپ کے لئے ایک عالیشان خانقاہ تعمیر کر دی۔ جو اس وقت سرینگر کے محلہ ملارٹہ[۲] میں خانقاہ اندرابیہ کے نام سے مشہور ہے۔ لنگر کے مصارف کے لئے چند مواضعات جن میں موضع ویڈر، چیرہ ہار اور اچھن وغیرہ بھی شامل تھے۔ بطور جاگیر عطا کئے ۸۰۸ھ میں آپ نے وفات پائی۔ اور سلطان سکندر نے مزار السلاطین

---

[۱] یہ خاندان عرب سے نکلکر پہلے پہل اندراب (ایران) میں داخل ہوا۔ وہاں سے کچھ عرصہ کے بعد کوہ ہندوکش کے قریب اقامت اختیار کی۔ لیکن عجم کے وطن اول یعنی اندراب کی طرف منسوب ہو کر اندرابیہ کہلایا۔ جب یہ خاندان کشمیر آیا تو یہاں بھی سادات اندرابیہ کے نام سے ہی مشہور ہوا۔

[۲] اس کا نام اصل میں ملا عراقی ہٹہ تھا۔ ملا عالم تبحر کو کہتے ہیں۔ شاید کسی عراقی ملا کے نام پر ہو۔ اب اسی محلہ کو ملارٹہ کہتے ہیں۔

کی صف اول میں آپ کو جگہ دی۔

کشمیر کا مشہور مورخ شائق اپنی تاریخ میں آپ کے متعلق لکھتا ہے

حسینی نسب سید احمد بنام ؛ کہ بودہ است از اولیائے کرام

زیاران میر کبیر است او ؛ بہ زہد و ورع بے نظیر است او

سید شمس الدین اندرابی آپ سے تیسری پشت میں ہیں۔ آپ نے اپنے والد ماجد سید ابراہیم اندرابی سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل کر کے فقہ، حدیث اور تفسیر میں امتیازی شہرت حاصل کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بیس سال ہی کی عمر میں علوم ظاہریہ کی تکمیل سے آپ فارغ ہو گئے تھے۔

آپ نے سلسلہ درس و تدریس جاری کر کے اپنی خاندانی روایات کو از سر نو زندہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ تزکیہ نفس کرتے ہوئے مدارج سلوک و مقامات عرفان طے کرتے رہے۔ اور آخر آپ نے اپنے علم و عمل سے ثابت کر دیا۔ ع

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق

آپ جیسے صاحبان علوم باطنیہ کے لئے ہی موزوں ہے۔ یہ فاضل ترین ہستی بڈشاہ کی نگاہوں سے زیادہ دیر تک پوشیدہ نہ رہ سکی۔ چنانچہ اس جوہری نے اس نگینہ کی قدر و قیمت سے آگاہی حاصل کر کے اس کو چار چاند لگا دیئے۔ بلکہ آپ کی شادی بھی منطقی سیدوں کے خاندان میں ہوئی جن کے ایک لڑکے محمد امین اویسی کو بڈشاہ نے اپنا لے پالک بنا رکھا تھا۔ شاہی خاندان میں منسلک ہونے کی وجہ سے ان کا ظاہری ٹھاٹھ بھی شاہانہ تھا۔ بادشاہ نے بھی اپنے الطاف و کرم کے اظہار سے ہمیشہ اپنی عقیدت کا ثبوت دیا۔ سلطان سکندر کی بنا کردہ خانقاہ کے باوجود

ا؎ سید احمد اندرابی کے فرزند سید محمدان کے سید محمد ابراہیم اور ان کے فرزند سید شمس الدین اندرابی۔

اسی خانقاہ کے متصل ایک عالیشان مسجد معہ حمام ان کے لئے تعمیر کرائی۔ ایک پختہ کنواں بھی کھدوایا۔ لنگر کا انتظام بھی کیا۔ جس سے آپ کے طالبان علوم و معارف کو دونوں وقت کھانا ملتا تھا۔

سکندر اور بڈشاہ کی دونوں عمارتیں اب تک موجود ہیں پہلی عمارت کو گرمیوں میں اور بڈشاہ کی بنائی ہوئی مسجد کو سردیوں میں نماز کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بڈشاہی عمارت کے اختتام کی تاریخ "عبادت گاہ نکوکاراں" کے فقرہ سے نکلتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ بڈشاہ نے یہ مسجد ۱۵۰ھ میں تعمیر کرائی۔

اس قدر ساز و سامان کے باوجود سید شمس الدین پر زہد و درویشی کا رنگ غالب رہا۔ آخری عمر میں کوہ ماراں (ہری پربت) کے جنوب میں عزلت و تنہائی کے ساتھ عبادت کرنے کے لئے آپ نے ایک عبادت گاہ بنوائی یہیں آپ نے ۱۷ رجب ۹۳۲ھ کو انتقال کیا۔ اور یہیں دفن کئے گئے[1]

سید حسین قمی رضوی ؒ

آپ بڈشاہ کے عہد میں اپنے وطن قم (ایران) سے تشریف لائے۔ بادشاہ کو جو مردم شناسی میں فرد یگانہ ہونے کی حیثیت سے قیافہ دیکھکر اندرونی کیفیت پرکھ لیتا۔ اور لفافہ دیکھکر خطوں کا مضمون بھانپ لیتا تھا۔ جب آپ کے بے مثال علم و فضل زہد و اتقا عظمت و فضیلت

[1] سید محمد بیرک اندرابی آپ ہی کے اکلوتے فرزند تھے۔ جن کی ذریت سے کشمیر کا مشہور خانوادہ سادات اندرابیہ کشمیر و پنجاب میں اس کس مپرسی کے زمانہ میں بھی اپنا علمی روایتی وقار قائم رکھے ہوئے ہے۔ آپ کا مزار قلعہ ناگر نگر یعنی اکبری قلعہ ہری پربت کے اندر قلعہ مذکور اور اخون ملاشاہ کی مسجد و حمام کے درمیان واقع ہے۔

اور کشف وکرامات کا علم ہوا۔ تو زینہ گیر کی آبادی وبرکت کے لئے باغ زینہ گیر ہی میں آپ کی اقامت کا انتظام کیا۔

سید صاحب بھی ایسے ملک (ایران) سے آئے تھے جس کو کوہساروں مرغزاروں اور چشمہ ساروں کے مناظر نے بہشت ارضی بنا رکھا تھا یہاں آکے بھی یہی کیفیت دیکھی۔ خصوصاً قرب وُلر کو آپ نے بہت پسند کیا۔ بادشاہ نے بھی آپ کی سیر وتفریح کے لئے چاکواری (ہوس بوٹ) پرندہ اور شکارے بنوا دیئے۔

کشمیر میں سادات تو پہلے سے بھی موجود تھے۔ اور بڈشاہ کے زمانہ میں بھی آئے۔ لیکن کشمیر میں خاندان سادات رضویہ کا سلسلہ آپ ہی سے چلا ہے۔ جو امام علی الرضا کی طرف منسوب ہے۔ جن کا روضہ مشہد مقدس میں زیارت گاہ خاص وعام ہے۔

آپ کے فرزند کلاں کا نام حاجی محمد سید ہے۔ جن کا روضہ احمد پورہ ماگام (بارہ مولا) میں واقعہ ہے جس کے ساتھ ایک مسجد اور ایک امام باڑہ بھی ہے۔ آپ کی اولاد زیادہ تر اسی موضع میں آباد ہے یہ سب لوگ سادات احمد پورہ کہلاتے ہیں۔

علامہ سید حسین قمی علیہ الرحمۃ کے دوسرے فرزند کا نام آغا سید احمد تھا جن کی اولاد کشمیر کے علاوہ مرشد آباد۔ عظیم آباد پٹنہ۔ لاہور اور دیگر مقامات کے علاوہ عراق میں بھی پائی جاتی ہے۔ آپ کے خاندان کے کئی افراد کربلائے معلٰی میں تحصیل علوم کے لئے گئے۔ جنہوں نے وہیں سکونت اختیار کرلی۔ ان میں آغا سید حسن کاشمیری مجتہد عراق کے نام سے مشہور رہے ہیں۔

غرض بڈشاہ ابھی زندہ ہی تھا کہ سید صاحب ۷ شعبان ۸۷۱ھ کو انتقال فرما گئے اور زینہ گیر ہی میں جہاں آپ کے نام پر موضع سید پورہ آباد ہو گیا تھا۔ آپ دفن کئے گئے۔ آپ کے مزار مبارک کے حالات زینہ گیر کے بیان میں لکھے جا چکے ہیں۔

بڈشاہ اور سید صاحب کے تعلقات کے سلسلہ میں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بڈشاہ سنی المذہب تھا اور سید صاحب شیعہ تھے۔ لیکن بڈشاہ نے کبھی اس بات کا خیال نہ کیا کہ میں ایک شیعہ بزرگ کی کیوں عزت افزائی اور ارادت مندی کر رہا ہوں اور سید صاحب نے کبھی اس بات کو وقعت نہ دی کہ وہ شیعہ مذہب کے بزرگ ہو کر ایک سنی بادشاہ کے پاس کیوں پناہ گزیں ہیں۔ اگر ان کے بعد بھی عالمان دین اور حکام دنیوی انہی خیالات وجذبات کے مالک ہوتے۔ ان کے دل بھی فرقہ بندیوں کے جھگڑوں اور باہمی تکفیر ونفرت سے ایسے ہی آزردہ ہوتے۔ تو نہ کبھی سنی بلخ بدنام ہوتا نہ شیعہ کشمیر مورد طعن سمجھا جاتا۔

بابا حاجی ادہم

سلطان ابراہیم ادہم کے خاندان سے منسوب ہونے کی وجہ سے ادہمی کہلاتے تھے۔ جامع علوم ظاہر و باطن تھے۔ ترک وطن کے بعد پہلے حج کیا پھر کشمیر آئے۔ شیخ بہاؤالدین گنج بخش اور شیخ نورالدین ولی کے صحبت دار ول میں تھے۔ مقام میرواری میں جس کو شاعرواری بھی کہتے ہیں اور جو میرا ویسی باغ کا نام ہے۔ اور فی الحال (حدود قلعہ اکبری) سے باہر ہے مدفون ہیں۔ میر محمد اویسی کی تعلیم وتربیت بادشاہ نے آپ ہی کے سپرد کر رکھی تھی۔ میر سید حسن منطقی میر سید محمد اور مولانا حسام الدین غزنوی اور بڑے بڑے صوفیا بزرگ

اہل اللہ حضرت باباصاحب کے صحبت یافتہ اور مرید تھے۔

سید محمد اویسی جو بڈشاہ کی بیہقی بیگم کے لے پالک فرزند تھے۔ آپ سے ظاہری علوم حاصل کرتے رہے ہیں۔ باباحاجی ادہم بلخی کا مزار شاعرداری عرف شہیدواری میں ہے۔ سید محمد امین اویسی آپ کی وفات کے بعد آپ کے مزار پر بھی حاضر ہوتے رہے۔ سید حسین منطقی بھی جو سید حسن منطقی اور سید محمد امین اویسی کے والد تھے حاجی بابا ادہم سے روحانی تعلیمات حاصل کرتے رہے۔ آپ صاحب تصانیف بھی تھے۔ تقالات اولیائے کشمیر[۱] آپ کی ایک مشہور کتاب ہے۔

سید محمد عالی بلخی

بیان کیا جاتا ہے۔ کہ آپ بلخ کے بادشاہ[۲] تھے۔ دوسال کی حکومت کے بعد کہ ابھی شباب ہی کا عالم تھا۔ تخت وتاج پر لات مار کر خدا کی یاد اختیار کی۔ اشارہ غیبی سے کشمیر آئے۔ وہ زمانہ سلطان سکندر بت شکن کا تھا۔ اور شیخ العالم شیخ نورالدین ولی نے مقام رویہ دون سے بابا نصرالدین کو استقبال کے لئے بھیجا۔ سلطان زین العابدین بھی آپ کی بڑی عزت کرتا تھا۔ پرگنہ ماگام آپ کے اخراجات کے لئے وقف تھا۔

---

[۱] بعض احباب سے جب سنا کہ اس کتاب میں اکثر مقامات پر بڈشاہ کا بھی ذکر ہے۔ تو اس کی بہت تلاش کی گئی۔ مولانا مولوی محمد عتیق اللہ صاحب جنرل سکریٹری انجمن نصرت الاسلام سرینگر اور مولوی محمد شاہ سعادت مفتی سرینگر کے پاس اس کا پتہ چلا۔ مگر وہاں سے بھی دستیاب نہ ہو سکی۔ پھر معلوم ہوا۔ کہ ایک پیرزادہ کے پاس اس کا ایک نسخہ موجود ہے لیکن پیرزادہ نے اتنی تکلیف بھی گوارا نہ کی کہ ان کے مکان پر ہی اس کا مطالعہ کر لیا جاتا۔

[۲] بلخ کی کوئی تاریخ ہی ان کے بادشاہ بلخ ہونے کی تصدیق وتکذیب کرسکتی ہے۔ ممکن ہے خاندان شاہی سے ہوں یا بلخ کے رئیس زادے ہوں۔

حضرت سید محمد مدنی

سید مدین صاحب کے نام سے بھی آپ مشہور ہیں کشمیر کے اکثر تذکروں میں آپ کا حال درج ہے۔ اصلی وطن مدینہ تھا۔ وہاں سے مکہ آئے پھر خراسان اور ترکستان وغیرہ ممالک میں پہنچے۔ امیر تیمور سے ملے۔ حملہ ہند میں اس کے ہمراہ تھے۔ اس نے ان کا علم وفضل ان کی اصابت رائے اور سیاست دانی دیکھکر دہلی سے واپسی پر اپنے سفیروں کے ہمراہ انہیں کشمیر بھیجا۔ چنانچہ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری بہ سلسلہ حالات سید محمد مدنی اپنی تاریخ واقعات کشمیر میں لکھتا ہے "بہ اتفاق ایلچی امیر تیمور در عہد سلطان سکندر بہ کشمیر آمدہ" کشمیر کی آب وہوا ایسی پسند آئی کہ واپس جانے کو جی نہ چاہا۔ مگر بہ سلسلہ سفارت واپس جانے کے لئے مجبور تھے۔ چنانچہ بقول خواجہ اعظم "برائے ادائے بعض عہود باز توجہ بہ ولایت ماوراء النہر فرمود" لیکن اہل وعیال کو ہمراہ لے کر بہت جلد واپس آگئے۔

ابتدا میں محلہ رینہ واری میں اقامت اختیار کی جب سکندر کو آپ کے تبحر علم اور آپ کی روحانی تر قیوں کا علم ہوا۔ تو خود زیارت کے لئے آیا۔ اور جب تک زندہ رہا آپ کا احترام کرتا رہا۔

جب بڈشاہ نے اپنے دور میں زینہ نگر یعنی نوشہرہ کو اپنی راجدھانی قرار دیا۔ تو باصرار انہیں نوشہرہ میں لے آیا۔ جہاں ان کے لئے لنگر خانہ مسجد[1] خانقاہ اور مدرسہ ہر چیز کا انتظام کر دیا۔ اور ان کے اخراجات کے لئے چند دیہات وقف کر دیئے۔

آپ کے سال وفات میں مورخین کو اختلاف ہے۔ تاہم اس بات پر سب

---

[1] مزار اور مسجد کی سابقہ اور موجودہ حالت کے لئے دیکھو ضمیمہ ۔

متفق ہیں۔ کہ آپ کی تجہیز و تکفین کے فرائض آپ کی وصیت کے مطابق قطب العالم شیخ بہاؤالدین گنج بخش نے ادا کئے اس وقت بڈشاہ زندہ تھا لیکن یہ عجیب بات ہے۔ کہ آپ کا یوم وفات ۱۱ رجب سب نے لکھا ہے۔ لیکن سال وفات کا کسی نے ذکر نہیں کیا۔ اسی تاریخ کو آپ کا عرس بھی ہوتا ہے۔ دو سال تک آپ کا مزار مرجع خلائق رہا ہے۔ اب بھی لوگ آتے ہیں۔ لیکن وہ رونق نہیں ہے۔

میر سید حسین منطقی

اصل وطن شہر بہیق ملک خراسان تھا۔ چونکہ علم منطق میں کمال رکھتے تھے اس لئے منطقی کے نام سے مشہور ہیں۔ سید حسین منطقی کے جد امجد سید تاج الدین بہیقی ملک خراسان کے رہنے والے تھے۔ سید حسین منطقی کی اولاد ان کے منطقی ہونے سے منطقی کہلائی۔ دوسری شاخ بہیق کی نسبت سے بہیقی مشہور ہوئی۔ در اصل منطقی اور بہیقی یک جدی ہیں۔

وانتی پورہ اس زمانہ میں بادشاہ کی توجہ سے روز بروز رونق حاصل کر رہا تھا۔ اور بادشاہ نے اپنا باغ بھی وہاں تعمیر کرایا تھا۔ میر سید حسین نے بھی اسی باغ کو اقامت گاہ بنایا۔ آپ کا مزار بھی وانتی پورہ ہی میں ہے۔

آپ کے دو لڑکے تھے ایک کا نام سید حسن منطقی اور دوسرے کا نام سید محمد امین اویسی تھا۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ نے ایک دن میر سید حسین منطقی سے تبرک مانگا۔ آپ نے دوسرے دن کا وعدہ کیا۔ اور حسب وعدہ جب دوسرے دن کوئی چیز زیر آستین چھپائے ہوئے سلطان کے پاس آئے۔ تو فرمایا تمہارے لئے تبرک لایا ہوں۔ بادشاہ نے ہاتھ بڑھایا تو آپ نے ایک نوزائیدہ بچہ نکال کر اس کے حوالے کیا اور کہا کہ میں تم کو اپنا لخت جگر بطور تبرک بخشتا ہوں۔ اس کا نام محمد امین رکھنا۔ بادشاہ اس عجیب

تبرک سے خوش بھی ہوا۔ اور حیران بھی۔ لیکن آگے چل کر اس نوزائیدہ بچہ نے بالشکیس کی بجائے دنیائے تصوف وسلوک میں وہ نام پیدا کیا۔ کہ آپ کے مناقب وفضائل میں کئی کتابیں لکھی گئیں۔ اور آپ کے مزار فائض انوار کے متعلق کہا گیا ؎

گلشن نوراست بار رب یا ہمہ بیت السرور
یا چو بیت اللہ بہر طائفاں دارالاماں

سید جان باز ولی

خضر راہ اہل نیاز حضرت سید جانباز کا اصل نام محمد وطن اصفہان اور طریقہ رفاعیہ تھا۔ حضرت سید جلال الدین بخاری کے مرید اور علوم ظاہری و باطنی میں صاحب کمال تھے۔ سلطان زین العابدین کے زمانے میں کشمیر آئے۔ پہلے سید رفاعی کے نام سے مشہور رہے۔ پھر ریاضت کاملہ کی وجہ سے سید جانباز مشہور ہوئے۔

بادشاہ کے اصرار سے دارالخلافہ (نوشہرہ) کو اپنا وطن بنایا۔ لیکن جب لوگوں کی کثرت عبادت وریاضت میں حارج ہونے لگی۔ تو بادشاہ کو مجبور کر کے اپنی قیام گاہ بدل لی۔ اور بارہ مولا میں آرہے۔

بادشاہ آپ کے ساتھ کشتی میں سوپور تک آیا۔ بلکہ جزیرہ زینہ لنک کی تعمیر کے لئے حضرت سے دعا کرائی۔

آپ کا قیام عین دامن کوہ میں دریا کے کنارے اس جگہ تھا۔ جہاں آج موضع خانپورہ آباد ہے۔ بادشاہ نے حضرت کے خدام اور لنگر کے اخراجات کے لئے تین گاؤں جاگیر میں دیئے۔ اور ایک وسیع چراگاہ ان کے خدام کے گھوڑ ڈال

سلہ اسرار الابرار غیر مطبوعہ تصنیف ۱۰۶۳ھ دمکمل تاریخ کشمیر حصہ دوم۔

کے لئے عطا فرمائی۔ اسی چراگاہ کے مقام پر آج جانباز پورہ ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے۔

۲۴ ربیع الاوّل ۸۴۳ھ کو آپ کا وصال ہوگیا۔ خانپورہ میں آپ کا مزار مبارک مرجع خاص و عام ہے۔

جو جاگیر خاندان شہمیری اور چکوں کی حکومت اور مغلوں کے دور اور افغانوں کے عہد میں اس زیارت کے ساتھ وقف تھی۔ سکھوں نے اپنے زمانہ حکومت میں ضبط کرلی۔

بابا زین الدّین

شیخ نورالدین ولی کے نامور خلفا میں تھے۔ اصل وطن کشتواڑ تھا اور راجگان کشتواڑ کی اولاد سے تھے۔ ابھی بچہ ہی تھے کہ دشمنوں نے ان کے باپ کو قتل کرکے یتیم بنا دیا۔ ان کی بیوہ ماں نے ان کو دُرِ یتیم بنا کر رکھا ایک خواب کے مطابق ان کی والدہ ان کو کشمیر لے آئی۔ اور شیخ بابا بام الدین کے پاس جو شیخ نورالدین کے خلیفہ تھے پہنچی۔ اتنے میں شیخ نورالدین ولی بھی آگئے۔ ان کی ماں نے کہا۔ بس یہی بزرگ تھے۔ یہی شکل اور یہی صورت تھی۔ جو عالم خواب میں میرے پاس تشریف لائے تھے۔ آخر ماں بیٹا حضرت شیخ نورالدین ولی کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئے۔ اور نام آپ کا زین الدین[1] رکھا گیا

آپ عیش مقام میں برسوں تک عبادت و زہد میں مصروف رہے اور یہیں آپ کا مزار مبارک بھی بنا۔ لیکن آپ شمالی کشمیر میں بھی مختلف مقامات میں سیر و سیاحت کرتے رہے۔

---

[1] اسرار الابرار کے مطابق اصل پیدائشی نام جے سنگھ تھا۔ صاحب تاریخ اعظمی نے زیا (جیا) سنگھ لکھا ہے زے جیم سے اور جیم زے سے بدل جاتی ہے جیسے جوزا ج سے زو زاج۔ اصلی نام ان کا جے سنگھ تھا

میں سیر و سیاحت کرتے رہے۔

ایک مرتبہ شیخ بابا زین الدین علاقہ زینہ گیر میں تھے۔ موضع ہردوشیوہ میں ان کا قیام تھا۔ سلطان زین العابدین بھی زینہ گیر کی آبادی اور نہر کی کھدائی اور نیاری کے سلسلہ میں اسی علاقہ میں تھا۔ بادشاہ ایک دن موضع ہردوشیوہ میں ان سے ملنے کو گیا۔ شیخ عبادت میں مصروف تھے۔ بادشاہ کی تعظیم و تکریم جیسی کہ چاہیے نہ کر سکے[1]۔ بادشاہ سجادہ پر بیٹھ گیا۔ اور کچھ دیر انتظار کرتا رہا۔ جب حضرت نے کوئی توجہ نہ کی۔ تو ملول خاطر ہو کر وہاں سے اٹھ آیا۔

بادشاہ کے جانے کے بعد جب حضرت بابا صاحب عبادت سے فارغ ہوئے۔ حکم دیا۔ سجادہ آلودہ ہو گیا ہے۔ اس کو دھو ڈالو۔ بادشاہ کو ملاقات اور زیارت سے محروم ہونے کا بہت رنج تھا۔ بعض لوگوں نے نمک مرچ لگا کر سجادہ دھلوانے کا واقعہ بھی بیان کیا۔ جب یہ سنا۔ کہ میرے بیٹھنے سے وہ جگہ بھی ناپاک سمجھی جانے لگی ہے۔ تو اور بھی برافروختہ ہوا۔ حکم دیا کہ اگر میں ایسا ہی ناپاک ہوں۔ تو میرے ملک سے کیوں نہیں چلے جاتے۔ بلکہ بعض تذکروں میں تو لکھا ہے۔ کہ ملک سے نکل جانے کا حکم ہی دیدیا۔ باوجود شدت زمستاں کے آپ مریدوں کی ایک جماعت کے ساتھ کوہستان تبت کی طرف چلے گئے۔

چونکہ یہ زمانہ نالہ لچھمن کی کھدائی اور تعمیر کا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے

[1] نتحیات کبرویہ صفحہ ۱۰۰ پر لکھا ہے۔ درآں وقت شیخ طہارت میکرد سلطان آمدہ بر مصلیٰ بنشست و از شیخ التفاتے نیافت تا بتعظیم چہ رسد۔ خوارق السالکین کے مصنف نے بھی صاحب فتحیات کی تائید میں طہارت ہی کا ذکر کیا ہے۔ اسی واقعہ کو ان دونوں کتابوں کے بہت بعد بابا کمال الدین ریشی نے اپنی تصنیف نور نامہ منظوم (۱۲۲۵ھ) میں بڑھا گھٹا کر بابا بام الدین کے ساتھ منسوب کیا ہے۔ یہ کتاب بھی غیر مطبوعہ ہے۔ اور ساڑھے بارہ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ [2] اسرار الابرار سال تصنیف ۱۰۶۳ھ غیر مطبوعہ

کہ یہ واقعہ ۹۰۵ھ یا اس سے ایک دو سال پہلے کا ہے۔ کیونکہ نہر کی تعمیر کی وجہ سے ان ایام میں بادشاہ اس طرف اکثر آیا کرتا تھا۔

حضرت کے ملک بدر ہونے یا ترک وطن کرنے کے بعد جو واقعہ زین العابدین کو پیش آتا ہے۔ اس میں تذکروں کا بہت کچھ اختلاف ہے۔ صاحب خوارق السالکین[1] لکھتے ہیں چند دنوں کے بعد بادشاہ کا بیٹا پاؤں کے درد میں مبتلا ہو گیا۔ جب علاج معالجہ بے سود ثابت ہوا۔ تو بادشاہ کو خود ہی خیال آیا کہ یہ سزا بابا زین الدین کو ملک بدر کرنے کے نتیجہ میں مل رہی ہے۔ ادھر بابا زین الدین بھی تھوڑے عرصہ کے بعد خود بخود ہی مراجعت وطن پر آمادہ ہو گئے۔ بادشاہ نے ان کے آنے کی خبر سنی۔ تو بیمار بیٹے کو استقبال کے لئے بھیجا۔ جس کو رستہ ہی میں اس شدت درد سے نجات مل گئی۔

صاحب اسرار الابرار لکھتے ہیں۔ بادشاہ اس واقعہ کے بعد خود درد پا میں بیمار ہو گیا۔ جب حکماء و اطباء اس کے علاج سے عاجز آگئے۔ تو اہل دربار سے فرمایا۔ میرے درد کا علاج صرف اس درویش کی رضا ہے جس کو زمستان اور برف و باراں کے شدید موسم میں میں نے محض شاہانہ غرور کی وجہ سے جلاوطن کیا ہے۔ جب تک وہ بزرگ واپس تشریف نہ لائیں گے۔ مجھے شفا کی امید نہیں ہے۔ چنانچہ اپنے ایک فرزند اور بقول صاحب فتحیات الکبرویہ[2] (شہزادہ حیدر خاں) کو کوہستان تبت کی طرف بھیجا کہ سمجھا بجھا کر اور عذر و معذرت کرکے ان کو ہمراہ لے آئیں۔ چنانچہ شیخ نے شہزادہ کی التجا قبول کی اور کشمیر کی طرف روانہ ہوئے۔ بادشاہ باوجود اس درد عظیم کے مع امراء و زراء استقبال کو نکلا۔ لکھا ہے کہ جوں جوں شیخ نزدیک آتے تھے بادشاہ صحت یاب ہوتا جاتا

[1] صفحہ ۹۳ - ۹۴ - ۹۵ غیر مطبوعہ سال تصنیف ۱۱۰۹ھ مترجم [2] غیر مطبوعہ سال تصنیف ۱۲۶۳ھ مترجم

تھا۔ یہاں تک کہ بالکل تندرست ہو گیا۔

عیش مقام میں انتقال فرمایا۔ رحلت کے وقت وصیت کی کہ مجھ کو غسل دیکر کفن پہنا دو اور تابوت رکھ دو اور دیکھو پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ چنانچہ جب تابوت دیکھا گیا۔ تو اندر کچھ بھی نہ تھا۔ آخر تابوت ہی کی جگہ قبر بنائی گئی[1]

فانی زخود و بہ دوست باقی　　　این طرفہ کہ نیستند و ہستند

آپ کے مریدوں اور خلیفوں میں بابا دریا دین دبابا شکر الدین۔ بابا پم رشی اور بابا حنیف الدین اور چند اور بزرگ بہت مشہور گزرے ہیں بابا شکر الدین کا مزار وُلر کے عین کنارے ایک پہاڑی پر زینہ گیر کے علاقہ میں واقعہ ہے۔ اس مزار سے وُلر اور گردونواح کا لفریب نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ بابا پم رشی علاقہ لار کے امیرزادے تھے۔ ایک دن شکار کو جارہے تھے دیکھا کہ ایک چیونٹی منہ میں دانہ لئے جارہی ہے اور زمستان کے لئے ذخیرہ جمع کر رہی ہے۔ معاً دل میں خیال آیا۔ کہ مور ضعیف کو تو آئندہ کے توشہ کی یہ فکر اور میں صاحب ثروت اور اہل منصب ہو کر توشۂ آخرت سے غافل۔ چنانچہ منصب شاہی کے ساتھ ہی دنیا کو بھی ترک کر دیا۔ اور آخر شیخ زین الدین کی نظر صاحب اثر سے صاحب کمال ہو گئے۔ پرگنہ بانگل میں آپ کا مدفن ہے۔

[1] صاحب فتحیات نے بھی خود بادشاہ کے بیمار ہونے کی تائید کی ہے لیکن اتنا اضافہ کیا ہے کہ بادشاہ عاجز ہونے کے بعد بابا لطیف الدین کی خدمت میں جو اس زمانے میں کامل واکمل بزرگ تھے آیا اور شفا کے لئے دعا کی التجا کی۔ آپ نے فرمایا بابا زین الدین ہی کی دعا کارگر ہو سکتی ہے چنانچہ بادشاہ نے اپنے بیٹے شہزادہ حیدر خاں (حاجی خاں) کو استدعائے مراجعت اور عذر تقصیرات کا پیغام دیکر بھیجا۔ ان کے تشریف لانے سے بادشاہ کو صحت کلی ہو گئی۔

بابا عثمان گنائی

آپ خاص سرینگر کے رہنے والے تھے۔ اس زمانہ میں حسب معمولی سفر درشتوار گزار تھے۔ آپ پنجاب و ہند کی سیر کرتے ہوئے حرمین الشریفین تک پہنچے ؎

فراز و شیب رہ از رہروان گرم مپرس
کہ پیش مرغ ہوا کوہ و دشت یکساں است

وہاں خواجہ اسحاق ختلانی[1] سے ملاقات ہوئی۔ اور ان سے ارادت و بیعت کی خواہش کی۔ خواجہ نے فرمایا۔ تمہارے گھر میں گنگا بہہ رہی ہے زیارت حرمین سے فارغ ہو کر سیدھے اپنے وطن جاؤ اور شیخ بہاؤ الدین گنج بخش کی خدمت و اطاعت سے مقاصد دلی حاصل کرو۔

چنانچہ آپ واپس تشریف لائے۔ اور ان سے فیوضات باطنیہ حاصل کئے حضرت شیخ نورالدین ولیؒ اور حضرت باباحاجی آدمؒ[2] اور دیگر اولیائے کرام کی صحبتوں میں بھی رہے

تاریخ اعظمی میں لکھا ہے "بابا صاحب کمال بود بعد تحصیل علوم بہ ذوق خدا پرستی راہ حرمین گرفت۔ حق تعالیٰ در علم تقویٰ او در ابرکت داو سا کثر احفاد و ذریات ایشاں را کار با فضیلت و علم افتاد" بابا رجب گنائی۔ بابا زینی گنائی ملا فیروز گنائی۔ ننو گنائی بڈشاہی۔ ملا نوری گنائی۔ بایزید عاصمی وغیرہم جو کشمیر کے نکوکاروں تقویٰ شعاروں اور صاحبان علم و فضل میں درجۂ امتیاز رکھتے تھے۔ آپ ہی کے اولاد و احفاد سے تھے۔

صاحب "تاریخ اعظمی لکھتے ہیں: گنائی در عرف آنوقت نویسندہ راے

---

[1] مزار حضرت شاہ اسحاق در کابل در جہت شرقی قریب سواد شہر واقعہ است دران جا بہ "شہیداں" اشتہار دارد حاشیہ تاریخ اعظمی صفحہ ۱۵۲ [2] باباحاجی ادہم بھی آپ ہی کا نام ہے۔

گفتند از معنی تا به پٹواری ہمیں لقب بود" مصنف تذکرۃ الحضرات اور کشمیر کے دیگر مصنفوں نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ اور بابا عثمان گنائی کے متعلق لکھا ہے خوش نویسی و حساب دانی میں دیگر علوم و فنون کے علاوہ شہرۂ آفاق اور بنمبائے شہر میں ممتاز تھے۔

آپ کی تاریخ ولادت صرف تذکرۃ الحضرات میں سنہ ۷۳۱ھ درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڈشاہ کے اوائل عہد میں پچاس سال سے زیادہ عمر کے تھے کشمیر کے تذکروں میں آپ کی بہت سی کرامتوں کا ذکر ہے۔ صاحب خوارق السالکین نے لکھا ہے۔ کہ بڈشاہ نے بھی آپ سے ملاقات کر کے آپ کے کمالات وکرامات کا اعتراف کیا ہے۔ اور اپنے حق میں مخدوم بابا سے دعائے خیر بھی کرائی ہے۔ صاحب تذکرۃ الحضرات نے آپ کی وفات سنہ ۸۲۱ھ لکھی ہے۔ مدفن آپ کا مقبرہ سلاطین میں پیش روئے مقبرہ مرزا حیدر کاشغری بیان کیا جاتا ہے۔ عمر آپ کی نوے سال تھی۔

شیخ بہاؤالدین گنج بخش

شاہ اسحاق ختلانی (خلیفہ امیر کبیر علی ثانی) کے تربیت یافتوں اور مریدوں میں تھے۔ ابتدا میں بڑے سیاح تھے۔ چنانچہ شاہ اسحٰق کے پاس خود ختلان گئے۔ اور ان سے فیوضات حاصل کئے۔ ان کے جذب و سلوک کی حکایات بے شمار ہیں۔

اصل نام بہاؤالدین ہے۔ گنج بخش ان کا لقب ہے۔ شیخ سلطان کشمیری سید محمد مدنی اور حضرت شیخ نورالدین ولیؒ کے صحبت یافتوں میں تھے بادشاہ ان کی ایک بشارت کے عملی ظہور کی وجہ سے جس کا ذکر بادشاہ کے بچپن کے بیان میں ہو چکا ہے۔ ان کا بڑا ادب کرتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ کو

محلات شاہی میں آنے اور دربار کی سیر کرنے کی دعوت دی گئی۔ آپ نے شکریہ کے ساتھ قبولیت دعوت سے انکار کر دیا۔

ایک دن حضرت شیخ بہاؤالدین موضع کرشہ بل میں لب دریا ایک درخت کے نیچے سر بہ زانو بیٹھے تھے۔ نصف شب کے قریب چوروں کی ایک جماعت شہر سے مال متاع لیکر اس طرف آئی۔ اور چوری کا مال باہم تقسیم کرنے لگی۔ مال تقسیم کرنے کے بعد ان کی نظر اس تاریکی میں آپ پر پڑی۔ ان ظالموں نے اس خوف سے کہ یہ شخص ضرور ہمارا راز فاش کر دے گا۔ آپ کو شہید کر دیا۔

بادشاہ کو اس المناک واقعہ کی خبر ہوئی۔ تو بہت افسوس کیا۔ شیخ نے اپنے ہم صحبتوں اور ارادتمندوں کو وصیت کر رکھی تھی۔ کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو میرا جنازہ کندھوں پر لیجانے کی بجائے یہ کام کرو کہ میرے پاؤں میں رسہ باندھکر کشاں کشاں لئے پھرو۔ یہانتک کہ قبرستان میں پہنچا دو۔ لوگ اس وصیت کی تکمیل کے لئے بڑے متردد و مضطر تھے۔ بادشاہ کو اطلاع ہوئی تو حکم دیا۔ حضرت شیخ کی وصیت ضرور پوری ہونی چاہیئے۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ایک گہوارہ بنایا گیا۔ اس میں آپ کی لاش رکھی گئی۔ گہوارے کے نیچے پہیئے لگائے گئے۔ اور اس کے ساتھ رسہ باندھکر قبرستان تک پہنچایا گیا۔ بادشاہ حضرت بابا عثمان گنائی۔ اور بہت سے بزرگان شہر اور اعیان مملکت کے ساتھ آپ کے جنازے میں شامل ہوا۔ کوہ ماراں کے دامن میں قلعہ کے باہر جہاں ایک وسیع قبرستان ہے۔ آپ دفن کئے گئے۔ مزار آپ کا اور احاطہ قبرستان بڈشاہ کی بھتیجی بیگم نے اپنا زیور فروخت کر کے تعمیر و مرمت کرایا تھا۔

۸۴۶ ۸۴۵
۸۴۲ ھ میں آپ نے درجہ شہادت حاصل کیا۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ

لہ مزار اور قبرستان بہاؤالدین شیخ گنج بخش کے مفصل حالات دیکھو ضمیمہ ملا

شہادت کے وقت آپ کی عمر بہت بڑی تھی۔
آپ کے مزار مبارک کے دروازے پر ہی شمس چک کی قبر ہے۔ جو ۹۳۲ھ میں لعہد سلطان محمد شاہ بن سلطان حسن شاہ کشمیر کا حاکم اور مدار المہام گزرا ہے۔

شیخ نورالدین ولی

اوائل عمر میں اپنے بھائیوں کے اصرار و جبر سے ان کے ساتھ چوری و رہزنی کیا کرتے تھے۔ اور چونکہ جذبہ الٰہی کے لامتناہی شعلے بطن مادر ہی سے لے کے آئے تھے۔ اس لئے ان کے بھائی ہمیشہ ان پر ناراض رہتے تھے آخر تیس سال کی عمر میں بھائیوں کا ساتھ بالکل ترک کر دیا۔ بلکہ وہ کام بھی جو طبیعت پر گراں گزرتا تھا۔ چھوڑ دیا اور ایسی توبہ کی کہ ریاضت و جانبازی اور زہد و عبادت میں قدم رکھکر یادگار متقدمین اور افتخار متاخرین ثابت ہوئے اور حب محبوب ذوالجلال سے لو لگائی۔ تو تعلقات زن و فرزند کو بھی حجاب تصور کر کے قطع کر دیا۔

آں کس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند فرزند و عیال و خاناں را چہ کند
دیوانہ کنی دو ہر دو جہانش بخشی دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

بارہ سال تک آپ پہاڑوں کی غاروں میں صرف کاسنی کے پتے کھا کر گزارہ کرتے رہے۔ اس کے بعد ۱۲ سال تک کاسنی کو ترک کر کے دودھ کے ایک پیالہ پر گزر کی۔ پھر اسے بھی لذت نفس جان کر ترک کیا۔ اور دو اڑھائی سال تک قدرے آب جو پر گزارہ کیا۔ غرض گوشہ نشینی و تنہائی اختیار کرنے کے بعد بقول صاحب تاریخ اعظمی "بست و شش سال نان و غلہ نخورد"

قوت جبرئیل از مطبخ نبود بود از دیدار خلاق ودود

حضرت میر محمد ہمدانی میر سید حسن سامانی شیخ بہاؤالدین گنج بخش شیخ سلطان کھلی بابا حاجی ادہم اور کئی بزرگ آپ کے ہم مرتبہ و ہم سال بیان کئے جاتے ہیں۔ آپ کی ولادت قریباً تمام مورخین نے بالاتفاق ۷۵۷ھ بیان کی ہے۔ لیکن تاریخ وفات میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے سال وفات ۸۳۸ھ اور بعض نے ۸۴۲ھ لکھا ہے۔ اور عمر آپ کی ۶۳ یا ۸۲ سال بتائی ہے۔ اور یہ بھی نور جنین نے لکھا ہے کہ بڈشاہ کے زمانے میں وہ فوت ہوئے۔ اور بادشاہ آپ کے جنازہ پر گیا صاحب تاریخ اعظمی کے حساب سے ۲۶ سال وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں رہے۔ ۳۰ سال کی عمر میں انہوں نے رہبانی ترک کی چھبیس سال تو اسی طرح ہو گئے۔ ادھر ۷۵۷ھ کی پیدائش اور ۸۳۸ھ کی وفات کے مطابق ان کی عمر صرف اکیاون سال ہوتی ہے۔

البتہ اگر ۸۴۲ھ کو سال وفات صحیح تسلیم کیا جائے۔ اور اسی کو صاحب اعظمی نے بھی تسلیم کیا ہے۔ تو آپ کی عمر ۷۵۷ھ کی پیدائش کے مطابق پچاسی سال ہوتی ہے۔ اور یہ وہ زمانہ ہے کہ بڈشاہ بھی آپ کے سال وفات میں زندہ موجود تھا۔ اور اس حساب سے اس کا حضرت کی ذات سے فیوض حاصل کرنا اور ان کے جنازہ میں شامل ہونا قرین قیاس بھی ہے۔ ذیل کے قطعہ تاریخ سے بھی ان کا سال وفات ۸۴۲ھ معلوم ہوتا ہے ؎

ز ہجرت ہشتصد و چہل و دو بود   کہ شیخ نوردیں رحلت نمودہ

بڈشاہ سے آپ کا تعارف کس طرح ہوا اس کو ہم معارف الحقانی کے طویل مضمون سے مختصر طور پر یہاں درج کرتے ہیں صاحب معارف لکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ بادشاہ بیمار ہو گیا۔ جب علاج سے تمام حکماء عاجز آ گئے۔ تو بادشاہ نے نجومیوں کی طرف رخ کیا نجومیوں نے کہا بیماری کی وجہ یہ ہے کہ ملک رانی

وعدالت گستری میں کوئی کمی ہوگئی ہے۔ اور حاکموں اور افسروں پر سستی و کاہلی نے عمل دخل کر لیا ہے۔ اور بطور مثال یہ واقعہ بیان کیا۔ کہ گزشتہ زمانہ میں ایک بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں ایک بڑھیا کا اکلوتا بیٹا سخت بیمار ہوگیا۔ وہ دربار میں آکر شور و فغاں کرنے لگی۔ بادشاہ نے سبب پوچھا۔ تو کہا میرا بیٹا سخت بیمار ہے۔ اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ بادشاہی اہلکاروں نے کوئی ایسا کام کیا ہے۔ جو عدالت و آئین فرمانروائی کے خلاف ہے۔

بادشاہ نے نجومیوں سے کہا۔ تم اپنی کتابوں میں دیکھو کہ پیرزال کا فرزند کیوں بیمار ہوگیا ہے منجموں نے متفق ہو کر کہا۔ کہ ہمارا علم ہم کو یہی کہتا ہے کہ بادشاہ کے ملک میں کسی بے انصافی کا واقعہ ظہور میں آیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ایک قصاب نے اپنا پیشہ ترک کر کے دنیا کمانے کے لئے گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے۔ لازم یہ ہے کہ قصاب کو غار سے نکال کر شہر میں لایا جائے اور سزا دی جائے۔ تا کہ کوئی اور شخص آرام طلبی اختیار کر کے مکر و فریب سے دنیا کو لوٹنے اور کاروباری دنیا کو ضعف پہنچا کر گوشہ گیری اختیار کرنے کی جرات نہ کرسکے۔ چنانچہ جب اس کو پکڑ کر لائے اور بزرگی و ریاضت میں لاف زنی کرنے پر تنبیہہ کر کے اس سے اس کا آبائی کاروبار شروع کرایا گیا۔ تو اس بڑھیا کے بیٹے کو شفا حاصل ہوگئی۔

نجومیوں نے یہ واقعہ بیان کر کے بادشاہ سے کہا۔ اے بادشاہ جم جاہ تیرے عہد میں بھی اس قسم کا ایک واقعہ پیش آیا ہے۔ ایک شخص جس کا کاروبار رہزنی چوری اور ڈاکہ زنی ہے جنگل میں جا بیٹھا ہے۔ زن و فرزند کو جواب دے چکا ہے۔ اور اپنے آپ کو عابد و زاہد کہتا ہے۔ جب تک اس کو گرفتار کر کے قتل نہ کیا جائیگا۔ بادشاہ کو صحت کلی حاصل نہ ہوگی۔ بادشاہ نے حکم دیا۔ ایسے شخص

کو گرفتار کر کے حضور میں پیش کرو بادشاہی آدمی دوڑے دوڑے اس جنگل میں گئے۔ جہاں حضرت شیخ نورالدین کا قیام تھا حضرت ٹہل رہے تھے۔ کر بادشاہی پیادوں کو مضطرب الحال دیکھکر پوچھا۔ اے جوانو! یہ شتاب و اضطراب کیوں ہے۔ اور کس کی تلاش میں سرگردانی ہے۔ پیادوں نے کہا۔ ہم شیخ نورالدین کی تلاش کر رہے ہیں۔ اسے بادشاہ کے حضور میں لے جانا ہے۔ شیخ نے کہا جس کی تلاش میں تم نے بیابانوں۔ ویرانوں اور کوہستانوں کو ایک کر دیا ہے۔ وہ فقیر میں ہی ہوں۔ چلو اسی حال میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔

جب شیخ بادشاہ کے پاس پہنچے تو اس کی بیماری میں افاقہ ہونا شروع ہوا منجموں نے کہا کہ بادشاہ سلامت ہم نے جھوٹ تو نہیں بولا تھا۔ یہ دزد و مکار کہ اس کے باپ دادا کا پیشہ ڈاکہ اور رہزنی ہے اب دعویٰ بزرگی کرتا ہے۔ جونہی حاضر دربار ہوا ہے۔ حضور کو بیماری سے نجات مل رہی ہے۔

بدشاہ تو بڑا زیرک اور مصلحت اندیش بادشاہ تھا۔ اس نے کہا کہ اے نادانو! اپنی اپنی سمجھ کا پھیر ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسی بزرگ کے دیدار برکت و فیض آثار سے میری صحت بحال ہو گئی ہے۔ ایسا بزرگ میرے ملک میں ہو۔ جس کے دیدار ہی سے آثار نحوست و ادبار دور ہو جائیں۔ اس سے زیادہ میری کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔ یاد رکھو ایک درویش کی ناراضگی اور پھر بلا وجہ ایک عالم کو درہم برہم کر دیتی ہے۔

بادشاہ کے دل میں روز بروز شیخ کی عزت بڑھتی گئی۔ بہت عذر خواہی کی اور کہا میرے لئے بدرگاہِ رب العلا دعائے نیک فرمایئے۔ حضرت شیخ نے کہا۔ خدا تمہیں عدل و انصاف کی توفیق مزید دے کہ اس ملک کے ساتھ ملک آخرت بھی کہ باقی و پائندہ ہے۔ تمہارے قبضہ میں ہو۔

۸۴۲ھ میں کہ بڈشاہ کی حکومت کا اٹھارہواں سال تھا۔ پچاسی سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ نماز جنازہ اور تجہیز و تکفین میں تمام علما وصلحا، اور بزرگان دین جمع ہوئے بادشاہ خود خیل و حشم کے ساتھ چرار شریف پہنچا۔ اور کہنے لگا۔ جسد مبارک شہر میں لے چلو۔ وہیں حضرت کا مرقد و مقبرہ بنایا جائیگا۔ شہر میں لوگوں کی آمد و رفت زیادہ ہے۔ زیارت سے منوّر و مسرور ہوا کریں گے۔

اس موقعہ پر گرد و نواح کے قریباً دس ہزار آدمی جمع تھے۔ ان کا منشا یہ تھا۔ کہ مقبرہ خام پور میں ہو جو سر راہ ہے حضرت کے جو درویش تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی۔ کہ اسی جنگل خارزار میں جہاں آپ نے اپنی عمر بسر کر دی ہے روضہ مبارک بنایا جائے۔

حضرت بابا نصر الدین جو شیخ کے خلفائے اعظم میں سے تھے۔ اور بادشاہ بھی ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔ اس اجتماع و کثرت اور بحث و مباحثہ سے بہت متردد تھے۔ آخر آپ کے فیصلہ کے مطابق مقبرہ چرار ہی میں بنایا جانا قرار پایا۔ اور بادشاہ نے اس فیصلہ کو قبول کر لیا۔

بادشاہ ابھی چرار شریف ہی میں تھا۔ کہ اس کے حکم سے گل کار اور کارکن بلائے گئے۔ اور روضہ کی تعمیر شروع ہو گئی۔ چنانچہ روضہ مبارک سب سے پہلے بڈشاہی نے تعمیر کرایا۔ انقلاب زمانہ کی وجہ سے بعد میں اس میں ترمیم و تعمیر بھی ہوتی رہی ہے۔

میر سید محمد امین اویسی

یہی وہ نور دیدہ بچہ ہے۔ جس کو اس کے باپ میر سید حسین منطقی نے بڈشاہ کو بطور تبرک عطا کیا تھا۔ اور کہا تھا۔ نام اس کا

محمد امینؒ رکھنا۔ اسی خاندان (بہیق) سے چونکہ بادشاہ کی ایک بیگم بھی تھی۔ جو اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ غمگین و ملول رہتی تھی بادشاہ نے وہ نوزائیدہ بچہ بہیقی بیگم کے سپرد کر دیا۔ بادشاہ نے محمد امین کی ظاہری و باطنی تعلیم کا پورا پورا انتظام کیا۔ خواجہ ہلال اشم والے ان کے پیر طریقت تھے اور بابا حاجی ادہم کے سپرد ان کی ظاہری تعلیم ہوئی۔ چنانچہ تعلیم قرآن اور علوم دینیہ یعنی فقہ و حدیث و تفسیر اور معقول و منقول آپ نے سب انہی سے حاصل کئے۔

بادشاہ اس کو اپنے بچوں کی طرح رکھتا تھا۔ ایک تو اس کی پیشانی سے ستارہ بلندی کی جھلک نظر آ رہی تھی۔ دوسرے وہ ایک بزرگ صاحب علم و فضل سید کا عطیہ متبرک تھا۔ اس لئے سفر و حضر میں اس کو ساتھ رکھتا اور کہتا۔ ع

سفر برائے تو جویم وطن برائے تو خواہم

اویسی اس لئے مشہور تھے کہ حضرت اویس قرنی سے نسبت رکھتے تھے۔ بلکہ اپنا تخلص بھی اویس رکھ لیا تھا۔ اور اپنے نام کی بجائے میر اویسی کے نام سے زیادہ مشہور رہتے۔

جب سن تمیز کو پہنچے تو بادشاہ نے آپ کی فراست و کیاست دیکھکر بعض امور مملکت آپ کے سپرد کرنا چاہے۔ ماں نے بھی بہت کچھ کہا سنا حشمت و شوکت

لے عالی کدل میں جس مکان میں آپ پیدا ہوئے وہاں آجکل مفتی اعظم مولانا شریف الدین مرحوم کے فرزند رہتے ہیں۔ اکبر بادشاہ نے یہ مکان آپ کے ایک بزرگ خواجہ موسیٰ کو عنایت کیا تھا جب آپ کے پردادا مولوی نظام الدین محمد شاہ مؤلف تاریخ نظام الوقائع بعہد جبار خاں سکھوں اور پٹھانوں کی لڑائی میں شہید ہو گئے تو سکھوں نے جو علم و ادب کی قدر و قیمت سے بے بہرہ تھے مکان کے ساتھ ہی آپ کے عظیم الشان کتب خانے کو بھی جلا دیا مولانا شریف الدین مرحوم ابو الخیر مولوی خیر الدین کی جو فتاویٰ عالمگیری کے مرتب کرنیوالوں میں سے ایک تھے ساتویں پشت سے تھے۔ ۲ے فتوحات اکبر دیہ صفحہ ۳۱۵

بادشاہی کی ترغیب دلائی اور بڑی بڑی امیدوں کا اظہار کیا۔ مگر جس کے سر میں فضائے عالم معنوی کی ہوا سے سیر کرنے کا سودا ہو وہ لذت مال وجاہ صوری سے ذائقہ حلاوت کی کیا تمنا رکھتا ہے۔ غرض آپ نے نہ بادشاہ کا مشورہ قبول کیا۔ نہ بیگم کی بات پر کان دھرے بلکہ مندرجہ ذیل شعر

رماسوائے تو آنانکہ فارغ البال اند

بہ عالمے نہ فروشند ذوق تنہائی

کے علاوہ ایک طویل ترجیع بند میں دنیا سے کنارہ کشی کا اظہار کر دیا۔ بادشاہ اور بیگم کو محمد امین کی ذات سے ملکی خدمات وفلاح کی بڑی بڑی تمنائیں تھیں۔ اس صوفیانہ طرز عمل اور اس کے اشعار کے مطالعہ سے سب خاک میں مل گئیں لیکن باوجود ان ہاتوں کے بادشاہ کو آپ سے کمال محبت تھی۔ سال میں دو تین مرتبہ ان سے ضرور ملتے۔ کبھی کبھی میر اویسی خود بھی بادشاہ کے پاس چلے آیا کرتے تھے۔

زینہ لنک کے جشن شاہی کے واقعہ کے بعد جس میں میر اویسی ناراض ہو کر چلے آئے تھے۔ اور جس کا ذکر زینہ لنک کی تعمیر کے دوران میں ہو چکا ہے۔ اپنے محلات ریچن شاہ میں جس کا نام محلۂ بلچھ بھی ہے رہنا اختیار کیا۔ کبھی کبھی موضع اشم میں بھی

ے جب ریچن شاہ نے اسلام قبول کر کے اپنا نام ملک صدرالدین بادشاہ کشمیر رکھا۔ اور اس کی دیکھا دیکھی اور لوگ بھی مسلمان ہو گئے اور بادشاہ اور سید بلبل (بلال) شاہ نے جن کے ہاتھ پر ریچن شاہ نے اسلام قبول کیا تھا۔ اسی علاقہ میں اپنے محلات ومکانات بنوائے تو ہنود نے از راہ نفرت وحقارت اس محلہ کا نام ملیچھ مر رکھا ملیچھ اس زمانہ میں ہر غیر ہندو کا نام تھا اور مر بزبان کشمیری جگہ کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ محلہ جو عالی کدل سے بجانب شمال ہے بلندی پر واقع ہے۔ اس کو بلندی مریعنی بلندی کی جگہ اور اب تھوڑے سے تغیر کے ساتھ بلدی مر بھی کہتے ہیں۔

کئی کئی دن رہا کرتے تھے۔ جہاں آپ کے شیخ طریقت سید بلال کا قیام تھا۔ بادشاہ نے اشم پن میں بھی میر اویسی کے لئے کئی عمارات تیار کرا دیں۔

میر اویسی بادشاہ کے گھر میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے باوجود نہایت درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لطیف طبع تھے اور حسن ظاہری کے ساتھ حسن خلق بھی بے مثال تھا۔ باوجود نمایاں حال و کمال اور علوم و افضال انکساری و نیازمندی پر فخر تھا فرماتے ہیں ؎

گناہِ ما زعدم گرنیامدے بہ وجود
وجود عفو تو در عالم عدم نے بود

لیکن باوجود اس درویشی کے مکان پر دربان رہتا تھا۔ جب میر اویسی حالت خاص میں ہوتے تھے۔ تو دربان اعلان کر دیتا تھا۔ کہ میر باخدا است چنانچہ کوئی شخص ان کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ جب وہ اعلان کرتا تھا۔ کہ میر باخدا و خود است یعنی آپ مشاہدہ وحدت کثرت میں کرتے ہیں۔ تو لوگوں کو اندر آنے کی اجازت ہوتی تھی۔

جب حسن شاہ بادشاہ ہوا۔ تو سادات بیہقی کے ایک سید حسین" نام کو کہ سید میرک میر بھی ان کو کہتے تھے۔ وزارت کا مرتبہ ملا۔ امرائے ملک نے ایک غیر ملکی کی اطاعت سے انحراف کیا۔ چنانچہ ایک شورش عظیم برپا ہوئی۔ سید میر اویسی بھی ہر چند بادشاہ کے گھر کے تربیت یافتہ تھے۔ لیکن ان کے والدین بھی چونکہ سید تھے۔ اس لئے مخالفوں نے ان پر بھی اہل فتنہ و فساد کو مشورے دینے کا الزام لگایا۔ حالانکہ ان باتوں سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔

اس زمانہ میں سید میر اویسی سادات کی ایک جماعت کے ساتھ محلہ

نوشہرہ میں رہتے تھے۔ اشرار کی جماعت رات کے وقت آپ کے حجرہ میں گھس آئی۔ اور اپنی طرف سے ان کو شہید کر کے چلی گئی لہ لیکن ان میں ابھی جان باقی تھی۔ آپ نے اسی حال میں ایک شعر اور دو حسب ذیل رباعیاں کہیں ؎

منم آں رند جہاں گرد مسیحا نفسے ۔۔۔ کہ من ایں ہردو جہاں را نشمارم بہ خسے
اگر از عشق تو ام سر برود گو بردد ۔۔۔ ہرگز ایں سر نہاں تو نگویم بہ کسے
من فارغم ز مصلحت اہل روزگار ۔۔۔ وآں بیقیں کہ کشتن من بود بیگناہ
اکنوں بیاؤ شعر بخواں بر مزار من ۔۔۔ تا روئے ظالمان ستمگر شود تباہ

صورت قبرم زبعد مرگ ویراں خوشتر است
نامرادے ہمچو من با خاک یکساں خوشتر است

تاریخ وفات شہید کشمیر ۸۸۹ھ شہید شرع ۸۸۹ھ اور شہید عرش ۸۸۹ھ ہے۔ خوارق السالکین میں حسب ذیل شعر بھی درج ہے ؎

رفت از جہان فانی بیروں چوں میر دلبی
گفتند سال وصلش مخدوم وصلیں بود

مخدوم العرفا شیخ حمزہ کاشمیری، اپنے ابتدائی زمانہ۔ لوک میں مدت تک اس آستانہ پر حاضر ہوتے رہے ہیں۔ محلہ زینہ شاہ میں جس کو اب بلبل لنگر کہتے ہیں۔ اور جو عالی کدل میں واقع ہے آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ بادشاہ کی زندگی میں جب آپ شہر میں ہوتے تھے، تو یہیں آپ کا قیام ہوتا تھا۔ بادشاہ نے آپ کے لئے رباط بھی تیار کرا دی تھی۔ اور بادشاہ اور بیگم اسی رباط میں آکر آپ سے ملاقات کرتے تھے۔ آپ کا مزار

لہ فتوحات کبرویہ اور خواجہ اعظمی میں لکھا ہے کہ آپ کے ساتھ چودہ اور سادات بھی شہید کئے گئے تھے

آپ کی وصیت کے مطابق اسی رباط میں تعمیر ہوا۔ آپ کے مزار پر آپ کے آخری اشعار جو وصال کے وقت آپ نے فرمائے تھے۔ ابھی تک موجود ہیں۔

بابا رحیب الدین

حضرت بابا بام الدین کے مرید اور خلیفہ تھے۔ وطن کشمیر سے باہر تھا۔ ان کے ساتھ ان کے دو بھائی بھی فخر الدین و شکر الدین نام آئے تھے۔ پرگنہ مارتنڈ کے کوہ ناگہ نارن کے دامن میں قیام فرمایا۔ کلام اللہ کی کتابت کر کے اپنی روزی پیدا کرتے تھے۔ ان کے مریدوں میں شیخ نورو زریشی اور شیخ ہردے ریشی بہت بڑے مشہور تھے۔

شیخ پرباز

سلطان المجاہدین شیخ نورالدین ولی کے ارادت مندوں میں تھے۔ بارہ برس کی عمر تھی کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پیرو مرشد کے حکم سے چترابل میں اقامت اختیار کی۔ مرشد کے حکم سے ان کے دوسرے پیر بھائی شیخ عبداللطیف اور شیخ شریف بھی وہیں قیام پذیر تھے۔ عموماً یہ تینوں بزرگ جنگل کا اُبلا ساگ کھایا کرتے تھے ایک دن آپ سخت اور خشک سا اوبل ساگ لائے جس کا پکنا اور گلنا بہت مشکل تھا۔ شیخ عبداللطیف نے کہا آج کیا لے آئے۔ شیخ پرباز نے کہا سبز ساگ کو تسبیح (خدا کی عبادت) پڑھتے سُنا۔ اس لئے اکھاڑنے کی جرات نہ ہوئی ؎

ہر گیاہے کہ از زمیں روید   وحدہٗ لاشریک لہ گوید

اگر میں اس کو اکھاڑتا۔ تو اس سے خون جاری ہو جاتا۔ چنانچہ شیخ عبداللطیف و شریف نے بھی اس کے بعد سبز ساگ کھانا چھوڑ دیا۔

حافظ فتح اللہ خوش خواں و حضرت شیخ اسماعیل

حافظ فتح اللہ شیخ احمد خوش خواں کے فرزند تھے۔ علوم عقلیہ و نقلیہ میں صاحب کمال تھے۔ اپنے زمانہ کے صاحب جمال و جلال تھے۔ ان کے فرزند شیخ اسماعیل بھی اپنے باپ اور دادا کی طرح عالم علوم ربانی تھے۔ . . . . شیخ اسماعیل بڈشاہ کے آداخر عہد میں موجود تھے۔ اپنے وقت کے شیخ الاسلام تھے۔ ان کی اقامت دو جگہ تھی۔ ایک ہری پربت کے دامن میں۔ دوسری جامع مسجد کے متصل جہاں ان کے آباؤ اجداد کے مزار تھے۔ دونوں مقامات پر جو صوفی اور درادخان اور طالب علم رہتے تھے۔ ان کی تعداد صاحب تاریخ اعظمی نے چار سو بتائی ہے۔ ان کے مدرسہ و خانقاہ میں بعض طالبان علوم ماوراءالنہر اور ہرات تک سے آتے تھے۔ یہ دونوں باپ بیٹا ایسے خوش الحان تھے کہ لوگ جب ان سے قرآن شریف اور مثنوی مولانا روم کا بیان سنتے تھے۔ تو وجد میں آجاتے تھے۔

ان کی وصیت تھی کہ میری وفات کے بعد میرا کتب خانہ اور لنگر وقف عام رہے۔ خواجہ محمد اعظم اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ ۱۱۰۹ھ تک ان کی خانقاہ موجود تھی۔ آتش زدگی نے اس کو مٹا دیا۔ وہ لکھتے ہیں۔ اکثر اہل دل اور صوفی منش بزرگ ان کے مزار پر آکر گوشہ نشینی کیا کرتے تھے

حضرت سید ہلال

بڈشاہ کے لے پالک فرزند سید محمد امین اویسی کے علوم ظاہری و تعلیم قرآن کے استاد تو حضرت باباحاجی ادہم تھے۔ لیکن پیر صحبت اور استاد علوم باطنی حضرت سید ہلال تھے۔ چونکہ سید ہلال بالعموم موضع اشم

میں رہتے تھے اور ان سے فیض و برکات حاصل کرنے کے لئے سید محمد ابن اویسی منطقی بیہقی المعروف بابا میر اویسی کو بھی عموماً وہیں رہنا پڑتا تھا۔ اس لئے بادشاہ نے ان کی خاطر اشم میں کئی حجرے مسجد۔ لنگر خانے اور مکان رہائشی تعمیر کرا دیئے تھے۔

سید بلال سید محمد ہمدانی خلف امیر کبیر سید علی ہمدانی سے تربیت یافتہ تھے۔ صاحب تاریخ خواجہ اعظمی ان کے مقبرہ کی برکات کے عینی مشاہدات لکھتے ہیں آپ کا مزار ابھی موضع اشم ہی میں زیارت گاہ خلائق ہے۔

سید بدرالدین زینہ کدلی و سید نورالدین زینہ کدلی

سید بدرالدین کشمیر کے سادات قدیم میں ایک ممتاز ہستی تھے۔ محلہ زینہ کدل میں مدفون ہیں۔ خواجہ محمد اعظم اپنی تاریخ (۱۱۴۸ھ) میں لکھتے ہیں۔ ان کا مقبرہ میرے اوائل عمر میں موجود تھا۔ بعد ازاں حوادث زمانہ کی نذر ہو گیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد بعض اصحاب کی کوشش سے پھر اس کا وجود ظاہر ہو گیا۔ سید نورالدین زینہ کدلی ان کے برادر زادہ تھے۔ چچا بھتیجا کی قبریں ایک ہی جگہ ہیں۔ زینہ کدل سے غربی جانب۔ ان کی قبر بھی جب اہل کشف کی توجہ سے ظاہر ہوئی۔ تو ان کی قبر کے تعویذ پر بہ خط قدیم یہ رباعی لکھی ہوئی نظر آئی۔ ؎

جامے است کہ عقل آفریں می زندش	صد بوسہ ز شوق بر جبیں مے زندش
آں کوزہ گر دہر چنیں جام لطیف	مے سازد و باز بر زمیں مے زندش

خواجہ محمد اعظم ان دونوں بزرگوں کی قبروں کو مصدر فیوض و برکات بتاتا ہے۔

انتیسواں باب ۲۹

متفرقات

دو ماہہ دم دار تارا

کشمیر کے اس دور امن واماں کو فلک پیر زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔ ملک میں بظاہر تو فتنہ وفساد کی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی۔ لیکن لوگوں نے ایک دفعہ شام کو شمال کی طرف ایک دم[1] دار تارا دیکھا۔ جو برابر دو ماہ تک آسمان پر نظر آتا رہا۔ بادشاہ اور اس کے نجومیوں اور عام لوگوں نے اس تارہ کی بدشگونی کو دیکھکر سمجھ لیا۔ کہ ملک میں کوئی نہ کوئی آفت آنے والی ہے۔ کئے دن کو خود بخود اور رنگا تار بھونچال آتے رہتے تھے۔ اسی دوران میں پندرہ دن کے اندر اندر سورج اور چاند دونوں کو گرہن لگا۔

آفتاب ایک نحس دن میں ایک برج سے دوسرے برج میں چلا گیا۔

شاہی محل کے اوپر ایک چتر تھا۔ انہی ایام میں ایک اُلو[2] آکر اس پر بیٹھا کرتا اور اپنی کرخت آواز سے اپنی نحوست ظاہر کیا کرتا۔ لوگوں کا

---

[1] اس زمانہ میں دم دار ستارہ ہیلی صاحب کے نام سے موسوم ہے۔ اسی نے سب سے پہلے اس کو نحوست کے آثار بتایا تھا۔ ۱۵۰۶ء میں ہنری ششم بادشاہ انگلستان کے زمانے میں اس کی تحقیقات ماہران علم نجوم نے کی۔ [2] معلوم ہوتا ہے کہ کسی مکان پر اُلو کے بیٹھنے کی بدشگونی عرصہ دراز سے چلی آتی ہے اور آج بھی جس مکان پر اُلو بیٹھتا ہے سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس مکان والے پر ضرور کوئی آفت آئیگی۔

خیال تھا کہ غالباً زراعت کو نقصان پہنچیگا۔ اور ملک پھر قحط کی آفت میں مبتلا ہوگا۔ اور شاید بادشاہ پر بھی کوئی مصیبت نازل ہو۔ بادشاہ بھی ان واقعات سے بہت مضطرب رہتا تھا۔

اس دم دارتارا کے بعد ہی سوپور میں عظیم آتشزدگی ہوئی جس میں شہر کے علاوہ سرکاری دفاتر اور دریا کا پل بھی نذر آتش ہو گئے۔ ملکۂ کشمیر اور بادشاہ کے بھانجے قیام الدین اور جنید اور مصاحبین کی موت بھی اسی واقعہ کے بعد ہوئی اور ان موتوں نے بادشاہ کو اور بھی غمزدہ اور نحیف کر دیا۔

خراسانی قحط زدگان کشمیر میں

خراسان سے کئی اہل ہنر لوگ کشمیر میں موجود تھے۔ ان کے ذریعے خراسان میں بادشاہ کی فیاضی و رحمدلی کی خبریں پہونچ رہی تھیں۔ نیز بادشاہ خراسان کے ساتھ اس کے تعلقات بھی اچھے تھے۔ ایک دفعہ خراسان میں اس شدت سے قحط پڑا کہ شیخ سعدی کا یہ شعر ؎

چنیں قحط سالے شد اندر دمشق   کہ یاراں فراموش کردند عشق

دمشق کی بجائے خراسان پر صادق آنے لگا۔

خراسانی قحط زدہ فوج در فوج کشمیر میں پناہ ڈہونڈنے کے لئے آنے لگے۔ بادشاہ نے ان سے کیفیت پوچھی۔ تو ان کے نمائندوں نے عرض کیا۔ ہمارے ملک میں اور ملحقہ کئی ممالک میں سخت قحط پڑا ہے۔ لعل و جواہر کوڑیوں کے مول بک چکے ہیں اور بک رہے ہیں۔ بڑے بڑے دولتمند اور خاندانی آدمی بھی ہماری طرح بھیک مانگنے اور ملک بدر ہونے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ آدمی کو آدمی کھا رہا ہے۔ ملک ویران ہو چکا ہے۔ بے شمار مر گئے اور لاتعداد زندہ گور ہیں۔ مرزا ابوسعید بادشاہ خراسان بھی ایک جمعیت لیکر خوراک کی تلاش

میں اپنے ملک سے باہر نکلا اور مجبوراً اپنے دشمن بادشاہ عراق کے ملک میں داخل ہو گیا۔ دونوں میں لڑائی ہوئی۔ گرفتاری کے وقت بلکہ گرفتاری کے بعد بھی اس نے بڑی بہادری دکھائی۔ لیکن آخرکار وہ مارا گیا۔ اور اس کے ساتھ بہت سے ترشک (ترک) بھی ہلاک ہو گئے۔ اے بادشاہ ہم نے آپ کی خیاضی نیکی اور خوشحالی کا حال سنا ہے۔ اور ہم مصیبت کے مارے آپ کی پناہ میں آئے ہیں۔

خرپور لکھتا ہے۔ بادشاہ پر اس تقریر کا بڑا اثر ہوا۔ اس نے مہاجرین خراسان کو خوراک اور رہائش کے اسباب مہیا کئے۔ اور ہر طرح سے ان کی دلجوئی کی۔

اقوام جرائم پیشہ کے ساتھ سلوک

ملک میں ڈوم چوہان اور چند دیگر ایسی اقوام تھیں جنہوں نے ملک میں ادھم مچا رکھا تھا۔ یہ لوگ اکیلے دکیلے مسافر کو لوٹ لیتے تھے۔ اور موقعہ ملتا تو جان سے بھی مار دیتے تھے۔ چوری اور ڈکیتی ان کا پیشہ تھا۔ کہیں خانہ بدوشوں کی طرح رہتے تھے۔ اور کسی جگہ کوئی مکان بھی بنا لیا کرتے تھے۔

بادشاہ نے سخت سزاؤں کے ذریعے ان کا تدارک کیا۔ ان میں جو نامی چور اور ڈاکو تھے۔ ان کو دائم الحبس کر کے بیڑیاں پہنا دیں۔

بادشاہ نے یہ بھی محسوس کیا۔ کہ یہ آوارہ گرد اور پس افتادہ اقوام کے لوگ کچھ تو عادتاً کچھ غربت کی وجہ سے جرائم کرتے رہتے ہیں۔ اگر ان کی غربت دور کرنے کا علاج سوچا جائے۔ اور وعظ و نصیحت سے ان کی عادت ثانیہ کو بتدریج تبدیل کیا جائے۔ تو ممکن ہے ان کی اصلاح بھی ہو جائے۔ اور عوام کو بھی ان کی لوٹ مار سے نجات مل جائے۔

چنانچہ بادشاہ نے ان جرائم پیشہ اقوام کو اراضیات کاشت کے لئے مفت عطا کیں اور دیگر ضروریات زندگی کے لئے بھی کچھ نقد و جنس عطا کیا۔

ہرچند شریور نے اپنی زینیہ راج ترنگنی میں واضح طور پر اس بات کا کہیں ذکر نہیں کیا کہ بادشاہ نے مذہبی عالموں کے ذریعے بھی ان کے اخلاق درست کئے ہوں لیکن جو بادشاہ اپنی رعایا کے فلاح و بہبود اور امن عامہ اور درستی اخلاق کے لئے نیم سرکاری واعظوں کا تقرر منظور کرتا ہے۔ وہ مفسد اور لٹیری اقوام کے اخلاق کی درستی سے کب غافل رہ سکتا ہے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر بادشاہ نے ان اقوام سے اخلاق و اطوار کے لئے کچھ واعظ بھی مقرر کئے ہوں۔

صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں۔ اس کے عہد میں جہاں کہیں چوری کا واقعہ ہوتا۔ مال اسباب کا نقصان اس موضع کے باشندوں سے وصول کر لیا جاتا۔ اس طریق سے اس کے زمانہ میں چوری عنقا ہو گئی تھی۔ صاحب جنبیر التواریخ بھی اس کی تائید کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ جہاں کہیں چوری کی خبر سنی جاتی۔ شہر کے رئیس اور علاقے کے کوتوال سے مال مسروقہ کی قیمت وصول کی جاتی اور یہ رقم جو اس زمانہ میں تاوان کے نام سے موسوم تھی۔ اس شخص کو بہ افذ رسید دی جاتی جس کا مال چوری ہو جاتا حقیقت یہ ہے کہ یہ بات بادشاہ کے ذہن نشین ہو گئی تھی۔ کہ علاقہ میں جو لوگ صاحب اثر ہوتے ہیں چوریاں اُن کے ایما سے ہوتی ہیں۔ اور وہ ان میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ اس لئے اس نے چوروں کو سزا دینے کے علاوہ دیہات کے ذمہ دار لوگوں پر بھی مال مسروقہ کا تاوان ڈال رکھا تھا۔ شریور لکھتا ہے اس بادشاہ کے عہد میں مسافر جنگلوں میں اس طرح پاؤں پسار کر سوتے تھے۔ جیسے وہ اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر ہی سو رہے ہیں۔

جیل خانہ میں اصلاحات

اقوام جرائم پیشہ کے لئے تو بادشاہ نے مفت اراضیات کا انتظام کیا۔ لیکن جو عام قیدی زندان خانوں میں آتے تھے۔ اور جو چوری مارپیٹ اور بعض دیگر

جرائم کے مرتکب ہوتے تھے۔ ان کو بادشاہی تعمیرات میں مزدوری پر لگا دیا جاتا تھا کشمیر میں بادشاہی تعمیرات کی جو کثرت ہے۔ اور شہر کے علاوہ مراز و کمراز کے علاقہ میں بادشاہ کے حکم سے جو باغات بنائے گئے اور بستیاں آباد کی گئیں نہروں کا اجرا کیا گیا۔ اور دریا کے ستھو تعمیر کئے گئے۔ ان میں عام مزدوروں کے علاوہ قیدی مزدور بھی کام کیا کرتے تھے۔ اور جب وہ جیل سے باہر نکلا کرتے تھے۔ تو ان کے دل و دماغ بہت کچھ اصلاح یافتہ ہوتے تھے۔

مذہبی ایدیشکوں اور واعظوں کا امتحان

بادشاہ کے باپ شاہ سکندر بت شکن اور بادشاہ کے بھائی علی شاہ بادشاہ کشمیر کے عہد میں چونکہ نو مسلم وزیر ملک سیف الدین کو ہندوؤں سے اور ہندوؤں کو اس سے نفرت تھی۔ اس لئے ان دونوں بادشاہوں کے زمانے میں ہندو اطمینان کا کوئی سانس نہ لے سکے۔ مذہبی تکرار اور بحث مباحثہ کی وجہ سے ان میں اکثر بدمزگی بھی ہو جایا کرتی تھی۔ بڈشاہ کے زمانے میں جب ہندوؤں کو از سر نو عروج حاصل ہوا اور بڈشاہ نے ملکی مصلحتوں اور اقلیت کے تالیف قلوب کے خیال سے جب ان کو ان تمام ٹیکسوں اور پابندیوں سے آزاد کر دیا۔ جو گزشتہ بادشاہوں کے زمانہ میں ان کے لئے مصیبت کا باعث تھیں۔ تو معلوم ہوتا ہے مسلمانوں اور ہندوؤں میں کچھ نہ کچھ پھر چپقلش ہونے لگی۔ شریور لکھتا ہے کہ جب بادشاہ نے ہندو مردوں کے جلائے جانے اور ان کے ماتمی مراسم کی ادائیگی کا ٹیکس معاف کر دیا۔ تو مسلمانوں نے اس پر اپنی ناخوشی کا اظہار کیا۔ چونکہ مذہبی اشتعال ایدیشکوں اور واعظوں کے ذریعہ ہی کسی قوم میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ انہی باتوں سے متاثر ہو کر بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ کسی مذہب کا کوئی واعظ یا عالم اس وقت تک وعظ

کرنے یا لیکچر دینے کا مجاز نہیں ہے۔ جب تک وہ وعظ خوانی کی سرکاری سند نہ حاصل کرلے۔ شرلویر لکھتا ہے۔ ان مذہبی عالموں کا باقاعدہ امتحان لیا جاتا تھا اور بعض اوقات بادشاہ خود بھی امتحان لیتا تھا جسے مذہبی تعلیم میں صبر و ضبط میں اور رفاہ امن عامہ میں کامل دماہر دیکھتا تھا۔ اس کو وعظ خوانی کی اجازت دیتا تھا۔

جب مذہبی عالموں کا باقاعدہ امتحان ہوتا تھا۔ تو یقیناً ان کے لئے کوئی باقاعدہ درسگاہ بھی ہوگی۔ جہاں ہندو مسلمان علیحدہ علیحدہ لینے اپنے مذاہب کی واقفیت حاصل کرتے ہونگے۔ بلکہ ممکن ہے ہندو مسلمانوں کی مذہبی کتابوں سے اور مسلمان ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے بھی واقفیت رکھتے ہوں۔

بادشاہ کا محکمہ خفیہ پولیس

حکومتوں اور سلطنتوں میں خفیہ پولیس کا رواج زمانہ دراز سے چلا آتا ہے۔ اس محکمہ کے ذریعے بادشاہوں کو اپنی رعایا کے صحیح صحیح حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ جو حاکم یا افسر رعایا پر ظلم کرتا ہے یا رشوت لیتا ہے اس کی اطلاع بادشاہ کو مل جاتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ اس محکمہ کے افسر اور اہلکار نہایت متدین صادق اور خیر خواہ رئیس و رعیت ہونے چاہئیں ورنہ بصورت دیگر اس محکمہ کے ہاتھوں رعایا کی تباہی ہوجاتی ہے اور مملکتوں کی طرح بڈشاہ نے بھی اپنی مملکت میں خفیہ پولیس کا ایک محکمہ قائم کر رکھا تھا۔ اس محکمہ کے اہلکار جو درحقیقت شاہی جاسوس اور پرچہ نویس تھے تمام ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس محکمہ کے فرائض ان ایام میں غالباً اس قسم کے تھے۔

(۱) سخت گیر حکام اور رشوت خوار افسروں کے متعلق رپورٹ کرنا۔

(۲) ملک میں بدامنی کی وجوہات صحیح طور پر دریافت کرکے اطلاع دینا۔
(۳) غافل آرام طلب اور عیش پرست حکام کے حالات لکھنا۔
(۴) دورہ کے ایام میں حکام کا طرزِ عمل رعایا کے ساتھ کیا ہوتا ہے اس کی نگرانی کرنا۔
(۵) زمینداروں کی واجب اور جائز شکایات معلوم کرنا۔
(۶) باغیوں اور سرکشوں کی حرکات سے مقامی حکام اور مرکزی حکومت کو اطلاع دینا وغیرہ وغیرہ۔

اس طریق سے بادشاہ کو اپنی رعایا اور اپنے ماتحت حکام کے حالات سے کامل واقفیت رہتی تھی۔ اور وہ توجہ طلب امور کا تدارک بھی کرتا تھا۔

صلحار علمار کا احترام

بادشاہ ہر چند ہندوؤں پر حد سے زیادہ مہربان تھا اور برہمنوں کی خاص طور پر قدر افزائی کیا کرتا تھا لیکن وہ اپنے مذہب کے صلحار علمار اور صوفیائے عظام کے اعزاز و مناصب سے بھی غافل نہ تھا۔ ان کا بیحد احترام کرتا تھا۔ مذہبی معاملات میں ان سے مشورے لیتا تھا۔ اور ان کی باتوں پر عمل بھی کرتا تھا۔ علمائے کرام کے لئے مساجد۔ مدارس اور خانقاہیں تعمیر کراتا تھا۔ اور اکثر اوقات خود بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ زونراج لکھتا ہے۔ چونکہ بادشاہ اپنے صلحار و علمار سے تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آتا تھا۔ اس کی تقلید میں راجہ مدر دلش اور دوسرے کئی راجے اور رئیس کتول کی طرح اولیا و صوفیار کی خدمت میں حاضر رہا کرتے تھے۔

ف زینہ ترنگنی مصنفہ زونراج کا ترجمہ از۔ جے سی دت کلکتہ ۱۸۹۸ء صفحہ ۹۔ یہ الفاظ بہت سخت ہیں۔ مترجم ان سے بہتر الفاظ میں بھی اپنا مطلب ادا کر سکتا تھا۔

جس طرح بادشاہ مسلمان صلحاء سے مذہبی معلومات حاصل کیا کرتا تھا اسی طرح نیلہ مت پران اور دوسرے ہندو شاستروں کو پنڈتوں سے سُنا کرتا تھا۔

بادشاہ کی ایک خواہش

(سُریور لکھتا ہے بادشاہ کی ایک خواہش بڑی زبردست تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جو باتیں بادشاہ اپنی رعایا کے لئے نہیں کر سکے۔ وہ میرے ہاتھوں سے پوری ہوں۔ بلکہ آئندہ بادشاہوں کے لئے میں جہانداری اور جہانگری کے وہ آئین و قوانین بنا جاؤں۔ جن سے ان کے نام ہمیشہ رعایا کے لوح دل اور تاریخوں کے سنہری اوراق پر منقوش رہیں۔

ہر چند کہ اس کے ناخلف فرزندوں نے نت نئے لڑائی جھگڑوں سے اس کو ہمیشہ آزردہ اور پریشان رکھا اور اس کا بہت سا وقت اور خزانہ جو رعایا کی فلاح میں صرف ہو سکتا تھا۔ خانہ جنگیوں کی روک تھام میں صرف ہو گیا۔ تاہم بادشاہ نے اپنے عہد حکومت میں رعایا کے لئے جو کچھ بھی کیا۔ وہ بھی اس کے بعد کے آنے والے بادشاہوں کے لئے ایک سبق اور نمونہ ہے۔

وہ گذشتہ بادشاہوں کے حالات بڑے شوق سے سنتا ان کی بُری باتوں کو نظر انداز کر دیتا۔ اور ان میں جو اچھی باتیں ہوتیں وہ ذہن نشین کرنے آویزۂ گوش بنا لیتا اور خذ ما صفا ودع ما کدر پر صحیح عمل کرتا۔

ایک خاص لباس کا حکم

کشمیر میں عام طور پر مشہور ہے۔ کہ پھرن اور کانگڑی بڈشاہ کی ایجاد ہے اور یہ دونوں چیزیں اس نے اس لئے ایجاد کیں کہ رعایا جو باغی اور سرکش رہتی ہے وہ سست اور آرام طلب ہو جائے

بڈشاہ کے طویل عہد حکومت میں اس کی رعایا کے باغی یا سرکش ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ اس کے فرزند باغی اور سرکش ضرور ہو جایا کرتے تھے۔ بلکہ رعایا کا کثیر حصہ اس کے فرزندوں کی حرکات سے نالاں رہتا تھا اس لئے رعایا کے سرکش یا باغی ہونے اور پھرن اور کانگڑی کی ایجاد سے اس کے سست اور آرام طلب کئے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اہل کشمیر کا اصل لباس تنگ پاجامہ اور انگرکھا ہوتا تھا۔ بال لمبے لمبے ہوتے تھے۔ داڑھی منڈانے کا رواج نہ ہندوؤں میں تھا نہ مسلمانوں میں جب سلطان قطب الدین کے زمانہ میں حضرت سید علی ہمدانی تشریف لائے تو انہوں نے مسلمانوں کے لئے عربی قسم کا جبہ و عمامہ پسند کیا۔ اور اسی کا رواج عام ہو گیا۔ جیسا کہ صاحب واقعات کشمیر خواجہ محمد اعظم لکھتے ہیں "احکام اسلام و شریعت ہنوز بخوبی شائع شدہ نبود۔ وسلطان ہم لباس قوم کفرہ مے پوشید آں را بہ امر و نہی حضرت سید ترک داد و اُمرا آنحضرت را سلطان بہ دل و جان بجا آورد"۔ چونکہ بادشاہ نے بھی یہی لباس اختیار کر لیا تھا اس لئے الناس علی دین ملوکہم کے مطابق ہندوؤں نے بھی یہی لباس پہننا شروع کر دیا۔ جس نے رفتہ رفتہ موجودہ پھرن (پیراہن) کی شکل اختیار کر لی۔

بڈشاہ کے زمانہ میں بھی یہی لباس تھا مگر شر لیور لکھتا ہے کہ بادشاہ نے ملک کے لئے ایک خاص لباس مقرر کیا۔ لیکن اس نے اس خاص لباس کی تشریح نہیں کی۔ یہ پھرن تو جبہ کی صورت میں اس سے پہلے ہی رائج ہو چکا تھا۔ پھر وہ خاص لباس کون سا لباس تھا۔ چونکہ اس کے ساتھ ہی شر لیور نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے فوج میں اس قسم کی سپرٹ پیدا کر دی اور ایسا

نظام قائم کر دیا۔ کہ بیرونی حملہ آوروں کے لئے کشمیر میں داخل ہونا ناممکن ہو گیا۔ ان سطور سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے جو خاص لباس مقرر کیا تھا۔ وہ سارے ملک میں نہیں تھا بلکہ صرف فوج کے لئے تھا۔ اس لئے کہ پھرن سے فوجی سپرٹ پیدا نہیں ہوتی۔ فوجی سپرٹ ہمیشہ چست اور تنگ لباس سے ہوا کرتی ہے۔

بازیگروں کا تماشہ

اس بادشاہ کے زمانے میں اترپتھ (uttarapatha) کے مقام سے کچھ بازیگر[1] آئے۔ بادشاہ بیگمات سمیت ومیش پرست (vimshaprastha) مقام پر ان کے کمالات دیکھنے کے لئے آیا۔ بازیگروں نے ایک لمبی رسی کو لکڑی کے دو مضبوط ڈنڈوں کے ساتھ جن کا باہمی فاصلہ ایک سو کمان کے قریب تھا باندھا اور ایک رسی کے ذریعہ جو لٹک رہی تھی۔ وہ ایک جانور کی طرح دوڑتا ہوا چڑھ گیا۔ اور پھر اس لمبی رسی پر جو دو ڈنڈوں کے درمیان تھی اس طرح چلنے لگا جس طرح کوئی زمین پر چلتا ہے۔

رشوت کا انسداد

(ملک میں بہت عرصہ سے رشوت کی گرم بازاری تھی۔ عدالتوں کے لوگ کیا جج اور کیا اہلکار رشوت کو شیر مادر سمجھ کر بے ڈکار ہضم کیا کرتے تھے۔ بادشاہ نے راشیوں کے لئے سخت سے سخت سزائیں مقرر کیں۔ اور جس افسر کے متعلق رشوت گیری کا الزام پایہ ثبوت تک پہنچ گیا۔ اس کے عہدہ یا منصب کا لحاظ کئے بغیر اس کو پوری سزا دی۔)

بادشاہ کی روحانیت

بادشاہ کی صفائی قلب اور اس کی روحانیت کا ذکر کرتے ہوئے شریور لکھتا ہے

---

[1] جہانگیر نے بھی اپنی توزک میں اپنے زمانہ کے بازیگروں کے تماشہ کا ذکر کیا ہے۔

جو خودغرض اور فتنہ پرداز وزرا اور اہل اقتدار لوگ بادشاہ کے فرزندوں کو کبھی بادشاہ کے ساتھ لڑا دیا کرتے تھے۔ اور کبھی شہزادوں کی باہمی خانہ جنگیوں سے ذاتی فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ کئی روحانی و جسمانی تکلیفوں کے بعد ایک ہی سال میں ختم ہو گئے۔ بادشاہ نے ایک مرتبہ ایسے لوگوں کے متعلق صاف طور پر کہہ دیا تھا۔ کہ یہ وزرا اور درباری جو میرے فرزندوں کو میرا نافرمان بنا کر ملک کو بدامنی کے غار میں دھکیل رہے ہیں۔ اور اپنی خودغرضیوں کی وجہ سے مجھ کو صدمہ پہنچا رہے ہیں۔ وہ اپنی اندرونی خباثتوں کی وجہ سے اب زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور میں اپنی زندگی ہی میں ان کی موت کی خبر سنوں گا۔ شرلور لکھتا ہے۔ بادشاہ کی دلی پاکیزگی اور روحانیت اور اس کی نیک نیتی ہی کا یہ اثر تھا کہ فتنہ پرداز ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے رخصت ہو گئے۔

جہانگیر نے اپنی توزک اور مولانا نظام الدین احمد نے طبقات اکبری اور محمد قاسم فرشتہ نے تاریخ فرشتہ میں اور کشمیر کے ہندو مسلمان مورخوں نے اپنی تصانیف میں اس کی بعض خوارق عادات کا بھی ذکر کیا ہے۔

حرمت ماہ رمضان

آج کتنے مسلمان ہیں۔ جو رمضان کے مہینے میں گوشت سے قطعی پرہیز کرتے اور ہر قسم کے عیش و عشرت سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں؟ بادشاہ اس مبارک مہینے کے احترام میں سدا مہینہ گوشت ترک کر دیتا تھا۔ اور ہر قسم کی لذات دنیوی سے پرہیز اختیار کر لیتا تھا۔ اس سے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ حرمت ماہ رمضان کے لئے اور کیا کچھ نہ کرتا ہوگا۔ افطاری کا انتظام بادشاہ کی طرف سے کس اہتمام سے ہوتا ہوگا۔ نوشہرہ کی شاہی مسجد میں بادشاہ کس ذوق و شوق سے آتا ہوگا۔

اور پھر عید کا جلوس کس شان شوکت اور کس جاہ و جلال سے نکلتا ہوگا۔ اس کا اندازہ پھولوں کے تہوار سے ہو سکتا ہے۔

شفا خانے اور دائیاں

شبوبٹ نہ صرف اعلیٰ درباری طبیب ہی تھا بلکہ اس کو اس زمانہ کا ڈائرکٹر میڈیکل سروسز سمجھنا چاہیے۔ بادشاہ نے جو شفا خانے تیار کر لئے تھے وہ سب اسی کی زیر نگرانی تھے۔ بادشاہ نے بہت سی طبی کتب بھی ہندی اور سنسکرت سے عربی اور فارسی میں ترجمہ کرائیں۔

اس زمانے میں جبکہ ہندوستان میں عام شفا خانوں اور رفاہ عام کے کاموں کا بادشاہوں کو بہت کم خیال تھا۔ بڈشاہ نے ہمدردئی نسواں کا عملی ثبوت دیا۔ اور گو زنانہ شفاخانوں کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن اس قدر پتہ چلتا ہے کہ اس نے سرکاری طور پر سرکاری اور غیر سرکاری تربیت یافتہ دائیوں کا ضرور انتظام کر رکھا تھا۔ چنانچہ خواجہ محمد اعظم تاریخ اعظمی میں لکھتے ہیں۔

"از ارباب صنائع راشل کاغذ گر وصحاف وقابلہ ہاے وزین ساز و قابلہ ہا کہ وقت وضع حمل خدمت عورت بکنند یا خود بہ کشمیر آوردیلہ"

زینہ جامہ

بادشاہ نے اپنے عہد میں زینہ گیر کو آبادی و آبپاشی و باغات وایوانات کی کثرت سے نمونہ خلد بنا رکھا تھا۔ اس زمانہ میں یہاں پٹو سازوں کی بھی کثرت تھی۔ اور تمام کشمیر میں زینہ گیری پٹو سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔

زینہ گیری پٹو کو اس زمانہ میں زین العابدین کے نام کی رعایت سے

لہ باخود آوردہ اس سے لکھا ہے کہ مصنف تاریخ اعظمی کے خیال میں شاہان سب کو سمرقند سے کشمیر لایا تھا حالانکہ واقعات سے ثابت ہے کہ وہ سمرقند گیا ہی نہیں دایہ عورتوں کا انتظام کشمیر ہی میں ہوا۔

زینہ جامہ کہتے تھے۔ خواجہ محمد اعظم اسی پٹو کے متعلق لکھتا ہے "آں را در عرف آں وقت زینہ جامہ مے گفتند"

کشمیر میں لباس کی تبدیلی ۵۷۸۳ھ سے شروع ہوئی۔ جبکہ امیر کبیر سید علی ہمدانی تیسری مرتبہ کشمیر آئے۔ اور سلطان قطب الدین کو کشمیر کے قدیم لباس سے جو تنگ اور چست ہوتا تھا منع کیا اور عرب کا لباس ایک لمبا کرتہ جس کو اب ہم پھرن کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ پہننے کا مشورہ دیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ کہ زینہ جامہ پھرن ہی تھا۔ یا پھرن نما کوئی لباس تھا۔

پولیس چوکیاں

گو کشمیر کے پہاڑوں نے کشمیر کی وادی کو چاروں طرف سے محفوظ رکھنے میں بہت مدد دی ہے۔ لیکن ملک کی زیادہ حفاظت کے لئے کوہستانی دروں پر زمانہ قدیم ہی سے چوکیوں کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ یہ چوکیاں عموماً قلعہ یا گڑھی کی صورت میں ہوتی تھیں۔ جن میں فوج اور پولیس کی کچھ تعداد رہا کرتی تھی۔ جو اس بات کی ذمہ دار ہوتی تھی۔ کہ کوئی شخص بلا اجازت یا بلا پروانہ راہداری نہ ملک سے باہر جا سکے نہ اندر آ سکے۔ چنانچہ جب راجہ سسل کا قاتل اتپل "پنتیان ناد" کی طرف سے جس کا موجودہ نام پشیان ہے کشمیر میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ تو ہور پور[۲] کی چوکی کے محافظوں نے اس کو گرفتار کر لیا

[۱] صالحہ ماجی بیگم سلطان محمد شاہ نے خانقاہ معلی کی مرمت دستیر کے اختتام پر معماروں تجاروں کو پنجہزار کلہ پوش (ٹوپیاں) پٹو کے علاوہ بارہ سو زینہ جامہ بھی انعام میں دیئے تھے۔ تاریخ اعظمی ۶۷ ۔

[۲] اس کا قدیم نام سورپور ہے۔ راجہ ادتی ورمن کے وزیر سور نے اسے نویں صدی عیسوی میں آباد کیا تھا۔ اکبر کے زمانے میں اس کا نام ہورپور یا ہیرہ پور تھا۔ اب بھی یہی نام ہے۔

پولیس اور فوج کی ذمہ داریاں علیحدہ علیحدہ بھی تھیں۔ پولیس تو انتظام کو برقرار رکھتی۔ اور پروانہ راہداری دیکھتی تھی۔ اور فوج پہاڑی شورہ پشتوں سے میدانی لوگوں کو محفوظ رکھتی تھی۔ قدیم ہندو زمانے میں ان تمام سرحدی مقامات کے اختیارات ایک اعلیٰ سرکاری افسر کے سپرد ہوتے تھے جسے دوار پتی یا اسی قسم کے کسی اور نام سے مخاطب کیا جاتا تھا۔

اس طریق کا حوالہ عہد بڈشاہی کے نامور مورخ پنڈت زونراج نے بھی دیا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے۔ کہ پروانہ راہداری کے سلسلہ میں بڈشاہ کے زمانہ میں بھی اس کے سخت احکام کے باوجود عہد قدیم کا جبر و تشدد قائم تھا۔ اور پولیس لوگوں سے جبریہ رقمیں وصول کر کے ان کو ملک سے باہر جانے یا اندر آنے کی اجازت دیتی تھی۔

ہوپورہ کی چوکی میں لنگرخانہ اور حمالوں کی بستی

انقلاب حکومت و مذہب کی وجہ سے ہیرہ پور یا ہورپور کی چوکی کی پہلی شان قائم نہ رہی تھی۔ زین العابدین نے اس تجارتی راستہ کی اہمیت برقرار رکھنے کے لئے یہاں مسافروں کے لئے ایک لنگرخانہ جاری کیا اور علاقہ ابھیار (موجودہ نام بھمبر) کی طرف سے حمال اور قلی لا کر یہاں آباد کئے۔ چنانچہ ہیرہ پور۔ پشیان یا پشیانہ اور درہ پیر پنجال کے قریب اب بھی پیشہ ور حمال اور قلی بکثرت پائے جاتے ہیں۔

گراں فروش غلہ داروں کے لئے بادشاہ کے احکام

سوداگروں کا قاعدہ تھا۔ کہ جو مال وہ دیہات و مفصلات یا بیرون کشمیر سے لایا کرتے تھے۔ اس کو گراں قیمت پر بیچنے کے لئے چھپا رکھتے۔ تجارت

؎ راج ترنگنی شریور ترنگ ۱ شلوک ۲۰ بحوالہ اردو ترجمہ راج ترنگنی کلہن

کے متعلق اسلام نے جو احکام دے رکھے ہیں۔ بادشاہ ان سے بے علم نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رسول خدا صلعم کا ارشاد ہے۔ کہ جو شخص غلہ لاکر بہ نرخ حال بیچتا ہے۔ خدا اس کی روزی میں برکت دیتا ہے۔ اور جو شخص گرانی کی خاطر غلہ کو روک کے رکھتا ہے۔ وہ رضائے حق سے دور کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے بادشاہ نے نہایت سختی سے سوداگروں کے نام احکام جاری کئے۔ کہ جو شخص اپنا مال گراں بیچنے کے لئے پوشیدہ رکھتا ہے۔ اور زیادہ منافع لگا کر قحط اور گرانی کا موجب ہوتا ہے۔ وہ سرکار کا مجرم ہے۔ کوئی شخص اپنا فروختنی مال پوشیدہ نہ رکھے۔ بلکہ بہت کم منافع پر فروخت کیا کرے لے

بادشاہ کی دریائی سیر و سیاحت

بادشاہ بالعموم سیر و سیاحت میں رہتا۔ میدانی سیر کی طرح وہ دریائی تفریحات کا بھی عاشق تھا اور بلند و رفیع پہاڑوں پر بھی جہاں وسیع و عمیق چشمے ہوتے تھے۔ وہ کشتی کی سیر کیا کرتا تھا۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے۔ کہ اس کے زمانہ میں کس قسم کی کشتیاں اس ملک میں رائج تھیں۔ ایک قسم لہ ناؤ کہلاتی تھی۔ اس کو آجکل کا ہوس بوٹ سمجھنا چاہئے۔ اس کا طول ۳۰ سے ۴۰ گز اور عرض ۴ سے پانچ گز ہوتا تھا۔ اس کشتی کے درمیان اس کی نوکدار سمت جو سطح آب سے بہت اونچی رہتی تھی۔ ایک قدآدم آشیانہ یعنی سقف بنایا جاتا تھا۔ جس کو حکام و سلاطین کے لئے سجایا جاتا۔ اس کے ہر دو جانب چالیس پچاس ملاح بیٹھتے۔ اور اس ہوس بوٹ کو اس طرح چلاتے۔ کہ وہ پانی پر چلتا نہیں۔ بلکہ دوڑتا نظر آتا۔ اس قسم کی کشتی دریا۔ ڈل اور ولر کے سوا اور کہیں استعمال نہ ہو سکتی تھی۔

لے طبقات اکبری مطبوعہ و جیز التواریخ غیر مطبوعہ

کشتی کی دوسری قسم پرندہ کہلاتی تھی۔ اس کا طول ۲۰ سے ۳۰ گز اور عرض چار گز تک ہوتا۔ اس کی نوک پر ایک مربع بنگلہ تیار کیا جاتا۔ جس میں حکام و سلاطین نشست فرماتے۔ لرہ ناؤ اور پرندہ یہ دونوں قسم کی کشتیاں بادشاہ اور حکام کے لئے مخصوص تھیں۔

چشمہ کوثر ناگ میں بڈشاہی کشتی

شہ پیاں کے بلند پہاڑ پر یہ مشہور و معروف چشمہ واقع ہے۔ اس کا دور تین چار میل تک بتایا جاتا ہے۔ اور شکل اس کی کف پا سے مشابہت رکھتی ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ یہاں وشن جی بیٹھے تھے۔ ان کے پاؤں سے یہ چشمہ پھوٹ نکلا۔ اس کا پانی ہمیشہ نیلگوں رہتا ہے۔ اور اس کے عین درمیان برف کے ٹکڑے نظر آتے ہیں۔ اس کی بلندی سطح سمندر سے ۰۵۵۳۰ فٹ بیان کی جاتی ہے۔

بادشاہ نیرنگئی فطرت اور نظارہ ہائے قدرت کا عاشق تھا۔ وہ اس بلند مقام پر پہنچتا اور مرغزار و چشمہ سار کے لطف اٹھاتا تھا۔ کوثر ناگ میں سیر کے لئے اس نے چوب صندل کی ایک خوش نما کشتی بنا رکھی تھی۔ جو ہمیشہ اسی چشمہ پر رہا کرتی تھی۔

زونراج مصنف زینہ ترنگنی نے کوثر ناگ میں بڈشاہی سیر کے ایک دن کی کیفیت لکھی ہے۔ وہ خود بھی اس سیر میں شامل تھا۔ وہ لکھتا

لے اس قسم کے پرندہ پر اب بھی مہاراجہ سر ہری سنگھ بہادر کی سالگرہ کا جلوس نکلتا ہے۔ پرندہ کا رنگ عموماً زرد ہوتا ہے۔ اور ہانجیوں (ملاحوں) کی وردی بھی زرد رنگ کی ہوتی ہے۔ شاہی پرندہ کے تیس چالیس ہانجی پرندہ کو واقعی پرندہ بنا کر آب رواں کی چادر پر اڑائے لئے جاتے ہیں۔

ہے۔ برتھم۔ وشنو اور مہادیو کی پہاڑیوں سے پانی زور سے نکل رہا تھا۔ بادشاہ بج بہارہ سے کوثر ناگ کی طرف بڑھا۔ اور تین دن میں "ڈرمرگ" تک پہنچا۔

اس سفر میں بادشاہ کے ہمراہ چھ ہجیوں کے علاوہ شہزادہ حاجی خاں اور شہزادہ بہرام خاں اور میرے علاوہ سمہ بٹ بھی موجود تھا۔ جب ہم پہاڑ کے اوپر پہنچے۔ تو ہم نے سارے پہاڑ کو کستوری کے پھولوں سے لہلہاتے دیکھا۔ اور جہاں تک نظر جاتی تھی۔ اس پہاڑ کو گلریز پایا۔ بادشاہ کشتی میں سوار ہوا۔ ہم سب اس کے ہمراہ تھے۔ ہم نے بادشاہ کو کشتی ہی میں گودند گیت سُنا کر محظوظ کیا۔ ہمارے گانے کی آواز جھیل کے اس سنسان اور خاموش عالم میں گونج رہی تھی۔ ہم نے اس جھیل میں تین دفعہ چکر لگائے۔ اور خوب لطف اُٹھایا۔ آخر ہم نے کشتی کو لوبندن پہاڑی کے ساتھ لگا دیا۔ اور بادشاہ نے کشتی سے اتر کر پہاڑی کی اس چھوٹی سی جھیل سے جو سمکار کے نام سے مشہور تھی۔ پانی پیا۔ ہم سب تھوڑی دیر تک جھیل کے کنارے بیٹھے رہے۔ پھر برفباری شروع ہو گئی۔ اور جس راستہ ہم آئے تھے۔ اسی راستہ واپس چلے گئے۔

صاحب تاریخ حسن بھی بادشاہ کی سیر کوثر ناگ[۲] کا ذکر کرتے ہوئے

[۱] معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں کوثر ناگ تک جانے کے لئے بج بہارہ سے "ورمرگ" کی طرف جاتے تھے۔ اب راستہ شوپیاں سے جاتا ہے۔ اور اس زمانہ کی نسبت بہت آسان ہے۔

[۲] مصنف تاریخ حسن نے کوثر ناگ کے ایک ہولناک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ جو اس کا چشم دید ہے۔ اور چونکہ یہ واقعہ بھی اپنی نوعیت (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۲)

لکھتے ہیں "اکثر اوقات در عین کوثر ناگ بہ سوارئ سفینہ یکے از
بندگان آں زماں کہ مربی او بود۔ ہمراہ گرفتہ در مطالعہ و مزاولہ تصانیف
و لطائف و بحث دقائق و نکات آں اوقات خود در سیر چشمہ مصروف
میداشت"۔

بادشاہ کی علم دوستی کی انتہا یہ ہے۔ کہ سیر و تفریح کے اوقات کو
بھی بعض اوقات مطالعہ و علمی مباحثہ میں صرف کرتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۲) میں عجیب قسم کا ہے۔ اس لئے درج کیا جاتا
ہے۔ وہ لکھتا ہے میں ایک مرتبہ چند احباب کے ہمراہ اس چشمہ پر گیا۔ ایک
ہمراہی نے اس میں نہانا شروع کیا۔ تھوڑا سا تیرنے کے بعد وہ باہر آنے
لگا۔ ابھی وہ پانی کے اندر ہی تھا۔ کہ اس نے شور مچانا شروع کیا۔ ہم
اس کا ہاتھ پکڑ کر کشاں کشاں اس کو ساحل پر لائے۔ دیکھا کہ ایک جانور نے
جو دو گز لمبا اور سر کی جانب سے آٹھ گرہ چوڑا ہے۔ اس کے دونوں پاؤں
کو منہ میں ڈالا ہوا ہے۔ ہم نے اپنے ساتھی کو اس خونخوار سے چھڑانے کے
لئے سنگ و چوب و تبر سے کچھ کام لیا۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔
یہاں تک کہ ہمارا رفیق زانو تک اس کے منہ میں چلا گیا۔ جب ہم نے کوئی
تدبیر اس سے چھٹکارے کی نہ پائی۔ تو اس کے سر پر لکڑیاں رکھکر ان کو
جلانا شروع کر دیا۔ جب آگ زیادہ بھڑکی۔ تو بندوق و توپ کی
سی آواز نکلی۔ اور ساتھ ہی وہ جانور ہمارے رفیق کو لئے ہوئے ہوا میں
اچھلا اور دریا میں جا پڑا۔ "آں اجل رسیدہ طعمۂ خود نمود" مصنف
مذکور لکھتے ہیں۔ اس جانور کا پوست دانہ دار تھا (بقیہ دیکھو حاشیہ صفحہ ۴۵۴ پر)

ہرمکھ گنگا میں بادشاہ کی دریائی سیر

کوہ ہرمکھ کے دامن میں بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر قریب ½ میل لمبا اور دو سو پچاس گز چوڑا چشمہ ہے۔ کشمیر کے ہندو اسے ہردوار کے برابر مقدس خیال کرتے ہیں۔ ہر سال ماہ اگست میں یہاں میلہ ہوتا ہے۔ جس میں ہزاروں ہندو جمع ہوتے ہیں دریائے گنگا کی طرح اس میں بھی مردوں کی سوختہ ہڈیاں یعنی پھول ڈالے جاتے ہیں۔ گرمیوں کے ایک دو مہینوں کے سوا یہاں بھی کوثر ناگ کی طرح ہمیشہ برف جمی رہتی ہے۔

اس وسیع و عریض چشمہ کو گنگا بل بھی کہتے ہیں۔ بادشاہی کشتیاں یہاں بھی موجود رہتی تھیں۔ جب کبھی بادشاہ آتا اور ہرنا بستان میں ضرور آتا۔ تو وہ اس آسمانی تالاب میں جو قلۂ کوہ پر قدرت نے پیدا کر رکھا تھا۔ کشتیاں ڈالتا۔ اس کے قدیم مصاحب اس کے ہمراہ ہوتے۔ اور وہ سب دریائی تفریحات سے اپنے دلوں کو بہلاتے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۳) تھا۔ اور اس پر چوب و تبر کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اس چشمہ کا پانی اپنے منبع سے نکل کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ جنوبی حصہ کا پانی دریائے چندر بھاگا (چناب) میں اور دوسرے حصہ کا پانی کشمیر کی طرف آجاتا ہے۔ اس چشمہ کی گہرائی بحساب اوسط دو سو گز عمیق بتائی جاتی ہے۔

ڈل اور وُلر کی سیر

ڈل میں سونہ لنک اور وُلر میں زینہ لنک اس کی یادگاریں اب تک کسی نہ کسی صورت میں موجود چلی آتی ہیں۔ جب وہ دریا اور دریا سے ڈل اور ولر کی طرف نکل جاتا۔ تو اپنے لنکوں میں اقامت گزین ہوتا۔ اور وہاں مختصر سے مصاحبوں کا جو اس کے ہمراہ ہوتے۔ ایک چھوٹا سا دربار منعقد کرتا۔ کبھی امور ملکی پر تبادلہ خیالات کرتا۔ کبھی مذہبی نکات کی موشگافیوں میں اپنا وقت صرف کرتا۔ اور کبھی سیر و تفریح میں اپنا دل بہلاتا۔

خاتمہ کتاب اور ضمیمے

راقم نے تاریخ ہذا کے "پیش لفظ" میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ کہ آج کی تحقیق کل کی ترقی اور زمانہ آیندہ کے علمی و تاریخی انکشافات کے معیار پر پوری نہیں اتر سکتی۔ چنانچہ تاریخ ہذا میں کئی قصبوں اور گاؤں کے نام ایسے آگئے ہیں۔ جن کے موجودہ ناموں یا محل وقوع کا علم نہیں ہو سکا۔ بعض اشخاص کے نام بھی ایسے آئے ہیں۔ جن کی کچھ وضاحت نہیں ہوسکی۔ اگر مزید مطالعہ سے ان امور کے متعلق کچھ علم ہوسکا یا کسی صاحب نے ان کے متعلق کچھ واقفیت بہم پہنچائی۔ اور زندگی نے بھی اس وقت تک وفا کی۔ تو اس تاریخ کا دوسرا ایڈیشن انشاءاللہ اس سے زیادہ مکمل ہوگا۔ تاہم ضمیمہ کے طور پر بعض حالات و واقعات کا جو تشریح طلب تھے۔ واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ تنقید اور نکتہ چینی اگر نیک نیتی سے ہو تو اس سے کوئی فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ حاسدانہ، متعصبانہ اور محض شہرت طلبی کی غرض سے ہو۔ تو معترض کو اپنی غیر محمود نمائش کے سوا اس سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔

محمدالدین فوق

ضمیمہ ۱

سنہ لوکک اور کشمیری سنہ

لوکک سمت کو سپت رلیشی سمت بھی کہتے ہیں۔ اور چونکہ اس کی ابتدا کشمیر سے ہوئی ہے۔ اس لئے اس کو کشمیری سمت بھی کہا جاتا ہے گو پونچھ اور کشتواڑ آج بھی کشمیر کے ماتحت ہیں۔ لیکن چمبہ اور کانگڑہ کے بعض علاقے بھی کسی زمانہ میں کشمیر ہی کے زیر اقتدار تھے۔ اس لئے اس سمت کا رواج کشمیر کے علاوہ ان علاقوں میں بھی تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ ان علاقوں کے بعض برہمنوں میں آج بھی یہ سمت رائج ہے۔

جب ۷۲۰ھ میں یہاں مسلمان حکمران ہوئے۔ تو انہوں نے لوکک سمت کی بجائے ایک اور کشمیری سنہ ایجاد کیا۔ جس کا ذکر آگے آئیگا۔

لوکک سنہ کی ابتدا اس کے بانیوں اور موجدوں نے چیت شدی ایکم سمت ۲۵ کلجگ سے رکھی ہے۔ یا یہ بالفاظ دیگر یہ سمت ۳۰۷۶ سال قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ کشمیر کے تمام سنسکرت مورخوں اور مصنفوں

نے اپنی تصنیفات میں اسی سمت کو راج دیا ہے۔ پنڈت کلہن نے جس سال اپنی مشہور تاریخ راج ترنگنی تصنیف کی۔ اس سال لوکاک سمت ۴۲۲۵ تھا اور عیسوی سنہ اس کے مطابق ۱۱۵۰ء تھا۔ اب ان ایام میں جبکہ یہ مضمون لکھا جارہا ہے۔ لوکاک سمت ۵۰۱۸ ہے۔ اور اس کے مطابق عیسوی سنہ ۱۹۴۱ و ۱۹۴۲ ہے۔

پنڈت کلہن کے تاریخی سلسلہ کو قائم رکھنے کے لئے جوناراج مورخ نے بعہد بڈشاہ بادشاہ کشمیر ۴۵۳۵ لوکاک مطابق ۱۴۵۹ء میں دوسری راج ترنگنی لکھی۔ جس کا نام اس نے راجاولی یا زینہ ترنگنی رکھا۔ اسی طرح جوناراج کے بعد اس کے شاگرد پنڈت شری ور نے جوناراج کے سلسلہ کو قائم رکھتے ہوئے ۴۵۶۲ لوکاک مطابق ۱۴۸۶ء میں تیسری راج ترنگنی بنام زینہ راج ترنگنی قلمبند کی۔ اپنی تاریخوں میں جوناراج اور شری ور نے کشمیری مسلمان بادشاہوں کے جو سالہائے تخت نشینی لوکاک سمت کے مطابق درج کئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

نام بادشاہ	تخت نشینی مطابق لوکک سمت	مطابق سنہ ہجری	مطابق سنہ عیسوی
رینچن شاہ عرف ملک صدرالدین	۴۳۹۶	۷۲۰ھ	۱۳۲۰ء
شمس الدین شاہ میری	۴۴۱۵	۷۴۰ "	۱۳۳۹ "
سلطان شہاب الدین	۴۴۳۰	۷۵۵ "	۱۳۵۴ "
سلطان سکندر شاہ	۴۴۶۵	۷۹۱ "	۱۳۸۹ "

نام بادشاہ	تخت نشینی مطابق لوکک سمت	مطابق سنہ ہجری	مطابق سنہ عیسوی
علی شاہ	۴۴۸۹	۸۱۶ھ	۱۴۱۳ء
بڈشاہ	۴۴۹۶	۸۲۳ "	۱۴۲۰ "
حیدر شاہ	۴۵۴۶	۸۷۴ "	۱۴۷۰ "
حسن شاہ	۴۵۴۸	۸۷۶ "	۱۴۷۲ "
محمد شاہ بار اول۔	۴۵۶۰	۸۸۹ "	۱۴۸۴ "

لوکک سنین کے ساتھ جو ہجری اور عیسوی سنین لکھے گئے ہیں۔ وہ راقم السطور نے لوکک سنین کی مطابقت کا حساب لگا کر خود درج کیے ہیں اور ان کی تصدیق ذیل کی سطور سے ہو سکتی ہے

طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ میں علی شاہ بادشاہ کشمیر کی گرفتاری کا سال جمادی الاول ۸۲۳ھ درج ہے۔ اور اسی سال اس کا بھائی بڈشاہ تخت نشین ہوتا ہے۔ ۸۲۳ھ کے مطابق لوکک سال ۴۴۹۶ ہے جو نراج اور سری ور نے بھی ۴۴۹۶ لوکک ہی کو بڈشاہ کی تخت نشینی کا سال لکھا ہے۔ کشمیر کے مابعد مورخوں نے بڈشاہ کی حکومت کا سال اول جو ۸۲۶ھ لکھا ہے وہ غلط ہے۔

بڈشاہ کے فرزند سلطان حیدر شاہ کا ایک سکہ جو عجائب گھر سرینگر میں

سنہ عجائب گھر میں گزشتہ ہندو اور مسلمان والیان کشمیر کے جو سکے موجود ہیں ان کے فوٹوز کتاب ہینڈ بک آف آرکیولوجیکل اینڈ نیومس میٹک میں طبع ہو چکے ہیں۔ اس سکہ کا فوٹو ۱۵۲ صفحہ پر اور اس سکہ کی کیفیت کتاب ہذا کے ۱۵۹ صفحہ پر درج ہے۔

موجود ہے ۸۷۴ھ کا ہے۔ اس سکّہ کے ایک طرف "سلطان الاعظم حیدر شاہ" اور دوسری طرف "ضرب کشمیر فی شہور سنہ سبعین" ساتھ ہی ۸۷۴ھ کے اعداد درج ہیں۔ فارسی مورخوں نے بڈشاہ کا سال وفات ۸۷۹ھ لکھا ہے۔ جو اس سکّہ کی رو سے قطعاً غلط ہے۔ اگر فارسی مورخین کے قول کے مطابق بڈشاہ کا سال وفات ۸۷۹ھ صحیح سمجھا جائے۔ تو اس کے فرزند کا سکہ اس کی موت سے پانچ سال قبل ہی کس طرح کشمیر میں رائج ہو سکتا ہے۔ لوکک سنہ ۴۵۴۶ کی مطابقت ہجری سنہ ۸۷۴ کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور شٹر لویر نے یہی لوکک سنہ حیدر شاہ کی تخت نشینی کا لکھا ہے۔

مزار کلاں یعنی احاطۂ قبرستان شیخ بہاء الدین گنج بخش میں ایک پختہ قبر سعید خاں کی ہے اس پر کچھ عبارت سنسکرت اور فارسی میں درج ہے۔ قبر کے کتبہ پر فارسی عبارت میں لکھا ہے: "بہ سال ہشت صد و ہفتاد و نو شہادت یافت" یعنی ۸۷۹ھ سعید خاں کا سال شہادت درج ہے۔ سنسکرت عبارت میں صرف ۶۰ لوکک اور بعہد محمد شاہ کے الفاظ درج ہیں۔ ساٹھ لوکک سے مراد ۴۵۶۰ لوکک ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ ۸۸۹ھ میں محمد شاہ تخت نشین ہو چکا تھا۔ مسلمان مورخوں نے محمد شاہ کا سال تخت نشینی جو ۸۹۳ھ لکھا ہے وہ غلط ہے۔

"بہارستان شاہی"[1] میں سلطان سکندر کی وفات ۸۱۶ھ درج ہے۔ اور اس سنہ کے مطابق لوکک سنہ ۴۴۹۶ ہوتا ہے۔ اور یہ لوکک ۸۱۶ھ کے مطابق ہے۔ غرض جونراج اور شٹر لویر نے جو لوکک سال درج کئے ہیں۔ وہ صحیح ہیں۔ اور ان لوکک سالوں کے مطابق جو ہجری سنین قاعدہ کے رو سے نکلتے ہوں۔ وہ درست سمجھنے چاہئیں۔

[1] یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری ایک واقفکار دوست نے اس کا ذکر کیا تھا۔



سلطان شمس الدین شہمیری بانی سلطنت شہمیریہ (۱۳۲۹ء) نے کشمیر کا لوکک سنہ جو تین ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ سے کشمیر میں رائج تھا۔ ترک کر کے اس کی بجائے کشمیری سمت کے نام سے ایک نیا سنہ جاری کیا۔ جس کی ابتدا اس نے سنہ ۱۳۲۰ء سے رکھی جبکہ تبتی شہزادہ رینچن شاہ نے اسلام قبول کر کے کشمیر میں اسلامی حکومت کی بنا رکھی تھی۔

شاہ میر نے سال کے دنوں کا شمار ۳۶۵ کی بجائے قمری سال کے مطابق ۳۵۴ دنوں پر رکھا۔ مہینوں کے نام ہندی اور کشمیری دونوں زبانوں میں رکھے گئے۔ چونکہ قمری اور شمسی سال میں گیارہ دن کا فرق رہتا تھا۔ اس لئے مہینوں کو موسم کے مطابق رکھنے کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ ہر تیسرے سال میں ایک مہینہ زائد رکھا جانے لگا جس سے کشمیری سال کا توازن تین سال کے بعد شمسی سال کے برابر ہو جاتا تھا۔

قمری مہینوں کے نام ہندوستان میں عرب سے آئے ہیں۔ نہایت قدیم زمانہ جاہلیت میں وہاں مہینوں کے نام یہ تھے۔ موتمر۔ ناجر۔ خوان۔ صوان۔ زبا۔ بائد اصم۔ واغل۔ ناطل۔ عادل۔ اہل عرب کے ہاں سال بارہ مہینوں اور ۳۵۴ دنوں کا ہوتا تھا۔ یعنی قمری اور شمسی سال کے درمیان گیارہ دن کا فرق تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کبھی کوئی مہینہ جاڑوں میں آجاتا تھا کبھی گرمیوں میں۔ جب بعد کو ہر تیسرے سال لوند کا ایک مہینہ بڑھایا جانے لگا۔ تو اس وقت گرمی سردی زمانہ بارش اور اوقات کاشت وغیرہ کے لحاظ سے مہینوں کے جدید نام رکھے گئے۔ جو حسب ذیل ہیں۔ محرم۔ صفر۔ ربیع الاول۔ ربیع الآخر۔ جمادی الاول جمادی الآخر۔ رجب۔ شعبان۔ رمضان۔ شوال۔ ذوالقعدہ۔ ذوالحجہ۔ ہر مہینہ کے نام کی کوئی نہ کوئی وجہ تسمیہ بھی ہے۔

معلوم ہوتا ہے شمس الدین شہمیری یا تو خود قمری مہینوں کو موسموں کے مطابق کرنے کی ضرورت سے آگاہ تھا۔ یا اس کے پاس کوئی ایسا واقفکار آدمی موجود تھا جو مہینوں کے متعلق اہل عرب کے رواج سے واقف تھا۔ اس لئے اہل عرب نے جو طریقہ مہینوں کو موسموں کے مطابق بنانے کے لئے اختیار کیا۔ اور جس طریق سے انہوں نے گیارہ دلوم کا فرق ہر تیسرے سال کے بعد نکالا۔ وہی طریق شمس الدین نے بھی کشمیر میں اختیار کیا۔

اب کشمیر میں کشمیری سنہ یا سمت کا رواج تو نہیں ہے۔ البتہ کشمیری مہینوں کا رواج دیہات میں بعض زمینداروں کی بول چال میں پایا جاتا ہے۔ کشمیری سمت ۱۳۲۰ء سے اگر اب تک جاری رہتا تو آج (۱۹۴۱ء ۱۹۴۲ء) میں اس کو ۶۲۲ سال کا عرصہ گزر جاتا۔

کشمیری مسلمان بادشاہوں کے زمانہ میں جوں جوں فارسی کا زیادہ رواج ہوتا گیا کشمیری سمت کے ساتھ ہی سنہ ہجری بھی چلتا رہا۔ کشمیری سمت چک بادشاہوں کے زمانہ تک جاری رہا۔ ان ایام میں جو کتابیں مسلمان کشمیری مصنف لکھتے تھے۔ ان پر سال تصنیف کشمیری سمت کے ساتھ بالعموم ہجری سنہ بھی ہوتا تھا لیکن پنڈت مصنفوں نے کشمیری سمت کا بہت کم استعمال کیا ہے۔ انہوں نے یا تو لوکک سمت استعمال کیا ہے یا ہندی بکرمی اور ہجری۔

کشمیری سنہ شہمیری بادشاہوں کے زمانہ میں قبروں کے تعویذوں اور مختلف کتبوں پر بھی درج ہوتا تھا۔ جیسا کہ مندر شنکر اچاریہ المشہور تخت سلیمان کی مرمت کا سال "پنجاہ و چہارم" درج ہے۔ چونکہ پنجاہ و چہارم کے ساتھ ۱۵۴ یا ۱۰۵۴ یا اور کوئی ہندسہ درج نہیں ہے۔ اس لئے بعض اس کو لوکک سمت کہتے ہیں۔ بعض کشمیری اور بعض ہجری۔ مصنف تاریخ حسن نے تو صاف

لکھدیا ہے۔ کہ سلطان زین العابدین در ۸۴۳ھ چہار ستہ سنگین و قابہ سقف آں استوار نمود" پھر آگے لکھا ہے۔" چنانچہ بریک ستون دو سطر منقوش است"

سطر اول۔ این ستون برداشت خواجہ اکم بن مرجان سال پنجاہ و چہار کشمیری

سطر دوم۔ معمار این ستون را۔ دو امی بہشتی زرگر پنجاہ و چہار۔

بڈشاہی عہد کے مصنف اور بعد کے قریب العہد مورخ اس بارہ میں بالکل خاموش ہیں۔ اس لئے اب ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ کیا درحقیقت بڈشاہ کے عہد میں مندر شنکر اچاریہ کی مرمت ہوئی تھی۔

۸۷۴ھ بڈشاہ کا سال وفات ہے۔ اسی سال بقول تاریخ حسن مندر کے چہار ستون سنگین مع سقف استوار ہوتے ہیں۔ اور پھر ستون کی عبارت میں سطر اول سے پنجاہ و چہار کشمیری اور دوسری سطر سے صرف پنجاہ و چہار کے الفاظ ظاہر ہوتے ہیں۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کشمیری سمت جب ۴۲۴ھ سے شروع ہوتا ہے۔ تو ۸۷۴ھ میں جب یہ ستون مع سقف تیار ہو جاتے ہیں۔ کس منزل پر تھا۔ ۴۷۸ سے ۲۰۷ وضع کرنے پر باقی ہیں ۴ ۱۵ حاصل ہوتے ہیں۔ اب مندر کے ستون پر ۵۴ درج ہے اور یہاں ۱۵۴ نکلتے ہیں اس کا حل اس طرح ہو سکتا ہے کہ نہ صرف اہل کشمیر بلکہ ہر ملک کے لوگ بالعموم سنہ اور تاریخ لکھنے کے وقت احاد لکھتے ہیں۔

چنانچہ آج سمت بکرمی ۱۹۹۹ ہے۔ لیکن عموماً تحریروں میں صرف ۹۹ ہی لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح عیسوی سنہ ۱۹۴۲ ہے مگر تحریروں میں صرف ۴۲ ہی لکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح اُس زمانہ میں بھی احاد لکھنے کا دستور تھا۔ اور ۱۵۴ کی بجائے ۵۴ ہی لکھ دیا کرتے تھے۔ گویا پنجاہ و چہار سال سے

مراد صرف ۴۵ نہیں بلکہ ۴۵۱ ہے۔ جو نہ لوکک ہے نہ ہجری۔ نہ بکری بلکہ کشمیری سمت ہے۔

۸۷۴ھ مطابق کشمیری سمت ۴۵۱ میں بڈشاہ انتقال کر جاتا ہے۔ اور یہی سال شنکراچاریہ کے مندر کی مرمت کا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرمت ۸۷۳ھ یا اوائل ۸۷۴ھ میں شروع ہو چکی تھی۔ اور چونکہ وہ مرمت، کچھ بہت زیادہ نہ تھی۔ اس لئے اس سال اس کی موت سے پیشتر ہی ختم ہو چکی تھی۔

اسی طرح مزار سلاطین میں ایک پختہ قبر دروازہ کے قریب ہی ہے۔ صاحب قبر کا نام اُڑ گیا ہے۔ صرف یہ الفاظ پڑھے جاتے ہیں " یہ سال شصت و شش از حساب کشمیری۔ کہ ہشتم صدی ذی الحجۃ المبارک یہ ہجری۔ یہاں ہشتم صدی ہجری کے ساتھ سمت کشمیری ۴۶ بھی درج ہے۔ یہ زمانہ سلطان قطب الدین شہمیری کا تھا۔ کشمیری مہینوں کے نام حسب ذیل ہیں۔ ومیک جیٹھ۔ ہار۔ شراون۔ بادرپت۔ آشت۔ کارتک۔ منجہور۔ پوہ۔ ماگ۔ پھاگن۔ چیتر۔ کشمیری سال کا پہلا دن یعنی کشمیریوں کا نوروز ماہ وہیک کی یکم کو مقرر کیا گیا۔ جو پھاگن سمت بکرمی پتن تاریخ کو ہوتا ہے۔



ضمیمہ ۲

اُڈبانڈپور یاہنڈ

جائے وقوع

شائن[1] صاحب نے کلہن کی راج ترنگنی کے ترجمہ میں جرنیل کننگھم نے اپنے جغرافیہ قدیم کشمیر میں ایلیٹ صاحب نے اپنی ہسٹری آف انڈیا میں اور کئی دوسرے محقق یورپین اصحاب نے اپنے مختلف مضامین میں اُڈبانڈپور کے متعلق جو کیفیت لکھی ہے۔ اس کا مختصر سا ذکر یہاں مناسب سمجھا جاتا ہے[2]۔

شائن صاحب نے ایک جرمن رسالہ میں اُڈبانڈپور کو جہاں شاہی خاندان کے راجاؤں کی حکومت تھی۔ گندھارا یعنی قدیم قندھار کی سلطنت سے تعبیر کیا ہے اس مقام کو البیرونی نے (زمانہ محمود غزنوی) دی ہُنڈ لکھا ہے۔ اور اس وقت یہی موضع اُنڈ اُہنڈ دریائے سندھ کے دائیں کنارے اٹک سے اوپر کوئی پندرہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ جو کسی زمانہ میں قندھار کا دارالحکومت تھا۔

---

[1] یہ نامور محقق اور آثار قدیمہ کا مشہور ماہر تقریباً اسی نوے سال کی عمر میں بادنومبر ۱۹۴۳ء بمقام کابل انتقال کر گیا۔ ہر سال کشمیر آتا تھا اور سونمرگ میں بیٹھکر تحریری کام کیا کرتا تھا۔
[2] دیکھو ضمیمہ لے نوٹ راج ترنگنی صفحہ ۶۵ تا ۶۹ اردو ترجمہ۔

زونراج نے زینہ ترنگنی کے شلوک ۲۷۲ میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سلطان شہاب الدین بادشاہ کشمیر نے جب اس کا محاصرہ کیا۔ تو اس زمانے میں گووندخاں والی اُدبانڈپور۔ سندھوپ (سندھ) اور گندھارا (قندھار) کا فرمانروا تھا۔

ڈی سینٹ مارٹن نام ایک یورپین مصنف نے اپنی کتاب بنام میمائر دا انیا (مطبوعہ ۱۸۵۸ء) میں وی ہند کے متعلق لکھا ہے۔ یہ وہی موضع ہے جس کو آجکل اُند۔ ہُند۔ اوہند۔ اُتہند کہتے ہیں۔ محمود غزنوی سے بھی چار سو سال پیشتر چینی سیاح ہیونگ سانگ نے گندھارا کی سلطنت میں ایک عظیم الشان اور دولتمند شہر کا ذکر کرتے ہوئے اس کا نام اُو۔ تو۔ کیا۔ ہَن۔ چہ لکھا ہے۔ ڈی سینٹ مارٹن کے خیال میں یہ وہی شہر ہے جس کا نام البیرونی وی ہند لکھتا ہے۔ اس لئے کہ دونوں نے اس کا محل وقوع ایک ہی مقام کو بتایا ہے۔

سٹائن صاحب ۱۸۹۱ء میں خود اس موقعہ پر گئے۔ وہ لکھتے ہیں۔ کہ اس موضع میں مجھے ایک کتبہ نہایت تباہ حالت میں ملا۔ جو ایک خستہ حال مسجد کی دیوار کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ اس کی سطور ناقابل مطالعہ تھیں۔ میں نے اس کو لاہور کے عجائب گھر میں بھجوا دیا۔

الیگزینڈر اپنی کتاب کابل میں لکھتے ہیں۔ میں "وی ہُند" سے شاردہ حروف میں کندہ کی ہوئی سنسکرت کتبوں والی سنگ مرمر کی سلوں کو لے آیا۔ اور کلکتہ میں میں نے ان کو امپیریل میوزیم میں رکھوا دیا۔

جرنل کننگھم نے اُڈبانڈ کے بگڑے ہوئے ناموں اوند۔ اُدہند اور ہند پر کافی بحث کی ہے۔ چینی سیاح ہیونگ سانگ کے تلفظ۔ اُو۔ تو۔ کیا۔ ہَن۔ چہ

کوسٹانٹ جولینین صاحب نے اُت کھانڈ اور کھانڈا اور بعض نے اس کا تلفظ ادک ہانڈ لکھا ہے اور اوک ہانڈ ہی کو دی ہند کا ماخذ بتایا جاتا ہے۔ مگر کلہن اور زونراج نے اس کو اُدبھانڈ پور لکھا ہے۔ سنسکرت میں اوبھانڈ کے معنی پانی کی ٹھلیا کے ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے "عرب و ہند کے تعلقات" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی ہے جس کو ۱۹۳۰ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے شائع کیا ہے اس میں کئی جگہ دی ہند کا ذکر آتا ہے صفحہ ۶۰ پر بیت المقدس کے ایک مسلمان عالم بشاری مقدسی کے حالات میں لکھا ہے۔ کہ ۳۷۵ھ کے گرد و پیش سیاحت ہند کے بعد وہ اپنا سفرنامہ ترتیب دیتا ہے اور لکھتا ہے۔ دی ہند، منصورہ[1] سے بڑا شہر ہے۔ نہایت پاک و صاف۔ نہایت اچھے پھل۔ بڑے بڑے درخت، ارزاں نرخ، شہد ایک درہم[2] کا تین من[3] ردی اور ارزانی کا حال مت پوچھو۔ اخروٹ اور بادام کے درخت بکثرت ہیں۔

پھر ۲۵۵ صفحہ پر بشاری مقدسی کے حوالہ سے لکھا ہے "ہندوستان اور درہ خیبر پار کے ملکوں کے درمیان ہمیشہ سے صلح و جنگ کے متواتر تعلقات قائم تھے۔ اسلام سے پہلے ان ملکوں کی کیفیت یہ تھی۔ کہ جب کبھی کابل کے بادشاہ

---

[1] محمد بن قاسم (۹۲ھ) کے حملہ کے بعد منصورہ اور ملتان صرف دو اسلامی ملک ہندوستان میں رہ گئے تھے۔ اس کا پرانا ہندو زمانہ کا نام بہمانیہ تھا۔ ایرانیوں نے برہمن آباد رکھا مسلمانوں نے جب اس کو فتح کیا تو بطور تفاؤل اس کا نام منصورہ (فتح کیا گیا) رکھا۔

[2] ایک درہم کی قیمت اندازاً ۳۰ر بتائی گئی ہے۔

[3] علاؤ الدین خلجی (۶۹۵ھ مطابق ۱۲۹۷ء) بادشاہ ہند کے زمانہ میں ایک من ۱۲-۱۳ سیر کا ہوتا تھا اور بشاری مقدسی کے زمانہ (۳۷۵ھ) میں اس سے کم اس کے برابر یا اس سے کچھ زیادہ ہوگا

کو قوت حاصل ہوئی۔ اس نے پشاور اور وی ہند تک قبضہ کر لیا۔ اور جب رائے لوہارو (راجہ لاہور) کو موقع ملا اس نے کابل و قندھار تک اپنی سرحد قائم کر لی۔ یہی حال سندھ کی طرف تھا۔"

پھر اسی کتاب نے ۲۹۶ و ۲۹۷ صفحوں پر وی ہند کا ذکر ذرا اور بھی تفصیل سے ہے۔ لکھا ہے: "یہ ہندوستان کا مشہور پرانا شہر ہے۔ غزنوی فتوحات کے سلسلہ میں اس کا بھی نام آتا ہے۔ ۳۹۲ھ میں پشاور کے بعد محمود نے اس پر قبضہ کیا۔ اس شہر میں محمود سے پہلے ہی مسلمانوں کی کچھ آبادی موجود تھی۔ بیرونی نے اپنی کتاب قانون مسعودی میں اس کے ذکر میں لکھا ہے کہ "یہ گندھارا کا پایہ تخت ہے اور یہ وادیٔ سندھ میں واقع ہے۔" ونسنٹ اے سمتھ صاحب "دی ارلی ہسٹری آف انڈیا" میں اوہند نام شہر کو دریائے سندھ پر جگہ دیتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ ۸۷۰ء میں مسلمانوں کے کابل فتح کر لینے کے بعد وہاں کا دارالسلطنت اوہند کو منتقل ہو گیا۔ جو دریائے سندھ پر واقع تھا۔ اور ہندو شاہیہ خاندان کا پایہ تخت تھا۔ بشاری مقدسی نے پھر ایک جگہ اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ میں نے تحقیق کی۔ تو معلوم ہوا کہ ویہند پایہ تخت کا نام ہے۔ اور اس کے ماتحت شہر دہان بتیر۔ نوج توار اور سان کوج وغیرہ ہیں۔

راقم السطور خود بھی ۱۹۳۶ء میں زیدہ میں چند دنوں کے لئے مقیم تھا۔ اس مقام سے اُند یا ہُنڈ صرف تین میل کے فاصلے پر ہے۔ زیدہ اور ہُنڈ کے درمیان ایک قدیم نالہ بہتا ہے جس کو بھدری کہتے ہیں۔ ہُنڈ پشتو زبان کا لفظ ہے۔ دی اند اور ہُنڈ بھی اسی کا نام ہے۔ اور فی الواقع یہ وہی مقام ہے۔ جس جگہ یہاں کے شاہیہ خاندان نے شکست کھا کر محمود غزنوی کے لئے پنجاب کا دروازہ کھول دیا تھا۔ ہُنڈ کے معمر لوگ بھی یہی بیان کرتے ہیں۔ کہ آج سے سوا نو سو سال قبل

محمود غزنوی اسی رستہ سے ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔

ہُند میں قریباً بارہ سو نفوس آباد ہیں۔ تمام آبادی ایک فصیل کے اندر ہے۔ یہ گاؤں ایک قلعہ کی صورت میں ہے۔ اس کے دو دروازے ہیں۔ اور یہاں کے باشندے انہی دروازوں کے ذریعہ آمد و رفت رکھتے ہیں۔ اکثر انگریز محققین موسم گرما میں اس مقام پر آتے اور قلعہ ہند کے کھنڈر دیکھتے رہتے ہیں۔ ہُند سے دریائے اٹک قریباً ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر شمال کی طرف بہتا ہے۔ اور دریا اور قلعہ ہُند کے درمیان پرانے زمانے کی اینٹوں کا پختہ فرش اب تک اپنی بُری بھلی حالت میں موجود ہے۔ جہانگیرہ ریلوے سٹیشن سے جو دریائے اٹک کے کنارے آباد ہے۔ ہند پندرہ میل کے فاصلہ پر ہے۔

لاہور کے عجائب گھر میں اس کمرے کے سرے پر جہاں پشاور اور صوبہ سرحد سے دستیاب شدہ بُدھ کی مورتیاں موجود ہیں۔ اور جو گندھارا گیلری کے نام سے موسوم ہے۔ ایک نقشہ دیوار پر آویزاں ہے۔ اس میں قندھار کی قدیم سلطنت کے دریا پہاڑ اور شہروں اور قصبوں کے نام واضح حروف میں لکھے گئے ہیں اس زمانہ میں گندھارا سلطنت مانکیالا (راولپنڈی) سے افغانستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نقشہ میں ایک مقام اُند (und) کے نام سے درج ہے جس کے ساتھ اس کا قدیم نام (udbhand) بھی لکھا ہوا ہے۔

محققین و مورخین کی اس تحقیقات اور ہند کے لوگوں کی سینہ بسینہ روایات سے صاف ظاہر ہے کہ سکندر بادشاہ کشمیر نے جس اودبھانڈ کو فتح کیا تھا۔ اور جس اودبھانڈ کے بادشاہ نے اس کو اپنی لڑکی پیش کی تھی۔ وہ یہی اُند ہے جس کو آجکل پشتو نی زبان میں افغان لوگ ہُند کہتے ہیں۔

مختلف محققین و مورخین کے بیانات سے یہ ثابت ہو چکا ہے۔ کہ

زیدہ صوبہ سرحد کے متصل تین میل کے فاصلہ پر ہند کے نام سے دریائے اٹک کے کنارے جو موضع آباد ہے۔ اسی کا نام محمود غزنوی اور اس سے قبل کے زمانہ میں اُدبانڈ تھا۔

اُڈبانڈ یعنی ہند کا تُرکی شاہی خاندان

عیسوی صدی کے ظہور سے کچھ عرصہ پیشتر برہانگین نام ایک ترک نے افغانستان کی طرف اپنی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ برہانگین اور اس کی تمام ذریات مذہباً بت پرست اور افغانستان کے علاقہ کے لوگ بدھ مت کے پیرو تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ حکمران قوم بھی بدھ مذہب ہی میں جذب ہو گئی جب کنشک کا زمانہ (۱۲۵ء سے ۱۵۰ء) آیا جس کا دارالحکومت پشاور تھا تو افغانستان کے علاوہ ترکستان اور ماوراالنہر بھی اس کی حکومت میں داخل ہو چکے تھے۔ چونکہ ایران ان کے ساتھ ملتا تھا۔ اور شاہان ایران کا لقب شاہ تھا۔ اس لئے یہ بھی شاہی کہلائے۔ بقول مصنف "سلطان محمود غزنوی" البیرونی لکھتا ہے کہ برہانگین کے ترکی شاہی خاندان میں ساٹھ سے کم بادشاہ نہیں ہوئے۔ اس خاندان کا آخری تاجدار لگاترمان تھا۔ سٹاین صاحب ترک خاندان کی تصدیق میں اوکنگ نام ایک سیاح کا بیان لکھتے ہیں جس نے ۷۵۳ء سے ۷۶۲ء کے درمیان گاندھارا کی سیاحت کے دوران میں وہاں ترک خاندان کو حکمران دیکھا ہے۔

اُڈبانڈ یعنی ہند کا ہندو شاہی خاندان

لگاترمان کے وزیر کا نام کلّر تھا۔ راجہ کی بزدلی اور غفلت کی بدولت اس نے اس قدر طاقت حاصل کر لی تھی کہ راجہ اس کے سامنے عضو معطل بنا رہتا تھا۔ آخر کلّر نے راجہ کو معزول کر کے حکومت خود سنبھال لی۔ اور ہندو شاہیہ

خاندان کی نبیاد رکھی۔ جب سبکتگین نے ہندوستان پر حملہ کیا ہے۔ تو پنجاب میں اسی ہندو شاہیہ خاندان کی حکومت تھی۔ اس خاندان کا جو شجرہ البیرونی نے لکھا ہے۔ وہ حسب ذیل ہے۔ سب سے پہلے کلور۔ پھر اس کا فرزند سند۔ پھر کملو پھر بھیم پھر جے پال پھر انند پال۔ پھر ترلوچن پال پھر بھیم پال۔ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب" کے نام سے رائے بہادر مہا مہو پادھیائے گوری شنکر ہیرا چند اوجھا نے ایک کتاب بزبان ہندی لکھی ہے جس کا اردو ترجمہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد نے ۱۹۳۱ء میں طبع کیا ہے۔ اس میں مصنف نے قرون وسطیٰ کا زمانہ ۶۰۰ء سے ۱۲۰۰ء کے درمیان قرار دیا ہے۔ ترجمہ میں صفحہ ۲۰۸ پر ہندوستان کے مختلف راجاؤں کے سکوں کے تذکرہ میں اُدبانڈپور (دی ہند یا ہند) کے راجاؤں کے سونے چاندی کے سکوں کا ذکر بھی آتا ہے۔

البیرونی لکھتا ہے۔ ہندو خاندان شاہیہ کا جو راجہ سب سے پہلے اُدبانڈپور میں گزرا ہے۔ اس کا نام کلور تھا۔

اُدبانڈپور کا تعلق کشمیر کے ساتھ

اُڈبانڈپور کے شاہیہ خاندان کا تعلق کشمیر کے ساتھ کسی نہ کسی رنگ میں ہمیشہ رہا ہے۔ راجہ للتادتیہ (۶۹۹ء تا ۷۳۶ء) کے زمانہ میں سابقہ اٹھارہ اعلیٰ عہدوں کے علاوہ پانچ اعلیٰ عہدے ایسے بھی قائم کئے گئے تھے۔ جن پر کشمیر کے راجکماروں کے علاوہ اُدبانڈپور کے شاہیہ خاندان کے راجکمار بھی مامور ہوا کرتے تھے۔

راجہ گوپال ورمن فرزند رانی سوگندا (۹۰۲ء تا ۹۰۴ء) کے وزیر پربھاکر دیو نے اُدبانڈپور کی شاہیہ سلطنت کو از سر نو مغلوب کیا۔ اس نے یہ حکومت پرانے راجہ سے چھین کر اسی خاندان کے نئے راجہ للہ کے بیٹے تورمان کو دیدی۔ اور اس کا نام کملاک رکھا۔

اُڈبانڈپور اور پونچھ کشمیر

سنہ۹۵۰ء سے سنہ۹۵۸ء کے درمیان اُدبانڈپور کے راجہ کا نام بھیم شاہ تھا۔ جو کملک یا کملو یا کملوک کا جانشین تھا۔ راجہ بھیم شاہ نے اپنی لڑکی کی شادی راجہ سنگراج یا سنگرام راج والی لوہر (لوہرین پونچھ) کے ساتھ کر دی تھی۔ کشمیر کی مشہور رانی دِدا جس نے راجہ کشیم گپت والئے کشمیر کو اپنے حسن کی وجہ سے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ بھیم شاہ کی نواسی اور سنگراج کی بیٹی تھی۔ کلہن نے اس موقع پر بھیم کو اُدبانڈ کا شاہی فرمانروا تسلیم کیا ہے۔ اس رانی نے اپنے نانا بھیم شاہ کے نام پر ایک مندر بھیم کیشو جنوبی کشمیر میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ اس ٹیلہ پر واقع تھا۔ جہاں دریائے لدر کے کنارے اب علیش مقام کے نام سے ایک موضع آباد ہے۔ جو بابا بام الدین کی زیارت کی وجہ سے مشہور ہے۔ علیش مقام کشمیر کی مشہور صحت گاہ ہے۔ جو پہلگام کو جاتے ہوئے دائیں ہاتھ کو آتی ہے۔

راجہ ابھے مینو والی کشمیر سنہ۹۵۸ء تا سنہ۹۷۲ء کے زمانہ میں ادبانڈپور کے شاہی خاندان پر مصیبتیں نازل ہونا شروع ہوتی ہیں۔ اور راجہ کے کمانڈر انچیف کی سازشوں سے اس خاندان کی طاقت بہت کمزور ہو جاتی ہے۔

محمود غزنوی اور ہندو شاہیہ خاندان

لیکن اس خاندان کی مکمل تباہی سنہ۱۰۰۱ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب محمود غزنوی ہندوستان کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں ترلوچن پال اُدبانڈپور کا فرمانروا تھا جب اس کو اس طوفان وسیلاب کی جو افغانستان سے اٹھا۔ خبر ملی۔ تو اس کا ملک چونکہ رستہ میں ہی آتا تھا۔ اس لئے اس نے بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے۔ ترلوچن پال نے راجہ کشمیر کو اس آندھی

کی خبر دی اور لکھا کہ اگر میں تباہ کر دیا گیا۔ تو آپ کی باری بھی میرے بعد آئیگی۔ اس لئے نہ صرف مجھے بلکہ اپنے آپ کو اور ہندوستان کو اور ہندو دھرم کو بچانے کے لئے اس وقت جتنی امداد آپ دے سکتے ہیں۔ اس سے دریغ نہ کریں۔

کلہن لکھتا ہے اس زمانہ میں راجہ سنگرام راج (۱۰۰۳ء تا ۱۰۲۹ء) حکمران تھا۔ اس نے اپنے سب سے اعلےٰ افسر تنگ اور اس کے بیٹے کو ترلوچن پال کی اعانت کا حکم دیا اور اس کے ہمراہ ایک بہت بڑی فوج جس میں کئی راجکمار کئی امیر، مشیر اور باجگزار والیان ملک شامل تھے بھیجی ترلوچن پال نے ان کا شاہانہ استقبال کیا۔ لیکن تنگ نخوت و تکبر سے دشمن کی حرکات کی کوئی پروا نہ کرتا تھا۔ ترلوچن پال نے پانچ چھ یوم کے بعد جب دیکھا کہ یہ لوگ رات کے پہرہ۔ جاسوسوں کی تعیناتی فوجی قواعد اور حملہ کی دیگر تیاریوں سے غافل رہتے ہیں۔ تو اس نے تنگ آکر تنگ سے کہا۔ جب تک آپ ترشکا (مسلمانی) طریق جنگ سے واقف نہ ہو جائیں۔ بہتر ہے آپ اس پہاڑ کی چوٹی پر حسب خواہش آرام کرتے رہیں۔ لیکن ان طعن آمیز الفاظ کا بھی تنگ پر کوئی اثر نہ ہوا۔

اوبانڈ کے شاہیہ خاندان کی تباہی

ترلوچن پال کے حملے اور اس کی ذاتی شجاعت کی کلہن نے بہت تعریف کی ہے۔ پنجاب کے بچاؤ کے لئے ترلوچن پال کا یہ آخری مقابلہ تھا۔ لیکن وہ ناکام رہا۔ محمود نے فتح پائی۔ تنگ بھاگ کر کشمیر چلا گیا۔ البیرونی لکھتا ہے ترلوچن پال شاہی خاندان کا آخری فرمانروا تھا۔ بقول البیرونی ترلوچن پال ۴۱۲ھ مطابق ۱۰۲۱ء و ۱۰۲۲ء میں مر گیا اس کا بیٹا بھیم پال اس کے بعد صرف پانچ سال زندہ رہا۔ لیکن حکمران کی حیثیت سے کسی مورخ نے اس کا ذکر

نہیں کیا۔ باپ کی موت کے بعد وہ راجہ اجمیر کے پاس چلا گیا اور ۱۰۲۶ء میں راہئے ملک عدم ہو گیا۔ اور اپنی موت کے ساتھ ہی ہندو خاندان شاہیہ کا بھی خاتمہ کر گیا۔

البیرونی نے شاہی خاندان کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ ہندوشاہی خاندان اب نیست و نابود ہو چکا ہے۔ اور ساری نسل میں سے ان کا ذرا سا نشان بھی بچا ہوا نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے تباہی و بربادی کے بعد اس خاندان کے کچھ لوگ کشمیر بھی چلے گئے۔ چنانچہ کلش (۱۰۶۳ء لغایت ۱۰۸۹ء) کے زمانہ میں اس نامور خاندان کے ایک رکن کا نام راج ترنگنی میں نظر آتا ہے۔ جہاں لکھا ہے کہ خاندان شاہیہ کے ایک رکن تل نے جسے راجہ کلش نے عارضی طور پر دوارپتی کا عہدہ عطا کیا تھا۔ ملحقہ والیان ملک سے اور اُرشہ (ہزارہ و پکھلی) کے راجہ سے بھی جنگ کی تھی۔

دوارپتی کا عہدہ اس زمانہ میں کشمیر کے درول کے محافظوں کے اعلےٰ افسر کے لئے ہوتا تھا اور وزیر اعظم کمانڈر انچیف اور چیف جسٹس کے عہدوں سے کم نہ سمجھا جاتا تھا۔ اگر ہم یہ نظریہ قائم کریں۔ کہ ہندوشاہی خاندان کا پہلا راجہ کلور ۸۷۰ء میں گزرا ہے۔ تو اس کی نسل اپنی تباہی کے آخری ایام (تقریباً سوا دوسو سال) تک اُد بانڈ پور میں جو آج ہُنڈ کے نام سے ایک معمولی سا گاؤں ہے حکمران رہی ہے۔

اُد بانڈ (ہنڈ) کے مسلمان خوانین

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُد بانڈ ہر چند سلطنت گندھارا کے دارالحکومت کے نام سے مشہور تھا۔ تاہم بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اد بانڈ کو

شاہیہ خاندان کے بعض حکمرانوں کی کمزوریوں نے قندھار سے بالکل علیٰحدہ کر رکھا تھا۔ اور قندھار اور اس کے نواحات اس خاندان کے قبضہ سے نکل چکے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ عظیم الشان سلطنت جو قندھار اور سارے افغانستان پر چھائی ہوئی تھی اور راولپنڈی اور مانکیالہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ کشمیر کے راجہ سے اعانت کی خواستگار نہ ہوتی (افغانستان) کی حدود میں اس کے جو ناظم اور نائب تھے۔ وہ بھی محمود کے ساتھ لڑائی کرتے ہوئے نظر آتے۔

ہندو حکمرانان ہند کا آفتاب اقبال محمود کی آمد کے ساتھ ہی غروب ہو گیا۔ بلکہ محمود کی زندگی ہی میں اس خاندان کا کوئی نام لیوا نہ رہا۔ بچے کھچے لوگ کشمیر اور دیگر ممالک میں چلے گئے۔

زونراج عہد بڈشاہی کا مورخ و شاعر زینہ ترنگنی میں سلطان شہاب الدین بادشاہ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس بادشاہ نے گووندخان والی ادبھاند کو مغلوب کر رکھا تھا۔ گووندخان کا نام گو آدھا تیتر آدھا بٹیر ہے تاہم اس سے اسلامی نام کا ایک جزو ظاہر ہو رہا ہے۔ اور کیا عجب ہے کہ گووند بھی کسی ایسے ہی سرحدی بے معنیٰ اسلامی یا پشتو نی نام کا بگڑا ہوا تلفظ ہو بہر حال اس کی اصلیت ہنوز روشنی میں نہیں آسکی۔

لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ محمود غزنوی کے پے درپے حملوں نے ہندو شاہیہ خاندان کو جس کی حکومت غزنی سے پنجاب کو جاتے ہوئے رستہ میں آتی تھی۔ پہلے کمزور اور ۱۰۲۱ء میں بالکل ملیا میٹ کر دیا اور اس کا نام و نشان باقی نہ رکھا۔ تو ہمیں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ جب بعض مصنفین دیکھتے ہیں کہ اس موقعہ پر اکثر لوگ اپنی جان بچانے کے لئے مسلمان ہو گئے تھے یا مسلمان کر لئے گئے تھے۔ جن میں بہا کشمیری فوج اور کشمیری شاگرد پیشہ

لوگوں کی جو اس جنگ میں تر لوچن کی مدد کے لئے آئے ہوئے تھے ۔ کثیر تعداد بھی ظاہر کی گئی ہے ۔ تو کیا اُہند کے مقامی لوگ بہ جبر یا بہ مصلحت یا برضا دائرہ اسلام میں شامل نہ ہوئے ہونگے ۔

بلکہ افغانستان کی تاریخوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ محمود کے زمانہ میں افغانستان کے تمام قبائل اور سرحدی مقامات کے تمام خیل کافرستان کے وسیع ملک کے تین بہت بڑے قبیلوں سمیت مسلمان ہو چکے تھے ۔ اس لئے اُدبانڈ یعنی اُہند کی بہت سی رعایا محمود کے زمانہ ہی میں مسلمان ہو چکی تھی ۔ اور محمود کے ہمراہی مسلمان افغان قبائل میں سے بھی کئی قبیلوں نے اس علاقے میں بود و باش اختیار کر لی تھی ۔ اور بقول لبشاری مقدسی اواخر چہارم صدی ہجری میں یہاں مسلمانوں کی ایک ریاست بھی ہندو حکومت سے الگ واقع تھی ۔

زونراج نے اودبانڈ کے اس فرمانروا کا نام نہیں لکھا جس نے کشمیر کے بادشاہ سکندر کو اپنی بیٹی دی تھی ۔ لیکن واقعات ذیل سے اس کا مسلمان ہونا یقینی پایا جاتا ہے ۔

(۱) یہ کہ محمود کے زمانہ میں اُہند کا ہندو حکمران خاندان ملیا میٹ ہو چکا تھا ۔ اور رعایا مسلمان ہو چکی تھی ۔ اور وہاں کا جو حاکم تھا ۔ لامحالہ وہ بھی مسلمان ہی تھا ۔

(۲) زونراج کی تحریر کے مطابق سلطان شہاب الدین کے عہد میں اُہند کے بادشاہ کا نام گووند خاں تھا ۔ یہ زمانہ ۷۵۵ھ سے ۷۸۰ھ کے درمیان ہے یہ بادشاہ جس کا نام گووند خاں ہے سلطان سکندر بُت شکن سے قریباً چالیس سال پہلے گزرا ہے ۔ چونکہ ہندو حکمرانان

اُود بانڈ کے زوال کے بعد یہاں کے کسی ہندو حکمران کا نام کسی تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ اس لئے گوند خان نام گو عجیب و غریب نام ہے۔ لیکن بہر حال یہ کسی مسلمان ہی کا نام معلوم ہوتا ہے۔ نیز زونراج نے اُدبانڈ کے حکمران کی بیٹی کا نام میرا لکھا ہے۔ یہ نام آج بھی کشمیر کی مُسلمان عورتوں میں رائج ہے۔ اور گو ہندوؤں میں بھی راجپوتانہ کی ایک مشہور شاعرہ میراں بائی کے نام سے گزری ہے۔ لیکن شمالی ہند میں اس قسم کے نام ہندوؤں میں کبھی نہیں پائے گئے۔

زونراج نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان سکندر بُت شکن کے زمانہ میں جو والئے اُدبانڈ تھا۔ اس کا نام فیروز تھا۔ اس نام سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُود بانڈا اور ہند کے فرمانروا بایئس سلاطین کشمیر کے زمانہ میں مسلمان ہی تھے۔ اور مسلمان بادشاہ ہی نے اپنی لڑکی کی شادی

لہ مُہنڈ اور زیدہ کے خوانین کا جو ایک ہی خاندان سے ہیں۔ بیان ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد محمود غزنوی کے حملۂ ہند کے دوران ہی میں اس کے ساتھ آئے تھے اور ہمارا سیاسی اقتدار بھی اسی زمانہ سے چلا آتا ہے۔ لیکن جب تک ہم شہاب الدین کے زمانہ کے گوند خان اور سلطان بت شکن کے عہد کے فیروز کو ہُنڈ کے موجودہ خاندان سے کوئی علیحدہ خاندان سمجھتے رہیں گے۔ ہمارے لئے یہ باور کرنا کہ اس خاندان کا اقتدار غزنوی عہد ہی سے چلا آتا ہے۔ بہت مشکل ہے۔ تاہم اس امر کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں ہے۔ کہ یہ خاندان عرصہ دراز سے اس علاقہ میں صاحب اقتدار چلا آتا ہے۔ اور اگر غزنویوں اور غوریوں کے عہد میں نہیں۔ تو مغل بادشاہوں کے عہد میں مُہنڈ اور زیدہ کے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۸ پر)

سلطان سکندر سے کی تھی جس کے بطن سے کشمیر کا نامور بادشاہ سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ پیدا ہوا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۴) خوانین ہنڈ اس علاقہ کے با اقتدار رئیس ہو گئے تھے۔ چنانچہ رانا ڈھیری نام کا موضع جو غہ اقلیم میں ایک آباد و بارونق مقام تھا۔ انہی خوانین کے جدِ اعلیٰ رانا خیل کا آباد کیا ہوا ہے۔ آج کل یہ چھوٹا سا موضع جس کی آبادی صرف ستر اسی گھروں کی ہے۔ خان آف زیدہ کی ملکیت میں ہے۔ زیدہ اور ہُنڈ کے خوانین کے جدِ اعلیٰ رانا خیل کو تین چار سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ پھر مغلیہ خاندان کے زوال کے بعد ہُنڈ کے خوانین میں شہداد خان اور اس کے باپ کا نام بہت مشہور ہے۔ شہداد خاں سکھوں کے زمانہ میں ہنڈ کا واقعی ایک نامور اور با اقتدار خان تھا۔

رانا خیل کی ذریات میں زیدہ کا خان ارسلا خاں تھا۔ جو اپنے علاقہ کا ایک مشہور اور زبردست اور با اختیار خان تھا۔ افغانستان کی تاریخ حیات افغانی میں ان دونوں خانوں کے مختصر سے حال میں درج ہے۔ کہ یہ دونوں خان ایک دوسرے کے زبردست حریف ہیں۔ اور ان میں باہم سخت عداوت ہے۔

۱۸۶۲ء میں ارسلا خان کا بیٹا ابراہیم خان زیدہ کا خان تھا۔ اس کے بعد خان بہادر عبدالغفور خان زیدہ کے مشہور خان گزرے ہیں جو پنجاب کے مختلف اضلاع میں سشن جج رہ چکے تھے۔ اور ریٹائر ہونے کے بعد صوبہ سرحد کی کونسل کے پریزیڈنٹ ہو گئے تھے۔ ۱۹۳۵ء میں آپ وفات پا گئے۔ راقم کو زیدہ ہی میں جہاں ان دنوں راقم کا فرزند ظہور الحق سب پوسٹماسٹر تھا۔ نیاز حاصل ہوا تھا۔ اب ان کے صاحبزادہ کلاں خان عبدالحمید خان زیدہ کے خان اور رئیس اعظم ہیں اور ان سے بھی راقم کو نیاز حاصل ہے

ضمیمہ ۳

مدر دیش

مدر دیش اور مہابھارت

مدر دیش کا نام سب سے پہلے مہابھارت کے پرب[1] اول میں آتا ہے۔ جہاں بھیشم (بھیکم) بدر کے ساتھ پانڈو اور دھرت راشٹ کے ناطہ بیاہ کا مشورہ کرتا ہے اور کہتا ہے۔ کہ جادوا ان کے خاندان میں ایک لڑکی ہے۔ جو ہمارے خاندان کے مناسب حال ہے۔ اور راجہ شیل کی لڑکی گاندھاری کی بھی میں نے تعریف سنی ہے۔ اور یہ بھی سنا ہے۔ کہ مدر دیش کا راجہ بھی ایک دختر رکھتا ہے۔ یہ دونوں بھی ہمارے خاندان کے لائق ہیں۔

پھر اسی پرب[2] میں راجہ پانڈو کی شادی جب راجہ کنت بھوج کی لڑکی رانی کنتی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ تو بھیشم اپنی اولاد اور اولاد

[1] ترجمہ مہابھارت مطبع آفتاب پنجاب لاہور مطبوعہ ۱۸۹۱ء صفحہ ۱۹۰

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

در اولاد کو بکثرت دیکھنے کے لئے پانڈو کی دوسری شادی کی خاطر بڑا بھاری لشکر اور جاہ و حشم لے کر مدر دیش کو روانہ ہوتا ہے۔ راجہ مدر جس کا نام شل[1] تھا۔ شاہانہ استقبال کر کے اس کو اپنے شہر میں لاتا ہے۔ اور تشریف آوری اور تکلیف فرمائی کا سبب دریافت کرتا ہے۔ بھیشم اس کے استفسار کے جواب میں اس کی بہن مدری کی تعریف کرتا ہے پھر پانڈو کی لیاقت و شائستگی اس پر ظاہر کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اگر ان دونوں کی قرابت صورت پذیر ہو جائے۔ تو مناسب ہے۔ راجہ شیل اس خویشی و قرابت پر اپنی مسرت کا اظہار کرتا ہے۔ اور تھوڑے دن کے بعد راجہ شیل رتھوں پر سامان جہیز لاد کر اور فیلان کوہ پیکر ہمراہ دیکر اپنی بہن رانی مدری کو بھیشم کے ہمراہ ہستناپور روانہ کر دیتا ہے جہاں پانڈو کے ساتھ اس کی شادی ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مدر دیش کا نام مہابھارت کے گیارہویں پرب بنام استری پرب میں آتا ہے۔ جہاں پانڈو کے بیٹوں اور پوتوں کا ذکر ہے۔ پانڈو کے پانچ بیٹے تھے۔ تین رانی کنتی کے بطن سے۔ جن کے نام یہ ہیں:۔

یدہشٹر، بھیم، ارجن۔ دوسری رانی مدری راجہ شل کی بہن کے بطن سے سہدیو اور نکل تھے۔ جو دونوں توام پیدا ہوئے تھے لیکن ان پانچوں بھائیوں میں ارجن کے سوا کسی اور بھائی کی اولاد حکمران نہیں ہو سکی۔

مدر دیش کے شاہی خاندان میں صرف پانڈو ہی کی شادی نہیں ہوئی بلکہ اس کے فرزندوں میں سے یدہشٹر اور سہدیو کی شادیاں بھی

[1] راجہ مدر راجہ شل اور ان کی راجکماریوں کا واقعہ مزید تفصیل طلب ہے۔

مدر دیش ہی میں ہوئی تھیں جس کا ثبوت مہابھارت کے گیارھویں پرب کے الفاظ ذیل سے ملتا ہے۔ جدھشٹر کی ایک رانی کا نام دروپدی تھا جس سے بھرت پیدا ہوا۔ دوسری رانی مدر دیش کے شاہی خاندان سے تھی۔ جو اپنے ملک کے نام پر مدری کہلاتی تھی۔ اس سے بودھا پیدا ہوا۔ سہدیو کی ایک بیوی تو پہلے ہی تھی۔ دوسری راجہ مدر دیش کی لڑکی لوہوتر نام تھی۔ ان تین مقامات پر مدر دیش کے لئے مدر دیش ہی کا لفظ درج ہے۔

بعض اور مقامات پر مہابھارت میں اس لفظ کو کسی جگہ مدسنوز نے کسی جگہ مندر شدر اور کہیں منڈاور بھی لکھا گیا ہے

مدر دیش اور راج ترنگنی

مہابھارت کے بعد جس کی تصنیف کو پانچ ہزار سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ مدر دیش کا نام پنڈت کلہن کی راج ترنگنی میں اس موقعہ پر آتا ہے۔ جہاں راجہ بھکشاچر راجہ جے سنگھ والئے کشمیر کے خوف سے کشمیر سے فرار ہو جاتا ہے۔ یہاں چند ملکوں کے ساتھ مدر دیش کا نام اس کی فیاضیوں کی شہرت کی وجہ سے بطور ضرب المثل لکھا گیا ہے۔

لہ ترجمہ مہابھارت فارسی تا اردو میں پرب دوم صفحہ ۲۰

تہ " " " " دوم پرب صفحہ ۶ و ۱۳ او بھیکم پرب صفحہ ۲۵

سہ " " " " بھیکم پرب صفحہ ۲۷

کہ یہ کتاب سب سے پہلے سنسکرت نظم میں لکھی گئی۔ پھر انگریزی میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس کے بعد اردو میں شہ راجہ جے سنگھ کا عہد حکومت ۱۱۲۸ء سے ۱۱۵۴ء تک بیان کیا جاتا ہے کلہن نے اسی کے زمانہ میں راج ترنگنی راجگان کشمیر کے حالات میں لکھی تھی لہ لیکن مہابھارت میں راجہ کرن راجہ شل والئی مدر کو اس کے ملک کی سوشل خرابیوں کا طعن دیتا ہوا دیکھا گیا ہے۔

مدر دیش اور زینہ ترنگنی

راجہ جے سنگھ کے مورخ پنڈت کلہن کے بعد بڈشاہی زمانے کا مورخ جونراج اپنی کتاب راجہ ولی عرف زینہ ترنگنی میں کم سے کم سات جگہ مدر دیش کا ذکر کرتا ہے۔ ایک مرتبہ اس مقام پر لکھتا ہے جب علی شاہ والئی کشمیر حج کو جانا چاہتا ہے۔ اور راجہ مدر دیش اس کو اس ارادے سے باز رکھتا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

مدر دیش کے مغرور راجہ نے اس خیال اور طعن کے خوف سے کہ اس کا داماد یعنی علی شاہ سلطنت چھوڑ کر حج کو جا رہا ہے۔ اور اس کی بیٹی کو ہمیشہ کے لئے اس سے جدا کر رہا ہے۔ بادشاہ کو سلطنت ترک کرنے اور حج سے مشرف ہونے کے ارادہ سے باز رکھا۔ اور کچھ وقفہ کے بعد وہ علی شاہ کو اپنے ہمراہ کشمیر لایا۔

پھر مدر دیش کا ذکر اس موقعہ پر آتا ہے۔ جب علی شاہ اور اس کے بھائی شاہی خاں عرف زین العابدین میں کشمیر کے تاج و تخت کے لئے باقاعدہ جنگ شروع ہوتی ہے۔ اس موقعہ پر مدر دیش کا راجہ علی شاہ کی مدد کو آتا ہے اور اس کو پیغام بھیجتا ہے۔ کہ جب تک ہم تمہاری مدد کو نہ آئیں۔ تم پہاڑ پر ہی مقیم رہو۔

---

[1] اس تاریخ میں ۱۱۴۹ء یعنی راجہ جے سنگھ کے بعد کے حکمرانوں سے لیکر ۱۴۵۹ء تک کے حالات جبکہ بڈشاہ ابھی زندہ تھا لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب بادشاہ کے حکم سے کلہن کی راج ترنگنی کا سلسلہ قائم کرنے کے لئے لکھی گئی تھی۔

[2] دیکھو ترجمہ انگریزی زینہ راج ترنگنی بنام کنگس آف کشمیر مترجمہ جے سی دت ۱۸۹۸ء صفحہ ۱۰

[3] دیکھو ترجمہ انگریزی زینہ راج ترنگنی ترجمہ جے سی دت ۱۸۹۸ء صفحہ ۷۵

پھر مدر دیش کا نام اس جگہ آتا ہے۔ جب زونراج سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ کی اولاد کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ کہ اس کے چار فرزند تھے۔ اور وہ چاروں راجہ مدر کی دو بیٹیوں کے بطن سے تھے۔

زونراج پھر ایک جگہ لکھتا ہے۔ ایک دفعہ گکھڑوں کے سردار نے مالدیو راجہ مدر[2] کو شکست دینے کے بعد گرفتار کر لیا جب بادشاہ کو خبر ہوئی۔ تو اس نے گکھڑوں کی قید سے راجہ کو رہا کرا دیا۔

مدر دیش اور زینہ راج ترنگنی[3]

اس تاریخ میں تین جگہ مختلف مقامات پر مدر دیش کا ذکر آتا ہے۔ اس کا مصنف سلطان حیدر شاہ ابن سلطان بڈشاہ کے عہد حکومت کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے۔ "اس دوران میں راجہ مانک دیو والئے مدر دیش[4] کے زیر کمان اس کی ایک بہادر فوج ترشکوں کے ساتھ لڑائی کرتی ہوئی تباہ ہو گئی۔"

دوسری جگہ۔ سلطان حسن شاہ کی حکومت کا ذکر کرتا ہوا شر ور پنڈت زینہ راج ترنگنی میں لکھتا ہے۔ جب تاتار خاںؒ نے ماجپوری (راجوری) اور والئے مدر راجہ اجے دیو کو بہت تنگ کیا۔ تو ان راجوں نے سلطان حسن شاہ والئے کشمیر سے اعانت طلب کی۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے تازی بٹ بہترین سامان

---

[1] دیکھو ترجمہ انگریزی زینہ راج ترنگنی ترجمہ جے سی دت ۱۸۹۸ء صفحہ ۱۰۸

[2] " " " " " " صفحہ ۸۶

[3] اس کتاب کا مصنف شر ور پنڈت ہے۔ جو پنڈت جونراج مصنف زینہ ترنگنی کا شاگرد ہے۔ یہ کتاب بعہد سلطان فتح شاہ والئے کشمیر $\frac{۱۴۸۶ء}{۸۹۹ھ}$ میں لکھی گئی۔ اس مصنف نے بڈشاہ لیکر فتح شاہ تک پانچ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا [4] دیکھو زینہ راج ترنگنی کا ترجمہ بنام کنگس آف کشمیر مصنفہ جگدیش چندر دت صفحہ ۴ ۱۸۹۸ء تاتار خاں لودی صوبہ لاہور

جنگ سے مسلح فوج لیکر گیا - اور جب ان ممالک کے لوگوں نے شاہی جھنڈے کو دیکھا - تو انہوں نے اپنی مسرت کا اظہار کیا - اور تازی بٹ نے سیالکوٹ اور دوسرے مقامات کو جو تاتارخان (حاکم لاہور) کے ماتحت تھے . تباہ کرکے ملک میں ہلچل مچادی -

تیسری جگہ سلطان محمد شاہ والئے کشمیر کے سلسلہ میں شر یوبر پنڈت مدر کے راجہ پرشرام کا اور اس کی مدری فوج کا ذکر کرتا ہے - اور لکھتا ہے . کہ وہ تاتارخاں کے خوف سے کشمیر میں چلے آئے تھے . اور سادات کشمیر سے جو اس زمانے میں بڑے عروج پر تھے - ان کے دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے تھے - جون رینہ نے ان تعلقات سے خوفزدہ ہوکر ملک میں یہ افواہ پھیلادی کہ "تاتارخاں نے سادات کے نام ایک خط لکھا ہے - کہ مدر والوں کو اپنی دوستی کی آڑ میں فوراً گرفتار کرلو - یہ قصہ طویل ہے مختصر یہ ہے کہ سادات اور راجہ پرشرام کی فوج میں باقاعدہ جنگ ہوتی ہے . سید حسن - غازی امین - اور یاسیم لالہ اور کئی نامور سادات جن کی تعداد راج ترنگنی میں تیس نفر درج ہے مارے جاتے ہیں -

مہابھارت کے زمانہ میں مدر دیش کا محل وقوع

راجہ شل کا نام والئے مندر ور (مدر) کی حیثیت سے مہابھارت کے پانچویں پرب بنام ادوم پرب میں پانڈواں کی جلاوطنی اور بن باسی زندگی ختم کرنے کے بعد اس موقعہ پر آتا ہے - جب دریودھن کے ساتھ ان کی لڑائی ہوتی ہے - راجہ شل جو راجہ پانڈو کا خسر پورہ اور اس کے دو فرزندوں کا حقیقی ماموں تھا - اپنے ملک سے بیشمار لشکر لے کر جس کا پھیلاؤ مہابھارت میں

ك دیکھو رینہ راج ترنگنی کا ترجمہ بنام کنگس آف کشمیر مصنفہ جگدیش چندر دت صفحہ ۲۶۶ - ۲۰۰ -

دو روس تک تباہ کیا ہے۔ ان کی مدد کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ لیکن جونہی دریودھن کو راجہ شل کے آنے کی اطلاع ملتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ وعدے وعید کرکے اپنے ملک میں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور لکھتا ہے۔ کہ میرا ملک آپ کے سر راہ ہے۔ بے مروت سے بعید ہے۔ کہ آپ بالا بالا ہی چلے جائیں۔ شل دریودھن کی دعوت قبول کرلیتا ہے۔ اور دریودھن باتوں ہی باتوں میں اس کو ایسا شیشہ میں اتارتا ہے۔ کہ وہ اپنے بہنوئی راجہ پانڈو اور اپنے بھانجوں تہدیو اور نکل کی امداد کی بجائے ان کے دشمن دریودھن کی امداد پر آمادہ ہو جاتا ہے اور آخر اسی خونریز جنگ میں اپنے بھائی اور چند بیٹوں سمیت کام آجاتا ہے۔

ادوم پرب کے اس مختصر سے اقتباس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ مدردیش کا راجہ اس زمانہ میں شل ہی تھا۔ اور اس کے ملک کی حدود دوریودھن کے ملک سے ملحق تھیں۔ یوں سمجھ لینا شاید زیادہ آسان ہوگا۔ کہ راوی سے اور بقول جنرل کننگھم بیاس سے پار ہو کر دہلی اور دہلی سے پرے تک دریودھن چھایا ہوا تھا۔ اور راوی سے شمال کی طرف سیالکوٹ کوہستان جموں اور جہلم بلکہ اس سے آگے تک شل کی حکومت تھی۔ اس زمانہ میں یہ علاقہ اتر مدرا کہلاتا تھا۔ اور سیالکوٹ سے لاہور تک کے علاقہ کو دکھن مدرا کہتے تھے۔

مہابھارت کے آٹھویں پرب بنام کرن پرب میں پھر راجہ شل کا ذکر آتا ہے۔ اور بڑی تفصیل سے آتا ہے۔ بلکہ اسی پرب میں لکھا ہے۔ کہ شاکل یا شاکوٹ یا شل نگری۔ آپگا ندی کے کنارے واقع ہے اور مہابھارت کے

لہ کلہن پنڈت کی راج ترنگنی کے ترجمہ کے جلد اول کے صفحہ ۲۰۹ پر فوٹ نوٹ ۹۸ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے۔ اپگا ندی کا نام جرنل بھنت پرانک سوسائٹی ۱۹۳۳ء میں بھی درج ہے۔

مترجموں نے اپگانڈی ہی کو ایک ندی بتایا ہے۔ جو سیالکوٹ کی مشہور ندی ہے۔ اور جموں کے پہاڑوں سے نکل کر سیالکوٹ کے ضلع کو شاداب کرتی ہوئی اسی علاقہ میں گم ہو جاتی ہے۔

مہابھارت کے اس پرب میں راجہ شل کا ذکر والئے مدر کی حیثیت سے اس موقعہ پر آتا ہے۔ جب دریودھن راجہ شل کو راجہ کرن کا رتھ بان بننے کا حکم دیتا ہے۔ اور وہ پس و پیش کے بعد بہت سی شرائط کے ساتھ آخر اس کا رتھ بان بننا قبول کر لیتا ہے۔ اسی موقعہ پر کرن اور شل میں تلخ و تُند گفتگو بھی ہو جاتی ہے۔ اور کرن جوش میں آکر شل کو اس کے ملک کی بے غیرتی اور بے شرمی کا طعن دیتا ہوا کہتا ہے کہ تمہارے ملک کی عورتیں جو کھلے منہ پھرا کرتی ہیں۔ تمام عیوب کی مجموعہ ہیں ؎

مندرجہ بالا تمام اقتباسات سے صاف ظاہر ہے۔ کہ مہابھارت میں جس ملک کو مدر اور جس راجہ کو شل لکھا گیا ہے۔ اس کا تعلق پنجاب سے باہر کسی اور ملک سے نہ تھا۔ بلکہ مدر وہی ملک ہے۔ جو پنجاب کی شمالی اور کوہستانی حدود تک پھیلا ہوا تھا۔ اور شل وہی راجہ تھا۔ جو اس ملک کا حکمران تھا۔

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی ایک سرکاری کتاب میں مدر دیش سے کچھ

؎ ترجمہ مہابھارت آٹھواں پرب بنام کرن پرب صفحہ ۵ راجہ کرن نے راجہ شل کے ملک کے جو عیوب بتائے ہیں۔ ان کے متعلق یہ امر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہ مد کے معنی نشئی اشیا کے لئے جاتے ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس ملک کے لوگ چونکہ بہت نشہ اور عرق پینے کے عادی تھے۔ اس لئے اس کو مد کہتے تھے۔ مد سے مدرہ اور مدر وغیرہ کئی الفاظ بنے اور بالآخر یہ ملک مد قوم یعنی مد پینے والے لوگوں کی وجہ سے مدر دیش کہلایا۔

بجانے وقوع کے متعلق جو یہ الفاظ درج ہیں۔ کہ مدرؔ بھونان کے قدیم علاقہ کا نام ہے۔ جو غالبًا بھونان کے جنوب میں واقعہ ہوگا: وہ قطعی غلط ہیں۔

مسلمان مؤرخ اور مدر دیش

کشمیر کے قدیم سنسکرت مورخوں نے جن میں سب سے آخر شریور مصنف راج ترنگنی گزرا ہے۔ اس علاقہ کو جو راوی یا بیاس سے جہلم اور سیالکوٹ بلکہ اس سے آگے شمالی کوہستانوں تک پھیلا ہوا تھا۔ مدر دیش ہی لکھا ہے۔ لیکن کسی مسلمان مورخ نے جو محمود کے زمانہ میں تھے۔ یا ان کے بعد عہد مغلیہ میں۔ اپنی کسی تاریخ میں مدر دیش کا لفظ تک بھی نہیں لکھا۔ حالانکہ ان مورخوں میں بعض کشمیر کے قدیم مورخوں سے بھی پہلے گزرے ہیں۔ جیسے البیرونی وغیرہ اور بعض مسلمان مؤرخ کشمیر کے ان سنسکرت نویسوں کے ہم عہد و ہمعصر تھے۔ جیسے مصنف ظفرنامہ تیموری مصنف تاریخ فیروز شاہی (ضیا برنی) وغیرہ اکبر کے زمانہ میں طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ لکھی گئی ہیں۔ ان میں بھی مدر دیش کا لفظ کہیں موجود نہیں ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے۔ کہ گو خاص کشمیر کے قدیم پنڈت مورخ مدر دیش کا لفظ ہی لکھا کرتے تھے۔ لیکن ہندوستانی مورخوں کے زمانہ میں یہ لفظ قطعًا متروک ہو چکا تھا۔ بلکہ عہد اسلامیہ میں کشمیر کے ہندو مورخ بھی کسی جگہ مدر دیش کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔

مدر دیش کا موجودہ محل وقوع

جنرل کننگھم کشمیر کے جغرافیہ قدیم میں ایک جگہ مدر دیش کے متعلق لکھتے ہیں یہ وسط پنجاب کا پرانا نام معلوم ہوتا ہے۔ جو دریائے بیاس۔ اور چناب اور جہلم

ؔ زمانہ اردو کورس جماعت ہفتم مرتبہ سررشتہ تعلیم پنجاب صفحہ ۲۱ در بیان پانڈو کورو

کے درمیان واقعہ تھا۔ اگر یہ نظریہ صحیح ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کوہستان جموں کا وہ حصہ بھی جو چناب سے ملحق ہے۔ مدر دیش میں شامل تھا۔

راجہ شل کا دارالحکومت چونکہ شاکل یا سیالکوٹ ہی سب مورخوں نے بیان کیا ہے۔ اس لئے سیالکوٹ کی جس قدر تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ ان سب میں سیالکوٹ کے علاقہ ہی کو مدر دیش بتایا گیا ہے۔ حالانکہ مدر دیش سیالکوٹ کے موجودہ علاقہ سے بہت زیادہ وسیع تھا۔ اور سیالکوٹ کے محدود علاقہ کا فرمانروا راجہ شل اس قدر عظیم الشان لشکر نہیں رکھ سکتا تھا جو جنگ کورو پانڈو کے ایام میں دو کوس تک کے وسیع میدان میں بمشکل سما سکتا۔

مصنف گلاب نامہ نے مدر دیش کا علاقہ سارا پنجاب بتایا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ راجہ چندر ہاس والئے مدر دیش (پنجاب) سے جب راجہ باہولوچن والئے جموں کی لڑائی ہوئی۔ تو باہولوچن کے قتل کے بعد اس کے بھائی جامبولوچن نے جو شہر جموں کا بانی تھا۔ راجہ چندر ہاس سے جنگ کی۔ اور اس کو قتل کر کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔ اور پنجاب اور اطراف و اکناف کے کئی علاقے اپنے قبضہ میں لے آیا۔

اس واقعہ سے کئی صدیوں بعد راجگان سیالکوٹ اور راجگان جموں میں لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ کبھی سیالکوٹ والئے جموں کا کچھ علاقہ لے لیتے

۱؎ دیوان کرپارام مدارالمہام مہاراجہ سر رنبیر سنگھ آنجہانی والئے جموں و کشمیر اپنی تصنیف گلاب نامہ فارسی سنہ تالیف ۱۹۲۲ء ب میں لکھتے ہیں۔ راجہ شل نے جموں سے چھ فرسنگ کے فاصلے پر ایک سنگین قلعہ بنام شلکوٹ تیار کر کے اپنا دارالعمارت بنایا اور یورش ہائے متواترہ سے جموں کو خراب کرتا رہا۔ ۲؎ گلاب نامہ میں لکھا ہے کہ راجہ شل کی ولایت پنجاب سے قندہار تک پھیلی ہوئی تھی۔

اور کبھی جموں والے سیالکوٹ کے کسی حصے پر قابض ہو جاتے تھے۔

مدر دیش کا علاقہ راجہ شل کے زمانہ میں یقیناً سارے پنجاب پر حاوی ہوگا لیکن مہابھارت سے اس کی صحیح وسعت مملکت کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ نہ راج ترنگنی ہی سے مدر دیش کا صحیح محل وقوع معلوم ہوسکتا ہے۔ البتہ پنڈت زونراج کی زینہ ترنگنی اور شریور کی زینہ راج ترنگنی سے اتنا معلوم ہوسکا ہے کہ ان کے عہد میں جس کو آج قریباً ساڑھے پانچسو سال گزر چکے ہیں صرف کوہستان جموں کا نام مدر دیش تھا۔ چنانچہ راجہ مالدیو اور راجہ مانک دیو اور راجہ عجب دیو یا اجے دیو جن کا وہ والیان مدر کی حیثیت سے ذکر کرتا ہے۔ جموں ہی کے راجہ تھے۔

راجہ مالدیو[1] کے متعلق زینہ ترنگنی میں لکھا ہے۔ کہ اس راجہ کے ساتھ بدشاہ کے بہت اچھے تعلقات تھے۔

راجہ مالدیو کا سال وفات ۱۴۵۶ء ب ہے۔ آج ۱۹۹۶ء ب ہے۔ اس حساب سے اس واقعہ کو ۵۴۰ سال گزر چکے ہیں۔ بدشاہ ۸۲۶ھ میں۔

[1] چالیس سال کی حکومت کے بعد یہ راجہ ۱۴۵۶ء ب میں قتل ہوگیا۔ تیمور گورگانی کے زمانہ میں بھی جموں کا یہی راجہ تھا۔ چنانچہ مصنف گلاب نامہ لکھتا ہے۔ "جب ۸۰۱ھ میں امیر تیمور ملک ہند کو تباہ کرکے مراجعت سمرقند کے ارادہ سے "چوں متصل کوہستان جموں نزدل رایت اقبال گشت راجہ مالدیو معہ جماعہ راجپوتاں پیکار طلب بہ عزم شب خون بہ قشون شتافتہ دکلز مین جموں را از لشکر گورگان کان گورساختہ" بدشاہ کی تخت نشینی اور تیمور کی وفات میں صرف ۱۶-۱۷ سال کا فرق ہے۔

تخت نشین ہوتا ہے۔ اور ۸۰۹ھ میں انتقال کر جاتا ہے۔ اس زمانہ کو بھی آج ۵۳۳ سال ہو چکے ہیں۔ گویا جس مالدیو کو زونراج نے راجہ مدر لکھا ہے۔ اسی مالدیو کو مصنف تاریخ گلاب نامہ اور مصنف تاریخ راجپوتان پنجاب راجہ جموں لکھتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر یہ وہی راجہ مالدیو ہے جو بڈشاہ کے زمانہ میں جموں کا حکمران تھا۔ جس کو سنسکرت مصنفوں نے راجہ مدر اور فارسی و اردو کے مصنفوں نے راجہ جموں لکھا ہے۔

پھر اس کے بعد سلطان حیدر شاہ کے زمانہ میں شری ور پنڈت راجہ مانک دیو کو اور بہ زمانہ سلطان حسن شاہ راجہ اجے دیو یا عجب دیو کو مدر دیش کا راجہ لکھتا ہے۔ راجہ عجب دیو ہمیر دیو عرف بھیم دیو[1] کا فرزند تھا اور بھیم دیو راجہ پال دیو کا بیٹا تھا۔ راجہ بھیم دیو کا ذکر طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ میں بھی ہے۔ یہ راجہ سید مبارک شاہ والئے دہلی ۸۲۴ھ لغایت ۸۳۷ھ کے عہد میں زندہ تھا۔ اور جنگ کے دوران میں جسرت گکھڑ کے ہاتھ سے قتل ہو گیا تھا۔

راجہ اجے دیو یا عجب دیو وہی راجہ ہے۔ جس نے تاتار خاں لودی حاکم لاہور کے خوف سے سلطان حسن شاہ والئے کشمیر سے مدد طلب کی تھی۔ اور اس نے اپنے سپہ سالار تازی بٹ کو اس کی اعانت کے لئے روانہ کیا تھا۔

---

[1] راجہ بھیم دیو کے دو اور بھائی بھی تھے ایک چندن دیو دوسرا ساگر دیو۔ ان میں چندن دیو کے دو فرزند تھے۔ شہزادہ سلطان اس زمانہ میں دہلی پر سادات خاندان کی حکومت تھی اور راجہ مالدیو کی اولاد سے اکثر جموال راجپوت دربار دہلی میں ملازم تھے۔ علاقہ جموں کے شہزادانیہ جموال راجپوت اسی شہزادے کی اولاد سے ہیں۔ از تاریخ راجگان جموال جلد دوم صفحہ ۲۴۷۔

مندرجہ صدر تمام واقعات جن کا تعلق مہابھارت کے زمانہ سے ہے اس بات کی زندہ شہادت ہیں۔ کہ سنسکرت زبان کے مورخین کشمیر نے جس مدر دیش کا ذکر کیا ہے۔ وہ شمالی پنجاب اور کوہستان جموں ہی کا علاقہ ہے۔ اور جس جموں کا ذکر اردو فارسی کے مورخوں نے علی شاہ اور بڈشاہ کے زمانہ میں کیا ہے۔ وہ مدر[1] ہی کے علاقہ میں ہے۔

---

[1] پروفیسر گلشن رائے (لاہور) اپنے ایک مضمون "سیاسیات کشمیر میں آئینی اصلاحات" میں لکھتے ہیں۔ پرانے زمانہ میں علاقہ جموں کا نام اتر مدرا تھا۔ اور لاہور کو دکھن مدرا کہتے تھے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ علاقہ جموں مدر دیش ہی کے ایک حصہ کا نام تھا۔ (یہ مضمون ۱۴۔ اگست ۱۹۳۰ء کے اخبار ہمدرد سرینگر کشمیر میں شائع ہوا ہے)

ضمیمہ ۴

ترشک

پنڈت کلہن کی راج ترنگنی میں یہ لفظ کئی مقامات پر آتا ہے۔
سب سے پہلے ہم یہ لفظ راجہ سنگرام راج (۱۰۰۳ء تا ۱۰۲۸ء) کے عہد میں اس موقعہ پر دیکھتے ہیں۔ جہاں راجہ سنگرام راج محمود غزنوی کی فوج کا حملہ روکنے کے لئے اپنے چند عیاش اور نکمے افسروں کو بھیجتا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔ کہ جب ان کو ترشکوں کے ساتھ لڑنے کو بھیجا گیا۔ تو وہ بھی ننگ کی طرح بھاگ کر اپنے ملک کو واپس آگئے اس موقعہ پر راج ترنگنی کے ترجمہ کا حاشیہ ۲ ص ۲۵۸ مظہر ہے کہ اس جگہ مراد محمود کے کشمیر پر چڑھائی کرنے سے ہے۔ اور اس کی یہ وہ مہم تھی جس میں وہ لوہر یعنی لوہ کوٹ (علاقہ پونچھ) تک پہنچ گیا تھا۔ ترلوچن پال کو بھی جو اُود بانڈپور (اُند یا اُہند) کے شاہی خاندان کا آخری فرمانروا تھا۔ محمود غزنوی ہی نے تباہ کیا ہے۔ اور چونکہ اس کی فوج میں زیادہ تر ترکستانی نسل کے سپاہی تھے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ترشکا کا لفظ بھی ترکستان ہی سے نکلا ہے۔

راج ترنگنی میں ترشک اور ترشکوں کا لفظ پھر راجہ ہرش (۱۰۸۹ء تا ۱۱۰۱ء) کے عہد میں آتا ہے۔ چونکہ یہ راجہ بتوں اور مورتیوں اور مندروں اور مقدس مقامات کی بے حرمتی کرتا رہتا تھا۔ اس پر کلہن لکھتا ہے کسی گاؤں قصبہ یا شہر میں کوئی بھی ایسا مندر نہ تھا۔ جسے اس ترشک راجہ ہرش نے ناپاک نہ کیا ہو۔

یہاں ترشک کا لفظ بطور حقارت لکھا گیا ہے۔
اور چونکہ مسلمان ہی بت شکن اور مورتیوں کے نہ پوجنے والے تھے۔ اس لئے ترشک سے ہر موقعہ پر مسلمان ہی مراد لی جاتی ہے۔

راجہ نہ صرف بت شکن ہی تھا۔ بلکہ وہ سو سو سپاہیوں کے دستہ کے ترشک کپتانوں کو روپیہ کی مدد بھی دیا کرتا تھا۔ راج ترنگنی جلد اول کے حاشیہ ۵۰۵ میں لکھا ہے۔ کہ اس میں کچھ شبہ نہیں۔ کہ کلہن کا اشارہ ان مسلمان فوجی افسروں کی طرف ہے۔ جو ہرش کی فوج میں ملازم تھے۔ بلکہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان آج سے قریباً ساڑھے نو سو سال پہلے گو کشمیر میں مستقل طور پر آباد نہ تھے۔ تاہم وہ کشمیر میں موجود ضرور تھے۔ اور فوجی حیثیت میں وہاں اپنا اقتدار بھی رکھتے تھے

راج ترنگنی کا مصنف پنڈت کلہن ترشک لوگوں کا ذکر ۱۱۲۰ء سے ۱۱۲۱ء کے درمیان بھی کرتا ہے۔ جب کشمیر پر راجہ بھکشاچر کی حکومت تھی۔ وہ لکھتا ہے۔ جب راجہ نے لوہر (علاقہ پونچھ) پر جہاں راجہ سسل پناہ گزین تھا چڑھائی کرنے کے لئے اپنی دوسری فوج کے ہمراہ ترشکوں کی ایک فوج بھی بھیجی۔ تو ترشک فوج کا ہر ایک سوار نخوت و غرور کے لہجہ میں کہتا تھا۔ کہ میں رسی سے باندھکر سسل کو گھسیٹتا ہوا لاؤں گا۔ اس پر

حاشیہ ۲۶ میں درج ہے۔ کہ ترشکوں سے مراد اس جگہ بلاشبہ پنجاب اور جنوبی پہاڑوں کے مسلمانوں سے ہے۔

پھر کلہن آٹھویں ترنگ میں لکھتا ہے۔ کملیہ کا چھوٹا راجکمار سنگیہ ایک ایسی کشتری نسل سے تھا۔ جس کے آدمی ترشکوں کے علاقہ میں رہنے کے باعث سوائے ظلم کے اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔

اس زمانہ میں پنجاب میں مسلمان بادشاہوں کی حکومت تھی۔ اور کلہن کا اشارہ ہندوستان کے اسلامی ممالک ہی کی طرف تھا۔

علی شاہ کے ترشکوں سے بھی مراد مسلمانوں ہی سے ہے۔

سکھوں کی مذہبی کتابوں میں بھی اکثر مقامات پر مسلمانوں کے لفظ کی بجائے ترکوں کا ہی لفظ درج ہے۔ اور ترک اور ترشک ایک ہی بات ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ کشمیر کے سنسکرت مصنفوں نے جہاں کہیں ترشک قوم کا ذکر کیا ہے۔ وہاں ان کی مراد مسلمان قوم ہی سے ہے۔

ضمیمہ ۵

قوم چک

اس قوم کے حسب نسب کے متعلق کشمیر کی تاریخوں میں جو واقعہ درج ہے۔ وہ کسی مورخ کے نزدیک بھی قابل قبول نہیں ہے۔ راقم الحروف نے بھی تاریخ اقوام کشمیر کے صفحات ۳۹۷ تا ۳۹۹ میں جہاں اس قوم کا ذکر کیا ہے۔ اس واقعہ کو غیر معتبر اور ناقابل قبول سمجھکر درج نہیں کیا۔

لیکن اکثر اصحاب نے تاریخ اقوام کشمیر کے مطالعہ کے بعد قوم چک کے نسب کے بارے میں لکھا ہے۔ کہ اگر اس کو غلط سمجھا گیا تھا۔ تو اس کو درج کرنے کے بعد اس کی تردید کر دینا چاہئے تھی۔ بعض اصحاب نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ تاریخ اقوام کشمیر کی تصنیف کے بعد اس قوم کے بارہ میں جس نے صدیوں تک کشمیر میں تلاطم برپا رکھا ہے۔ اور تیس بتیس سال کے قریب مستقل بادشاہی بھی کی ہے۔ اگر کچھ اور معلوم ہو۔ تو اس سے آگاہی بخشی جائے۔

اب چونکہ اس کتاب میں قوم چک کا ذکر آگیا ہے۔ اس لئے اسی موقع پر کشمیر کی تاریخوں کا بیان اور اس قوم کے مزید حالات جو معلوم ہو سکے ہیں ضمیمہ کے طور پر درج کئے جاتے ہیں۔

راجگان قدیم کے آخری دور (۱۳۰۰ء لغایت ۱۳۲۴ء) میں لنگر چک[1] نام ایک شخص اپنے اہل و عیال سمیت دردستان[2] سے کشمیر آیا۔ خواجہ محمد اعظم دیدہ مری تاریخ اعظمی میں لکھتے ہیں۔ اس کے نسب کے متعلق بہت کچھ اختلاف ہے۔ لیکن جو بات نقارۂ خدا ہو کر زبان خلق پر مشہور ہے۔ وہ یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں ایک عورت دردستان میں پانی لانے کے لئے ہر روز نہر پر جایا کرتی تھی۔ ایک جن اس پر عاشق ہو گیا۔ اور ان کا ارتباط باہمی یہاں تک بڑھا کہ اس کے بطن سے ایک قوی ہیکل انسان پیدا ہوا جس کا قد و قامت ڈیل ڈول اور وضع قطع عام انسانوں سے بالکل مختلف تھی۔ اس نے اپنی بے مثال قوت و شجاعت سے دوسری اقوام پر غلبہ حاصل کر لیا۔ لنگر چک جو سب سے پہلے کشمیر میں آیا۔ اس کی چھٹی پشت سے تھا۔

چک قوم سے اہل کشمیر نے ہمیشہ تکلیف اٹھائی ہے۔ اس نے نہ صرف کشمیر کے مسلمان بادشاہوں کا تختہ الٹ دیا۔ بلکہ بر سر اجلاس شہمیری خاندان کے آخری بادشاہ سلطان حبیب شاہ کے سر پر سے تاج اتار کر اپنے سردار غازی عرف غازی شاہ چک کے سر پر رکھدیا۔ اس واقعہ سے شہمیری خاندان اور رعایائے کشمیر کے دلوں کو بڑا صدمہ پہنچا۔ اس کے علاوہ

---

[1] زینہ راج ترنگنی میں زونراج نے اس کا نام النکا چکر لکھا ہے۔
[2] گلگت۔ چیلاس اور ملحقات۔

جب سلاطین کشمیر کے مختلف زمانوں میں ان کا عروج ہوتا رہا۔ تو امور سلطنت میں مداخلت کی وجہ سے بعض کشمیری خاندانوں کی تباہیاں ہوتی رہیں۔ اور جب چک بادشاہ نے شیعہ مذہب اختیار کر لیا۔ تو ملک میں ایک فریق کی بجائے مسلمانوں کے دو فریق ہو گئے۔ اور مذہبی تعصبات کی وجہ سے ان میں فتنہ و فساد اور قتل و غارت نے یہاں تک ترقی کی۔ کہ کوئی شخص بھی اپنی جان کو محفوظ نہ سمجھتا تھا۔ اس بنا پر ممکن ہے کہ کسی دل جلے نے ان کے حسب نسب کا فسانہ جن کی صورت میں گھڑ لیا ہو۔ بلکہ ایک جگہ تو جن کی بجائے اژدہا بھی لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ شخص جو اس خاندان کا بانی بیان کیا جاتا ہے۔ غیر معمولی قوت رکھتا ہو اور قد و قامت بھی اس کا عام انسانوں سے بڑا ہو۔ اسی لئے اس کو مافوق الانسان سمجھ کر اس کا تعلق کسی جن سے کر دیا ہو گا۔ مگر کسی کا غیر معمولی قد و قامت کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔[1]

لارنس صاحب نے بھی ویلی آف کشمیر میں جن اور اژدہے کے واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ یہ لکھا ہے۔ کہ "چک ذات کے متعلق بہت سے شکوک ہیں۔ اور اگرچہ صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکتا۔ کہ ان کی اصل کیا تھی لیکن تم اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ کشمیر کے ہندوؤں سے مسلمان نہیں ہوئے بلکہ ان کا نسب چیلاس کی درد قوم سے جا کر ملتا ہے۔

[1] ۱۹۰۳ء کے دربار دہلی میں بعہد لارڈ کرزن ہز ہائینس مہاراجہ سر پرتاپ سنگھ والئے جموں و کشمیر اپنی ریاست کا ایک آدمی لیگئے تھے جس کا قد آٹھ فٹ سے بھی زیادہ تھا اور اس زمانے کے والیسرائے لارڈ کرزن اور ان کی لیڈی اور دیگر ہزارہا لوگوں نے بھی اس کو دیکھا مہاراجہ صاحب نے اس کا کچھ وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا مگر وہ سال دو سال کے بعد ۲۴-۲۵ سال ہی کی عمر میں انتقال کر گیا۔

تاریخ حسن (غیر مطبوعہ) میں جو درج ہے۔ کہ اس قوم کے بزرگ عہد سلاطین کشمیر میں دردستان سے وارد کشمیر ہوئے۔ یہ قطعی غلط ہے بلکہ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے۔ وہ ہندو راجگان قدیم بالخصوص اچہ بہدلو کے عہد میں کشمیر میں آئے تھے۔ البتہ ان کے قرب سلطانی حاصل کرنے اور بادشاہی ملازمت میں داخل ہونے کے لئے تاریخ خواجہ اعظمی کی یہ تحریر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کہ "لنگر چاک ندبور در زمان سلطان شمس الدین شہمیری داخل ملازمان پادشاہی شد۔"

ان بیانات سے اور دیگر تاریخوں کے حوالوں سے جن کو بوجہ طوالت نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ چاک قوم کا وطن قدیم ملک دردستان ہے۔ دردستان کس ملک اور کس علاقہ کا نام ہے۔ اس کی تصدیق کے لئے جب ہم کشمیر قدیم کے نقشہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہمیں ایک طرف کھوئی ہامہ[1] کے اوپر اور دوسری طرف لولاب اور لار (پھاگ)[2] کے اوپر جا کر دردیش لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ جس کے ساتھ ساتھ دریائے کرشنا (کشن گنگا) بہتا چلا جاتا ہے۔ اسی دردیش یا دردستان میں گلگت لداخ وغیرہ واقع ہیں اور اس کے ساتھ ہی چیلاس اور چترال کا علاقہ ملتا ہے۔

اس سے لارنس صاحب کی یہ تحقیق صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کہ ان کا نسب چیلاس کی درد قوم سے ہے سٹائن صاحب کے ایک بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ البیرونی کی کتاب الہند کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔ بارہ مولا کی گھنڈ سے وادیٔ کشمیر میں داخل ہو کر جو کھلا میدان آتا ہے۔ جس میں

---

[1] قدیم نام کھویا آشرم ملک لولاب۔ [2] علاقہ گاندربل سے آگے وادی واانگت۔

دودن کے کوچ کے اندر بائیں طرف کوہستان بوتوا ورشمیلان آتے ہیں۔ جہاں بھٹ دریاں نامی ترکی قبائل آباد ہیں۔ ان کے فرمانروا کا لقب بھٹ شاہ ہے یہ اشارہ اس سلسلہ کوہ کی طرف ہے جو کشمیر کے شمال اور شمال مغرب میں واقع ہے۔ اور جو علاقہ درد اور بلتستان کی طرف سے اس کی حدود کا کام دیتا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے۔ ممکن ہے۔ البیرونی کی مراد گلگت اور لداخ کے بھوٹوں سے ہے۔ جن کو کشمیری بھٹہ کہتے ہیں۔ البیرونی نے ان لوگوں کی زبان بھی ترکی ہی ظاہر کی ہے۔ اور ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ کشمیر کا مشرقی علاقہ تبتی ترکوں کے قبضہ میں ہے جن سے مراد صاف طور پر لداخ اور نواحی علاقوں کے تبتیوں سے ہے سنسکرت کی تاریخوں میں بھی جیسا کہ جغرافیہ قدیم کشمیر ملحقہ ترجمہ راج ترنگنی میں لکھا ہے۔ بھٹ کا لفظ لداخ اور بلتستان (سکردو) کے تبتی نسل کے لوگوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

البیرونی جو سلطان غزنوی کے ساتھ ہندوستان آتا رہا ہے۔ گو محمود کی طرح کشمیر میں داخل نہیں ہو سکا۔ لیکن پونچھ کے علاقہ کوٹ (لوہرین) کا محاصرہ کرنے کی وجہ سے چونکہ غزنوی فوجوں کو کافی عرصہ تک نواح کشمیر میں رہنا پڑا تھا۔ اس لئے البیرونی جو کچھ کشمیر کے متعلق لکھتا ہے۔ وہ کشمیر اور اس کے ملحقات کے جغرافیائی حالات سے پورا پورا واقف معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس سے وہ اس قسم کے حالات دریافت کرتا ہے۔ وہ بھی کشمیر اور اس کے ملحقات کے جغرافیائی حالات سے باخبر نظر آتا ہے۔ اسی لئے البیرونی کے بیانات کی قریباً سب مورخوں نے تصدیق و تائید کی ہے۔ چنانچہ لداخ کے علاوہ وہ دردستان میں گلگت۔ ہنزہ اور شلتاش کا ذکر بھی کرتا ہے۔ اور یہ وہی مقامات ہیں۔ جن کے نام گلگت۔ استور۔

اور چیلاس ہیں۔ اس لئے بحوالہ جغرافیہ قدیم کشمیر اس میں کوئی شبہ نہیں۔ کہ کشمیر کے شمال مغربی علاقہ میں جن لوگوں کو ترکی قبائل ظاہر کیا گیا ہے۔ وہ دردستان اور بلتستان ہی کے رہنے والے ہیں۔ اور چک قوم جس کا وطن تمام مورخوں نے دردستان تسلیم کیا ہے۔ انہی ترکی قبائل میں سے ہیں۔ ایک اور بات بھی اس شبہ کی موید ہے۔ جو یہ ہے کہ ضلع مظفر آباد کشمیر میں بھی جس کی حدود دارشہ وضلع ہزارہ۔ چترال اور یاغستان سے ملتی ہیں۔ اور جس کے طویل حصہ میں دردستان کا دریائے کرشنا ٹھاٹھیں مارتا ہوا دومیل کے مقام پر جاکر وتستہ سے مل جاتا ہے۔ ایک ترک قوم آباد ہے۔ جو صدیوں سے وہاں مقیم چلی آتی ہے۔ چونکہ اس ضلع کی حدود بھی چیلاس وغیرہ سے ملتی ہیں۔ اس لئے ممکن ہے۔ کہ چیلاس اور دردستان کے چک اور ضلع مظفر آباد کے ترک ایک ہی نسل سے ہوں۔ بہر حال یہ معاملہ ابھی مزید تحقیق کا محتاج ہے۔

---

۵ مولوی عبدالواحد مدیر اخبار اصلاح سری نگر جنہوں نے سیاحت کے شوق میں کشمیر اور ملحقات کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے اخبار اصلاح میں مظفر آباد کی سرحدات کا دورہ کرتے ہوئے درہ کاغان اور علاقہ منور کے متعلق لکھتے ہیں: "اس درہ میں زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی ہے۔ مالک اراضیات اور عام طور پر سادات یا سواتی لوگ ہیں۔ یہ علاقہ پہلے ترک حکمرانوں کے ماتحت تھا۔ بعد ازاں سید جلال بخاری نے سواتی لوگوں کی امداد سے ترکوں کو یہاں سے نکال دیا۔ اور سواتی اور سادات درہ کاغان اور علاقہ منور پر قابض ہو گئے۔ درہ کاغان بالاکوٹ سے جہاں سید احمد بریلوی کا مزار ہے۔ (بقیہ حاشیہ دیکھیے صفحہ ۵۰۱ پر)

ایک بات باقی رہ گئی ہے۔ کہ چک قوم کا نام کس طرح مشہور ہو گیا۔ چک نام لنگر چک کے زمانہ سے جس کو آج قریباً ساڑھے چھ سو سال ہو گئے تاریخوں میں نظر آرہا ہے۔ اس لفظ کی اصلیت کے متعلق قدیم وجدید مورخوں میں سے کسی نے توجہ نہیں کی۔ اس لئے جب کوئی بنیاد ہی نظر نہیں آتی تو اس پر عمارت کھڑی کرنا تو اور بھی مشکل ہے۔ تاہم اس قدر قیاس کہتا ہے۔ کہ چک کسی ترکی لفظ کا خواہ وہ ذاتی تھا یا توصیفی کچھ بگڑا ہوا ڈھانچہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے۔ کہ زینہ راج ترنگنی میں لنگر چک کا نام النگر چکر درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چک لفظ چکر کا خلاصہ ہے۔ لیکن چکر کا کیا مطلب ہے۔ اس کے متعلق زینہ راج ترنگنی بھی خاموش ہے

چک قوم کے بزرگ جو تبتی قبائل میں سے تھے۔ بت پرست تھے یا مسلمان؟ چونکہ وہ بہت قدیم زمانہ سے وہاں آباد چلے آتے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے۔ وہ بت پرست ہوں۔ یا اگر زیادہ صاف لکھا جائے۔ تو شاید ان کا تعلق بدھ مت سے ہو۔ لیکن وہ مسلمان کب ہوئے۔ اس کے متعلق کوئی تاریخی واقفیت بہم نہیں پہنچتی۔ کشمیر میں چک قوم کے دو خاندان ابتدا میں آئے ہیں۔ ایک خاندان کا بانی لنگر چک تھا۔ دوسرے کا ہمت چک یا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۰۰) شروع ہو کر ۹۲ میل کے نشان پر جہاں سے بادو سرگلی شروع ہوتی ہے۔ ختم ہوتا ہے۔ ضلع مظفر آباد کی ترک قوم غالباً درہ کاغان کی بسنے والی ترک قوم ہی ہے۔ جس کو سید جلال بخاری نے جلاوطنی پر مجبور کر دیا تھا۔

ہست چک جس خاندان نے کشمیر میں قریباً پونے دوسو سال کی امامت کے بعد آخر کا کشمیر کے تخت وتاج پر قبضہ کرلیا۔ وہ لنگر چک کے فرزند پانڈو چک کی ذریات سے تھا۔ لیکن نہ لنگر چک یا النکا چکر کے نام سے اور نہ پانڈو چک کے نام سے ان کا مسلمان ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ پانڈو چک کی اولاد کے نام البتہ مسلمانوں سے ملتے ہیں۔ لیکن اس کے بیٹے حسین چک کے ایک پوتے کا نام ہیر شنکر چک آتا ہے۔ جو ہندوانہ نام ہے۔ ان کے قبول اسلام کے زمانے پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔ ممکن ہے۔ کشمیر ہی میں آکر انہوں نے اسلام قبول کیا ہو۔ اس قوم کے سیاسی حالات چونکہ کشمیر کی تاریخوں اور تاریخ اقوام کشمیر میں بھی درج ہیں۔ اس لئے اس قصہ کو یہیں ختم کیا جاتا ہے۔

چک خاندان کے بادشاہوں میں یوں تو سب اہل علم تھے۔ لیکن چند ایک ان میں شاعر بھی گزرے ہیں۔ حسین شاہ چک (وفات ۹۷۷ھ) کے دو شعر حسب ذیل ہیں ؎

حماں کردم تیغ و لبستہ خنجر یار مے آید
دلا برخیز کارے کن کہ جاں درکارے آید

آں ترک آل پوش سوار سمند شد
یاراں حذر کنید کہ آتش بلند شد

یوسف شاہ (۹۸۶ھ) فارسی و کشمیری دونوں زبانوں کا شاعر تھا۔ اس کا ایک فارسی شعر ہے ؎

لیلیٰ جنازہ رابر مجنوں بہ خود تراند
زور کمند جذبۂ معجز نمائے اوست

جہانگیر کے عہد میں جس انبہ خاں نے شیر افگن خاں کو بردوان میں قتل کیا تھا وہ بھی چک خاندان کا ایک شہزادہ تھا۔

چک قوم نے بڑے بڑے جوانمرد۔ شہزور اور شجاع فرزند پیدا کئے ہیں۔

ضمیمہ ۶

مزار کلاں شیخ بہاؤ الدین گنج بخش

اور اس کی چند اندرونی قبریں

اس مزار اور قبرستان کا احاطہ مزار کلاں کے نام سے مشہور ہے۔ اس احاطہ قبرستان میں جو دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اور قلعہ ناگر نگر دہری پربت کی دیوار کے نیچے تک چلا گیا ہے۔ بڑے بڑے عالی دماغ امراء، وزراء، علماء اور نامور خواتین اور شاہی بیگمات دفن ہیں۔ اس احاطہ کے اندر ایک اور چھوٹا سا احاطہ ہے۔ جو سیدواری قبرستان کہلاتا ہے۔ اس میں تقریباً ساٹھ قبروں کے نشان ملتے ہیں۔ بہت سی قبروں کے پتھر زمین کے اندر دھنسے ہوئے ہیں۔ کئی قبروں کے پتھر گرمی کی حدت سے پھٹ چکے ہیں۔ چند قبروں کے تعویذوں پر صاحبان قبور کے نام اور کچھ اشعار درج ہیں۔ لیکن پتھروں کے پھٹ جانے کی وجہ سے صاف نہیں پڑھے جاتے۔

قبر حرم سلطان حسن شاہ فرمانروائے کشمیر

اس چھوٹے سے قبرستان میں سادات بیہقی اور بعض والسنگان

خاندان شاہی کی قبریں ہیں۔ ہیبت خان نواسہ سلطان زین العابدین حضرت مخدومہ خاتون (بڈشاہ کی بھیتی بیگم) اور حرم سلطان حسن شاہ (کہ نام اس کا درج نہیں ہے) اور کئی اور سادات اور متعلقین خاندان شاہی اسی جگہ خاک میں سوئے پڑے ہیں۔ حرم سلطان حسن شاہ کے تعویذی پتھر پر ایک طرف حرم سلطان حسن کھدا ہوا ہے۔ اور بطرف مشرق ؎

ہست دَور فلک برائے جفا　　کاسۂ درد راکجاست صفا

اور بطرف مغرب ؎

ہر کہ آمد بہ آہ و نالہ برفت　　اے جہاں از تو کس ندید وفا

درج ہے۔ شریورا اپنی راج ترنگنی میں سلطان حسن شاہ کے حالات لکھتا ہوا ترنگ سوم شلوک ۲۰۱ میں اس کی ایک بیگم مبارک خاتون کا ذکر کرتا ہے چونکہ اس کا مزار سادات بیہقیہ میں ہے۔ اس لئے اغلب ہے کہ وہ بیگم سادات بیہقیہ ہی سے ہو۔

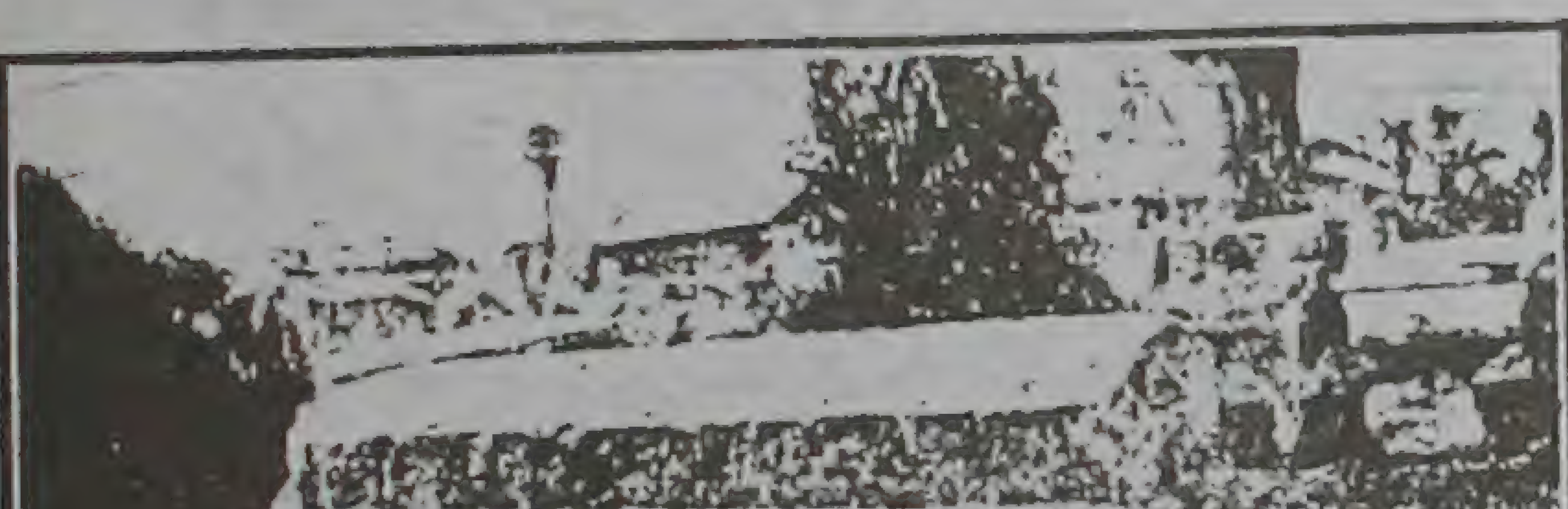
قبر حافظہ مریم مصاحبہ خاص شہزادی زیب النسا بیگم

اس چھوٹے سے احاطہ قبور کے باہر اور مزار کلاں کے احاطے کے اندر حافظہ مریم بیگم مصاحبہ وانیسہ خاص زیب النساء بیگم بنت عالمگیر بادشاہ کی قبر بھی ایک بلند چبوترہ پر ہے۔ قبر کے سرہانے کا پتھر دو ٹکڑے ہو چکا ہے۔ اور قبر سے الگ بکھرا پڑا ہے۔ لیکن اس کے حروف بالکل صاف ہیں۔ اور اچھی طرح پڑھے جاتے ہیں۔ مگر آثار اس قسم کے ہیں۔ کہ یہ ٹوٹے ہوئے پتھر بھی شاید زیادہ دیر تک سلامت نہ رہ سکیں۔ اور پھر اگر کوئی ان کو جوڑنا بھی چاہے گا تو جُڑ نہ سکیں گے۔

شعر ؎



ہیبت خاں قرلغ کی قبر کا دوسرا پہلو



ہیبت خاں قرلغ نواسہ بڈشاہ کی قبر کا ایک پہلو

شفیتہ اب دل کے ٹکڑے جوڑنے سے بھی نہیں جڑتے
وہ شاید کھیل سمجھے تھے شکست شیشۂ دل کو

اس لئے اس کتبہ کے اشعار کو ایک یادگار کے طور پر یہاں درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

از جہاں رفت مریم دوراں — برد با خویش خلیۂ ایماں
بیست و ششم ربیع الثانی بود — سفر از دار بے مدار نمود
دفن بعد از نماز جمعہ شد است — ہر کہ دیدہ بہ تعزیہ بنشست
نقل بہر وفات نیک سرشت — گفت تاریخ "شدہ سوئے بہشت" ۱۰۸۹ھ

عنایت اللہ خاں بھی جو عالمگیر کا مقرب خاص رہا ہے۔ حافظہ مریم ہی کا فرزند تھا۔ یہ قاضی موسیٰ شہید کے تیسرے فرزند قاضی محمد صالح کی اولاد سے تھا۔ عالمگیر کے زمانے میں قاضی موسیٰ شہید کی اولاد کا دہلی آگرہ اور کشمیر میں بڑا عروج رہا ہے۔ میر فیروز الدین المخاطب بہ نواب ابوالبرکات خان بہادر فیروز جنگ صوفی تخلص۔ ناظم صوبہ کشمیر۔ نواب ابوالقاسم خاں صوفی۔ امانت خاں المخاطب بہ نواب عبدالاحد خاں اکبرآبادی اور حافظہ مریم بیگم کی اولاد سے نواب عنایت اللہ خان کے فرزند ہدایت اللہ خان مخاطب بہ نواب وزارت خان میر ساماں۔ نواب لطیف اللہ خان۔ میر نعمت اللہ المخاطب بہ نواب مشرف خان وغیرہ نامی گرامی ہو گزرے ہیں۔

قبر سعید خاں

اس قبرستان میں دو قبریں ایسی بھی نظر سے گزریں۔ جن پر عربی و فارسی رسم الخط کے علاوہ سنسکرت یا شاردا میں بھی کچھ حروف درج تھے۔ ان میں ایک قبر کے الفاظ پڑھے نہیں جا سکے۔ دوسری قبر سعید خاں شہید کی ہے۔ قبر

کی فارسی عبارت سے نام سعید خان اور یوم و سال شہادت جمعہ ۸۸۹ھ ظاہر ہوتا ہے۔ یہ عبارت قطعہ تاریخ وفات کے دو شعروں میں حسب ذیل ہے۔

به سال هشتصد و هشتاد و نه شهادت یافت | به تختگاه سلیمان سعید خان شهید عاقبت بخیر باد
رسول ہاند (یہ الفاظ پڑھے نہیں گئے) فرزند شاه ابراهیم | سپرد جان خداوند و در بهشت رسید فی یوم الجمعه

سنسکرت عبارت فارسی قطعہ تاریخ ہی کا ترجمہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ سنسکرت عبارت میں ہجری سنہ اور تاریخ کی بجائے لوکک سنتہ ۶۰ یعنی سنتہ ۴۵۶۰ لوکک اور بکرم شراون بدھی تشکروار درج ہے۔ یہ عبارت شاردہ رسم الخط میں لکھی ہوئی ہے۔ جو کشمیر کا قدیم رسم الخط ہے۔ اور جس کو سارسوت برہمنوں کے سوا کوئی لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ سنسکرت عبارت میں "محمد شاہ راج" کے الفاظ بھی درج ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ۸۸۹ھ میں جو سعید خاں کا سال وفات ہے۔ محمد شاہ بادشاہ کی کشمیر میں حکومت تھی۔ یہ وہی سال ہے جس سال سید حسن بیہقی اور سید محمد امین اویسی وغیرہ کئی سادات قتل کئے گئے تھے۔ سید محمد امین اویسی کی تاریخ شہادت شہید کشمیر۔ شہید شرع اور شہید عرش سے بھی نکلتی ہے۔ اور وہ بھی ۸۸۹ھ ہے جو محمد شاہ کی حکومت کا سال اول تھا۔

سعید خاں سادات سے تھا یا نہیں۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اس کے قطعہ تاریخ وفات اور اس کی قبر کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بھی قتل سادات کے سلسلہ ہی میں جو لڑائی ہوئی تھی۔ اس میں مارا گیا تھا۔ شری ور اپنی راج ترنگنی میں اس کا معمولی سا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ وہ سادات کا طرفدار تھا۔

قبور خیر الزمان خاں عالمگیری و خواجہ محمد اعظم مصنف تاریخ اعظمی

سعید خان شہید کی قبر سے ذرا فاصلہ پر خواجہ محمد اعظم دیدہ مری مصنف واقعات کشمیر عرف تاریخ خواجہ اعظمی کا مزار خستہ حالت میں ہے۔ اور جلاہوں کے مکانات کی دیوار کے ساتھ لپٹا ہوا ہے۔ آپ کی وفات ۱۰ محرم ۱۱۷۹ھ کو ہوئی تھی۔ یہیں آپ کے والد خواجہ خیر الدین الملقب بہ خیر الزمان خاں عالمگیری (وفات ۱۱۶۵ ہجری) کی قبر ہے۔ خیر الزمان خان نے قبرستان ملکھواہ کے حدود میں مزار کلاں کے متصل اپنا ایک خاندانی قبرستان وسیع احاطہ میں مزار دیدہ مرکے نام سے تعمیر کیا تھا۔ اب تو وہاں صرف دونوں باپ بیٹوں کی یا چند ایک اور قبریں نظر آتی ہیں۔ وہ بھی ایک گوشہ میں ہیں۔ باقی احاطہ مزار پر مکانات بن چکے ہیں۔

شاہی خاندان کابل کی چند قبریں

حضرت شیخ بہاؤالدین گنج بخش کے روضۂ خاص کی چہار دیواری کے باہر مگر دروازہ کلاں کے اندر بائیں ہاتھ ایک بلند چبوترہ پر جس کا فرش سیاہ و سفید پتھر کا ہے۔ تین چار قبریں افغانستان کے شاہی خاندان کے نامور فرزند سردار محمد ہاشم خان اور ان کے اعزہ کی ہیں۔ قبروں کے تعویذ سفید پتھر کے ہیں۔ اور ہر چند کہ ان قبور کو تینتالیس سال سے زیادہ عرصہ ابتک نہیں گزرا تاہم فرش کا پتھر کئی مقامات سے اکھڑ چکا ہے۔ اور بعض حروف بھی مٹ رہے ہیں۔ میں ان اشعار کو بھی ایک یادگار سمجھکر یہاں درج کرتا ہوں۔ معلوم ہوا ہے کہ پرنس عبد الرحمان خان آفندی خلف سردار ہاشم خان مرحوم جنہوں نے اب کشمیر کو اپنا اصل وطن بنا لیا ہے۔ ان قبور کی مرمت کی طرف توجہ فرما رہے ہیں۔

سب سے پہلے غربی جانب سردار محمد ہاشم خان کی قبر ہے جس پر یہ عبارت درج ہے۔

حضرت فیض درجت امیرالامرا سردار السلطنت اقتدار عالیجناب معلی القاب سردار محمد ہاشم خان محمد زہی شہزادہ افغانستان نوراللہ مرقدہ ؎

محمد ہاشم آں فرخندہ سیما　　محمد زائی و درانی آبا
بہ دنیا ماند چہل و ہشت سالہ　　کشیدہ رخت بر فردوس اعلیٰ
بہ بست و ہشتم ماہ رجب رفت　　بہ معراج وصال حق تعالیٰ
مزار گنج بخش آں قطب عالم　　شدہ چوں جنت الماوی مت بادا
نوشتہ قادری تاریخ سالش　　محمد ہاشم آمد خلد آرا = ۱۳۲۰ھ

دوسری قبر پر یہ عبارت درج ہے۔ محترمہ عزیزہ مستورہ بیگم صبیہ صفیہ سردار عالی مقام محمد ہاشم خان طلب شعاہما۔

بی بی پاک زاد و مستورہ　　نورعین امیر ذوی الاکرام
بست و سہ سال سن پاکش بود　　شد ز دار المحن بہ دار السلام
بست و چارم ربیع ثانی بود　　کہ بہ حوران خلد کرد آرام
قادری سال فوت او جست　　گفت دل در بہشت کرد مقام۔ ۱۳۰۱ھ

تیسری قبر بیگم صاحبہ سردار محمد ہاشم خاں مغفور کی ہے جس پر ذیل کی عبارت درج ہے "حضرت نواب مستطابہ بی بی احیرہ بیگم زوجہ عفیفہ سردار فردوس مکین محمد ہاشم خان نور البصر اعلیٰ حضرت امیر شیر علی خان والئے دولت قوی شوکت افغانستان نوراللہ جتودہم"۔

حضرت نواب عفت نشان ذوالاحترام　　زوجۂ پاک محمد ہاشم عالی مقام
غرۂ ماہ جمیدالاول از دنیا بہ رفت　　بود ہفتاد و دو سال عمر آں فرخندہ نام

قادری برداشت دست التجا در سلنش
گفت بادا سایۂ خیر النسا بر دے مدام

مزار کلاں کی بعض اور قبور

مزار کلاں کے وسیع احاطہ میں دو مشہور اولیائے کرام کے مزار بھی ہیں ان میں ایک سید احمد کرمانی اور دوسرے سید صبیب کاسانی ہیں۔ ان کے مزارات مقدسہ پر کوئی کتبہ نظر نہیں آتا۔ ان کے تفصیلی حالات کشمیر کی تاریخوں میں موجود ہیں۔ دونوں [illegible]روں کے سالانہ عرس ہوتے ہیں۔ اور عقیدت مند کافی تعداد میں جمع ہو جاتے ہیں۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل ایسی قدیم قبریں ہیں۔ جن پر صاحبان قبور کے نام درج ہیں۔ سلامت خاتون۔ رابعہ بی بی۔ سعیدہ بانو۔ خواجہ خسرو بیگ خواجہ مرجان۔ حاجی عبداللہ۔ میر حبیب اللہ۔ میر بابا۔

پتھر کی ایک طویل سل احاطۂ مزار میں ایک دیوار کے ساتھ ہے جس پر میر الٰہی شاعر کے متعلق بہت سے اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ یہ سل دراصل میر الٰہی کی قبر کا تعویذ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ قبر بھی جو اب منہدم ہو چکی ہے۔ اسی احاطہ مزار میں تھی۔ میر الٰہی کا یہ مشہور شعر مقبول عام ہے۔

ع یا الٰہی از الٰہی تو چہ پرسی در حشر
آنچہ او کرد تو دیدی وچہ گفتن دارد

کشمیر کی مختلف تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مزار کلاں میں مندرجہ ذیل بزرگ بھی مدفون ہیں۔

سادات۔ سید محمد افضل۔ سید مسافر۔ سید جلال۔

مشائخ - ملا محمد آنی - ملک جہانگیر - خواجہ محمد ککر و - شیخ رحمت اللہ - مولانا محمود بلخی - شیخ عباد اللہ - شیخ نعیم تارہ بلی - فخر الدین خوش قلم - خواجہ امیر الدین پھپلی وال -

علماء - قاضی ابراہیم - ملا نور اللہ کبنٹھ - ملا غلام رسول - مولوی غلام الدین جامعی - مولوی امیر الدین خورد - مولوی غنی شاہ -

شعراء - ملا شرف الدین خان فرحت - محمد علی خان متین محتشم خان فدا -

لیکن ان بزرگوں کی قبروں کا نہ محل وقوع کہیں ملتا ہے - اور نہ کوئی کتبہ ہی ایسا نظر آتا ہے جس سے ان کے اسماء یا سالہائے وفات معلوم ہو سکیں ؎

امیر فاتحہ پڑھنے کوئی کہاں آئے
نشان ہے نہ نشانِ مزار باقی ہے

ضمیمہ

بڈشاہی دارالحکومت (راجدھانی نوشہرہ) کے کھنڈر

اے کھنڈرا اے سرگذشت عظمتِ جنت نشاں
اے متاعِ جنس گمنامی کے بوڑھے پاسباں
اے عروجِ شانِ رفتہ کے پرانے نوحہ خواں
اے کہ توُ ہے مرثیوں کا اک نشانِ بے نشاں
جنتِ ارضی کی تو تعمیرِ عالیشان تھا
وہ بھی دن تھے تو محل تھا قصر تھا ایوان تھا

شہر گڑھی (امیرا کدل) سے گاندربل دملہ شاہی باغ کو جاتے ہوئے پانچویں میل کے قریب جرنیلی سڑک کے عین کنارے دائیں طرف چند سرکاری و غیر سرکاری باغات آتے ہیں۔ جن میں باغ نواب علی مردان خان باغ دینا ناتھ منشی۔ باغ دیوان بچھنداس بہت مشہور ہیں۔ یہ تمام علاقہ کشمیر کے نامور اور ہر دلعزیز بادشاہ سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ کے زمانہ میں راجدھانی نوشہرہ کے نام سے موسوم تھا۔ اور اس کی حدود چار کوس تک پھیلی ہوئی تھیں۔

دونراج راج ترنگنی میں دارالحکومت بڈشاہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔
بادشاہ نے ہری پربت کی پہاڑی سے امریش پور تک زینہ نگر نامی ایک شہر بسایا۔
جس میں مختلف بازار نہایت سلیقہ اور ترتیب سے تیار کرائے۔ بادشاہ نے اپنے
اس نئے شہر میں برہمنوں کے لئے کئی مٹھ تعمیر کرائے۔ اور ان کے لئے
کسی قیمت یا کرائے کے بغیر زمینیں وقف کیں۔ اور زینہ گنگا نہر کا اجراء
کرکے زینہ نگر کو زیب و زینت دی۔ لیکن عوام میں زینہ نگر کی بجائے نوشہرہ
یعنی نئے شہر کے لفظ نے زیادہ شہرت پائی۔ جو اب تک قائم ہے۔ امریش پور
کا موجودہ نام امیر دہیر ہے۔ جو نوشہرہ کے شمال میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے
یہیں بڈشاہ کا وہ شاہی ایوان تھا جس کی بارہ منزلیں تھیں اور ہر منزل
صنعت و حرفت اور نقش و نگار اور وسعت و سربلندی کے لحاظ سے عجوبۂ
روزگار تھی۔ ہر منزل میں پچاس پچاس کمرے و حجرے تھے۔ اور ہر کمرے
میں پانچسو آدمی سما سکتے تھے۔

مرزا حیدر کاشغری نے اپنی تاریخ رشیدی میں اور خواجہ نظام الدین احمد
نے طبقات اکبری اور جہانگیر نے اپنی تزک میں اس ایوان عالی شان اور
دارالحکومت کے باغ ہائے دلکشا کی بہت تعریف کی ہے۔ مگر اب ان باغات
دلکشا کے غنچہ و گل کا کیا حال ہے۔ چند ورق جو جمع تھے۔ بکھر چکے ہیں۔ اور
انقلاب زمانہ کے بے درد و بے رحم ہاتھوں نے اس "راجدھانی" کے
ٹکڑے ٹکڑے کرکے بار لوگوں کو سستے داموں بانٹ دیئے ہیں ؎

اڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری (اقبال)

راجدھانی کے اس محدود علاقہ کے مشرق میں موضع منڈی بل۔ مغرب

ہیں محلہ گل کدل نوشہرہ شمال ہیں لکھری پورہ۔ اور جنوب ہیں محلہ مدین صاحب واقعہ ہے
دیوار پختہ کے آثار منڈی پل کی طرف سے شروع ہوکر دینا ناتھ منشی کا وہ ڈاری
اور آنند بوئی بیل لانگری کے باغات سے ہوکر دیوان پھمنداس کے باغ
ہیں داخل ہوتے ہیں۔ اور یہاں سے نکل کر عبلی شاہ جلالی اور عیلی خان ساکن مدین
صاحب کے باغات ہیں جاکر معدوم ہوجاتے ہیں۔ اس چونہ گچ دیوار کے جو
آثار منڈی پل سے باغ دینا ناتھ منشی تک جاتے ہیں۔ وہ بھی چھ سو فٹ
کی لمبائی سے کم نہیں ہیں۔ اور جہاں اس دیوار کے آثار معدوم ہوجاتے
ہیں۔ وہ لمبائی بھی ایک میل سے کم نہیں ہے۔ دیوار کے علاوہ محلات و مکانات
کی بنیادوں کے آثار اب تک نظر سے اوجھل نہیں ہوسکے۔ یہ آثار پانچ چھ
فٹ کی گہرائی تک کھودے جاچکے ہیں۔ اور "مالک باغ" ان بنیادوں کا
اور اس دیوار کا چونہ اینٹ اور پتھر فروخت کرتا رہتا ہے۔
ان کھنڈروں کے دو طبقوں کے نشان اب تک موجود ہیں۔ زیرین
طبقہ کے متعلق منڈی پل کے معمر لوگوں کا بیان ہے کہ یہاں فوارے بھی تھے
اور آبشاریں بھی تھیں۔
یہاں سے مشرق کی طرف قریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلہ پر ایک نہر بنام
"بادشاہ کوہل" ہے جس کو بادشاہ اپنی راجدھانی کے ایوانات و باغات کی
زیبائش و آبادی کے لئے نالہ سندھ سے لایا تھا۔ جو احمد اکدل کے
متصل ڈل ہیں جاگرتی ہے۔
نہر کا قدیم نام بادشاہ کے نام پر زینہ گنگا تھا
۔یہی زینہ گنگا بادشاہ کے حکم سے علاقہ لار (نالہ سندھ)
سے لائی گئی تھی۔ جو دارالحکومت نوشہرہ کو سیراب کرتی تھی۔ یہ نہر بادشاہ

کوہل کے نام سے اب بھی موضع منڈی بل کے پاس سے گزرتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے۔ کہ یہاں بڈشاہی عہد کی اینٹیں بھی پائی جاتی ہیں۔

راجدہانی کے اس محدود رقبہ میں اس وقت جو غیر سرکاری باغات ہیں۔ ان کی تعداد سات ہے۔ مگر اس خام سڑک نے جو محلہ مدین صاحب سے دچار ناگ کو جاتی ہے۔ ان کو یا یہ الفاظ دیگر ان کھنڈروں کو دو حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔ اب ایک طرف وزیر باغ درباغ اور باغ آنندکول ہیں اور دوسری طرف باغ دیناناتھ منشی۔ باغ دیوان نجھنداس اور باغ عبکلی شاہ جلالی رہ جاتے ہیں۔ باغ انندکول کی چاردیواری کے اندر قدیم زمانے کے تراشیدہ پتھر منتشر طور پر اب تک پڑے ہیں۔ لچھمی کوہل جس کی بانیہ ملک سیف الدین بٹ وزیر اعظم سلطان سکندر کی دختر لچھمی خاتون تھی۔ کے آثار پائے جاتے ہیں۔ یہ نہر گاندربل (نالہ سندھ) سے نکل کر دچار ناگ کے ایک قدیم سنگین ڈمٹ[۱] کے پاس سے ہوتی ہوئی منڈی بل میں جاتی ہے۔ اور نوشہرہ۔ مدین صاحب اور حول سے گزر کر جامع مسجد میں جاکر ختم ہو جاتی ہے۔

درباغ اور باغ انندکول میں تین چار مقامات پر بڑے بڑے پرانے پتھر بکھرے پڑے ہیں۔ اور "بیچارگی" اجڑی ہوئی دنیا" کے نشان ملتے ہیں۔ ایک بے آب و گیاہ خشک کھنڈر پر کھدائی بھی ہو چکی ہے۔ غالباً سنگدل ضرورت مندوں نے دیوار کا سینہ چاک کر کے اس میں سے پتھر نکال لئے ہونگے جس سے یہ سنگین دیوار اب ایک کھنڈ کی شکل میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس پختہ سنگین دیوار کے بقیہ پتھر اب تک اس میں سے نظر آرہے ہیں۔

دو مقامات پر زمانہ قدیم کی دو پختہ قبریں بھی اپنی شکل و صورت سے

[۱] اس سنگین ڈوسٹ کے پاس بھی حوض اور فواروں کے نشان موجود ہیں

اپنی قدامت کا ثبوت دے رہی ہیں۔ ان کے ساتھ چند اور معمولی قبریں بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بدشاہی دارالحکومت کی بربادی اور ان کے زمانہ مابعد کے باغات کی ویرانی کے بعد بولتے چالتے انسانوں کے شہر کی جگہ یہاں شہر خاموشاں کو آباد کرنا مناسب سمجھا گیا تھا ؎

جو خستہ حال الفت ہیں وہی برباد ہوتے ہیں
تباہی ڈھونڈتی پھرتی ہے دنیا میں تباہی کو

باغ آنند کول سے جنوب کی طرف ایک مستطیل شکل کی بہت نشیبی جگہ ہے چونکہ اس کے ایک طرف اس باغ کی دیوار کے متصل ایک معلوم و معدوم سنگین دیوار نظر آتی ہے جس کے کچھ پتھر اب تک مٹی کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ اور بعض گڑھوں اور نشانوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان میں سے پتھر نکالے جا چکے ہیں۔ اس کے شمال کی طرف بھی کچھی کوہل کے ساتھ ساتھ بعض پتھر اب تک موجود ہیں۔ اور سیدھی قطاریں دیوار بندی کی شکل میں ہیں اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ نشیبی جگہ کوئی پختہ تالاب یا بہت بڑا حوض تھی جس کے کنارے بادشاہی مجلس آراستہ ہوتی ہوگی غور کرو اس میں فوارے چلتے ہونگے تو بادشاہ اپنے ندیموں کے ہمراہ کیا کچھ لطف نہ اٹھاتا ہوگا۔ اور یہ علما پرست اور علم نواز بادشاہ جب اپنے ہندو مسلم اہل درباریوں سے علمی مباحث یا سیاسی گفتگو اسی حوض کے کنارے بیٹھ کر کرتا ہوگا۔ تو کیا کیا نکات حل نہ ہوتے ہونگے۔ اور کیسی کیسی سیاسی گتھیاں تدبر کے منتظم ہاتھوں سے سلجھائی نہ جاتی ہونگی۔ آہ ؎

اک جھلک اپنی دکھا کر چھپ گئی برق تپاں
بجھ گئے شعلے سلگتی رہ گئیں چنگاریاں

ان باغوں کا یہ وسیع و عریض علاقہ جو منڈی بل سے لیکر محلہ مدین صاحب کے قرب تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جو کسی زمانے میں سلطان زین العابدین عرف بڈشاہ کے دارالحکومت ہونے کی وجہ سے "راجدھانی" کے نام سے موسوم تھا۔ ایک بلندی پر واقع ہے۔ جو زمین کی سطح سے قریباً آٹھ گز اونچائی پر ہے۔ باغات کے علاوہ اس رقبہ میں جو خالی زمین پڑی ہے۔ خصوصاً منشی باغ کے سامنے وہاں اب تک خشک فصل کی کاشت ہوتی ہے۔

یہ اس بادشاہ کے باغات وایوانات کا عبرتناک حشر ہے۔ جو مسلمانوں میں بڈشاہ (شاہ اعظم) کہلایا۔ اور جس کو ہندوؤں نے بٹ شاہ یعنی ہندوؤں کے بادشاہ کا خطاب دیا۔ اور آج بھی کہ اس کی موت کو قریباً پونے چھ سو سال گزر چکے ہیں۔ اس کے تقدس اور اس کی بزرگی کا یہ عالم ہے کہ جب کشتی بان بڑے بڑے کچھوؤں اور ہوس بوٹوں کے چلانے میں اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہیں۔ تو بے ساختہ ان کی زبان سے "بڈشاہ بادشاہ" کے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ اس دردانگیز منظر پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ اور بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن ؎

یہ تو ہے بات ہی کچھ اور کہیں کچھ نہ کہوں
ورنہ کیا مجھ پہ جو گذری ہے مجھے یاد نہیں

ضمیمہ ۸

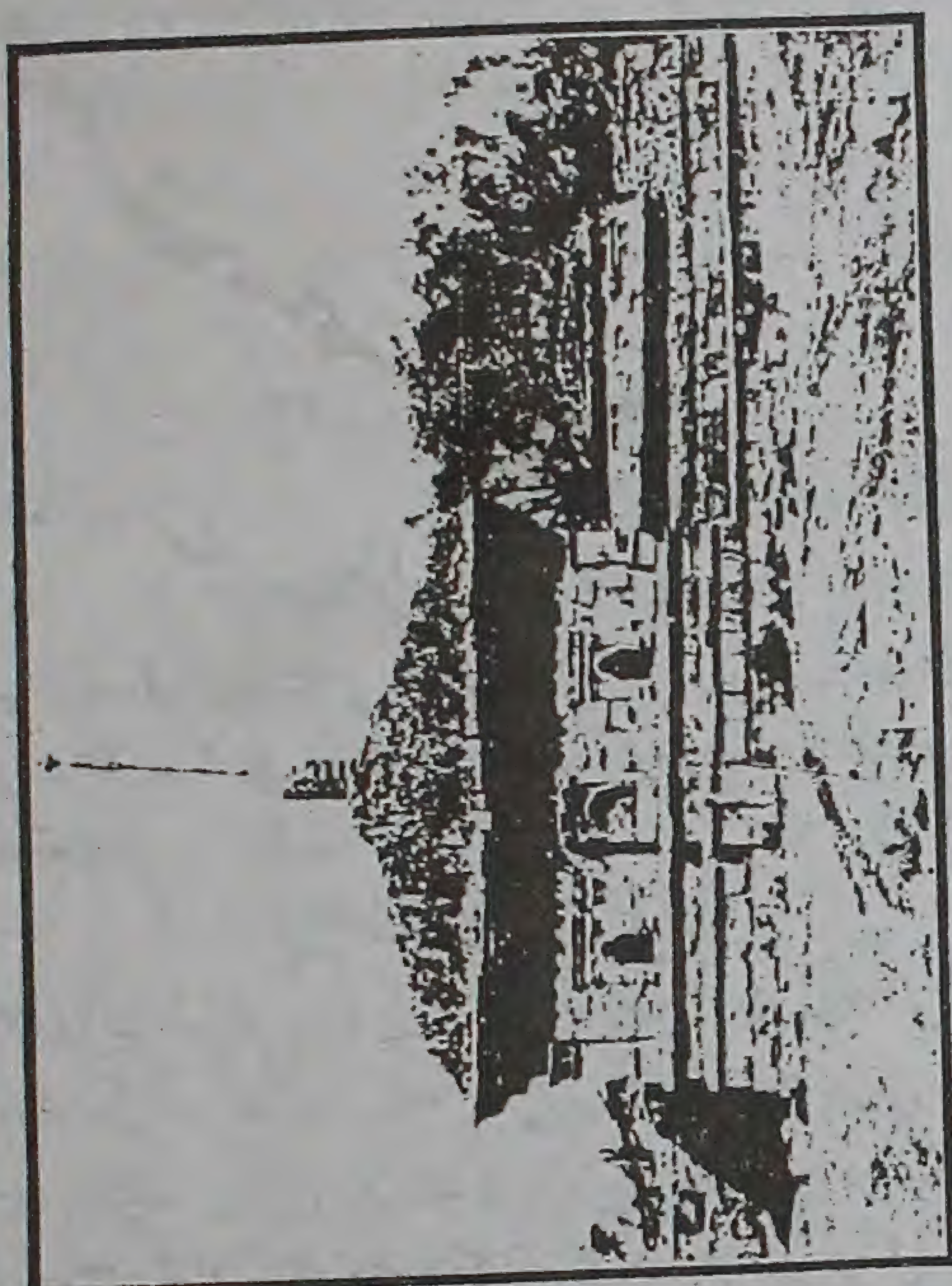
مسجد و مزار سیّد مدنیؒ

آپ کا کچھ ذکر عہد بدشاہی کے علماء و مشائخ میں ہو چکا ہے۔ بادشاہ نے آپ کے لنگر خانہ، مسجد، مدرسہ اور خانقاہ کے اخراجات کے لئے چند دیہات وقف کر دیئے تھے۔

مسجد حضرت سید مدنیؒ

مسجد کی تعمیر ۸۴۸ھ میں ہوئی۔ ۸۲۶ھ کی تخت نشینی کے مطابق اس وقت بادشاہ کی حکومت کا بائیسواں سال تھا۔ مسجد اب بھی موجود ہے لیکن جب ہم تذکروں میں یہ پڑھتے ہیں۔ کہ یہ مسجد اہل فن کاریگروں کی قابل دید صنعت اور اعلےٰ قابلیت کا نمونہ تھی۔ اور جب ہم مسجد کی موجودہ حالت دیکھتے ہیں۔ اور اس کے ملحقہ حمام اور لنگر خانے اور مسجد کی در و دیوار پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ایک آہ بھر کر رہ جاتے ہیں۔

یہ مسجد محلہ مدین صاحب میں واقع ہے۔ اور سر راہ موجود ہے۔ یہیں



سے چند قدم آگے دائیں طرف بڈشاہ کی "راجدھانی" کے عبرتناک آثار نظر آتے ہیں۔ مسجد کا چوبی دروازہ اور اس کے سیاہ پتھر کے ستون اب بھی اس کی عظمت دیرینہ سکے نوحہ خواں ہیں۔ دروازہ کے اوپر بخط جلی عربی حروف میں لکھا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ محمد الرسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَ اٰلِہٖ وَسَلَّم۔ بنی ھذا المسجد فی العھد ظل اللہ فی الارضین سلطان زین العابدین

خلداللہ ملکہٗ۔ اس عبارت کے دائیں طرف ایک دوسرے پتھر پر یہ الفاظ درج ہیں:۔ "بنا ھذ المسجد الفقیر محمد المدنی ساکن کشمیر" اور بائیں طرف سال تعمیر مسجد ۸۴۸ھ ان عربی الفاظ میں درج ہے۔

فی تاریخ سنہ ثمان واربعین وائما نمائتیہ"

مزار حضرت سید مدنیؒ

مزار بھی مسجد کے ساتھ ہی ہے۔ اور احاطہ مزار کے باہر ایک بہت بڑا قبرستان ہے۔ جو قبرستان مدین صاحب کہلاتا ہے۔ مزار کے دروازے کے سامنے عین سڑک کے درمیان ایک اوربختہ قبر ہے۔ جو ان کے "عرض بیگی" کی بیان کی جاتی ہے۔ عرض بیگی لوگوں کی اطلاعات اور عرضداشتیں آپ کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا۔ مزار کا احاطہ بڈشاہی عہد کی رنگین ٹائیلوں سے مزین تھا۔ اور دروازے کے اوپر اور اس کے دائیں بائیں کئی فارسی اشعار درج ہیں۔ جن میں اب کچھ پڑھے جاتے ہیں۔ کچھ پڑھے نہیں جاتے۔ بعض مقامات پر حروف ٹوٹے ہوئے ہیں۔ بعض جگہ بالکل ہی مٹ گئے ہیں۔ عہد شاہجہانی کی مرمت نے اس میں بعض جدید

اشعار کا اضافہ کر دیا ہے۔ اور وہ اضافہ بھی اب نابود ہو رہا ہے۔

اشعار کے کچھ نمونے حسب ذیل ہیں ؎

ہزار شکر کہ دروازۂ بنا شدہ خوش ـ بہ عہد شاہجہاں (اس کے آگے حروف مٹ گئے ہیں)

طواف روضۂ (صد پاک) سید مدنی ـ (آگے پھر مصالحہ اکھڑا ہوا ہے)

ــــ سید ناوائے مفخر دیں ـ از فیض تو سرسبز بود روئے زمیں

سید مدنی ــــ سرمایۂ کونین بود۔ طواف درت ــــ اخلاص ــــ

ظاہر اللہ ایں سید برگزیدہ در عدنی ست"۔ غرض بطور یادگار یہ نامربوط اور نامکمل مصرعے اور اشعار درج کر دیئے ہیں۔ ورنہ ان سے حاصل کچھ نہیں ہو سکا۔

بڈشاہ کے زمانہ کی ٹائیلوں نے دروازہ کی تمام دیواروں کو زیب و زینت کی نعمت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ اب وہاں صرف چند ٹائیلیں دیواروں میں جڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مزار کی عبرتناک حالت

اس کے اندر جاؤ جہاں مزار مبارک ہے۔ وہاں اور بھی زیادہ ہولناک اور عبرت انگیز کیفیت نظر آتی ہے۔ قبر کے سنگ سیاہ کے تعویذ پر سید محمد مدنی ساکن کشمیر کے الفاظ درج ہیں۔ قبر کی چھت کی لکڑیاں کچھ اٹکی ہوئی ہیں۔ اور کچھ نیچے زمین پر پڑی ہوئی ہیں۔ جنگلی بوٹیوں نے سبزہ زار تو نہیں خارزار کا عالم پیدا کر رکھا ہے۔ قبر کے آس پاس چند اور حضرات کی قبریں بھی ہیں۔ یہ اس برگزیدہ ہستی کا مزار ہے جس کا بادشاہ وقت ایک ادنیٰ خادم تھا۔ اور جس کے مزار کو خود بادشاہ کی حسن عقیدت نے تعمیر کرایا۔ اور جس کے دو سو سال کے بعد نواب علی مردان خان گورنر کشمیر نے اپنے بادشاہ شاہجہان کے حکم سے ۱۰۵۰ھ سے ۱۰۶۰ھ کے درمیان اس کی مرمت کی

مزار اور مسجد پر سرکاری قبضہ

اس واقعہ کے قریبًا سوا دو سو سال کے بعد ڈوگرہ حکومت کے عہد میں عرس کے موقعہ پر سنی اور شیعہ کے درمیان وہ فتنۂ عظیم برپا ہوا کہ لوٹ مار اور قتل و غارت کے علاوہ ایک دوسرے کے مکانات کو آگ لگا دی گئی۔

ان ایام میں مہاراجہ سر رنبیر سنگھ کشمیر کے حکمران اور وزیر پنوں انگروہ والے یہاں کے گورنر تھے۔ حکومت نے دوسرے ہی دن مزید فساد کے خوف سے سید محمد مدنی کے مزار اور ان کی مسجد کو سرکاری قفل لگا دیئے۔ یہ زمانہ ۱۲۸۰ھ مطابق سمت ۱۹۲۰ ب موافق ۱۸۷۱ء کا تھا۔ چنانچہ اس وقت سے لیکر ۱۳۵۰ھ یعنی کامل ستر سال تک یہ دونوں متبرک مقامات ضبط شدہ رہے۔

ستر سال کے بعد واگذاری

اب مہاراجہ سر ہری سنگھ بہادر کے عہد (۱۹۳۰ء مطابق ۱۳۵۰ھ) میں مسلمانوں نے جہاں اپنے اور متبرک مقامات اپنی معروضات کے ذریعہ واگزار کر لیے۔ ان میں یہ دونوں متبرک مقام بھی شامل ہیں۔

لیکن اب ان مقامات پر سنیوں کا قبضہ ہے نہ شیعوں کا۔ بلکہ جس کا جی چاہے آتا ہے۔ اور فاتحہ پڑھ کے چلا جاتا ہے۔